پاکیزہ

2015

نگہت سیما اور قیصرہ حیات کے سلسلے وار ناول

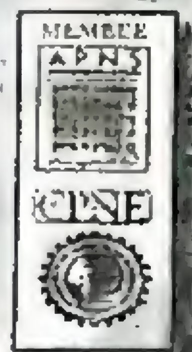
ثمیرین حمید نایاب جیلانی اور دیگر کے ہمراہ عشق رائٹرز کی پُر لطف تحریریں



ماڈل : سدرہ
میک اپ: روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر: موسیٰ رضا

ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی

نگرانِ اعلیٰ: معراج رسول
مدیرۂ اعلیٰ: عذرا رسول
مدیرہ: انجم انصار
معاون: آمنہ حماد



رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی

شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789
نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391
رانا اے حمید 0323-2895528
نمائندہ لاہور سید افراز علی نازش 0332-4214400

قیمت فی پرچا (پاکستان) 60 روپے
قیمت فی پرچا (سعودی عرب) 12 ریال یا مساوی متحدہ عرب امارات

اداریہ

سلسلے وار ناول

ناولٹ

منی ناول

افسانے

خصوصی مضامین

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



عید مبارک

مستقل عنوانات

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone: (021)35895313, Fax: 35802551, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com



اگر کوئی یہ جاننا چاہے کہ بڑھاپے کا حقیقی آغاز کب سے شروع ہوتا ہے تو ان سے ہم یہ کہیں گے کہ جس لمحے آپ یہ کہنا شروع کرتے ہیں...... آہ بیتے ہوئے دن کتنے اچھے تھے۔ جب میں جوان تھی تو ہر طرف میرا شہرہ تھا، جب میں کھانا پکاتی تھی، جب میں گھر ڈیکوریٹ کرتی تھی، ہر طرف میری واہ، واہ ہوتی تھی۔ کاش وہ بیتے ہوئے دن پھر لوٹ آئیں، مختصر یہ کہ جس لمحے یاد ماضی عذاب بن جائے سمجھ لیجیے کہ آپ کے بڑھاپے کا آغاز ہو گیا ہے۔

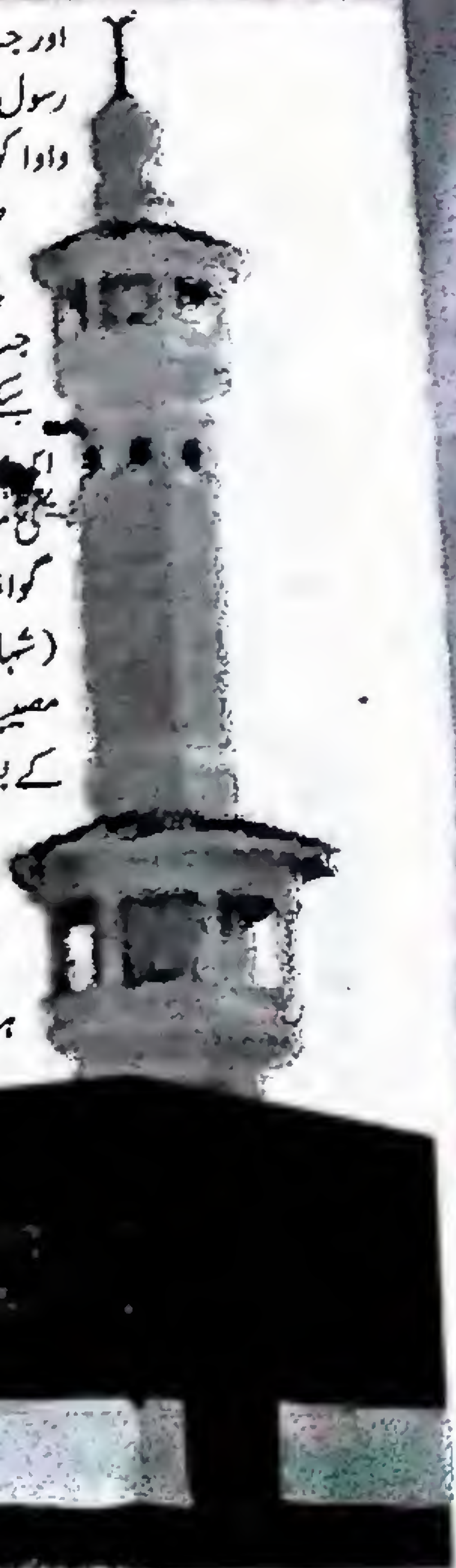
جس لمحے آپ کو حال کے بجائے ماضی دلکش نظر آنے لگے، مستقبل میں دلکشی نہ رہے تو خواتین وحضرات کو یہ جان لینا چاہیے کہ آپ پر پیرانہ سالی کا سایہ منڈلانے لگا ہے۔ آپ پر بڑھاپا طاری ہو رہا ہے۔ آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ ضعیف اور بوڑھے لوگ عموماً کیا باتیں کرتے ہیں؟ کیا وہ کبھی حال کی باتیں کرتے ہیں؟ مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے ہیں؟ یا وہ صرف یہی باور کراتے ہیں کہ ان کا ماضی ان کے حال سے زیادہ اچھا تھا تو اس کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف حال سے ہی نہیں بلکہ اپنے مستقبل سے بھی مایوس ہو چکے ہوتے ہیں اور ایسے تمام لوگ وقت سے پہلے بوڑھے ہو جاتے ہیں اور آج ہمیں آپ سے یہی کہنا ہے کہ ہمیں زندگی اور اس کے تغیر کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ گزرے ہوئے وقت کو یاد کرنے کے بجائے اپنے موجودہ وقت کو کامرانیوں اور شادمانیوں سے ہمکنار کرنے کے لیے کوشش کیجیے۔ اور یہ بات ہمیشہ یاد رکھیے...... جب تک ہم مستعد رہیں گے ہم پر بڑھاپا طاری نہیں ہوگا...... ورنہ بہت سے جوان لوگ بھی بوڑھے لوگوں جیسی زندگی گزارتے نظر آتے ہیں اور ہم تو ایک پُرعزم قوم ہیں، ہمیں اپنی زندگی اور اپنے ملک کو بہتر، کامیاب اور شادمان بنانا ہے اس کے لیے ہمیں بہت کچھ کرنا ہے اور بہت کچھ پانا ہے کہ اللہ ہمارا کارساز ہے (بے شک) آپ سب کو پیشگی یوم آزادی مبارک ہو......!

مدیرہ

انجم انصار

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو اللہ نے نازل فرمایا ہے اس کی طرف اور رسول (اللہ) کی طرف آؤ تو کہتے ہیں کہ ہم نے جس (طریقے) پر اپنے باپ، دادا کو پایا ہے (وہی) ہمیں کافی ہے (ہم) کو رسول کے پاس آنے کی ضرورت نہیں) کیا اگر ان کے باپ دادا کچھ نہ جانتے ہوں اور نہ ہدایت پر ہوں (۱۰۴) اے ایمان والو تم پر اپنی جانوں کی حفاظت لازمی ہے جب تم ہدایت پر ہو گے تو جو شخص گمراہ ہو گیا ہے وہ تمہیں کچھ ضرر نہیں پہنچا سکے گا اللہ کی طرف تم سب کو لوٹنا ہے پس جو کچھ تم (دنیا میں) کرتے تھے اس سے تمہیں آگاہ کر دے گا (۱۰۵) اے ایمان والو جب تم میں سے کسی کی موت قریب آئے تو وصیت کے وقت تم میں سے دو انصاف والوں کی گواہی تمہارے درمیان میں کافی ہے یا تمہارے سوا دوسرے آدمیوں کی (شہادت ہو) اگر تم زمین میں سفر کرو اور (بحالت سفر) تمہیں موت کی مصیبت پہنچے اگر تمہیں (کسی قسم کا) شک ہو تو ان دونوں (گواہوں) کو نماز کے بعد روکو وہ اللہ کی قسم کھائیں کہ ہم اس (گواہی) کے عوض میں کچھ دام نہیں لیتے اور اگرچہ (جس کی گواہی ہم دیتے ہیں وہ ہمارا) عزیز ہو (تب بھی ہم جھوٹی گواہی نہ دیں گے) اور اللہ کی (فرض کی ہوئی) گواہی نہ چھپائیں گے بے شک ہم اس وقت یقیناً گناہ گاروں سے ہو جائیں گے (۱۰۶) پھر اگر اس بات پر اطلاع ہو جائے کہ وہ دونوں گناہ کے مستحق ہو گئے (یعنی جھوٹی گواہی دی) تو دوسرے دو آدمی ان لوگوں میں سے جن کی حق تلفی کی ہے زیادہ قرابت دار (ہوں) ان کے قائم مقام ہوں اور اللہ کی قسم کھائیں کہ بے شک ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی سے سچی ہے اور ہم نے تجاوز نہیں کیا بے شک ہم اس وقت یقیناً ظالموں میں سے ہو جائیں گے (۱۰۷)

(سورۂ مائدہ آیت نمبر ۱۰۴ تا ۱۰۷)



سیدنا محمود صلی اللہ علیہ وسلم

۶..... حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میرے حوض کی مسافت ایک مہینہ کی ہے۔ (یعنی وہ اس قدر طویل و عریض ہے کہ ایک جانب سے دوسری جانب تک جانے کے لیے مہینہ درکار ہے) اور اس کے زاویے (گوشے) بالکل برابر نہیں (یعنی مربع ہے) اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور اس کی خوشبو مشک سے بھی بہتر ہے اور اس کے کوزے آسمان کے تاروں کی طرح حسین و چمکدار ہیں۔ اور بے شمار ہیں جو اس کا پانی پیے گا کبھی پیاس میں مبتلا نہیں ہو گا۔

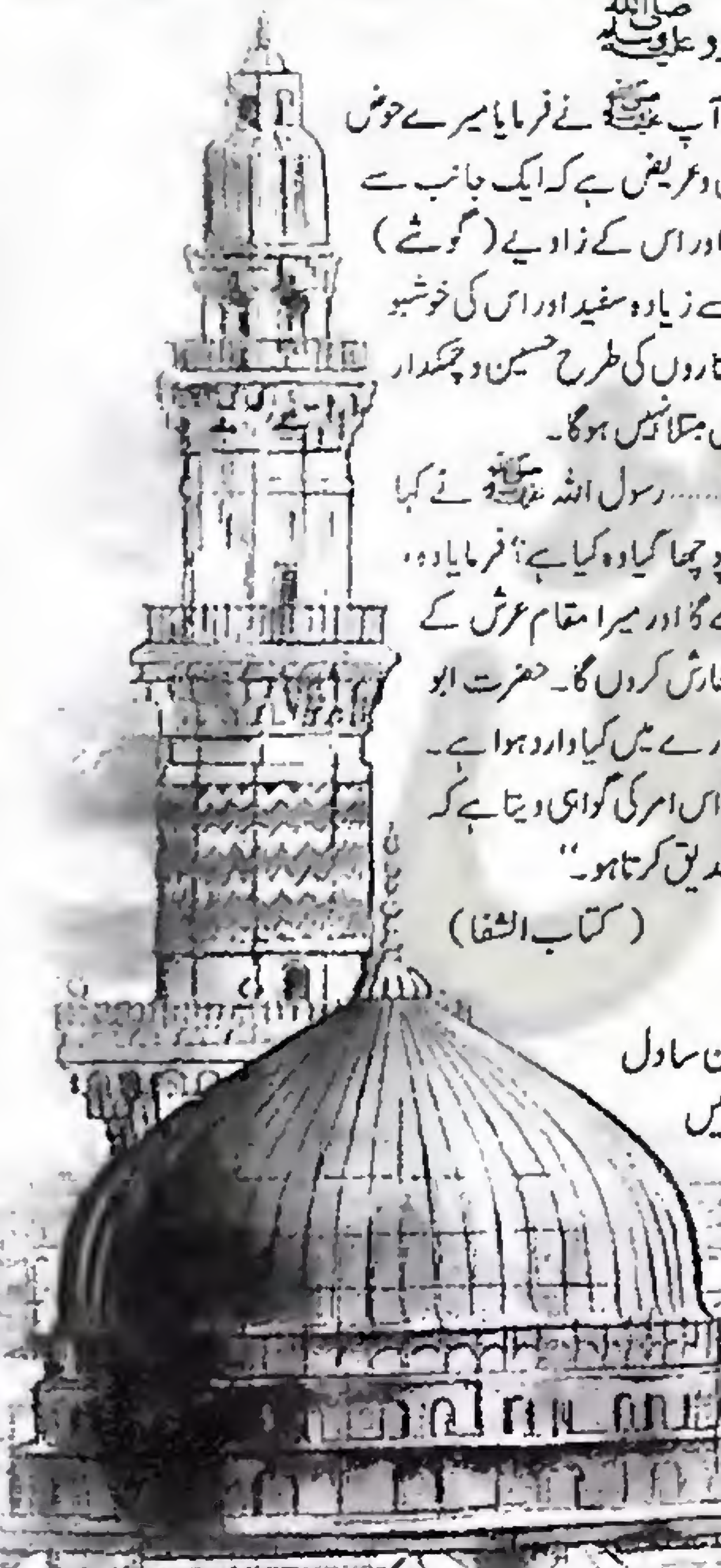
حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ فرمایا..... رسول اللہ ﷺ نے کہا میں مقام محمود پر کھڑا ہونے والا ہوں آپ ﷺ سے پوچھا گیا وہ کیا ہے؟ فرمایا وہ، وہ دن ہو گا جس میں اللہ تبارک تعالیٰ کرسی پر اترے گا اور میرا مقام عرش کے دائیں جانب ہو گا جہاں میں اپنی امت کے لیے سفارش کروں گا۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے پوچھا۔ آپ ﷺ کے لیے شفاعت کے بارے میں کیا وارد ہوا ہے۔ فرمایا۔ ”میری شفاعت اس شخص کے لیے ہے جو خالصتاً اس امر کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کا دل اس کی زبان کی تصدیق کرتا ہو۔“

(کتاب الشفا)

۴۔ الرائے......

1۔ انصاف کا دن یوم قیامت ’یوم لا دین‘ کون سا دل ہے جس میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی آرزوئیں کروٹ نہ لیتی ہوں۔ 19 ویں صدی کے وسط میں برطانیہ کا ایک آدمی ساٹھ برس کی زندگی پا لینے کی امید کر سکتا ہے۔ جب یہ ساٹھ برس گزر جاتے ہیں تو گویا وہ زندگی ایک دو دن کی محسوس نہیں ہوتی۔ مایوسی اور ناامیدی کی ایسی صورت حال میں محسن انسانیت محمد ﷺ کا پیغام ہمیں حیات جاوداں کا مژدہ سناتا ہے یہ حسین ترین سچائیوں میں سے ایک سچائی ہے۔

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسما النبی ﷺ سے اقتباس



اعتبارِ وفا

نگہت سیما

یہ سچ ہے کہ محبت میں وقت کا وزن نہیں ہوتا... گفتگو کا وزن نہیں ہوتا، ہر طرف تو کیا دل و دماغ تک پر ایک بے وزن سی کیفیت محسوس ہوا کرتی ہے... کہ دل و دماغ کو کوئی دوسری بات سُجھائی تک نہیں دیتی۔ ایسے حالات میں کسی بھی انسان کے پاؤں جمے نہیں رہتے اور وہ ہر وقت لڑھکتا رہتا ہے۔

مگر خود کو سنبھال کر متوازن رکھنا ہی محبت کا اصل پلیٹ فارم ہے... لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس بے وزنی کے اصول کو بھی محسوس کر لیا جائے... اور مان لیا جائے... کہ محبت کا اوّلین قانون اعتبار ہے... اور وفا کے غنچے وہیں کِھلتے ہیں... جس گلشن میں اعتبار کا بیج بویا جاتا ہے۔

گلاب چہروں پہ دُھول کتنی مسافتوں کی جمی ہوئی ہے
چراغ آنکھوں میں جانے کتنے سفر کے جالے تنے ہوئے ہیں
نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جلتی دھوپوں کا کوئی حصّہ
کہاں کا ذکرِ سفر کہ پہلے قدم پہ ہم تو رُکے ہوئے ہیں

قسط:12



''ہاں، میں سائیں مٹھا۔'' اس نے ثمر حیات کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کسی زہریلے سانپ کی سی چمک تھی اور اس کی نظریں جیسے ثمر حیات کے وجود میں کھبی جا رہی تھیں۔

''کیسے ہو دادا! میں تو سمجھا تھا کہیں مر کھپ چکے ہو۔'' اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ثمر حیات ہونٹ بھینچے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے اندر جیسے تلاطم بپا تھے، طوفان اٹھ رہے تھے۔ اس کے سامنے وہ شخص کھڑا تھا جسے وہ زندگی میں دوبارہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا اور اس نے بارہا دعا کی تھی کہ وہ کبھی اس کے سامنے نہ آئے ورنہ اسے ڈر تھا کہ وہ کہیں فرحی کے ساتھ کیا ہوا وعدہ توڑ نہ دے۔ وہ وعدہ جو اس نے مرتے دم اس سے لیا تھا لیکن آج اتنے سالوں بعد وہ پھر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے خون میں ابال اٹھ رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا اس نے مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔

''سائیں مٹھا اپنے دشمن کو قبر تک نہیں چھوڑتا دادا، تم خوش قسمت تھے جو تب بچ گئے تھے لیکن تقدیر پھر تمہیں آج میرے سامنے لے آئی ہے تو شاید اس بار تم اتنے خوش قسمت ثابت نہ ہو سکو۔'' وہ عجیب طرح سے ہنسا۔ بالی جو سیمو کو سہارا دیے ثمر حیات کے پیچھے ہی آ رہا تھا یک دم اس نے سیمو کے بازو سے ہاتھ ہٹایا اور چیتے کی سی پھرتی سے چلتا ہوا ثمر حیات کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور بے اختیار اس نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے کھلے ڈلے کرتے کی جیب میں ڈالا تو سائیں مٹھا کے ہونٹوں پر بکھری طنزیہ مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ اس نے رخ موڑ کر اپنے پیچھے موجود گارڈز کی طرف دیکھا جن کے ہاتھ اپنی گنوں پر تھے اور پھر مڑ کر بالی سے مخاطب ہوا۔

''لڑکے اپنا کھلونا جیب میں ہی رہنے دو پھر کسی موقع پر اپنی حسرت پوری کر لینا۔'' اور پھر ثمر حیات کی طرف دیکھا۔

''اسی شہر کراچی میں رہتے ہو دادا تو پھر ملاقات تو ہوتی رہے گی تب پچھلے حساب دیکھیں گے اور سارے کھاتے کھولیں گے۔ قدرت اگر آج اتنے سالوں بعد تمہیں سامنے لائی ہے تو پھر بھی ضرور لائے گی.. کیوں دادا؟''

ثمر حیات خاموش کھڑا فرحی کے ساتھ کیے اس آخری وعدے کو دل ہی دل میں دُہرا رہا تھا۔

''آج اگر کچھ دیر بعد میری بیوی کا یہاں اس کلینک میں آپریشن نہ ہوتا تو آج ہی دو، دو ہاتھ کر لیتے لیکن تم بہت غلط وقت پر سامنے آئے ہو۔ دادا تمہاری قسمت......''

''مٹھا سائیں۔'' ایک ملازم نما شخص گارڈز کے پیچھے سے نمودار ہوا تھا اور تقریباً آدھا جھک گیا تھا۔

''بولو۔'' سائیں مٹھا اب اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''بی بی پوچھ رہی ہیں وہ ابھی گاڑی میں ہی بیٹھیں یا......''

''انہیں لے آؤ۔'' سائیں مٹھا نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔

''جی سائیں۔'' ملازم یوں ہی جھکے، جھکے بولا تھا اور پھر سیدھا ہوتے ہوئے چند الٹے قدم چل کر مڑا تھا۔ ثمر حیات کی نظریں اب ملازم پر تھیں جو گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ بی ایم ڈبلیو تھی اور اس کے پیچھے ایک اور گاڑی تھی جس کے دروازے سے ٹیک لگائے ایک اور گارڈ گن ہاتھ میں اٹھائے کھڑا اِدھر اُدھر متجسس نظروں سے دیکھ رہا تھا، وہ کچھ دیر یونہی گارڈ کی طرف دیکھتا رہا۔ بی ایم ڈبلیو سے اترنے والی خاتون بڑی سی سفید چادر لپیٹے ایک ملازمہ کے سہارے ہولے، ہولے چلتی ہوئی کلینک کی طرف آ رہی تھی۔ بے حد مضطرب سا ہو کر اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنے ریوالور پر پڑا تھا جو قمیص کے نیچے چھپا ہوا تھا اور ایک لمحے کو اس کا جی چاہا تھا کہ وہ اپنے ریوالور کی ساری گولیاں سامنے ہولے، ہولے قدم دھرتی کلینک کی طرف آتی عورت کے سینے میں اتار دے اور اپنے سینے میں جلتی آگ کو ٹھنڈا کر لے..... وہ آگ جو کئی برسوں سے اس کے اندر جل رہی تھی، دہک رہی تھی، خون کا بدلہ خون...... لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے ہاتھ اٹھا لیا۔ کاش فرحی نے جاتے، جاتے اسے وعدے کی اس زنجیر میں نہ باندھا

ہوتا تو آج...... ایک گہری سانس لے کر اس نے سائیں مٹھا کی طرف دیکھا۔ اپنی بند مٹھیاں کھولیں لیکن اس کے اندر جھکڑ چل رہے تھے آندھیاں اٹھ رہی تھیں۔

''ہوں تو دادا پھر ملاقات ہو گی اور یاد رکھنا سائیں مٹھا اپنی بے عزتی نہیں بھولا نہ بھولے گا آج اگر......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر ایک نفرت بھری نظر ثمر حیات پر ڈالی اور خاتون کا ہاتھ پکڑ کر کلینک کی طرف بڑھ گیا۔ ثمر حیات ہونٹ بھینچے اپنے اندر اٹھتے طوفان پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا جب بالی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''باس یہ تو سکندر سومرو ہے ایم پی اے۔'' اس نے چونک کر بالی کی طرف دیکھا لیکن اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ آخری بار جب وہ سائیں مٹھا سے ملا تھا تو صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ ایک بگڑا ہوا جاگیردار ہے اور اب بالی جو کہہ رہا تھا یقیناً ایسا ہی ہو گا ہماری سیاست آخر ایسے ہی لوگوں سے تو بھری ہوئی ہے۔

''چلیں باس۔'' بالی نے اسے پھر مخاطب کیا۔

''سیمو کو گھر چھوڑ کر پھر ہمیں ولسن صاحب کی طرف جانا ہے' یہ لوگ وقت کے بہت پابند ہوتے ہیں باس۔''

اس نے خالی، خالی نظروں سے بالی کی طرف دیکھا اور پھر سر جھٹک کر گاڑی کی طرف قدم بڑھا دیے...... اپنے اندر اٹھتے طوفان سے لڑتے ہوئے اس نے گاڑی پارکنگ سے باہر نکالی تھی اور اسے خبر بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کے گاڑی میں بیٹھتے ہی تینوں گارڈ بہت عجلت سے بی ایم ڈبلیو کے پیچھے کھڑی گاڑی میں سوار ہوئے تھے اور بہت احتیاط سے اس کی گاڑی کے پیچھے آ رہے تھے۔

☆☆☆

ارتقاع ٹانگیں پھیلائے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے بہت ایزی موڈ میں ٹی وی دیکھ رہی تھی جب افنان ہاتھ میں فائل اٹھائے اپنے کمرے سے نکلا اور اسے لاؤنج میں اطمینان سے براجمان دیکھ کر ٹھٹک کر رک گیا۔

''ہے...... رتی تم نے یونیورسٹی نہیں جانا؟''

''نہیں۔'' اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر پاس پڑا ریموٹ اٹھا کر چینل چینج کیا۔

''کیوں؟'' افنان نے بغور اسے دیکھا۔

''بس موڈ نہیں۔''

''تم کل بھی نہیں گئی تھیں... کیا بات ہے؟'' اب کے افنان کے لہجے میں تشویش تھی۔

''بس ویسے ہی موڈ نہیں ہو رہا ان دنوں۔'' اس کی نظریں ٹی وی اسکرین پر تھیں اب بھلا وہ افنان بھائی کو کیا بتاتی کہ وہ یونیورسٹی کیوں نہیں جا رہی اور اس کے دل میں کیا خوف ہے۔ افنان کو تو صرف کل کا پتا تھا اور وہ پچھلے چار دنوں سے یونیورسٹی نہیں جا رہی تھی۔ ایمل سے تو اس نے بہانہ کر دیا تھا کہ ان دنوں کچھ خاص پڑھائی نہیں ہو رہی اور وہ گھر میں رہ کر زیادہ اچھی طرح سے پڑھ سکتی ہے لیکن افنان بھائی کو ٹالنا آسان نہیں تھا۔

''لیکن تم تو اپنی اسٹڈیز کے متعلق بہت کونشس رہتی ہو۔ تم لاہور بھی زیادہ دن اسی وجہ سے نہیں رکیں۔''

''ہاں، لیکن ان دنوں دل اچاٹ سا ہو رہا ہے پڑھائی سے۔'' غیر ارادی طور پر اس کے لبوں سے نکلا تو افنان نے تاسف سے کہا۔

''لیکن رتی ان دنوں تو بہت اہم لیکچرز ہوں گے تمہارے، اب جبکہ ایگزام نزدیک ہے تو تمہیں اپنے لیکچرز مس نہیں کرنے چاہئیں۔'' افنان کے انداز میں فکر بھی تھی اور تنبیہ بھی۔ اس نے صرف سر ہلایا تھا۔

''کہیں عالیہ سے ناراضی تو نہیں چل رہی؟'' افنان نے کچھ سوچتے ہوئے اندازہ لگایا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے اس کی بات کی تردید نہیں کی تھی۔

''یعنی میرا اندازہ درست ہے کہ دونوں دوستوں میں لڑائی ہوگئی ہے۔'' وہ مسکرایا۔ ''بہتر ہے اسے منالو بسٹر بجائے اس کے کہ اپنی پڑھائی کا نقصان کرو۔'' اس نے اس کا سر تھپتھپایا۔ ''ویسے تم انتہائی بے وقوف ہو رتی بھلا دوست کی ناراضی پر کوئی پڑھائی چھوڑ کر گھر بیٹھ جاتا ہے۔ میں واپس آ کر عالیہ کو فون کرتا ہوں۔''

''ارے نہیں۔'' اس نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا۔ ''ہماری صلح ہوگئی ہے اور میں کل سے یونیورسٹی جا رہی ہوں۔'' وہ مسکرائی وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ عالیہ کو فون کرے۔

''گڈ۔'' افنان بھی مسکرا دیا لیکن فوراً ہی سنجیدہ ہوگیا۔ ''زندگی بہت مشکل ہے رتی اور تم چھوٹی، چھوٹی باتوں کو بہت محسوس کرتی ہو اور ان کا اثر لیتی ہو۔ بہادر بنو، کیا خبر آئندہ زندگی میں کوئی مشکل مقام آ جائے اور تم ہمت ہار دو۔'' وہ اس سے چھوٹا تھا لیکن اس سے زیادہ سمجھدار تھا اور یہ صرف آج کی بات نہیں تھی بلکہ وہ ہمیشہ سے ہی ایسا تھا اور اسے چھوٹی، چھوٹی نصیحتیں کرتا رہتا تھا۔ اس نے محبت سے افنان کی طرف دیکھا۔

''تمہاری نصیحت کا شکریہ افی، آئندہ کوشش کروں گی کہ چھوٹی، چھوٹی باتوں کا اثر نہ لوں۔'' وہ زبردستی مسکرائی اور افنان نے آنکھیں پھیلا کر کچھ حیرت سے اسے دیکھا۔ کم از کم وہ ارتقاع سے اس بات کی توقع نہیں کر رہا تھا کہ نہ صرف یہ کہ وہ اس کی بات اتنے آرام سے سن لے گی بلکہ اس کا شکریہ بھی ادا کرے گی۔

''یہ تم ہی ہو ناں رتی، مجھے یقین نہیں آ رہا۔'' اس نے ایک شرارت بھری نظر اس پر ڈالی اور ایک بار پھر اس کا سر تھپتھپا کر باہر نکل گیا۔

''یہ چھوٹی سی بات کہاں تھی افی۔'' اس کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔ ''اگر تم جان لو تو پتا نہیں تمہارا ردِعمل کیا ہو؟'' وہ تو جب بھی ان لمحوں کے متعلق سوچتی تھی اس پر خوف طاری ہو جاتا تھا۔ اگر اس رات وہ ظفری کے چنگل سے نہ نکل پاتی، اگر رواحہ کی گاڑی اتفاق سے وہاں نہ آتی تو......؟ اس نے جھرجھری سی لی۔

کیا سمجھا تھا اس نے ظفری کو اور وہ کیا نکلا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اسے ظفری سے محبت تھی لیکن وہ اسے اپنا اچھا دوست سمجھتی تھی۔ عالیہ نے ہی پہلی بار اسے ظفری سے متعارف کروایا تھا اور وہ ہمیشہ ہی ظفری کی تعریف کرتی تھی شاید وہ بھی نہیں جانتی ہوگی کہ ظفری درحقیقت کیا ہے اور رواحہ اس کے لیے محض ایک کلاس فیلو تھا۔ اس نے بھی رواحہ کی طرف غور سے نہیں دیکھا تھا کبھی اس کے متعلق جاننے کی کوشش نہیں کی تھی حالانکہ ایک بار عالیہ نے کہا تھا کہ رواحہ اسے پسند کرتا ہے شاید لیکن چند روز بعد ہی عالیہ کی بات اس کے ذہن سے نکل گئی تھی۔ رواحہ خوش شکل، ذہین اور مہذب تھا۔ جواد، شہاب اور عظام کے متعلق بھی وہ یہی رائے رکھتی تھی لیکن اب رواحہ کے متعلق یکا یک اس کے احساسات بدل گئے تھے۔ کیا یوں اس طرح اچانک بھی احساسات بدل جایا کرتے ہیں یا اس کے دل میں کہیں کوئی چور گوشہ پہلے سے ہی موجود تھا؟

وہ حیران تھی ان پچھلے چار دنوں میں اس نے رواحہ کو بہت سوچا تھا اور رواحہ اسے دوسروں سے بہت مختلف لگا تھا۔ اس کا بہت جی چاہا تھا کہ وہ رواحہ سے ملے، اس کے متعلق مزید جانے۔ اس سے اس کے متعلق، اس کے خاندان کے متعلق پوچھے لیکن یونیورسٹی جانے کے خیال سے ہی اس پر خوف طاری ہو جاتا تھا۔ وہاں یونیورسٹی میں ظفری بھی ہوگا۔ وہ کیسے اس کا سامنا کرے گی اور اگر اس نے وہاں اسے مخاطب کر لیا۔ وہاں سب کے سامنے کچھ کہہ دیا کوئی غلط بات، کچھ ایسا کہ وہ سر اٹھانے کے قابل ہی نہ رہے اور کیا پتا اس نے وہاں یونیورسٹی میں ذکر کر دیا ہو کسی سے۔ اپنے دوستوں سے ہی کہ اس نے مجھے بلایا تھا اور میں اس کے گھر چلی گئی تھی۔ کوئی الٹی سیدھی کہانی سنا دی ہو۔ عالیہ نے بھی تو ان چار دنوں میں اسے فون نہیں کیا تھا۔ پتا نہیں کیا کہا ہوگا اس نے عالیہ کو۔

''نہیں، میں یونیورسٹی نہیں جاؤں گی۔'' وہ دل ہی دل میں فیصلہ کر کے بظاہر مطمئن ہوگئی تھی لیکن اندر سے

بے حد مضطرب اور بے چین تھی۔ پاپا تو خیر اس کی ہر بات مان لیتے لیکن ماما اور افنان ضرور اعتراض کریں گے بلکہ افنان تو خفا ہو جائے گا۔ ابھی تو خیر اس نے اسے ٹال دیا تھا لیکن پھر بعد میں کیسے اسے اور ماما کو قائل کرے گی۔

''اگر سب سچ بتا دوں تو افنان تو غصے سے پاگل ہو جائے گا۔ ظفری کو مارنے پر تل جائے گا۔ نہیں میں یونیورسٹی نہیں جاؤں گی...... کبھی نہیں۔'' اس نے جیسے اپنے فیصلے پر تصدیق کی مہر لگائی۔

''لیکن رواحہ......'' دل نے چپکے سے سرگوشی کی۔ ''اگر میں یونیورسٹی نہیں جاؤں گی تو پھر رواحہ سے بھی نہیں مل سکوں گی...... تو کیا ہوا کیا فرق پڑتا ہے وہ محض ایک کلاس فیلو ہی تو ہے...... لیکن کیا وہ واقعی صرف ایک کلاس فیلو ہے؟'' اس نے خود سے پوچھا اور اس کے دل میں ہوتی خوشگوار دھڑکنوں نے اس کی تردید کی تو وہ افسردہ سی ہو کر ٹی وی دیکھنے لگی تب ہی پاس پڑے اس کے موبائل کی اسکرین روشن ہوئی کسی کا فون آ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر یونہی فون کی طرف دیکھتی رہی۔ فون سائلنٹ پر تھا اور نمبر اجنبی لمحہ بھر سوچنے کے بعد اس نے فون اٹھا کر آن کیا۔

''ہیلو...... ارتقاع سے بات کرنی ہے۔''

''جی، میں ارتقاع ہوں۔''

''میں رواحہ ہوں۔'' دوسری طرف سے رواحہ نے کہا تو اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئیں۔ ''کیسی ہیں آپ اور یونیورسٹی کیوں نہیں آ رہی ہیں؟''

''وہ دراصل......'' وہ چپ کر گئی۔

''ظفری کی وجہ سے ناں؟'' دوسری طرف سے رواحہ پوچھ رہا تھا۔ ''لیکن آپ کو بھلا ظفری سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے ڈرنا تو اسے چاہیے۔'' اس کا لہجہ بہت نرم تھا دل میں اترتا ہوا سا؟ کتنا خوب صورت لہجہ تھا اور کتنی سحر انگیز آواز...... وہ اس سحر میں کھوسی گئی۔

''ویسے ظفری بھی آج کل یونیورسٹی نہیں آ رہا۔'' اس نے بتایا تو ارتقاع نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔

''آپ پریشان ہیں رتی...... پلیز پریشان نہ ہوں مجھے اندازہ تھا آپ کی پریشانی کا میں آپ کو پہلے فون کرتا لیکن میرے پاس آپ کا نمبر نہیں تھا آج ہی نمبر ملا ہے۔''

وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ اسے اس کا نمبر کہاں سے ملا کیا عالیہ سے......؟ لیکن وہ پوچھ نہ سکی بس خاموشی سے اسے سنتی رہی۔

''آپ جانتی ہیں ان دنوں سر حفیظ کتنے اہم لیکچر دے رہے ہیں۔ آپ کی اسٹڈی کا بہت حرج ہو رہا ہے۔ آپ کل سے یونیورسٹی آئیں گی رتی اور آپ کو کسی سے ڈرنے یا خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''جی۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''اول تو ظفری اب آپ کو پریشان نہیں کرے گا لیکن اگر کوئی مسئلہ ہوا تو ہم ہیں ناں، یوں بھی ظفری آپ کا دوست تھا۔ کوئی دوست بن کر وار کرے تو آدمی بے خبری میں مارا جاتا ہے لیکن اب کم از کم وہ بے خبری میں وار نہیں کر سکتا۔'' وہ سمجھا رہا تھا اور وہ ایک انوکھی سی کیفیت میں گھری ہوئی تھی اسے رواحہ کی بات سننا اچھا لگ رہا تھا۔

''تو پھر آپ کل آ رہی ہیں ناں؟'' اس نے تصدیق چاہی تھی۔

''جی، میں کل آؤں گی۔''

''گڈ...... تو پھر کل انشاء اللہ ملاقات ہوگی۔'' فون بند ہوگیا تھا لیکن وہ فون ہاتھ میں لیے حیران بیٹھی تھی۔ اندر دل کی دھڑکنوں نے اودھم مچایا ہوا تھا کیا اس طرح بھی ہوتا ہے کبھی کہ کوئی لمحوں میں اتنا قریب آ جائے جیسے صدیوں کی آشنائی ہو یہ رواحہ حسن ایک سال سے اس کا کلاس فیلو تھا لیکن دل پہلے کبھی اس کے نام پر یوں نہیں دھڑکا

تھا۔ وہ اپنے دل کے ساتھ ہونے والی اس واردات سے پریشان تھی۔ اسے خود اپنا یقین نہیں تھا کہ وہ ارتقاع بابر
کبھی کسی سے اتنا متاثر بھی ہوسکتی ہے۔ وہ اپنی کیفیت کو کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔ اگر اس کیفیت کا نام محبت تھا تو
کم از کم یہ نام اس وقت اس کے ذہن میں نہیں تھا۔ وہ اپنے ہی دھیان میں گم بیٹھی تھی۔ ٹی وی چل رہا تھا لیکن آواز
بند تھی۔ جب ایمل لاؤنج میں آئی اور اس نے خاموش بیٹھی ارتقاع کو دیکھا۔ ایمل کے آنے پر بھی اس نے ایمل کی
طرف نہیں دیکھا تھا ایمل کو وہ اداس اور پریشان لگ رہی تھی اور یونیورسٹی بھی نہیں جارہی تھی۔
''کیا ارتقاع کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے؟'' ایمل نے سوچا اور پریشان سی ہوکر اس کے قریب آکر اس کے
کندھے پر ہاتھ رکھا۔
''ارفی بیٹا کیا بات ہے؟''
''کچھ نہیں، کوئی بات نہیں۔'' ارتقاع نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔
''تم کچھ پریشان لگ رہی ہو ارفی بیٹا، کوئی بات ہے؟ کوئی پرابلم ہے تو مجھے بتاؤ۔'' وہ اس کے پاس ہی
صوفے پر بیٹھ گئی۔ ''مجھے لگتا ہے تمہیں کوئی بات پریشان کررہی ہے۔ مجھ سے کہو گڑیا ماں ہوں میں تمہاری۔''
اس نے ایمل کی طرف دیکھا اسے یقین تھا کہ وہ اس کی سگی ماں نہیں ہے اگرچہ بابر نے کھل کر اس بات کا
اعتراف نہیں کیا تھا لیکن اس کا مبہم انداز اسے شک میں مبتلا کرتا تھا بلکہ یقین دلاتا تھا کہ ایمل اس کی سگی ماں نہیں
ہے گو اسے بابر کے کاغذات سے کوئی ایسا ثبوت نہیں ملا تھا لیکن پھر بھی بہت ساری باتیں تھیں جن پر پہلے اس نے
کبھی غور نہیں کیا تھا لیکن اب غور کرتی تھی۔ بچپن سے ہی وہ ایمل کی نسبت بابر کے زیادہ قریب رہی تھی اور بابر نے
جس طرح اس کے لاڈ اٹھائے تھے اور اس کی ضدیں پوری کی تھیں ایمل نے نہیں۔ ایمل، افنان کے ساتھ مصروف
رہتی تھی۔ بچپن میں وہ کچھ کمزور اور بیمار سا تھا۔ کئی بار اس کا جی چاہتا تھا کہ ایمل اسے گود میں بٹھائے اس کے ساتھ
کھیلے، اسے توجہ دے لیکن کبھی تو افنان رو رہا ہوتا، کبھی اسے بھوک لگی ہوتی اور وہ دو سالہ ارتقاع ایمل سے مایوس
ہوکر بابر کی گود میں پناہ لیتی۔ باپ کے بے جا لاڈ پیار نے اسے ضدی اور خودسر بنا دیا تھا۔ اس بنا پر اس نے بچپن
میں دو تین بار ماں سے تھپڑ بھی کھائے تھے۔ بچپن میں وہ سمجھتی تھی کہ ایمل، افنان سے اس سے زیادہ محبت کرتی ہے
لیکن اس کے دل میں کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ ایمل اس کی سگی ماں نہیں ہے لیکن اب یہ خیال دل سے نکلتا ہی نہیں
تھا ہر روز کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جاتی تھی کہ اس کا یقین پختہ ہوتا چلا جاتا۔ ایک بار اس نے بابر سے پوچھا تھا کہ اس
کا نام کس نے رکھا تھا تب بابر نے بتایا تھا کہ اس کا نام خود اس نے رکھا تھا لیکن تمہاری ماما نے کہا یہ مشکل نام ہے
میں تو اسے رتی بلایا کروں گی لیکن ایمل نے اسے کبھی رتی کہہ کر نہیں بلایا تھا وہ ہمیشہ اسے ارفی کہتی تھی جبکہ باقی
سب اسے رتی ہی بلاتے تھے۔ اپنے ہوش سنبھالنے کے بعد اس نے کبھی ایمل کے منہ سے اپنے لیے رتی نہیں سنا
تھا۔ وہ اس کی سگی ماں نہیں تھی لیکن اس وقت اس کے لہجے کی دلگرفتگی نے اس کے دل کو گداز کیا تھا۔ یہ بھی تو سچ تھا کہ
ایمل نے کبھی اس کے ساتھ روایتی سوتیلی ماں کا سلوک نہیں کیا تھا۔ کچھ عرصے پہلے تک تو اسے گمان بھی نہیں گزرا
تھا۔ وہ اس کی روک ٹوک سے چڑتی بھی تھی لیکن اس نے اپنے دل میں اتنی بیگانگی کبھی محسوس نہیں کی تھی۔
''ارفی میری جان بتاؤ ناں کیا بات ہے؟'' ایمل نے اس کی خاموشی سے گھبرا کر پھر پوچھا۔
''کچھ نہیں ماما۔'' اس نے نرمی سے کہا۔ ''کوئی بات نہیں ہے بس یونہی موڈ نہیں ہو رہا تھا یونیورسٹی جانے کا،
کل سے چلی جاؤں گی۔''
''تم سچ کہہ رہی ہو ناں ارفی۔ دیکھو مجھ سے کوئی بات مت چھپانا۔ ماں باپ سے زیادہ کوئی آپ کا ہمدرد اور
خیرخواہ نہیں ہوتا جس طرح وہ آپ کا تحفظ کرسکتے ہیں اور کوئی نہیں کرسکتا۔'' ایمل کے لہجے میں اب بھی تشویش تھی۔

''کوئی بھی تو بات نہیں ہے ماما اگر ہوتی تو ضرور بتاتی۔ آپ کو نہ سہی پاپا کو تو ضرور بتاتی۔'' وہ مسکرائی تو
ایمل کو بھی یقین آگیا کہ وہ اپنی ہر بات بابر سے ضرور شیئر کرتی تھی۔ ''بی لیوی ماما۔'' اس نے پھر یقین دلایا۔
مسکراہٹ اسی طرح اس کے ہونٹوں پر ٹھہری ہوئی تھی اور اس کے اوپر والے دانت ذرا سے نظر آرہے تھے
تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ترتیب سے جڑے سفید دانت۔ وہ کھوسی گئی تھی کتنے سالوں بعد اس کی یہ مسکراہٹ
اسے کسی کی یاد دلا گئی تھی۔ ایسے ہی ذرا، ذرا سے فاصلے پر ترتیب سے جڑے دانت..... وقت نے جیسے پیچھے کی
طرف ایک زقند لگائی۔
''اُفوہ مدثر یہ تمہارے دانت ہر وقت باہر ہی کیوں نکلے رہتے ہیں؟'' وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی تھی
اور آئینے میں اس نے اپنی پیچھے کھڑے مدثر کے عکس کو دیکھتے ہوئے شرارت سے کہا تھا۔
مدثر کے لبوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی۔ وہ اس کے پیچھے سے ہٹ کر اس کے پہلو میں آکھڑا ہوا تھا اور
مسکراہٹ مزید گہری ہوئی تھی۔
''تو کیوں نہ نکلیں دانت باہر..... اپنی محبت کا پالینا، مل جانا کچھ کم ہوتا ہے کیا، شکر کرو میں دیوانہ نہیں ہوا ورنہ
میرا تو جی چاہتا تھا قہقہے لگاؤں، ناچوں، گاؤں اور پوری دنیا کو اپنی اس خوشی میں شریک کرلوں۔ سب کو بتاؤں کہ
مجھے میری محبت مل گئی ہے۔''
''تم سچ مچ پاگل ہو مدثر۔'' وہ اندر ہی اندر اترائی تھی لیکن بظاہر اس نے منہ بنایا تھا۔
''ہاں، پاگل ہوں..... دیوانہ ہوں تمہارا، یہ پاگل پن اور دیوانگی تمہارے لیے ہے ایما۔''
''تم پہلے تو ایسے نہ تھے مدثر اتنے جذباتی، اتنے رومینٹک!'' وہ حیران ہوئی تھی۔
''میں پہلے بھی ایسا ہی تھا اتنا ہی جذباتی اتنا ہی رومینٹک۔'' اس نے ایک بازو اس کے گرد حمائل کرتے
ہوئے ایک شوخ سی جسارت کی تو وہ بلش ہوگئی۔
''لیکن مجھے تو کبھی نہیں لگا تھا کہ تم اتنے رومینٹک ہو..... ہمیشہ اقبال کے شعر سناتے تھے اور بات کرتے
ہوئے کوئی سنجیدہ بوڑھے پروفیسر لگتے تھے۔'' وہ نچلے ہونٹ کا ایک کونا دانتوں تلے دبا کر مسکرائی تھی لیکن وہ سنجیدہ
ہوگیا تھا۔
''میں ڈرتا تھا ایما اپنے جذبوں کے بے وقعت ہوجانے سے..... ان کے رائگاں چلے جانے سے۔
مجھے خوف آتا تھا کہ ہمارے راستے الگ ہوگئے تو میرے کہے الفاظ تمہارا جینا مشکل کردیں گے۔'' اس نے
اس کے دونوں بازوؤں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا رخ اپنی طرف کیا تھا اور پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے
ہوئے بھیگتی آواز میں کہا۔ ''مجھے اب بھی کبھی کبھی بڑا خوف آتا ہے ڈر لگتا ہے کہ کہیں ہماری خوشیوں کو نظر نہ لگ
جائے..... کہیں ہم بچھڑ نہ جائیں۔''
''اللہ نہ کرے۔'' اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔
''مجھے کبھی چھوڑ کر مت جانا، وعدہ کرو کچھ بھی ہوجائے میرا ساتھ نہیں چھوڑو گی۔'' اور اس نے وعدہ کیا تھا۔
''ہم دونوں ہمیشہ ساتھ رہیں گے مدثر..... زندگی کی آخری سانسوں تک.....''
لیکن زندگی کی طرح لفظ بھی کبھی کبھی کتنے بے اعتبار ہوجاتے ہیں۔ انسان اپنے ہی کہے ہوئے لفظوں سے مکر
جاتا ہے۔ اسے یاد ہی نہیں رہتا کہ کب اس نے کیا کہا تھا۔ اس کے لبوں سے سسکی سی نکل گئی تو اس نے چونک کر
ارتقاع کی طرف دیکھا وہ ٹی وی کی طرف متوجہ تھی۔
مدثر سے اس کی شادی نہیں ہوسکتی۔ اس نے خود کو بہت بار باور کروانے کی کوشش کی تھی۔ ڈیڈی نے مدثر کے

ڈیڈی کو انکار کر دیا تھا اُس کا اور مدثر کا ساتھ ممکن نہیں تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ اگر ممی، ڈیڈی کو مدثر کا رشتہ قبول نہیں ہوا تو وہ ایسا کچھ نہیں کرے گی جس سے اس کے ڈیڈی کی عزت پر حرف آئے۔ وہ ایسا کچھ نہیں کرنا چاہتی تھی جو انہیں دکھ پہنچائے ایسا دکھ جیسا اس کے دادا اور دادی نے اٹھایا تھا لیکن وہ اس دل کا کیا کرتی جو تڑپ رہا تھا، مچل رہا تھا۔ رو، رو کر اس کی آنکھیں تھک گئی تھیں۔ اسے لگتا تھا جیسے اگر اسے مدثر کی رفاقت نہ ملی تو وہ مر جائے گی۔ وہ اس کے بغیر جی نہیں سکے گی۔

''مدثر میں کیا کروں، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی پلیز کچھ کرو۔'' اس نے بے حد مایوس ہو کر اسے فون کیا تھا۔
''میں ڈیڈی کو دکھ نہیں دینا چاہتی مدثر اور میں تمہارے بغیر بھی جی نہیں پاؤں گی۔'' وہ رو پڑی تھی۔ مدثر اس سے زیادہ مایوس اور اداس تھا پھر بھی اس نے سمجھایا تھا۔

''ہم یہ جانتے تھے ایما کہ طبقاتی فرق کی وجہ سے شاید ہمارا ملن ممکن نہ ہو پھر بھی ہمارے دل ایک دوسرے کی محبت میں دھڑکے، یہ محبت خود بخود ہمارے دل میں پیدا ہوئی۔ یہ محبت کبھی ختم نہیں ہو سکتی یہ ہمیشہ ہمارے دلوں میں رہے گی۔ ہر محبت کے نصیب میں وصل نہیں ہوتا۔ والدین اولاد کے لیے جو بھی فیصلہ کرتے ہیں ان کی بہتری کے لیے ہی کرتے ہیں شاید تمہاری بہتری اسی میں ہو۔'' وہ خود بھی رو پڑا تھا اور اس کے آنسو جیسے اس کے دل پر گر رہے تھے۔

''نہیں مدثر...... تم نہیں تو کوئی بھی نہیں۔ میں نے صرف تمہارے سنگ زندگی گزارنے کے خواب دیکھے ہیں۔ میں کسی اور کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ تم مجھے جو کہو گے میں وہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' وہ جذباتی سی ہو گئی تھی ہارنے لگی تھی اور بھول گئی تھی کہ جب اس کی پھپھو نے اپنی پسند سے شادی کی تھی تو دادا، دادی کو روتے دیکھ کر وہ سوچتی تھی کہ وہ کبھی پھپھو کی طرح اپنے ممی، ڈیڈی کو ناراض نہیں کرے گی۔
''نہیں...... میں تمہیں کچھ بھی ایسا کرنے کو نہیں کہوں گا جس سے تمہارے خاندان کی عزت پر حرف آئے۔ تم اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرو پلیز اور بھول جانا وہ سب جو ہمارے درمیان تھا۔''
''کیسے بھول جاؤں مدثر؟''
''وقت ہر زخم مندمل کر دیتا ہے ایک دن۔'' اور اس کی آواز بھرا گئی تھی۔
''پلیز...... پھر فون نہ کرنا کہیں اختیار کی لگام میرے ہاتھوں سے چھوٹ نہ جائیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ہمارے کسی عمل سے میرے اور تمہارے خاندان کی عزت پامال ہو۔'' اس نے فون بند کر دیا تھا اور وہ بلک، بلک کر رونے لگی تھی۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا وہ، خاندان کی عزت کو محبت پر قربان نہیں کیا جا سکتا تھا اسے اپنی جذباتیت پر شرمندگی ہوئی تو وہ اور زیادہ شدت سے رونے لگی تھی۔
تب ہی ڈیڈی دستک دے کر اندر آ گئے تھے اس نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر یک دم اٹھ کر ان سے لپٹ گئی تھی۔
''ایما...... میری جان، میری گڑیا۔'' وہ ہولے، ہولے اس کا سر تھپتھپانے لگے تھے۔ ''تم کیا سمجھتی ہو بیٹا کہ تمہارے ڈیڈی کو تم سے محبت نہیں ہے۔ میں نے تمہارے لیے جو بھی سوچا تھا تمہاری بہتری کے لیے سوچا تھا شاید میں تھوڑا سا خود غرض ہو گیا تھا۔ سوچا کہ بابر سے شادی کر کے تم ہمیشہ ہماری نظروں کے سامنے رہو گی۔ میں اب بھی جو فیصلہ کروں گا تمہاری بہتری کے لیے ہی کروں گا تمہیں اپنے ڈیڈی پر اعتبار ہے ناں؟''
''جی۔'' اس نے سر ہلایا تھا اور انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے تھے۔
''سوری ڈیڈی۔''

''کس بات کے لیے؟'' انہوں نے پیار سے اسے دیکھا تھا اور اس نے نظریں جھکا لی تھیں وہ اپنی سوچ اور جذباتیت پر شرمندہ تھی لیکن وہ یہ بات بھلا ڈیڈی کو کیسے بتاتی کہ کچھ دیر پہلے وہ کیا سوچ رہی تھی کہ اگر مدثر کہے گا تو وہ اس سے کورٹ میرج کر لے گی۔ یہ تو مدثر سے شادی کے بعد اسے پتا چلا تھا کہ ڈیڈی نے ایکس ٹینشن پر اس کی اور مدثر کی باتیں سن لی تھیں اور مدثر سے متاثر ہوئے تھے۔

''اب مت رونا تمہارے آنسو مجھے تکلیف دیتے ہیں۔'' وہ اس کا سر چوم کر چلے گئے تھے اور وہ لٹی، لٹی سی بیٹھی رہ گئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے زندگی ہولے، ہولے اس کے اندر مر رہی ہو۔ وہ جانتی تھی ڈیڈی کا فیصلہ قبول کر کے وہ کبھی خوش نہیں رہ سکے گی لیکن پھر بھی اس نے ڈیڈی کا فیصلہ قبول کر لیا تھا کہ اسے اپنی پھپھو جیسا نہیں بننا تھا۔ آنسو ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں آ گئے تھے اور ایک بار پھر وہ رو رہی تھی اور جب ممی نے آ کر بتایا تھا کہ ڈیڈی نے اس کی شادی مدثر کے ساتھ کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو وہ کتنی ہی دیر تک بے یقینی سے ممی کو دیکھتی رہی تھی۔

''وہ تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میری بڑی خواہش تھی کہ تمہاری شادی بابر کے ساتھ ہوتی اور تم ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتیں۔'' ممی بہت اداس اور دلگرفتہ لگ رہی تھیں۔

''ممی۔'' وہ ان سے لپٹ گئی تھی۔ ''سوری' میں نے آپ کو دکھ دیا لیکن میں نے بابر بھائی کے متعلق ایسا کبھی نہیں سوچا۔ مدثر اگر نہ ہوتا تب بھی بابر بھائی نہیں۔ پلیز ممی مجھے معاف کر دیجیے گا۔ خفا مت ہوں مجھ سے۔'' اور ممی اسے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے ہولے، ہولے تھپکنے لگی تھیں۔

''میں ناراض نہیں ہوں بیٹا۔ اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے' ہمارے لیے تمہاری خوشی ہر شے سے زیادہ مقدم ہے۔'' اور جب اس نے سر اٹھایا تھا تو ڈیڈی دروازے پر کھڑے تھے۔

''ڈیڈی میں بہت بری ہوں، میں نے آپ کو دکھ دیا آپ کا ہر فیصلہ مجھے منظور ہے ڈیڈی اگر آپ کو مدثر پسند نہیں تو......'' وہ ایک بار پھر جذباتی ہو رہی تھی اور آنسوؤں نے اس کا حلق سی دیا تھا۔

''نہیں...... میری بیٹی بہت اچھی ہے اور مدثر اچھا لڑکا ہے۔'' ان کی آنکھوں میں مدثر کے لیے ستائش تھی۔

''میں پہلے اسے دولت کے پیمانے پر پرکھ رہا تھا لیکن دولت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی وہ ایک اعلیٰ کردار کا اچھی سوچ رکھنے والا لڑکا ہے اور ایسا ہی لڑکا میری بیٹی کو ڈیزرو کرتا ہے۔''

''آپ خوش تو ہیں ناں ڈیڈی؟'' اس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا تھا۔

''میں خوش ہوں...... میری بیٹی کی خوشی ہی میری خوشی ہے۔'' اور وہ کتنے ہی دن بے یقین سی رہی تھی اور یقین تو مدثر کو بھی نہیں آیا تھا۔ وہ یونیورسٹی میں کتنی ہی بار پوچھتا تھا۔

''یہ سچ ہے ناں...... میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ناں؟'' لیکن یہ خواب نہیں تھا سچ تھا۔ ان کا ماسٹر مکمل ہوتے ہی بہت دھوم دھام سے ان کی شادی ہو گئی تھی اور وہ مدثر کے ساتھ بہت خوش تھی۔ مدثر کے گھر سوائے اس کے بابا کے اور کوئی نہیں تھا اور بابا تو محبتوں اور شفقتوں کا سمندر تھے۔ دھیمے لہجے میں بات کرتے تھے، ہر وقت اس کے لیے اور مدثر کے لیے فکرمند رہتے تھے۔ زندگی اتنی خوب صورت ہو گی اس نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔ بابا اور مدثر بھر، بھر کر محبتوں کے خزانے لٹاتے تھے اور ان محبتوں کو سمیٹتے، سمیٹتے اس کا دامن تنگ پڑنے لگا تھا وہ سوچتی تھی کیا اس روئے زمین پر اس سے زیادہ خوش قسمت بھی کوئی ہو گا...... وقت جیسے پر لگا کر اڑا جا رہا تھا اور جس روز اسے پتا چلا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے تو مدثر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ پورے شہر میں چراغاں کر دے اور بابا...... ان کی خوشی بھی دیدنی تھی وہ اس طرح اس کا خیال رکھ رہے تھے کہ اگر مدثر کی امی زندہ ہوتیں تو شاید اس طرح اس کا خیال نہ رکھ پاتیں۔ کالج سے واپسی پر ہر روز لدے پھندے گھر آتے تھے۔ فروٹ اور جوسز کے علاوہ نومولود بچے کے استعمال کی کوئی

نہ کوئی چیز خرید کر لے آتے۔ ڈھیروں کپڑے اور دوسری ضرورت کی چیزیں۔

''بابا ابھی اتنی جلدی ان سب کی کیا ضرورت ہے؟'' اسے بابا سے شرم آتی۔

''ضرورت تو پڑے گی ناں بس سامنے نظر آ گئی تو لے لیں۔ ارادتاً تو نہیں گیا تھا لینے۔'' اسے بابا کی بات پر ہنسی آتی لیکن وہ اپنی ہنسی چھپا جاتی اور جس روز پتا چلا تھا کہ اس کے ہاں جڑواں بچوں کی آمد متوقع ہے تو اس روز تو مدثر نے باقاعدہ بھنگڑا ڈالا تھا۔ بابا اور وہ مدثر کی دیوانگی پر مسکراتے رہے تھے اور مدثر نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

''سنو میں صرف انہی دو بچوں پر اکتفا نہیں کروں گا' مجھے کم از کم دو بچے اور چاہئیں۔''

''توبہ ہے مدثر...... اب دو آئے نہیں اور تم دو مزید کا لالچ کرنے لگے ہو۔'' اس نے اسے گھورا تھا۔

''تو میں نہیں چاہتا میرے بچوں کا بچپن بھی میری طرح گزرے...... تنہا، خاموش، اکیلا اکیلا سا۔ میرا تو جی چاہتا ہے میرا آنگن بچوں سے بھرا ہو وہ سب مل کر کھیلیں کودیں، لڑیں جھگڑیں اور گھر میں خوب ہنگامہ اور رونق ہو۔''

ان دنوں زندگی میں مزید رنگ بھر گئے تھے۔ اس کے منع کرنے کے باوجود بابا اور مدثر کچھ نہ کچھ آنے والے بچوں کے لیے خرید کر لے آتے تھے۔

''ٹھیک ہے ناں کچھ اور جو میرے ذہن میں نہیں ضرورت ہو تو بتانا۔'' بابا پوچھتے تو وہ جھینپتی، شرماتی۔

''ممی کہہ رہی تھیں مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے وہ خود کر لیں گی سب۔''

''ہاں تو ضرور کریں ان کا بھی حق ہے لیکن ہمیں بھی تو اپنے شوق پورے کرنے ہیں۔'' بابا ان دنوں بالکل بچہ بنے ہوئے تھے۔ وہ گھنٹوں بیٹھے نام سوچتے رہتے۔ مدثر کو سمجھ نہیں آتا تھا کہ کون سا نام زیادہ اچھا ہو گا اسے کئی نام پسند تھے۔

''سنو مجھے شہر یار نام پسند ہے۔ عبداللہ بھی اچھا ہے اور بابا کو تو عمر، بلال، تیمور جانے کون، کون سے نام پسند ہیں اور... تمہیں کون سے نام پسند ہیں؟''

''بچے دو ہیں دس نہیں ہیں۔'' وہ اسے چڑاتی تو اس کے ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ نمودار ہو جاتی۔

''چلو اس بار بابا کی پسند کا نام رکھ لیں گے اور اگلی بار تمہاری پسند کا اور پھر اگلی بار میری پسند کا اور......''

''مدثر۔'' وہ اسے گھورتی۔ ''بچے دو ہی اچھے۔''

''ہائے نہیں یار...... دیکھو یہ سارے نام اتنے پیارے ہیں کہ میرا جی چاہتا ہے کہ یہ سارے پیارے، پیارے نام میرے بچوں کے ہوں۔''

وہ اس کی پیٹھ پر مکا مارتی۔

خوشی کی تتلیاں جیسے ہر وقت اس چھوٹے سے گھر میں رقص کرتی تھیں۔ بابا ہر روز ان کی خوشیوں کے دائمی ہونے کی دعا کرتے تھے لیکن پھر کیا ہوا تھا ان کی خوشیوں کو نظر لگ گئی تھی۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ سارے خواب مٹی میں مل گئے تھے وہ جیسے خوشیوں کا جھولا جھولتے بہت بلندی سے نیچے گری تھی۔

ان دنوں وہ بڑی پھپھو کی بیماری کی وجہ سے ممی ڈیڈی کے گھر آئی ہوئی تھی۔ بڑی پھپھو کئی سال پہلے بیوہ ہو گئی تھیں چونکہ اولاد نہیں تھی اس لیے دادا دادی کی زندگی میں ہی وہ ادھر آ گئی تھیں اور ایمل کو ان سے بہت محبت تھی۔ اس لیے ان کی بیماری کا سنتے ہی وہ ادھر آ گئی تھی۔ مدثر بہت بے چین تھا۔

''یار میں تمہارے بغیر کیا کروں گا؟''

''وہ جو پہلے کرتے تھے۔''

"یہ ظلم ہے میرے ساتھ زیادہ دن مت لگانا۔"

"اچھا۔" اس نے وعدہ کرلیا تھا لیکن پھر اس کی اپنی طبیعت ہی خراب ہوگئی۔ ڈاکٹر نے اسے بیڈ ریسٹ بتایا تھا اور ممی نے اسے روک لیا۔

مدثر نے گھر چلنے کی ضد کی لیکن بابا نے اسے سمجھایا تو مجبور ہوگیا لیکن دن میں دس، دس بار فون کرتا۔ صبح کالج جاتے اور شام کو کالج سے واپس آتے ہوئے چکر لگاتا۔ وہ اس کی دیوانگی پر ہنستی۔

"کالج میں کیسے وقت گزارتے ہو؟"

"سچ بتاؤں بالکل دل نہیں لگتا۔" وہ بچوں کی طرح بسورتا اور وہ دل ہی دل میں اس کی محبت پر نازاں ہوتی۔ پھپو، ممی، ڈیڈی سب ہی اس کی خوشگوار زندگی سے مطمئن تھے لیکن اس روز جب بابر نے پوچھا۔

"تم خوش تو ہو ناں؟"

"ہاں بہت۔" اس نے بے حد حیران ہوکر اسے دیکھا تھا۔ بابر سے شادی سے پہلے بھی اس کی بے تکلفی نہیں تھی اور نہ ہی زیادہ بات چیت ہوتی تھی اور اب بھی رسمی سی بات چیت ہوتی تھی۔ جب سے وہ ممی کے گھر آئی تھی چند بار ہی براہِ راست بات ہوئی تھی لیکن اس وقت کمرے میں لیٹے، لیٹے اس کا دل گھبرایا تو وہ اٹھ کر لاؤنج میں آگئی تھی۔ ممی، ڈیڈی کے ساتھ کہیں گئی ہوئی تھیں۔ پھپو اپنے کمرے میں تھیں اور بابر لاؤنج میں صوفے پر نیم دراز ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر سیدھا ہوکر بیٹھ گیا تھا۔ وہ بھی ایک طرف بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگی تھی۔ جہاں ایک دلچسپ پروگرام لگا ہوا تھا۔ تب اچانک ہی آواز آہستہ کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"مدثر تمہارے ساتھ ٹھیک تو ہے ناں؟" لمحے بھر بعد اس نے پھر پوچھا تھا۔

"کیا بات ہے بابر بھائی، آپ کیوں پوچھ رہے ہیں یہ؟" اس بار جواب دینے کے بجائے اس نے خود ہی سوال کر ڈالا تھا۔

"بس یونہی۔" بابر نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا تھا اور ٹی وی کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔

"یونہی تو نہیں کوئی بات تو ہے؟" وہ متجسس ہوئی تھی۔ "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مدثر کا رویہ میرے ساتھ ٹھیک نہیں ہوگا؟"

"نہیں...... بس میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ ٹھیک ہے تم خوش ہو...... تم نے کہا کہ تم خوش ہو تو......" بات ادھوری چھوڑ کر وہ پھر ٹی وی کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

"لیکن آپ یہ کیوں جاننا چاہتے تھے؟" اس کے اندر تجسس پیدا کر کے وہ انجان بن رہا تھا۔ "مجھے لگتا ہے آپ کچھ چھپا رہے ہیں؟"

"تم یقین نہیں کروگی اس لیے بتانے کا فائدہ۔"

"یقین کرنا یا نہ کرنا تو بعد کی بات ہے، آپ بتائیں تو۔" وہ بضد ہوئی تھی۔

"تم بہت ضدی ہو ایمل۔" بابر نے بے بسی سے اسے دیکھا تھا اور لمحہ بھر بعد آہستگی سے بتایا۔ "مدثر تمہارے ساتھ مخلص نہیں ہے ایمل۔"

"نہیں۔" اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا۔ "ایسا نہیں ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"مجھے پتا تھا تمہیں یقین نہیں آئے گا، اس لیے میں تمہیں بتانا نہیں چاہتا تھا۔"

"مدثر ایسا ہرگز نہیں ہے۔" اسے پورا یقین تھا۔

"مے بی۔" بابر نے کندھے اچکائے تھے اور ٹی وی بند کر کے لاؤنج سے چلا گیا تھا۔

اسے مدثر پر یقین تھا۔ اس کی محبتوں پر اعتبار تھا لیکن پھر بھی اس کے اندر بے چینی پیدا ہوگئی تھی۔ مدثر ایسا نہیں ہوسکتا اس نے خود کو مطمئن کرنا چاہا اور مطمئن بھی ہوگئی۔ مدثر کی وارفتگیوں اور محبتوں میں کھو کر وہ بابر کی کہی ہوئی بات بھول گئی تھی۔ مدثر تو ایسا ہی تھا روزِ اول کی طرح فون کرتا تو بند کرنا بھول جاتا۔

"مجھے تمہارے بغیر نیند نہیں آتی سچ...... کب آؤ گی؟"

"ڈاکٹر نے ابھی ایک ماہ کا اور بیڈ ریسٹ بتایا ہے۔"

"تو بیڈ تو یہاں بھی ہیں اِدھر آکر بیڈ ریسٹ کرلو۔" وہ چڑتا اور وہ اس کی محبتوں پر مغرور ہوجاتی۔

بابا بھی صبح شام فون پر اس کی خیریت پوچھتے تھے اور کبھی کبھار ملنے بھی آجاتے تھے پھر کئی دن گزر گئے۔ بابر سے کھانے اور ناشتے کے وقت ملاقات ہوتی تھی۔ وہ اپنی جاب میں بزی تھا۔ ممی اس کے لیے لڑکی تلاش کررہی تھیں بابر نے پھر کوئی ایسی بات نہیں کی تھی لیکن ایک دن اچانک اس نے ٹیبل پر کھانا کھاتے ہوئے کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا۔

"آج مدثر ملا تھا، شاپنگ کررہا تھا۔ ایک لڑکی بھی ساتھ تھی غالباً کوئی رشتے دار ہوگی۔"

"لیکن اس کی تو کوئی رشتے دار لڑکی نہیں ہے۔ بس ایک پھپو تھیں جو گاؤں میں رہتی تھیں اور ان کی کوئی بیٹی نہیں تھی۔ ضرور مونا ہوگی۔" اس نے اپنی پلیٹ میں چکن کا پیس رکھتے ہوئے سوچا۔

"یہ لڑکا تو پاگل ہے۔" ممی نے مدثر کی شاپنگ پر تبصرہ کیا تھا۔ "ہر روز بلاوجہ ہی ڈھیروں چیزیں خرید لاتا ہے، تم اسے منع کیوں نہیں کرتیں؟"

"کیا منع کروں ممی! اس کا تو جی چاہتا ہے کہ مارکیٹ میں جو کچھ بھی بچوں کی ضرورت کا ہے سب خرید لائے۔" اور شام کو جب مدثر آیا تو واقعی وہ بچوں کے بہت پیارے بلینکٹ خرید کر لایا تھا ایک پنک، ایک اسکائی بلو۔

"کیسے ہیں؟" اس نے بہت اشتیاق سے پوچھا تھا۔

"پیارے ہیں لیکن بابا پہلے ہی دو بلینکٹ لا چکے ہیں۔"

"تو مجھے یہ اچھے لگے، دیکھو کتنے نرم اور ملائم ہیں۔" اور اس کے ہاتھ سے کمبل لیتے ہوئے اس نے یونہی سرسری انداز میں پوچھا تھا۔

"تم کس کے ساتھ شاپنگ کے لیے گئے تھے؟"

"کسی کے ساتھ نہیں اکیلا ہی گیا تھا، کالج سے نکلا تو سوچا اپنے لیے کف لنکس اور ٹائی لے لوں تو بس یہ نظر آگئے خرید لیے۔" اور اس روز پہلی بار اس کے دل میں شک کا کانٹا چبھا تھا۔ مدثر کے ساتھ اگر کوئی تھی تو اس نے چھپایا کیوں...... کیا اس کے دل میں کوئی چور ہے اور پھر ہر گزرتے دن کے ساتھ شک کے یہ کانٹے بڑھتے گئے۔ جیسے کانٹوں کی پوری فصل اُگ آئی تھی۔ بابر کی سرسری سی کی گئی بات اسے گھنٹوں پریشان رکھتی تھی۔ مدثر حیران تھا۔

"کیا بات ہے ایما تم اتنی چڑچڑی کیوں ہورہی ہو؟"

لیکن وہ اسے کیا بتاتی کہ شک کے کوڑیالے ناگ اپنی لمبی زبانیں نکالے ہمہ وقت اسے ڈستے رہتے ہیں اس کی طبیعت ٹھیک ہوگئی تھی لیکن گھر جانے کو اس کا جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ مدثر کی محبتیں اس کی شدتیں سب اسے مصنوعی، مصنوعی سی لگتیں۔ انہی دنوں جب بابا اسے گھر لے کر آنے کی باتیں کررہے تھے بڑی پھپو کا انتقال ہوگیا اور وہ خاموش ہوگئے۔

پریگنینسی کی تکالیف، بیزاری اور چڑچڑاپن مدثر کی محبتوں پر شکوک اور پھپو کی ڈیتھ وہ بہت ڈپریسڈ اور ٹینسڈ تھی اسی ٹینشن میں وہ گھر سے باہر نکل کر پورچ کی سیڑھیوں پر آکر بیٹھ گئی تھی اور لان میں مالی کو گھاس پر مشین چلا

دیکھ رہی تھی۔ پھپھو کی ڈیتھ کو پانچ دن ہو گئے تھے اور بابا آج کل میں اسے آ کر لے جاتے۔ وہ بابا کے سامنے انکار نہیں کر سکتی تھی جبکہ مدثر سے اسے بہت سی شکایتیں تھیں۔

بابر نے نہ جانے کتنی بار اسے کسی لڑکی کے ساتھ لنچ کرتے، گھومتے، آئس کریم کھاتے، شاپنگ کرتے دیکھا تھا لیکن وہ ہر بار انکار کر دیتا تھا۔

''میرے ساتھ بھلا کس لڑکی نے ہونا ہے، یہ روایتی بیویوں والے شک مت کیا کرو۔'' اس نے سوچا اگر بابا لینے آئے تو وہ بابا کو سب کچھ بتا دے گی۔

کسی قدر مطمئن سی ہو کر وہ پھر مالی کی طرف دیکھنے لگی تھی جو اب مشین ایک طرف رکھ کر باڑھ میں بیٹھے بلی کے بچے کو اٹھا کر گیٹ سے باہر لے جا رہا تھا۔ تب ہی بابر آ کر اس کے پاس ہی سیڑھی پر بیٹھ گیا تھا۔

''وہ کوئی اچھی لڑکی نہیں ہے، آج کل ہر رات ڈنر وہ اس کے ساتھ ہی کرتا ہے۔ تم میری کزن ہو میری بہت پیاری جان سے عزیز خالہ کی بیٹی۔ میں چاہتا ہوں تم مدثر پر اندھا اعتماد مت کرو۔ یہ اس طبقے کے لوگ مدثر کی طرح ہی امیر لڑکیوں کو سیڑھی بناتے ہیں۔ انہیں اپنی محبت کا دھوکا دے کر......'' وہ ہولے، ہولے کہہ رہا تھا اور ایمل کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر سب کچھ ڈھتا جا رہا ہو۔

مدثر کی محبتوں اور وفاؤں پر اس کا یقین اور اعتبار سب کرچی، کرچی ہو گیا ہو اور یہ کرچیاں اس کے دل و جان میں چبھی جا رہی ہوں شدید اذیت سے اس نے آنکھیں موند لیں اور اس درد کو برداشت کرنے کی کوشش کی جو دل و جان کو کاٹتا تھا۔

''تم اگر آج رات میرے ساتھ چلو تو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا، میری بات کا شاید تمہیں یقین نہ آئے۔'' بابر نے آہستگی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا اور اس نے سر ہلا دیا تھا اور اس رات بابر کے ساتھ اس ہوٹل کے ڈائننگ میں ایک ٹیبل پر مدثر کے ساتھ ایک ماڈرن لڑکی کو بیٹھے دیکھ کر اس نے سوچا تھا۔

''محبت اور نفرت کے درمیان بہت کم فاصلہ ہوتا ہے'' جتنی شدت سے اس نے مدثر کو چاہا تھا اس سے اس نے اس کے لیے اتنی ہی شدید نفرت محسوس کی تھی۔

ٹی وی کی آواز یکایک بلند ہوئی وہ ماضی کی بھول بھلیوں سے واپس آ چکی تھی۔ وہ چونک کر کچھ دیر یونہی خالی، خالی نظروں سے ارتفاع کی طرف دیکھتی رہی جو اب بھی پوری طرح ٹی وی کی طرف متوجہ تھی اور پھر بابر کی طرف دیکھنے لگی جو موبائل پر میسج پڑھتا ہوا نیچے اتر رہا تھا۔ ان دنوں اس کا موڈ کافی خراب تھا اور وہ اس کے موڈ کی خرابی کی وجہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ شاید کاٹن کے اس سودے میں اسے خاطر خواہ منافع نہیں ہوا تھا۔ اس نے خود ہی اندازہ لگایا تھا ورنہ اس کے پوچھنے پر اس نے کچھ نہیں بتایا تھا اور وہ جانتی تھی کہ اگر اسے کچھ بتانا نہ ہوا تو وہ کچھ نہیں بتائے گا۔ وہ ایسا ہی تھا اگر اسے کوئی بات نہ بتانی ہوتی تو کبھی نہ بتاتا۔ اس وقت بھی اس کے ماتھے پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں اس نے ایک سرسری سی نظر ایمل پر ڈالی اور پھر ارتفاع کے پاس رکا۔

''پاپا میری گاڑی؟'' ارتفاع کو یک دم ہی یاد آیا تھا کہ بابر نے اسے نئی گاڑی لے کر دینے کا وعدہ کیا تھا۔

''اپنی ماما سے پوچھو اس نے منع کر دیا ہے تمہیں نئی گاڑی لے کر دینے سے۔'' ارتفاع نے مڑ کر ایمل کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شکایت تھی لیکن کچھ کہے بنا وہ پھر ٹی وی کی طرف دیکھنے لگی۔ ایمل نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ بابر نے رات ہی اس سے ارتفاع کے لیے نئی گاڑی خریدنے کی بات کی تھی۔

''میں نے رتی سے وعدہ کیا تھا نئی گاڑی کا لیکن ان دنوں میرے حالات اس کی اجازت نہیں دیتے کہ میں اٹھارہ لاکھ کی گاڑی اسے لے دوں۔ میری رقم ادھر اُدھر کئی جگہوں پر پھنسی ہوئی ہے اگر تم اپنے اکاؤنٹ سے......''

''نہیں بابر۔'' اس نے بابر کی بات کاٹی تھی۔ ''ڈیڈی نے وہ رقم اس لیے میرے اکاؤنٹ میں جمع نہیں کروائی تھی...! اگر کبھی کوئی مشکل آئے ایمرجنسی ہو جائے تو کام آئے جیسے تمہیں اب ضرورت تھی تو کام آ گئی اور میں نہیں سمجھتی کہ ارفی کو نئی گاڑی کی ضرورت ہے۔ آئل کا لیک ہونا کوئی بڑا مسئلہ تو نہیں ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا جتنی بھی رقم ڈیڈی نے میرے اکاؤنٹ میں جمع کروائی ہے اسے محفوظ رہنا چاہیے آنے والے حالات کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔'' وہ اپنے اکاؤنٹ سے مزید رقم نہیں نکلوانا چاہتی تھی۔ ممی سے اس نے یونہی سرسری ساذکر کیا تھا تو وہ خاصی ناراض ہوئی تھیں کہ اس نے بابر کو اس رقم کے بارے میں کیوں بتایا۔

''جانتی ہو پہلے بھی تقریباً ایک کروڑ روپیہ تھا تمہارے اکاؤنٹ میں جو تم نے بابر کو بزنس کے لیے دے دیا تھا......'' اس نے بابر کو ممی کی ناراضی کا نہیں بتایا تھا لیکن ارتفاع کے لیے گاڑی خریدنے سے منع کر دیا تھا۔

''ارفی کی ایجوکیشن کمپلیٹ ہوتے ہی میرا ارادہ اس کی شادی کا ہے، ممی کی نظر میں دو تین اچھے رشتے ہیں اس کی شادی پر میں اسے اس کی پسند کی گاڑی لے دوں گی۔'' اور بابر کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

''جیسے ہی مجھے رقم ملے گی میں تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کروا دوں گا۔ تم پریشان مت ہو، تمہارے ڈیڈی کی دی ہوئی رقم تمہارے پاس محفوظ رہے گی۔ رہی گاڑی کی بات تو وہ رتی سے میں نے وعدہ کیا ہے تو میں ہی پورا کروں گا اپنی بیٹی کو خود گاڑی لے کر دوں گا۔''

''بابر......'' وہ روہانسی ہو گئی تھی۔ ''میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا آپ کو رقم کی ضرورت تھی آپ نے استعمال کر لی ہم الگ تو نہیں ہیں، بابر! میں نے کب کہا کہ آپ رقم واپس اکاؤنٹ میں جمع کروائیں۔ ارفی میری بھی بیٹی ہے میں دشمن نہیں ہوں اس کی لیکن میں چاہتی ہوں کہ......''

''لیو اٹ ایمل یہ موضوع ختم ہو چکا۔'' اس کا لہجہ سخت اور انداز حتمی تھا۔ وہ بابر کے اس موڈ کی وجہ سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی۔ بیتے سالوں میں بابر نے اس طرح بی ہیو نہیں کیا تھا جیسا ان دنوں کر رہا تھا۔ ہاں کبھی کبھار اس کا موڈ ضرور خراب ہوتا تھا لیکن اس طرح کا رد عمل تو کبھی اختیار نہیں کیا تھا اس نے۔

''ارفی بیٹا میں دراصل چاہ رہی تھی کہ تمہیں گاڑی......'' اس نے ارتفاع کی آنکھوں میں شکایت کا رنگ محسوس کر لیا تھا۔

''اٹس او کے مما، میں نے آپ سے کوئی وضاحت تو نہیں مانگی۔'' ارتفاع کے لہجے کی بیزاری نے ایمل کو دکھی کیا اس نے شکایتی نظروں سے بابر کی طرف دیکھا لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ اپنے سیل فون پر کوئی نمبر ملا رہا تھا۔ کال ریسیو ہوتے ہی وہ باتیں کرتا ہوا لاؤنج سے نکل گیا۔

☆☆☆

وہ بیزاری سے بیٹھی پاؤں کے انگوٹھے کو کارپٹ پر آگے پیچھے کرتے ہوئے کارپٹ کے پھولوں کو اتنے دھیان سے دیکھ رہی تھی جیسے یہ کوئی بہت اہم کام ہو۔ اس کے سامنے صوفے پر صاحبزادہ صاحب بیٹھے ہوئے تھے اور ان کی نظریں بار بار اس کی طرف اٹھ رہی تھیں جبکہ ان کے برابر میں بیٹھے بخاری صاحب کی نظریں تو جیسے اس کے چہرے پر ہی چپک گئی تھیں اور وہ بار، بار اپنے ہونٹوں پر یوں زبان پھیر رہے تھے جیسے شدید پیاس نے ہونٹ خشک کر دیے ہوں۔ ہونٹوں پر زبان پھیرنے کے بعد وہ ایک طویل اور گہری سانس لیتے...... ''غالباً یہ وہی ڈائریکٹر یا پروڈیوسر ہیں جنہیں موتیا کے کہنے پر صاحبزادہ صاحب اپنے ساتھ لائے تھے تاکہ وہ اسے کوئی چانس دے کر اماں کی خواہش پوری کر دیں۔''

نجل نے کارپٹ کے پھولوں کو تکتے ہوئے سوچا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب وہ موتیا کے پیچھے لاؤنج میں داخل

ہوئی تھی تو صاحبزادہ صاحب مبہوت سے ہو گئے تھے۔ سفید لباس میں وہ کوئی آسمان سے اتری اپسرا لگ رہی تھی۔ ایسا شفاف اور نوخیز حسن...... انہوں نے ایک شکایتی نظر شاہجہان بیگم پر ڈالی تھی جیسے نظروں ہی نظروں میں کہہ رہے ہوں ایسے نایاب ہیرے کو تو چھپا کر رکھا ہوا تھا اور ہمیں نقلی موتیوں پر ٹرخا دیا۔ شاہجہان بیگم نے نظریں چرالی تھیں اور انجان بن کر موراں کو آواز دینے لگی تھی۔

''کہاں مر گئی ہو موراں، کیا کنواں کھودنے چلی گئیں؟'' صاحبزادہ صاحب نے دائیں طرف والے سنگل صوفے پر بیٹھی موتیا کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اس وقت قیامت ڈھا رہی تھی...... سانچے میں ڈھلا جسم، چمکتا ہوا سفید رنگ، لانبی گردن...... وہ ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ سجائے نثار ہوتی نظروں سے صاحبزادہ صاحب کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''خیر موتیا بھی کچھ کم نہیں۔'' انہوں نے دل ہی دل میں اعتراف کرتے ہوئے بجل کی طرف دیکھا۔ ان کے بالکل سامنے بیٹھی میک اپ سے بے نیاز یہ نوخیز لڑکی اپنی سادگی میں بھی قیامت سے کم نہ تھی جو لاؤنج میں آنے کے بعد سلام کر کے صوفے پر بیٹھ گئی تھی اور چہرے پر انتہائی بیزاری لیے، وہ تب سے اب تک نگاہیں جھکائے غالباً کارپٹ کے پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔

''کمال ہے شاہجہان بیگم ہم کئی بار لاہور بھی آئے...... یہاں بھی دو تین بار آنا ہوا لیکن آپ نے پہلے کبھی بجل سے متعارف نہیں کروایا؟'' آخر ان کے لبوں پر شکوہ آ ہی گیا۔

''ارے کیا بتاؤں صاحبزادہ صاحب، جن دنوں آپ لاہور آتے تھے اپنی بجو بہت چھوٹی تھی اور اسکول میں پڑھتی تھی۔ پڑھنے کا اتنا شوق تھا کہ گھر آ کر بھی کتابوں میں گھسی رہتی تھی اور پھر آپ وہاں نکلتے کب تھے، آئے موتیا کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر چل دیے۔'' صاحبزادہ صاحب سے بات کر کے باقی کی آدھی بات شاہجہان نے بخاری صاحب کی طرف دیکھ کر کی۔

''اسے تو یوں بھی کسی شے سے دلچسپی نہ تھی، یہ تو اب پتا نہیں کیوں اسے اداکاری کا شوق چرایا ہے تو موتیا نے آپ سے ذکر کر دیا۔''

''ماشاء اللہ...... ماشاء اللہ ہم تو ایسے فن کے دیوانوں کی بڑی قدر کرتے ہیں۔'' بخاری صاحب کی نظریں بڑی دیر بعد بجل کے چہرے سے ہٹی تھیں اور اب وہ مسکراتی نظروں سے شاہجہان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک گھاگ ڈائریکٹر تھا چہرہ دیکھ کر اندر اتر جانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ بجل کی آنکھوں میں چھائی ناگواری اور چہرے پر پھیلی بیزاری سے جان گیا تھا کہ اداکارہ بننے کا شوق بیٹی کو نہیں ماں کو ہے۔ وہ اپنی بیٹی کو اداکارہ بنانا چاہتی ہے جبکہ بیٹی کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں لگتی۔

''میں آج کل اپنی ایک نئی سیریل کے لیے ہیروئن کی تلاش میں تھا بالکل ایسا ہی نیا اور تر و تازہ چہرہ لانا چاہتا تھا میں، تو بس سمجھیں کہ میری تلاش ختم ہو گئی۔'' شاہجہان کی باچھیں کھل گئیں۔ ''اب دیکھیے گا ایک ہی سیریل کے بعد کیسے بجل بی بی کا طوطی بولتا ہے۔'' شاہجہان سے بات کرتے، کرتے بخاری صاحب نے ایک حریص سی نظر بجل پر ڈالی تو صاحبزادہ صاحب بھی اپنے اندر ابلتے جذبات پر قابو پا کر مسکرائے۔

''بالکل...... بالکل بخاری صاحب تو پارس ہیں پارس جس کو ہاتھ لگا دیں سمجھو وہ سونا ہو گیا۔'' بخاری کے لبوں پر تفخر بھرا تبسم نمودار ہوا۔

''آج کئی ایسے اداکار، رائٹرز، اداکارائیں جن کا طوطی بول رہا ہے ان سب کو اس مقام تک لانے میں بخاری کا ہی ہاتھ ہے۔ ایسے ہی تو لوگ کنگ میکر نہیں کہتے انہیں۔ جسے چاہیں زیرو کر دیں جسے چاہے ہیرو بنا دیں۔

آپ کی بجل کو بھی دیکھیے گا ایک روز صفِ اول کی ہیروئن بنا دیں گے۔''

''بڑی مہربانی بخاری صاحب۔'' شاہجہان کا دل تو بلیوں اچھل رہا تھا اور خوشی اس کے چہرے سے بھی ظاہر ہوتی تھی۔

''آپ بے فکر رہیں شاہجہان بیگم، کل آڈیشن کے لیے بھجوا دیں۔'' وہ پھر بجل کو دیکھنے لگا تھا اور اسے دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ اپنے مسلسل بجتے فون کی طرف اس کا دھیان ہی نہیں تھا۔

''صاحب آپ کا فون آ رہا ہے۔'' موراں نے جوس کا گلاس اسے پکڑاتے ہوئے جتایا۔

''اوہ ہاں۔'' بخاری صاحب نے چونک کر گلاس پکڑتے ہوئے بجل کے چہرے سے نظریں ہٹائیں اور کوئی تیسری بار فون کی بیل کو نظر انداز کیا اور بجل سے پوچھا۔

''آج کل کون سا ڈراما زیادہ شوق سے دیکھ رہی ہیں آپ؟ کبھی میرا ڈائریکٹ کیا ہوا ڈراما بھی دیکھا؟''

''نہیں...... میں ڈرامے نہیں دیکھتی۔'' بجل نے پہلی بار کارپٹ سے نظریں ہٹا کر بخاری صاحب کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں واضح ناگواری تھی۔ صاحبزادہ صاحب دل ہی دل میں بے حد محظوظ ہوئے اور بہت دلچسپی سے بجل کی طرف دیکھا۔

''اور مجھے اداکاری بھی نہیں آتی، میں نہیں کر سکتی اداکاری۔'' لمحے بھر کے توقف کے بعد بجل نے کہا تو شاہجہان نے بے حد جز بز ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

''لو بھلا اداکاری ایسا کون سا مشکل کام ہے، بخاری صاحب سکھا دیں گے۔''

''میں نے تو ایسے ایسے جاہل ان پڑھ لوگوں سے بھی اداکاری کروالی، آپ تو پڑھی لکھی ہیں۔ آپ بے فکر رہیں، یہ میرا ہیڈک ہے آپ کو سکھانا۔'' بخاری نے پُرشوق نظروں سے اسے دیکھا۔

حسن بھی تھا، تمکنت بھی تھی اور بے نیازی بھی...... بخاری سوچنے لگا کہ اسے ہیروئن کے کردار میں کیا، کیا تبدیلیاں کروانی ہوں گی۔ تھوڑی سی مغرور تھوڑی بے نیاز اور پھراتنی حسین، بھلا سیریل کیسے ہٹ نہ ہوگا۔

''سنہری بہت اچھی ایکٹنگ کرتی ہے۔'' سجل نے شاہجہان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''اسے اپنے چہرے کے تاثرات بدلنے میں ملکہ حاصل ہے۔'' سجل نے شاہجہان کی ناراضی کی پروا کیے بغیر مزید اضافہ کیا۔

''سنہری کون؟'' بخاری چونکا۔

''میری منجھلی بیٹی ہے۔'' شاہجہان نے سجل کی اس بے وقت بات پر اندر ہی اندر دانت پیسے لیکن مصلحتاً لبوں پر مسکراہٹ سجالی۔

''بخاری صاحب سنہری تو سچ مچ سنہری ہے، سونے سے ترشی ہوئی، چمکتی دمکتی......'' صاحبزادہ صاحب کی آواز میں چہکار تھی۔

''ارے تو ان سے بھی ملوائیں...... کہیں نہ کہیں کوئی چانس نکل ہی آئے گا۔ جانتے تو ہیں ناں آج کل کیسے دھڑا دھڑ ڈرامے بن رہے ہیں۔'' اس کا فون پھر بجنے لگا تھا اس نے جھنجلا کر سجل کے چہرے سے نظریں ہٹا کر فون آن کیا اور کچھ دیر دوسری طرف کی بات سنتا رہا۔

''بس آرہا ہوں ملک صاحب، پندرہ منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔ آپ بس نورین بی بی کی کچھ خاطر تواضع کریں۔'' فون بند کر کے اس نے پھر سجل کی طرف دیکھا۔

''سوری دراصل مجھے شوٹ کے لیے جانا ہے۔ آج میرے ڈرامے کی آخری قسط تھی اور نورین بی بی آج وقت پر پہنچ گئی ہیں اور اگر ناراض ہو کر چلی گئیں تو پھر جانے کب ہاتھ آئیں اور اگر آج یہ episode نہ کرسکا تو ملک صاحب کا غصہ بجا ہوگا۔'' وہ کھڑا ہوگیا۔

''ارے بخاری صاحب چائے آرہی تھی۔'' شاہجہان بیگم نے اسے روکا۔

''چائے پھر کبھی سہی، ہاں کل بارہ بجے کے بعد آڈیشن کے لیے آجایئے گا۔'' اس نے سجل پر ایک نظر ڈالی اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ صاحبزادہ صاحب وہاں ہی بیٹھے اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ برسوں کی جان پہچان تھی لیکن شاہجہان بیگم نے کبھی سجل کا ذکر تک نہ کیا تھا۔ شاہجہان بیگم بھی صاحبزادہ صاحب کی ناراضی نوٹ کر رہی تھی لیکن جان بوجھ کر نظر انداز کر رہی تھی۔ صاحبزادہ صاحب جب بھی لاہور آتے ان کے چوبارے پر ضرور آتے تھے۔ ہاتھ کے کھلے اور دل کے سخی تھی سو خوب آؤ بھگت کی جاتی تھی۔ یوں بھی ان دنوں شاہجہان کا چوبارہ تھا یا پرستان تھا سرِشام ہی پریوں کا میلا سا لگ جاتا۔ رنگ برنگے آنچل لہرانے لگتے، خوشبوئیں بکھر جاتیں ایک سے ایک طرح دار لڑکی تھی لیکن اب تو چوبارہ ویران ہی ہوگیا تھا۔ کچھ کو موذی امراض لگ گئے اور کچھ دوسرے چوباروں پر چلی گئیں چند ایک نے گھر بسا لیے۔ لے دے کر دو چار لڑکیاں ہی رہ گئی تھیں شاہجہان کے پاس...... صاحبزادہ صاحب دل والے تھے۔ چوبارے کا حال دیکھا تو انہیں کراچی آنے کی دعوت دے دی انہی کے آسرے پر کراچی آئی تھی اور یہ گھر بھی انہوں نے ہی موتیا کے لیے خریدا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ موتیا صرف ان کے لیے وقف رہے۔ وہ صاحبزادہ صاحب کو ناراض نہیں کرسکتی تھی اس لیے ان کا دل ملنے کی کوشش کی۔

''آپ کا بہت شکریہ صاحبزادہ صاحب کہ آپ نے میری سجل کے لیے کوشش کی۔ آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی بہت حسرت تھی مجھے کہ میری بچو بڑی اداکارہ بنے۔''

''احسان کیسا شاہجہان بیگم، ہم موتیا کا کہا ٹال سکتے ہیں بھلا!'' موتیا کا چہرہ چمک اٹھا۔ ''لیکن ہمیں کبھی تم نے سجل کے رقص و آواز سے مستفید نہیں کروایا۔'' گلہ اب بھی ان کے لہجے سے جھلکتا تھا۔ موتیا نے بے چینی سے

پہلو بدلا اس کا چمکتا چہرہ ماند پڑ گیا تھا اور اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

''سجو کو رقص نہیں آتا۔'' صاحبزادہ صاحب کے لبوں پر استہزائیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''یہ کیسے ممکن ہے کہ مچھلی کو پانی میں رہ کر تیرنا نہ آتا ہو۔''

''ایسا ہی ہے صاحبزادہ صاحب، یہ تو شروع سے ہی پڑھائی میں پڑ گئی تھی اسے کبھی ناچ گانے سے دلچسپی نہیں رہی اور سچی بات ہے میں نے بھی کبھی اسے محفل میں بٹھانے کا نہیں سوچا۔ اس کے باپ سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی اولاد کو اس کام میں نہیں ڈالوں گی۔ ہم لاکھ برے سہی پر اپنے قول سے پھرنے والے نہیں۔'' شاہجہان نے جواب دیا تو صاحبزادہ صاحب کے لبوں پر بکھری استہزائیہ مسکراہٹ اور بھی گہری ہوگئی۔ سجل ایک دم کھڑی ہوگئی اس نے صاحبزادہ صاحب کو نہ تو خدا حافظ کہا اور نہ ہی ان کی طرف دیکھا اور......

''اماں میں جا رہی ہوں۔'' کہتی ہوئی وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

''اپنی اس بیٹی کو تم نے ادب آداب نہیں سکھائے شاہجہان بیگم۔'' صاحبزادہ صاحب نے جز بز ہو کر پہلو بدلا۔

''نہیں صاحبزادہ صاحب ایسی بات تو نہیں ہے بس اجنبیوں سے جلدی گھلتی ملتی نہیں ہے۔'' شاہجہان بیگم نے شرمندگی سے کہا۔ اسے سجل پر غصہ تو بے حد آرہا تھا لیکن پی گئی۔ اب بھلا اگر صاحبزادہ صاحب کو غصہ آگیا تو اس اجنبی شہر میں وہ بھلا کیا کرے گی بے یار و مددگار۔

''خیر اب شوبز میں بھجوانا ہے تو کچھ ادب آداب تو سکھانے ہوں گے اسے اور ہاں تم کیا کہہ رہی تھیں کہ اس کے باپ سے وعدہ کیا تھا تو کون تھا اس کا باپ؟'' اور سجل جو لاؤنج سے باہر نکل کر لمحے بھر کے لیے رکی تھی اس کا پورا وجود کان بن گیا۔

''تھا کوئی شریف آدمی۔'' شاہجہان بیگم کا انداز ٹالنے والا تھا۔

''اچھا ایسا ہی شریف زادہ تھا تو ساتھ کیوں نہ لے گیا، تمہارے پاس کیوں چھوڑ گیا؟'' صاحبزادہ صاحب کے طنز کو شاہجہان بیگم نے ہنس کر پی لیا۔

''مر کھپ گیا ہوگا، مجھے اتا پتا معلوم نہ تھا ورنہ پہنچا دیتی اسے اس کے پاس۔'' اور سجل کا دل جیسے ڈوب کر ابھرا۔ اس نے دیوار کا سہارا لیا۔ اس کا باپ ایک شریف آدمی تھا، پتا نہیں شاہجہان سچ کہہ رہی تھی یا جھوٹ۔

''کیا خیال ہے موتی کچھ دنوں کے لیے مری، اسلام آباد کا چکر نہ لگا آئیں؟'' صاحبزادہ صاحب اب موتیا کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔ وہ کھل اٹھی تھی اور اس کا بجھا ہوا چہرہ چمک اٹھا تھا۔

''کراچی کے اس ایک جیسے موسم سے دل اوب گیا ہے شاہجہان بیگم۔ اجازت ہے موتیا کو کچھ دنوں کے لیے مری لے جاؤں؟''

''آپ کو اجازت کی کیا ضرورت ہے صاحبزادہ صاحب آپ حکم کریں۔'' شاہجہان نے بھی اطمینان کی سانس لی کہ صاحبزادہ صاحب، سجل کے موضوع سے ہٹے لیکن صاحبزادہ صاحب نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ یوں بھی ٹھنڈی کر کے کھانے کے قائل تھے۔ عمر کی ساٹھ بہاریں گزار چکے تھے اور سجل پر ان کا دل آگیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں پلاننگ کر رہے تھے کہ کیسے اس نوخیز حسن کو اپنا بنالیں اور قدرت ان کی پلاننگ پر ہنس رہی تھی۔

''موراں...... موراں کہاں مر گئی ہو، تمہاری چائے ابھی نہیں بنی؟'' شاہجہان کی چیختی آواز سے سجل چونکی اور ہولے، ہولے چلتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اور برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھتے ہوئے لمبی، لمبی سانس لی۔

''کون تھا اس کا باپ؟ کوئی شریف آدمی۔'' شاہجہان سچ کہہ رہی تھی یا جھوٹ لیکن دل پر ایک بوجھ سا آگرا تھا اور پھر شاہجہان کا کیا پتا اتنے فراٹے سے جھوٹ بولتی تھی کہ مقابل کو شک تک نہ ہوتا تھا اور ممکن ہے شاہجہان کو

خود بھی پتا نہ ہوا اس کے باپ کا۔ اس نے سوچا اور دل پر دھرا بوجھ بڑھ گیا۔ شاہجہان سے کچھ پوچھنے کا فائدہ بھی نہ تھا وہ بتانے والی بھی نہیں تھی۔

''ایسا شریف زادہ ہوتا تو ساتھ ہی نہ لے جاتا۔ اس دلدل میں کیوں چھوڑ جاتا۔ صحیح تو کہہ رہے تھے صاحبزادہ صاحب۔'' ایک گہری سانس لے کر وہ پورچ میں بکھری دھوپ کو دیکھنے لگی اس سے زیادہ دھوپ تو اس کے اندر بھری تھی جو رگ، رگ کو جھلساتی تھی۔ وہ کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی یہاں تک کہ دھوپ اس کے چہرے پر پڑنے لگی لیکن وہ یونہی بے حس سی بیٹھی رہی کہ دل کی زمین۔ دھوپ کی تپش سے سلگ رہی تھی اور کہیں سے کوئی بادل آ کر اس جلتی بلتی زمین پر برس کر اسے ٹھنڈک نہیں بخشتا تھا ایک دم ہی گھٹن اور حبس سے اس کا دم گھٹنے لگا۔ اندر شاہجہان اور موتیا غالباً صاحبزادہ صاحب کی خاطر داریوں اور خوشامدوں میں لگی تھیں کہ ابھی تک وہ باہر نہیں آئے تھے۔ اس نے کبھی اپنی زندگی کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ وہ مطمئن تھی یا نہیں اس نے کبھی اس پر بھی غور نہیں کیا تھا۔

سنہری کبھی، کبھی اسے بے حس کہتی تھی لیکن وہ بے حس تھی یا حد سے زیادہ حقیقت پسند وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ سنہری کی طرح واویلا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ سنہری جو کبھی کبھار واویلا کر کے پھر خوش اور مطمئن ہو جاتی تھی۔ وہ شاہجہان بیگم کی بیٹی تھی اور اس حقیقت کو بدلنے پر وہ قادر نہیں تھی۔ اس کا باپ کون تھا اس کے متعلق بھی اس نے زیادہ تجسس نہیں کیا تھا۔ بس اپنے اسکول میں ظہور ے کا نام دیکھ کر پوچھا تھا ایک بار کہ کیا ظہورا ہی اس کا باپ ہے اور بس بقول سنہری کے وہ بغیر کسی گلے، شکوے کے ایک بے حس زندگی گزار رہی ہے لیکن آج اس کا دل کسی پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ دل پر جیسے آبلے بنتے اور پھوٹتے تھے اور ان پھوٹتے آبلوں کی جلن اور اذیت رگوں کو کاٹتی تھی۔ اسے یاد نہیں تھا کہ وہ کبھی روئی تھی لیکن اس وقت اس کا رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ شاید آنسو اس جلن کو کم کردیں۔ وہ یک دم کھڑی ہوگئی اور گہری، گہری سانس لی اور پھر بالکل غیر ارادی طور پر برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر گیٹ کھول کر باہر نکل آئی اور سڑک کراس کر کے پارک کی طرف جانے لگی۔ شاید کھلی فضا میں یہ گھٹن کم ہو جائے جو رہ، رہ کر اس کا دم گھونٹتی تھی۔

''کچھ لوگوں پر خدا کتنا مہربان ہوتا ہے۔'' اس نے پارک کی طرف سے آتی خوش باش خاتون کی طرف دیکھا۔ جو ایک پیارے سے بچے کی انگلی پکڑے مسکرا، مسکرا کر بچے سے باتیں کرتی ہوئی اس کے قریب پہنچی تو اس نے غیر ارادی طور پر انگلی سے بچے کے رخسار کو چھوا، عورت اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تو اس نے بھی مسکرانے کی کوشش میں اپنے ہونٹ پھیلا دیے اور پارک میں داخل ہوگئی۔ یہاں گھنے درخت تھے، سبزہ تھا اور چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے رونق تھی۔ اگرچہ فضا میں دھوپ کی تپش تھی پھر بھی آس پاس کے گھروں کے بچے پارک میں کھیل رہے تھے۔ غبارے، دال سویّاں اور قلفی بیچنے والے بھی آوازیں لگاتے پارک میں چکر لگا رہے تھے جبکہ بچوں کے ساتھ آنے والی کچھ خواتین اور مرد حضرات بینچوں پر بیٹھے تھے۔ وہ سر جھکائے کسی تنہا گوشے کی تلاش میں چلتی گئی۔ چلتے، چلتے یک دم کسی کی نظروں کی تپش محسوس کر کے وہ رکی اور اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ بائیں طرف درخت کے قریب کٹے ہوئے تنے پر وہ بیٹھا تھا ایسے کٹے ہوئے تنے پارک میں کئی جگہ لوگوں کے بیٹھنے کے لیے رکھے ہوئے تھے اسے رکتے دیکھ کر وہ کھڑا ہوگیا۔

''آپ...... یہاں...... کیسی ہیں آپ؟'' اس کی آنکھوں سے اشتیاق جھلکتا تھا لیکن اس اشتیاق میں نہ تو صاحبزادہ صاحب کی آنکھوں والی حرص تھی نہ بخاری صاحب کی آنکھوں کی ہوس۔ شفاف، بے ریا آنکھیں اپنے اندر شوق کا جہان چھپائے اس کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

''کتنا عجیب اتفاق ہے کہ میں یونہی بلا ارادہ اٹھ کر پارک میں آ گیا تھا...... شاید میرے دل......'' اس نے

زبان دانتوں تلے دبالی۔ ''دراصل بابا اور رواحہ، بابا کے کسی کولیگ کے ہاں گئے ہوئے تھے تعزیت کے لیے اور گھر میں اکیلے بیٹھے، بیٹھے میرا دل گھبرایا تو میں یہاں آ گیا چند بار بابا کے ساتھ صبح، صبح واک کے لیے آیا تھا لیکن آج اس وقت بس یونہی......'' اس نے چور نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کے سپاٹ چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا اور وہ بے حد گہری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی اس نے گھبرا کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

''سوری، شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں عظام ہوں آپ اپنی مدر کے ساتھ ہمارے ہاں آئی تھیں۔''

''میں نے پہچان لیا ہے، آپ کیسے ہیں؟'' اس نے نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹالیں۔ اب وہ زمین کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' عظام کی خوشنما آنکھوں میں جگنو سے دمکنے لگے۔ ''بیٹھیں ناں پلیز۔'' اس نے اپنے سامنے پڑے دوسرے تنے کی طرف اشارہ کیا۔

''آپ بھی غالباً میری طرح تنہائی سے گھبرا کر ادھر چلی آئی ہیں۔''

''نہیں، تنہائی تو نہیں حبس اور گھٹن سے گھبرا کر۔'' اس نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ یہ اس قدر شاندار وجیہہ شخص اس کے کانوں میں موتیا کی آواز گونجی۔

''سن سنہری یہاں سے جان چھڑانے کے لیے تو بس پھر ایک ہی حل ہے کسی کو پھنسا لے اور گھر بسا لے۔''

''اور اگر میں اسے......'' اور اپنی سوچ پر شرمندہ سی ہو کر وہ اپنے ناخنوں کو دیکھنے لگی۔

''بیٹھ جائیں ناں پلیز۔'' عظام نے پھر تنے کی طرف اشارہ کیا تو وہ بنا کچھ کہے بیٹھ گئی۔

''آپ کیا کھڑے رہیں گے؟'' اس نے پھر ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھائیں اور اس کا دل تیزی سے دھڑکا۔

''کیا ہے اگر یہ شخص...... ہاں یہ شخص مجھے اپنی زندگی میں شامل کر کے معتبر کردے۔'' کیا یہ صرف معتبر ہونے کی خواہش تھی یا کچھ اور جذبہ بھی دردون دل موجود تھا۔ اس سے وہ اس سے بے خبر تھی لیکن کچھ دنوں بعد اس نے جانا تھا کہ اس خواہش کے ساتھ محبت کے رنگ بھی شامل تھے لیکن اس وقت تو صرف معتبر ہونے کی خواہش رہ، رہ کر دل میں چٹکیاں بھرتی تھی۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد عظام نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔

''اس روز آپ کی والدہ نے بتایا تھا کہ آپ نے انٹر کے بعد پڑھائی چھوڑ دی ہے تو پھر سارا دن کیا کرتی رہتی ہیں کوکنگ وغیرہ؟''

''نہیں...... کوکنگ تو موراں کرتی ہے، مجھے کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔ میں سارے فارغ وقت میں کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتی ہوں۔''

''کیسی کتابیں پڑھتی ہیں آپ؟'' اس نے پوچھا۔

''ہر طرح کی جو بھی مل جائیں ناول، افسانے، سفرنامے، سوانح عمریاں کچھ بھی۔''

''کوئی خاص کتاب جو آپ کو پسند ہو؟'' عظام نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد پوچھا۔

''کوئی ایک نہیں...... بہت ساری ہیں جو مجھے بہت پسند ہیں۔'' وہ پہلی بار کسی اجنبی سے اس طرح بات کررہی تھی۔ کیوں کررہی تھی نہیں جانتی تھی۔ اس کے دل پر بہت بوجھ تھا، یہ بوجھ کیوں تھا وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی۔ اماں اسے اداکارہ بنانا چاہتی تھی یہ بات بھی وہ پہلے سے جانتی تھی اور موتیا نے کہا تھا یہ اس سے بہت اچھا ہے جو انہیں کرنا پڑتا ہے پھر بھی پتا نہیں کیوں اس کا دل بھر، بھر آ رہا تھا۔ کیا اس لیے کہ صاحبزادہ صاحب نے کہا تھا کہ اگر اس کا باپ ایسا ہی شریف زادہ تھا تو...... اور کیا...... واقعی اس کا باپ کوئی شریف آدمی تھا یہ سارا بوجھ شاید اس لیے تھا

کہ اسے اپنے باپ کا نام نہیں معلوم تھا اور اس لیے بھی تھا کہ بخاری صاحب اور صاحبزادہ کی نظریں...... اسے لگتا تھا جیسے وہ بیچ چوراہے میں بیٹھی کوئی عورت ہو اور ہر آنے جانے والا اس کا تماشا کر رہا ہو۔ آج سے پہلے تو اسے کبھی اپنا آپ اتنا کمتر اتنا گھٹیا نہیں لگا تھا لیکن آج۔

''آپ نے انٹر کے بعد کیوں چھوڑ دیا مزید کیوں نہیں پڑھا؟'' عظام اس سے کچھ نہ کچھ بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی اس سے بات کر رہی تھی اس نے ایسا سوچا تو تھا کہ کبھی ایسا ہو کہ وہ آمنے سامنے بیٹھ کر بات کریں لیکن ایسا ہوگا اس کا اسے یقین نہیں تھا لیکن ایسا ہو گیا تھا وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی اور اس کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔

''میری اماں مجھے اداکارہ بنانا چاہتی ہیں۔''

''اور آپ ایکٹنگ پسند نہیں کرتیں؟'' عظام نے پتا نہیں کیسے اندازہ لگایا اس کی نظریں اٹھیں اور پھر کچھ دیر اسی زاویے پر اٹھی رہ گئیں۔

''نہیں۔'' اس نے نگاہیں جھکا لیں۔ اس کے ''نہیں'' میں عجیب طرح کی سختی تھی۔

''حالانکہ آج کل تو بہت معزز گھرانوں کی لڑکیاں بھی اداکاری کر رہی ہیں۔ ایک دور تھا شاید جب اسے پسند نہیں کیا جاتا تھا لیکن اب تو یہ بھی پروفیشن ہے۔ ہماری یونیورسٹی میں ہر چوتھے لڑکے کو اداکار بننے کا کریز ہے جسے دیکھو آڈیشن کے چکر میں پڑا ہے۔'' وہ مسکرایا اس کی مسکراہٹ بہت دلکش تھی اور اس کے دانت بے حد خوب صورت تھے۔

''ہاں لیکن مجھے لگتا ہے کہ میں کبھی اداکاری نہیں کر سکتی جبکہ میری اماں نے میرے پیدا ہوتے ہی سوچ لیا تھا کہ وہ مجھے اداکارہ بنائیں گی۔'' وہ ہلکے سے ہنسی لیکن اس کی ہنسی میں بلا کا درد تھا۔ عظام کے دل پر ضرب سی پڑی کیا اس لڑکی کو کوئی دکھ ہے اس نے سوچا اور سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا وہ خالی، خالی نظروں سے عظام کے پیچھے درخت کو دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے پر جیسے کوئی کرب آ کر ٹھہر گیا تھا۔

''آپ یقیناً بہت خوب صورت اور پیاری ہوں گی تب آپ کی اماں نے سوچا ہوگا کہ آپ کو اداکارہ بنائیں اس وقت عموماً یہی تاثر تھا کہ اداکارائیں بہت خوب صورت ہوتی ہیں۔''

''اور کیا میں اب خوب صورت نہیں ہوں؟'' اس کی آنکھوں میں حیرت کا تاثر ابھرا تھا۔

''آپ......'' اس کی نظریں اس کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔ ''میرے پاس لفظ نہیں اس حسن کو بیان کرنے کے لیے کیا آئینے نے کبھی آپ کو کچھ نہیں بتایا؟''

''آئینے نے...... بہت بار لیکن صرف یہی ایک وجہ نہیں ہے اور بھی بہت سی وجوہات ہیں۔'' اس کے لہجے میں افسردگی گھل گئی تھی یا اسے محسوس ہوئی تھی۔

''دراصل اس فیلڈ میں پیسہ بھی تو بہت ہے۔ شہرت، عزت، پیسہ شاید اس لیے آپ کی اماں نے ایسا سوچا ہو لیکن اگر آپ کو پسند نہیں ہے تو انہیں بتا دیں کہ آپ کو نہیں پسند ایکٹنگ کرنا۔''

''ان کے پاس میرے لیے شاید اس سے بہتر چوائس نہیں تھی۔ انہوں نے اپنے حساب سے تو میرے لیے بہت اچھا سوچا اس سے بہتر جو موتیا اور سنہری کر رہی تھیں۔'' لمحے بھر کے توقف کے بعد وہ کسی اذیت آمیز خیال سے جیسے ڈوب کر ابھری۔

''موتیا اور سنہری میری بڑی بہنیں ہیں اور مجھے تو اس کے لیے اماں کا ممنون ہونا چاہیے لیکن میں شاید ناشکری ہوں۔ میری دوست آمنہ بھی کہتی تھی کہ مجھے ہمیشہ رب کا شکر ادا کرنا چاہیے لیکن میں نے کبھی نہیں کیا۔ یہ نہیں کہ میں

نے کبھی گلہ کیا ہو رب سے۔ شکر ادا نہیں کیا تو کبھی گلہ بھی نہیں کیا لیکن اب میرا دل چاہتا ہے کہ میں شکر ادا کروں کہ اللہ نے مجھے سنہری اور موتیا جیسی بہنیں دی ہیں جو مجھ سے محبت کرتی ہیں حالانکہ میں نے کبھی ان کی محبت کا رسپانس نہیں دیا اور اماں ہیں جنہوں نے ہمیشہ میرا فیور کیا۔ اپنی فطرت کے برخلاف مجھے بچا بچا کر رکھا اور موراں ہے جس کو ہر دم میری فکر رہتی ہے اور میں اللہ سے گلہ کروں...... شکوہ کروں کہ اس نے مجھے......'' اور اسے اپنی سانس سینے میں گھٹتی محسوس ہوئی اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ عظام نے ناسمجھی سے اسے دیکھا وہ اس کی بات سمجھ نہیں پایا تھا پھر بھی اس نے کچھ کہنا ضروری سمجھا۔

''ہاں، ہمیں شکر تو ہر وقت ادا کرنا چاہیے۔ میرے پاپا کہتے ہیں کہ بندے پر خالق کا شکر واجب ہے، اس کے اپنے بندوں پر اتنے احسانات ہیں، اتنی رحمتیں ہیں اور اتنی نعمتیں عطا کی ہیں اس نے کہ بندے کو ہر دم اس کا شکر گزار رہنا چاہیے۔ صرف اس لیے نہیں کہ اس نے آپ کو محبت کرنے والے رشتے دیے بلکہ اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جن کے لیے آپ کو اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اس نے آپ کو آنکھیں دیں دیکھنے کے لیے، ہاتھ پاؤں عطا کیے، سمجھ اور عقل دی اور پھر بہت ساری نعمتیں ہوا، پانی، پھل بندہ تو کبھی اپنے خالق کا شکر ادا نہیں کر پاتا، ساری زندگی ادا کرتا رہے تب بھی نہیں......'' وہ سر جھکائے اس کی بات سن رہی تھی اس نے اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھا اور دھیمے سے مسکرایا۔

''اور گلہ...... اور مخلوق کو گلہ کرنا تو بنتا ہی نہیں ہجل...... ہاں اسے صبر اور دعا کرنی چاہیے۔''

''صبر اور دعا۔'' صبر تو اس نے ہمیشہ ہی کیا تھا لیکن دعا...... دعا کبھی نہیں کی تھی۔

''اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آزماتا ہے کبھی دے کر، کبھی لے کر۔''

''ہاں، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' اس نے نظریں اٹھائیں عظام اسے ہی دیکھ رہا تھا اور اس کے لبوں پر نرم سی مسکراہٹ تھی دلاسا دیتی، تسلی دیتی ہوئی مسکراہٹ......

''ویسے......'' اسے اپنی طرف تکتا پا کر عظام نے کہا۔ ''ایکٹر بننا ایسا برا تو نہیں جو آپ اتنی اپ سیٹ ہو رہی ہیں۔''

''ہاں شاید اتنا برا نہیں...... لیکن میں کیا کروں میں اداکاری نہیں کر سکتی۔'' اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔ اب وہ اسے کیا بتاتی کہ بات صرف اداکاری کی نہیں تھی۔ کوئی اور بھی دکھ تھا جو چپکے، چپکے اسے کاٹ رہا تھا۔ اس نے کبھی کسی سے اپنے دل کی بات نہیں کی تھی اور زندگی میں پہلی بار وہ کسی اجنبی سے دل کی بات کر رہی تھی۔ وہ اجنبی ہی تو تھا بھلا دو تین بار صرف دیکھنے سے کوئی اجنبی اپنا تو نہیں بن جاتا ناں۔

اس نے تو کبھی موتیا، سنہری اور اماں کو بھی اپنے دل کا بھید نہیں دیا تھا اور اب وہ اس سے اس پہلی ملاقات میں ہی سب کچھ بتا دینا چاہتی تھی۔ کچھ چھپانا نہیں چاہتی تھی وہ خود نہیں جانتی تھی وہ کیوں ایسا کر رہی تھی لیکن وہ ایسا کر رہی تھی۔

''آپ نے پوچھا نہیں موتیا اور سنہری کیا کرتی ہیں؟'' اس نے جیسے کرب کے سمندر سے ابھر کر عظام کی طرف دیکھا۔ ''وہ ناچتی گاتی اور محفل سجاتی ہیں اور......'' ایک زخمی سی مسکراہٹ اس کے گلاب لبوں پر تھرتھرائی۔

''اور میری اماں...... بلکہ ہم سب یہاں آنے سے پہلے لاہور کے شاہی محلے میں رہتے تھے گلبرگ میں نہیں۔'' آنسو یک دم ہی اس کی آنکھوں کی سطح پر چمکے اور پھر جیسے بند توڑ کر رخساروں پر پھسل آئے۔

عظام نے تڑپ کر اسے دیکھا اور حیرت سے سوچا کہ اگر وہ گلبرگ کے بجائے شاہی محلے میں رہتی ہے تو اس میں رونے کی کیا بات ہے پھر یک دم ہی اس کے اندر کچھ کلک ہوا اس نے ایک بار ایک مضمون پڑھا تھا کسی سنڈے میگزین میں شاہی محلے کے بارے میں اور اس کی حیرت تاسف میں بدل گئی لیکن نہیں...... شاید میں کچھ بھول رہا

ہوں اس نے اس کے شفاف پاکیزہ چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ زندگی میں پہلی بار اس لیے رو رہی تھی کہ وہ شاہجہان بیگم کی بیٹی ہے اور اس کا ہر آنسو عظام کے دل پر آتشیں سیال بن کر گزر رہا تھا۔

''آپ پلیز مت روئیں، کیا آپ صرف اس بات پر رو رہی ہیں کہ آپ کی اماں آپ کو اداکارہ بنانا چاہتی ہیں یا اس لیے کہ آپ کی اماں گلبرگ کے بجائے شاہی محلے میں رہتی تھیں؟''

''آپ کو پتا ہے شاہی محلے میں رہنے والی عورتیں کون ہوتی ہیں؟ معاشرہ انہیں کس نام سے پکارتا ہے؟'' اس نے بھیگی پلکیں اٹھائیں۔

''اوہ...... ہاں۔'' وہ چونکا اور شرمندہ ہو گیا وہ مضمون پوری جزئیات کے ساتھ اسے یاد آ گیا تھا۔

''مجھے اپنے باپ کا نام نہیں معلوم کیا مجھے اس بات پر خوش ہونا چاہیے؟'' اس کے لہجے سے ناراضی جھلکنے لگی تھی اور وہ بے حد خفگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''نہیں...... میرا یہ مطلب نہیں۔'' وہ سٹپٹایا۔ ''لیکن آپ اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزار سکتی ہیں اپنی والدہ کو قائل کر سکتی ہیں۔''

''کیا ایسا ممکن ہے؟'' اس کی آنکھوں کے سامنے کئی منظر آ گئے جب وہ چھوٹی تھی تو اماں غلط پاؤں اٹھانے پر کیسے دھنک کر رکھ دیتی تھیں۔ اماں نے اگر ساری زندگی اسے اس ماحول سے الگ رکھا تھا تو اس کا پس منظر یقیناً کچھ اور تھا اس کے باپ سے کیا وعدہ...... یا شاید اماں کو اس کے باپ سے محبت ہو گئی ہو یا...... اس نے شاکی نظروں سے عظام کو دیکھا۔

''ساحل پر کھڑا شخص سمندر میں ڈوبتے ہوئے شخص کی اذیت کا اندازہ نہیں کر سکتا جو وہ بپھری ہوئی موجوں سے لڑتے ہوئے برداشت کر رہا ہوتا ہے۔''

''سوری۔'' عظام مزید شرمندہ ہوا۔

''آپ اس اذیت کا اندازہ نہیں کر سکتے جس سے ہمیں گزرنا پڑتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے سنہری کو پنجرے میں بند پرندے کی طرح پھڑ پھڑاتے۔ آزادی کے خواب دیکھتے اور پھر اپنی قید پر قانع ہوتے ہوئے۔ قناعت کی وہ بے بسی آپ محسوس نہیں کر سکتے۔''

''میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں نجل، آپ مجھے بتائیں؟'' اس نے دلگرفتگی سے پوچھا۔

وہ لمحہ بھر یونہی عظام کی طرف دیکھتی رہی اس کی آنکھوں میں نجل کا درد اتر آیا تھا۔ موتیا کہتی تھی۔

''سنہری تم کتنی بھی کوشش کر ڈالو کسی کو اپنی محبت کے جال میں گرفتار کر لو لیکن اسے جب تمہاری حقیقت معلوم ہو گی تو بھاگ جائے گا۔''

اس نے تو آگے بڑھنے سے پہلے ہی، پہلے قدم پر ہی حقیقت کھول دی تھی۔ پتا نہیں صحیح کیا تھا یا غلط...... اور سنہری کہتی تھی کہ اگر سچ مچ اسے مجھ سے محبت ہوئی تو وہ نہیں بھاگے گا۔

وہ کم عمر تھی، تجربہ کار نہیں تھی لیکن کتابوں نے اسے اپنی عمر سے بڑا کر دیا تھا۔ اس نے عظام کی آنکھوں میں وہ جذبہ دیکھا تو جو محبت کی کوکھ سے جنم لیتا ہے اور جو جب عشق میں ڈھلتا ہے تو پھر آتشِ نمرود میں بے خبر کود پڑتا ہے۔

''کیا آپ واقعی میرے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں؟'' اس نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''ہاں...... آپ کہیں تو۔'' عظام نے اس کے بھیگے رخساروں سے بہ مشکل نظر ہٹائی۔

''تو آپ مجھ سے شادی کر لیں۔'' اس نے ایک بار ہی چھلانگ لگا دی آر یا پار۔ عظام کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا، وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ یہ لڑکی جو پہلی نظر میں ہی اسے دل میں اترتی محسوس ہوئی تھی اور دوسری بار

جب اس نے اسے دیکھا تھا تو رات اپنے بستر پر لیٹتے ہوئے اعتراف کیا تھا کہ محبت صدیوں کا عمل نہیں ہے بلکہ یہ تو لمحوں میں طے پا جاتا ہے اور اسے اس اجنبی لڑکی سے محبت ہوگئی تھی اور آج اس پہلی ملاقات میں وہ کیا کہہ رہی تھی اسے لگا جیسے اس کی سماعتوں نے غلط سنا ہو بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے اسے جانے بغیر وہ اتنی بڑی بات کیسے کہہ سکتی ہے۔

اس کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ موتیا نے سچ ہی تو کہا تھا سنہری سے کہ تمہاری حقیقت جاننے کے بعد وہ تمہاری طرف مڑ کر دیکھے گا بھی نہیں اور یہ اس کے سامنے بیٹھا لڑکا اپنی خوشنما آنکھوں میں حیرت لیے اسے تکتا ہوا۔ اس نے تو اس سے محبت کا کوئی ایسا دعویٰ بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے بس اپنی نظر پر بھروسا کیا تھا۔ وہ نظر جس نے اس کی آنکھوں میں ایک لو جلتی دیکھی تھی اور اس نے پہلی منزل پر ہی اسے امتحان میں ڈال دیا تھا۔ اسے انتظار کرنا چاہیے تھا جب لو بھڑک کر شعلہ بن جاتی اور آتشِ نمرود میں بے دھڑک کودتے ہوئے خوف نہ آتا لیکن وہ تو ایک ہی بار پلِ صراط سے گزر جانا چاہتی تھی۔

اس کی آنکھوں کے کنارے پھر سے بھیگنے لگے جو ہوا سو ہوا وہ خلا میں مسلسل لٹکے رہنے کی اذیت سے تو بچ گئی تھی۔ یہ ہاں اور نہ کے درمیان کی اذیت سے یہ اذیت سے یقیناً کم ہوگی جو اس وقت اسے ہو رہی تھی۔ وہ یک دم کھڑی ہوگئی اور ساکت بیٹھے عظام پر ایک طنزیہ نظر ڈالی اور واپس مڑی۔

”کیا تھا اگر یہ شخص اس سے شادی کر لیتا جو اسے اتنی محبت سے تکتا تھا کہ مبہوت ہو جاتا تھا۔ وہ معتبر ہو جاتی۔ وہ صرف شاہجہان کی بیٹی نہ رہتی بھلے پھر اسے اپنے باپ کا نام معلوم ہوتا یا نہ ہوتا وہ نجل زریں ہوتی زوجہ عظام حیات...... مسز عظام۔“ آنسوؤں سے اس کا حلق نمکین ہو رہا تھا اور وہ پلکیں جھپک، جھپک کر انہیں باہر آنے سے روک رہی تھی۔ وہ تیز، تیز چلتی ہوئی پارک کے گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ عظام جیسے کسی نیند سے چونکا اور تیزی سے اس کے پیچھے لپکا۔

”سنو نجل...... سنو...... رکو۔“ لیکن وہ مڑی نہیں یوں ہی ہولے، ہولے چلتی رہی۔ باجود کوشش کے آنسو اس کی آنکھوں کے کناروں سے بہنے لگے تھے۔ عظام تیز، تیز چلتا ہوا اس کے قریب آ گیا تھا اور اب اس کے قدم سے قدم ملا کر چل رہا تھا۔

”سنو...... مجھے تم سے شادی میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں تم سے شادی کے لیے تیار ہوں اور تم کیا جانو تم سے شادی کرنا زندگی کی معراج کو پا لینا ہے میرے لیے۔“ وہ تیز، تیز بول رہا تھا۔ ”میری مدر نہیں ہیں اور میرے پاپا ملک سے باہر ہیں۔ تم مجھے اتنا سا تو وقت دو گی نا بلیا کہ وہ آ جائیں اور میں انہیں تمہارے گھر بھیجوں؟“ وہ بے اختیاری میں آپ سے تم پر آ گیا تھا اس کے چلتے قدم رک گئے اور اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس کے جھوٹ کو جانچنے کی کوشش کی۔

”تمہارے پاپا......؟“ اور عظام جیسے سمجھ گیا۔

”تم جن سے ملی تھیں وہ میرے پاپا نہیں تھے رواحہ کے بابا ہیں لیکن میں انہیں بابا ہی کہتا ہوں۔ میں آج ہی پاپا سے بات کرتا ہوں...... اگر وہ خود نہ آ سکے جلدی تو میں ان سے اجازت لے کر بابا کو بھیج دوں گا آپ کے گھر۔“ وہ پھر چلنے لگی تھی عظام اس کے ساتھ، ساتھ چل رہا تھا۔

”آپ...... آپ پلیز مجھ سے بدگمان نہ ہوں۔ آپ اس طرح اچانک اٹھ کر چلی آئیں تو مجھے لگا جیسے آپ مجھ سے بدگمان ہو گئی ہیں۔“ وہ پھر تم سے آپ پر آ گیا۔

”آپ اس طرح سوچ میں پڑ گئے تو میں نے سوچا کہ آدمی سوچ میں تب پڑتا ہے جب وہ سود و زیاں کا حساب کرنے لگتا ہے تو پھر عقل نے تو زیاں ہی زیاں بتانا تھا۔“

''نہیں...... نہیں میں سود وزیاں کا حساب تو نہیں لگا رہا تھا مجھ پر تو شادیٔ مرگ طاری ہوگئی تھی۔ مجھے تو اپنی سماعتوں پر اعتبار کرنے میں وقت لگا۔ میں نے تو جب پہلی بار آپ کو دیکھا تھا تو دل نے آپ کی عمر بھر کی رفاقت کی چاہ کی تھی۔ یقین کریں آپ تو تب سے ہی میرے دل میں دھرنا دیے بیٹھی ہیں۔ میں نے بہت کوشش کی تھی کہ آپ کا خیال دل سے نکل جائے لیکن نہیں نکل سکا۔'' عظام کا لہجہ خوشگوار تھا اور وہ اس کے ساتھ، ساتھ چلتا ہوا کہہ رہا تھا۔

پورے پارک میں دھوپ بھری تھی اور سجل کو یہ دھوپ اور گرمی بیزار نہیں کر رہی تھی اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے وجود پر ٹھنڈی، ٹھنڈی پھوار گر رہی ہو۔ ایک خوشگوار سی خنکی اور ٹھنڈک اس کے اندر اتر آئی تھی اور اس کے ساتھ، ساتھ چلتے ہوئے اسے اپنا آپ معتبر لگا اور اس نے دل ہی دل میں اس ساتھ کے دائمی ہونے کی دعا کی اور وہ زندگی میں پہلی بار دعا کر رہی تھی۔ اس شخص کے ہمیشہ کے ساتھ کی جو آج سے پہلے تک تقریباً اس کے لیے اجنبی ہی تھا۔ اپنی دعا کی قبولیت کا یقین خود بخود ہی الہام بن کر اس کے دل میں اترا تھا تو دوپہر کا ویران سناٹا اس کے لیے صبح کی خوشگوار خنکی میں بدل گیا اور اس کے سپاٹ چہرے پر حیا کے رنگ بکھر گئے۔ اس نے محجوب سی نظر اس پر ڈالی۔

''آپ کو لگا ہوگا میں پتا نہیں کیسی ہوں شاید بہت بے باک......''

''نہیں۔'' عظام نے اس کی بات کاٹی۔ ''میں نے سمندر میں چھلانگ لگا کر ڈوبتے شخص کو سمندر کی موجوں سے نبرد آزما ہوتے محسوس کیا اور اس کی اذیت و کیفیت کا اندازہ لگا لیا۔ یہ بے باکی نہیں بلکہ اپنے حالات سے نکلنے کی ایک کوشش تھی، ڈوبتا ہوا شخص ایک تنکے کا سہارا بھی لے لیتا ہے۔ میں آپ کے لیے وہ تنکا سہی لیکن آپ میرے لیے بہت اہم ہیں...... میرے دل کی اولین خواہش۔''

''نہیں......؟'' سجل اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ بھی اس کے لیے بہت اہم ہے اور یہ کہ اس نے بھی اسے دیکھنے کے بعد راتوں کو سوچا ہے اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید وہ اس سے یہ سب نہ کہہ پاتی۔ وہ تو محض کھلی فضا میں سانس لینے کے لیے نکلی تھی لیکن وہ اس سے کچھ نہ کہہ سکی اور اس نے اپنے بھیگے رخساروں کو ہاتھوں کی پشت سے صاف کیا۔

شاید یہ سنہری کے دیکھے گئے خواب اور باتوں کا اثر تھا یا اپنے حالات سے فرار کی کوشش...... کچھ بھی تھا لیکن اسے عظام کے ساتھ چلنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ واقعی محبت صدیوں کا عمل نہیں یہ تو لمحوں کی بات ہے اور اس کے دل میں بھی عظام کی محبت نمو پا رہی تھی۔

وہ دونوں پارک سے نکل کر روڈ پر آ گئے تھے۔ اپنے، اپنے خیالات میں گم دونوں ساتھ، ساتھ چلتے رہے یہاں تک کہ سجل کا گھر آ گیا۔ عظام چونکا وہ اپنے گھر والی روڈ پر جانے کے بجائے سجل کے ساتھ ہی آ گیا تھا اور ٹیرس سے سنہری نے اسے عظام کے ساتھ آتے دیکھا پہلے تو اس کی آنکھیں پھیلیں پھر اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر وہ کھلکھلا کر ہنستی ہوئی موتیا کے کمرے کی طرف بھاگی اور سجل نے عین اسی وقت اوپر دیکھا اور اسے سنہری کا سبز آنچل نظر آیا تو کچھ سوچتے ہوئے اس نے عظام کو اپنے ساتھ اندر آنے کی دعوت دی۔

''آیئے ناں...... اماں سے مل لیں۔''

''کیا مناسب ہوگا میرا اس طرح آنا؟'' عظام جھجکا۔

''نامناسب بھی نہیں ہے۔'' وہ مسکرائی۔ ''ہاں اگر لاہور کے شاہی محلے والا گھر ہوتا تو میں کبھی آپ کو آنے کو نہ کہتی۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔'' عظام سٹپٹایا اور اس کے ساتھ گیٹ میں داخل ہوگیا۔

☆☆☆

وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بہت دیر سے کتاب کھولے بیٹھے تھے لیکن ابھی تک دو صفحے بھی نہیں پڑھ پائے

تھے بار، بار ایک ہی صفحے کو پڑھتے لیکن کوئی بھی لفظ ذہن میں ٹکنے نہ پاتا۔ تنگ آ کر انہوں نے تکیے کے پاس کتاب یونہی اوندھی کر کے رکھ دی دل جیسے کسی پکے ہوئے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ ''عمر کی نقدی ختم ہوتی جا رہی ہے کاش...... اے کاش ایک بار صرف ایک بار......'' لیکن وہ جو ایک ننھی سی امید کی کرن نظر آئی تھی اس کو آج انہوں نے خود ہی بجھا دیا تھا۔ بہت درد...... بہت گہرا درد جیسے ان کے دل کو چھیلنے لگا اور اس درد کو برداشت کرنے کے لیے انہوں نے آنکھیں زور سے بند کر لیں اور لب بھینچے ہوئے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا لی۔

آج سنڈے تھا اور انہیں اپنے ایک کولیگ گل اختر صاحب کے ہاں ان کے سسر کی تعزیت کے لیے جانا تھا وہ تیار ہو کر لاؤنج میں آئے تو رواحہ اور عظام لاؤنج میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ان کا جی چاہا کہ وہ رواحہ سے کہیں کہ وہ ان کے ساتھ چلے، پتا نہیں کیوں انہیں لگ رہا تھا کہ وہ ڈرائیو نہیں کر پائیں گے۔ بڑی کمزوری اور نقاہت سی محسوس ہو رہی تھی۔ کئی دنوں سے وہ صحیح طرح سے سو نہیں سکے تھے شاید اس وجہ سے یا شاید ان رتجگوں میں کرلا دینے والی ماضی کی یادوں نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔

''بابا آپ کہیں جا رہے ہیں؟'' رواحہ نے ان سے پوچھا اور ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر دوبارہ کہا۔ ''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟''

انہوں نے سر ہلایا تھا۔

''نہیں، مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔'' وہ خالی کپ ٹیبل پر رکھ کر کھڑا ہوگیا تھا اور انہیں بہت دھیان سے دیکھ رہا تھا۔

''وہم ہے تمہارا۔'' وہ مسکرائے تھے۔

''آپ کا جانا ضروری ہے بابا؟'' اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

''گل صاحب کے سسر کا افسوس کرنے جانا ہے والد کی طرح ہی تھے ان کے لیے سب کولیگ ہو آئے ہیں، میں ہی رہ گیا ہوں۔''

''تو ایک منٹ رکیں بابا، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔'' انہوں نے ایک محبت بھری نظر اس پر ڈالی۔ جیسے دل کے تار دل سے جڑے تھے۔ رواحہ نے ان کے دل کی خواہش جان لی تھی۔ وہ عظام سے کچھ کہتا ہوا ان کے ساتھ ہی لاؤنج سے نکلا تھا۔ پورچ کی طرف جاتے ہوئے انہوں نے گاڑی کی چابی اس کی طرف بڑھا دی تھی۔

''میرا ہی جی چاہ رہا تھا رواحہ کہ تم ڈرائیو کرو۔ پتا نہیں کیوں آج ہمت نہیں ہو رہی تھی۔''

''بابا۔'' اس نے گاڑی کی چابی ان کے ہاتھ سے لیتے ہوئے شکایتی نظروں سے انہیں دیکھا۔ ''پھر آپ نے مجھے کہا کیوں نہیں؟ کیا میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں، کیا آپ کو کہنا نہیں چاہیے تھا کہ رواحہ بیٹا آج تم میرے ساتھ چلو...... بابا آپ......'' وہ بے حد خفا، خفا سا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

''میری جان۔'' انہوں نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ''میں نے عظام کے خیال سے نہیں کہا۔''

''میں بیٹا ہوں آپ کا بابا۔ ساری زندگی آپ نے میرا خیال رکھا...... ماں کی کمی محسوس ہونے نہیں دی، میری ذرا سی تکلیف پر آپ تڑپے، کیا میرا فرض نہیں بنتا کہ میں آپ کے لیے کچھ کروں آپ حکم دیا کریں بابا۔'' وہ بدستور خفگی سے کہہ رہا تھا۔ ''میرا تو دل چاہتا ہے کہ آپ تھکے ہوئے آئیں تو میں آپ کی ٹانگیں دباؤں آپ کے پاؤں دباؤں...... بابا میں آپ کو سکھ دینا چاہتا ہوں۔ آرام پہنچانا چاہتا ہوں۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

''تمہیں کیا خبر رواحہ میری جان کہ تمہارا ہونا ہی میرے لیے کتنے سکھ اور سکون کا باعث ہے تم نہ ہوتے تو شاید

تمہارا ابا باجی نہ پاتا۔'' انہوں نے دل ہی دل میں کہا اور ہولے سے ہنسے۔

''پگلے میری ٹانگوں اور پاؤں میں درد نہ ہو تو پھر بھی۔''

''میرا جی چاہتا ہے ناں بابا کہ میں آپ کی خدمت کروں۔'' اس نے ذرا سا رخ موڑ کر انہیں دیکھا تھا اب اس کی خوشنما آنکھوں سے ناراضی نہیں محبت اور پیار جھلکتا تھا۔ اس کی اس محبت پر جیسے ان کا دل پگھل کر پانی ہونے لگا بے اختیار ان کا جی چاہا کہ وہ اسے سینے سے لگا کر اس کے جوان جسم کی حرارت سے اپنے کمزور پڑتے جسم کو سہارا دیں لیکن خود کو سنبھالتے ہوئے انہوں نے اس کے اسٹیرنگ پر رکھے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا اور ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔

''میں اپنے رب کا جتنا بھی شکر ادا کروں وہ کم ہے کہ اللہ نے تمہیں مجھے دیا۔ تم میرا فخر ہو میرا مان ہو۔''

''بابا۔'' رواحہ خوش ہونے کے بجائے تشویش سے انہیں دیکھنے لگا تھا۔ ''بابا آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے، گل صاحب کے ہاں جانے کے بجائے پہلے اسپتال چلتے ہیں اس وقت ڈاکٹر شہریار اسپتال میں ہی ہوں گے ناں۔''

''ارے نہیں میری جان! اب ایسا بھی بیمار نہیں ہوں بس ذرا سستی ہو رہی ہے۔''

''مجھے لگتا ہے آپ باقاعدگی سے دوا نہیں کھا رہے۔''

''یار کھاتا تو ہوں صبح شام مٹھی بھر دوائیں۔''

''آپ جانتے ہیں ناں بابا میں آپ کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں۔ آپ ہیں تو میں ہوں۔'' اس نے کئی بار کی کہی بات دہرائی تھی اور وہ نم آنکھوں کے ساتھ ہولے، ہولے اس کا بازو تھپتھپاتے رہے۔

''گل صاحب کے ہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہریں گے بابا اور وہاں سے سیدھا اسپتال جائیں گے۔''

''اوکے یار لے جانا ڈاکٹر کے پاس۔'' انہوں نے کہا تو اس کے چہرے پر اطمینان سا پھیل گیا تھا اور پھر اُن کے نہ نہ کرنے کے باوجود وہ انہیں اسپتال لے گیا تھا۔ ڈاکٹر شہریار اس وقت اسپتال میں بیٹھتے تھے اور شام میں اپنے کلینک میں ہوتے تھے۔ ڈاکٹر شہریار تب سے ہی ان کے معالج تھے جب انہیں انجائنا کا اٹیک ہوا تھا۔

''کیا آپ کو آج کل کوئی ٹینشن ہے کوئی پریشانی......؟'' ان کا بی پی چیک کرنے کے بعد ڈاکٹر شہریار نے پوچھا تھا۔

''نہیں تو کوئی پریشانی نہیں ہے۔''

''میں نے پہلے بھی کہا تھا ایک بار انجیو گرافی کروالیں اب بھی یہی مشورہ دوں گا اور پلیز اپنے آپ کو ہر پریشانی سے دور رکھیں۔''

''بابا آپ کو کیا پریشانی ہے؟'' ڈاکٹر شہریار کے کمرے سے باہر نکلتے ہی رواحہ نے پوچھا تھا۔

''مجھے کوئی پریشانی نہیں میری جان۔''

''پھر آپ کا بی پی اتنا ہائی کیوں ہے؟'' وہ تشویش سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

''یار ہو جاتا ہے کبھی کبھی ہائی...... عمر کا تقاضا ہے جب ڈاکٹروں کو کچھ سمجھ نہ آئے تو وہ بس یونہی کہہ دیتے ہیں کہ ٹینشن ہے پریشانی ہے۔''

''لیکن بابا ڈاکٹر شہریار صحیح کہتے ہیں ایک بار انجیو گرافی کروالیں پتا چل جائے گا کہ وینز......'' وہ باتیں کرتے، کرتے اسپتال سے باہر نکل رہے تھے جب انہوں نے اسے دیکھا وہ ایک اسٹریچر کے پاس جھکی اسٹریچر پر لیٹے مریض سے کچھ کہہ رہی تھی وہ رواحہ کی پوری بات سنے بغیر تیزی سے اس کی طرف بڑھے تھے۔

جاری ہے

آدم سے انسان تک

قانتہ رابعہ

عینی بڑی دلچسپی سے کہانی پڑھنے میں مگن تھی، کہانی بہت دلچسپ موڑ پر تھی، عینی کے بغیر بتائے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے ہی پتا چل رہا تھا کہ ایک دم عینی کا موڈ سخت خراب ہو گیا...... رسالہ پٹخ کر پرے پھینکا اور کمبل میں منہ دے کر لیٹ گئی...... لائٹ آف ہونے میں اور موڈ آف ہونے میں بس چند لمحوں کا فاصلہ تھا...... فروہ...... ہائیں ہائیں کرتی رہ گئی۔



''آپی کیا ہوا......؟ آپی میں پریکٹیکل نوٹ بک تیار کررہی تھی، آپی لائٹ کیوں آف کی ہے؟''

مگر تین چار کے بجائے وہ تین چار ہزار سوال بھی کرتی تو عینی نے چپ ہی رہنا تھا...... اب تو کیا میکا اور کیا سسرال ایک، ایک کو پتا چل گیا تھا کہ عینی بی بی کا موڈ کب خراب ہوتا ہے، کب وہ بولنا بند کرتی ہیں۔

سو اس وقت فروہ جانتی تھی کہ پس منظر بھی وہی مسئلہ ہے اور پیش منظر بھی...... اولاد نہ ہونے کا دکھ...... سات سال، تین ماہ اور پچیس دن کم تو نہیں ہوتے...... پہلے یقینِ کامل تھا کہ شادی کی سالگرہ بعد میں اور بچے کی آمد پہلے ہی ہوگی...... کتنے ہی لوگ اس کے اردگرد بستے تھے جن کا پورا ریکارڈ اس کے پاس موجود تھا...... فائزہ کی شادی کراچی میں ہوئی تھی...... اس کی چچازاد بہن، کہاں چکوال اور کہاں کراچی...... ولیمے کے بعد جب وہ آئی تو ناک پر دوپٹا رکھا ہوا تھا...... ہر چیز میں بساند سے طبیعت کی خرابی کی کارونا روتے، روتے واپس چلی گئی اور شادی کے آٹھ ماہ چار دن کے بعد گل تھوتھنے سے صاحبزادے کی اماں بن چکی تھی۔

اس کی کلاس فیلو ملاحت آخری پیپر دے کر گھر پہنچی تو مایوں مہندی کی تیاریاں تھیں...... بی ایس سی کا رزلٹ آیا تو دوسرا رزلٹ بھی مل چکا تھا...... یعنی پازیٹو رپورٹ والا......

اللہ...... دو ماہ سے دو سال گزر گئے مگر کوئی دل خوش کن خبر نہ تھی...... شادی کے تیسرے سال یقینِ کامل، یقین پھر چوتھے سال آس' امید اور ساتویں سال مایوسی، محرومی، ڈپریشن میں بدل گیا۔

بن پوچھے ہی فروہ جانتی تھی کہ کہانی میں موضوع وہی ہوگا...... بے اولادی...... یا بانجھ پن......

فروہ سوائے دعا اور کندھے اچکانے کے کیا کرسکتی تھی...... اس نے دل ہی دل میں اس کے لیے دعا مانگی اور پریکٹیکل نوٹ بک بنانے کے...... اپنے پروگرام پر فاتحہ پڑھ کر وہ بھی لیٹ گئی۔ کبھی کبھار عینی کی سسکیوں اور ہچکیوں سے آنکھ کھل جاتی تو دل بڑا خراب ہوتا۔

فروہ فجر کی نماز کے لیے اٹھی تو عینی کی سوجی آنکھیں، بھاری آواز شبِ گزشتہ کی روداد سنا رہی تھیں۔ تھی تو وہ چھوٹی لیکن ہمت کر کے اس نے عینی سے کہہ ہی دیا۔

''عینی آپی آپ کسی کا بچہ ایڈاپٹ کرلیں۔''

''وہ کیوں...... نہیں...... بالکل نہیں۔ اگر خدا مجھے دینا نہیں چاہتا تو میں کسی سے بھیک کیوں لوں......'' اس نے فروہ کا فقرہ کاٹتے ہوئے کہا۔

''عینی آپی، اس طرح تو آپ نفسیاتی مریضہ بن جائیں گی، دنیا میں بہت سے لوگوں کی اولاد نہیں ہوتی، وہ ایسے روگ تو نہیں لگاتے جیسے آپ نے لگالیا ہے۔ کہیں جاتی ہیں نہ کسی کو بلاتی ہیں۔ آپ ایسے نہ کریں، اللہ جی آپ سے ناراض ہو جائیں گے۔''

''تو اب کون سا راضی ہیں۔'' جلے کٹے لہجے میں عینی نے کہا۔

''عینی آپی......'' فروہ نے قدرے غصے سے کہا۔ ''اللہ جی اتنی جلدی کسی سے ناراض نہیں ہوتے۔''

''اگر راضی ہیں تو میری مراد پوری کریں، میری دعائیں قبول کریں، مجھے بچے دیں، ایک دو تین چار...... بھلے ہر سال دیں، جڑواں دیں، تڑوا دیں۔ دیں تو سہی...... دیں تو سہی۔'' عینی بلک رہی تھی، رو رہی تھی ہسٹریا کی مریض بن گئی تھی۔ روتے' چیختے بے دم ہوکر بے ہوش ہوکر گر گئی تھی۔

☆☆☆

ہواؤں کی سختی، نرمی اور لطافت میں بدل گئی...... آگ اگلتا قہر برساتا سورج دھوپ چھاؤں کے کھیل میں مگن تھا...... ہر چیز عینی کو اٹکھیلیاں کرتی محسوس ہورہی تھی...... پتے جھولتے تو عینی بھی سبحان اللہ، سبحان اللہ کہہ کر جھومنے لگ جاتی...... کوئل کوکتی تو عینی بھی اللہ ہو، اللہ ہو کے ترانے شروع کردیتی...... اس کی زندگی سے خزاں رخصت ہوگئی تھی۔ بہار...... سدا بہار بن کر اس کی زندگی کو گل و گلزار کرچکی تھی۔

ناممکن، ممکن ہوگیا...... دعائیں قبول ہوگئیں اسے مستجاب الدعوات ہونے کا شرف مل گیا تھا۔

اِدھر سورج طلوع ہوتے وقت جھلک دکھاتا اُدھر غروب ہوجاتا...... دن اتنی تیزی سے گزر رہے تھے کہ اسے حیرانی ہوتی۔ پچھلے سال اسی موسم میں یہ دن کاٹے نہ کٹتے تھے...... لگتا تھا گھڑی کی سوئیاں اس کے غم میں ساکت ہوچکی ہیں، وقت کی رفتار مدھم ہوچکی ہے...... کوئل کے ترانوں میں بھی اسے آنسوؤں کی نمی محسوس ہوتی...... ''کیا ایک ہستی کی آمد کی خبر سے کائنات کی ہر چیز متاثر ہوجاتی ہے۔'' اپنے سوال کا جواب، ہاں میں پاکر وہ دانتوں تلے انگلی دبالیتی اور حیرانی سے کہتی ''واقعی......؟''

جب شادی کو ساڑھے آٹھ سال پورے ہوئے تو عبدالحنان سب کے دلوں کا محبوب بن کر اس کی گود میں آچکا تھا۔ پیمپی، فیڈر سے لے کر کان صاف کرنے والی، کاٹن بڈز تک اور ویٹ ٹشوز سے باکسنگ کریڈل پرام تک بچے کی آمد سے پہلے موجود تھے۔

آنے والے آتے، تحفے تحائف سے زیادہ خوشیوں بھرے کھنکتے لہجوں کے ساتھ، عینی نے بھی کمی نہیں چھوڑی، دونوں ہاتھوں سے لٹایا...... اگر مائیوں، دائیوں کو بے بہا دیا، مٹھی چاپی کرنے والوں کو مالا مال کیا تو بہنیں، بھانجیاں، بھابھیاں، بھتیجیاں، نندیں، دیورانیاں، جیٹھانیاں بھی اس کے قیمتی تحائف سے لدی پھندی واپس گئیں...... بچہ دو اڑھائی ماہ کا ہوا تو اس نے دوسروں کو پکڑانا شروع کیا...... وجہ دوسروں پر عدم اعتماد نہیں بلکہ وہ جان لیوا تکلیف تھی جس میں بچے کی پیدائش کے بعد وہ مبتلا رہی...... ویسے تو ہر عورت کا ہی دورانِ زچگی کفن سرہانے کے نیچے دھرا ہوتا ہے۔ ہر عورت ہی اوپر سے ہوکر نیچے آتی ہے اور بچے کو جنم دیتی ہے۔ لیکن

عینی کے ساتھ کچھ نہیں سب کچھ انوکھا ہوا...... حکم ربی ہوتو اناڑی بھی بہترین کارکردگی کا سرٹیفکیٹ لے سکتے ہیں...... بس ایک چھوٹی سی غلطی سے کیس بگڑ گیا اور آپریشن کے دوران اس کے جسم نے بے قابو ہوکر ہر بند مسام سے نکلنا چاہا......

تین دن زندگی اور موت کی کشمکش میں رہنے کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں ...... موندلیں ...... پھر کھولیں...... دائیں بائیں دیکھ کر بند کرلیں...... تیسری دفعہ آنکھیں کھلیں تو سرجن کے الفاظ اس کے کانوں میں سنائی دیے۔

''اب یہ مکمل طور پر ہوش میں ہیں...... اللہ نے انہیں نئی زندگی عطا کی ہے۔''

سو، عینی کی بھی نئی زندگی تھی اور اس کے بچے عبدالحنان کی بھی...... ابھی اس نے ڈھنگ سے پیمی لگانا، فیڈر بنانا نہ سیکھا تھا کہ ایک اور ذی روح کی خبر مل گئی...... ارے اتنی جلدی...... ؟ ابھی تو حنان ساڑھے چار ماہ کا ہوا ہے۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا...... لیکن اس نے آنے والے مہمان کو بھی بہت گرمجوشی سے خوش آمدید کہا...... تاہم وہ خود جانتی تھی کہ اس دفعہ کے احساسات، کیفیات اور جذبات میں وہ شدت نہیں جو پہلی دفعہ تھی۔ پہلے بچے کی دفعہ تو وہ دن میں دس دفعہ آنے والے کی شکل، صورت اور ناموں کا سوچتی تھی...... لڑکا ہوا تو کون، کون سے نام زیرِغور ہوں گے اور لڑکی ہونے کی صورت میں کون سے نام...... عقیقے کی رسم پر کس، کس کو مدعو کرنا ہے، کس، کس کو فون کرکے خود خوشخبری دینی ہے کن لوگوں کے ہاں مٹھائی بھجوانا ہے۔

اس دفعہ باقی سب باتیں تو دور کی بات یہ بھی نہ سوچا گیا کہ بیٹا ہوگا یا بیٹی...... سارا دن حنان کے چھوٹے، چھوٹے کاموں میں بھی گزر جاتا...... اپنا ہی ہوش نہ رہا...... سوتے میں بھی جاگتی رہی اور جاگتے میں بھی سوئی ہوئی پائی جاتی...... ایک وجود کو پال رہی تھی دوسرا پل رہا تھا...... زندگی تن آسانی سے مشقت کی پُرخار راہوں میں چل نکلی تھی...... لیکن جتنی بھی تنگی ہو، جتنی بھی مشقت ہو، خواہ کتنی ہی نیندیں اور آرام تج دینا پڑے ایک سوچ، ایک خیال ایک امید چہرہ پُرنور کردیتی...... جنت ایسے ہی تو پاؤں کے نیچے نہیں آجاتی ناں...... پھر سے تازہ دم ہوجاتی...... اور...

شکر خدا کا اس دفعہ حالات قابو میں رہے عبدالحنان کی چھ ساڑھے چھ پونڈ وزن کی بہن دنیا میں آئی تو وہ ہوش وحواس میں ہی تھی اوپر والے کا کرم ہی کرم رہا کہ وہ پچھلی دفعہ جن حالات سے گزری تھی اس دفعہ اس کا عشرِعشیر بھی نہ تھا۔

بیٹے کے بعد بیٹی کی محبت، چاہت اور مصروفیت نے اسے دنیا و مافیہا سے بیگانہ کردیا تھا...... جڑواں بچے ہوں تو دنیا والے تعاون کی...... ہی پیشکش کردیتے ہیں لیکن کون جانے ایک سال میں پیدا ہونے والے دو بچے پالنا جڑواں بچوں سے کتنا مشکل ہوتا ہے۔

ویسے بھی بچے اور بچی ہر دو کی عادات میں بہت فرق تھا...... ایک ہر وقت فیڈر کی طلب میں رہتا، دوسری فیڈر کو منہ میں لینا گوارا نہ کرتی...... ایک کو ہر گھنٹے بعد پمپر، پیمی بدلوانے کی عادت تھی دوسری کئی، کئی گھنٹے گزار لیتی...... ایک روتا تو روئے چلا جاتا، نیلا پڑ جاتا دوسری رونے کے لیے منہ کھولتی اور گدگدی پر کھلکھلانے لگ جاتی۔ بس وہ تو انہی دو بچوں کی ہوکر رہ گئی۔ ساس قریبی گلی میں رہتی تھیں، میکا چند منٹ کے فاصلے پر تھا لیکن کئی، کئی ہفتے بیت جاتے وہ گھر سے قدم نہ نکال پاتی...... بیٹی کا نام اس نے امیمہ رکھا تھا...... امیمہ کو کئی دن سے سینے میں انفیکشن تھا...... بلغم، کھانسی، بخار نے چڑچڑاہٹ طاری کردی تھی۔ ہر وقت ریں، ریں کرتی اور کندھے سے جڑی رہتی...... خود عینی کی اپنی حالت شاید جاگ، جاگ کر بہت خراب ہوچکی تھی...... بیماری کی وجہ سے بچی بار، بار فیڈ مانگتی اور بار، بار دودھ پلانے کی وجہ سے کندھے پھوڑے کی طرح

دکھ رہے تھے...... کئی دفعہ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا آیا...... اللہ نے مہربانی کی کہ گرتے، گرتے بچی...... جب بالکل ہی تھک کر بے دم ہوگئی تو ڈاکٹر کے کلینک کا رخ کیا...... ڈاکٹر نے بچی کو خوب اچھی طرح چیک کیا...... انجیکشن لگایا، اینٹی بایوٹک سیرپ تجویز کیا...... نسخہ لکھتے، لکھتے ڈاکٹر نے ایک دم قلم روک کر پرے رکھ دیا اور عینی کو بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''بی بی آپ نے خود اپنا چیک اپ کروایا ہے؟ آپ کی تو اپنی حالت قابلِ ترس ہے۔''

عینی کو ہمدردی میں ڈوبا یہ فقرہ بھی طنزیہ لگا...... اس کا دل بھر آیا۔ آنکھوں کے کونے گیلے ہوگئے، اس نے ہمت کرکے اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''نہیں، مجھے تھکاوٹ، نیند کی کمی ہے، بچے رات کو جگاتے ہیں، دن میں نیند پوری نہیں ہوتی۔''

''میرا خیال ہے آپ کسی لیڈی ڈاکٹر سے ٹریٹمنٹ لیں اور ضرور لیں، آپ کا رنگ کسی طرح بھی صحت مندوں والا نہیں ہے...... ہوسکے تو اپنا ایچ بی چیک کروائیں ضرور......'' بچی کی دوا کا نسخہ پکڑ کر وہ کلینک سے نکلی...... پتا نہیں کیوں دل میں آیا کہ اپنا چیک اپ کروالے...... کوئی ملٹی وٹامن، آئرن، کیلشیم ہی لکھ دے گی۔ لینے میں کیا حرج ہے؟ سامنے والی سڑک پر پڑے سے عائشہ اسپتال میں داخل ہوتے وقت اسے قطعی علم نہیں تھا کہ کون سی روح فرسا خبر اس کی منتظر ہے...... بچی کی پیدائش کے بعد اس نے حفظِ ماتقدم، احتیاطی بندوبست کیے ہوئے تھے گو کہ اس کے بعد مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا تاہم وہ مطمئن تھی۔ ایک دو سوال کرنے کے بعد ڈاکٹر نے آنکھیں بلکہ آنکھوں کے پپوٹے چیک کیے ایک دو ٹیسٹ لکھ کر دیے...... اور نیکسٹ کے لیے بیل بجادی......

تھکے، تھکے قدموں سے عینی نے اپنا بلڈ اور یورین لیبارٹری میں دیا...... بچی پرام میں سو رہی تھی...... شاید انجیکشن میں خواب آور دوا شامل تھی...... ڈاکٹر کے کمرے میں بند لفافے میں رپورٹ لے کر داخل ہوئی تو اتفاق سے مریضہ کے طور پر اب وہی تھی...... اس نے بغیر کہے رپورٹ ڈاکٹر کے آگے رکھ دی۔

''ہوں...... ہوں...... مجھے پہلے ہی شک تھا کہ آپ پریگنینٹ ہیں۔'' ڈاکٹر نے رپورٹ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

زمین و آسمان یکجا ہوکر دھماکے سے الگ ہوگئے۔

''ک...... کیا......'' گھٹی، گھٹی آواز میں عینی نے کہا۔ آنسو بھل، بھل تیز رفتار چشمے کے پانی کی طرح آپوں آپ بہنے لگے۔

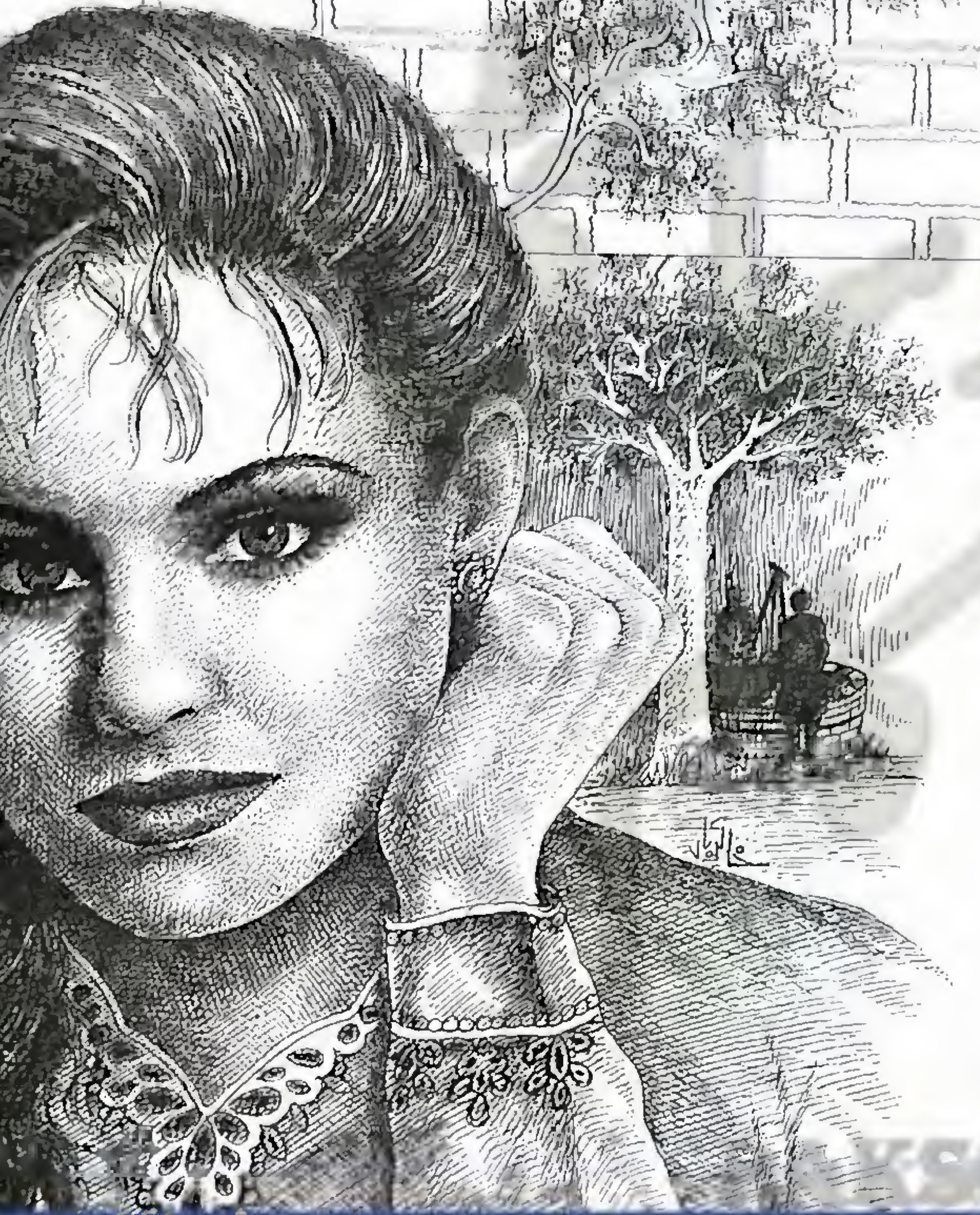
''ناٹھیک ہے...... آپ کو اصل میں بچی کی فیڈ بھی اب چھڑوا دینی چاہیے، فریش جوسز، مٹن، دودھ کا استعمال......'' عینی شاید بہری ہوگئی تھی...... اس کو ڈاکٹر کا کہا کوئی لفظ نہیں سنائی دے رہا تھا...... اگر سن بھی رہی تھی تو صرف ایک فقرہ...... ایک جملہ...... ''آپ پریگنینٹ ہوگئی ہیں۔''

''ابھی نہیں ڈاکٹر صاحب......'' بہت دیر کے بعد اس کے منہ سے فقرہ برآمد ہو...... ''بچے بہت چھوٹے ہیں میرے......''

وہ روئے جارہی تھی، روئے جارہی تھی۔ وہ نہ تو ناشکری تھی نہ ہی بچے سے انکاری...... بس ایک دے، دو دے، تین دے، چاہے ہر سال دے...... کہتے ہوئے یہ ذہن میں نہیں رہا تھا کہ آدم کو جنت میں بھی آدم ہی کہا جاتا تھا...... ترکِ اولیٰ ہوا ضعف کا شکار ہوگئے درخت کو ہاتھ لگا بیٹھے تو انسان کہلوائے، تھے تو آدم ہی......

آج عینی نے بھی آدمیت سے انسانیت کا سفر طے کرلیا تھا۔ اوپر فرشتے ایک دوسرے کو دیکھ کر کہہ رہے ہوں گے۔

''لو ایک اور...... انسان......''



چھٹا حصہ

متاعِ دل

نبیلہ ابر راجہ

ایک قیامت خیز انتظار کے بعد لیبر روم کا دروازہ کھلا اور سب سے پہلے نرسز اور اس کے پیچھے ڈاکٹر باہر آئی...... شیریں بے تابی سے ان کی سمت بڑھیں...... ان کے پیچھے دُرِ یکتا اور فوزیہ تھیں۔

''مبارک ہو...... آپ کی بیٹی نے خوب صورت اور صحت مند بیٹے کو جنم دیا ہے مگر ابھی ان کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہے۔ فی الحال آپ انتظار کریں جیسے ہی اس کی حالت سنبھلتی ہے آپ اُن سے مل لیجیے گا۔

ہاں آپ بے بی کو دیکھ سکتی ہیں۔'' وہ انہیں بتا کے دوبارہ لیبر روم کی طرف بڑھ گئی۔ شیریں کا جگمگاتا پُرامید چہرہ پھر سے بجھ گیا۔ وہ برسوں کی بیمار نظر آنے لگیں اور پھر سے ماضی میں پہنچ گئیں جب عمر زیب کی پہلی بیوی عائلہ نے درد اور کرب کے سمندر کو عبور کر کے ایک بیٹی کو جنم دیا تھا اور خود داعیِ اجل کو لبیک کہہ گئی تھی۔ اس کی دفعہ بھی ڈاکٹر نے یہی کہا تھا کہ اللہ نے بہت پیاری بیٹی دی ہے مگر ہم عائلہ کو نہیں بچا سکے۔

شیریں کو یوں لگا جیسے یہ الفاظ معمولی سی تبدیلی کے ساتھ ابھی ابھی اس کے کانوں میں کسی نے کہے ہوں...... '' مبارک ہو۔ اللہ نے بہت پیارا بیٹا دیا ہے...... مگر ہم مائرہ کو نہیں بچا سکے......'' اُف ان کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں مسلا...... وہ کاریڈور میں ہی سجدے میں گر گئیں۔

''اے اللہ۔ میری مائرہ کو سلامت رکھنا...... اسے زندہ رکھنا...... اسے بھی زندگی دینا۔'' یہ ایک بے قرار ماں کے سینے سے نکلی ہوئی پکار تھی۔ اس پکار میں درد تھا، اضطراب تھا، آہیں تھی، آنسو تھے، جو عرشِ خداوندی سے ٹکرا رہے تھے۔ مائرہ کی اکھڑی سانسیں رفتہ، رفتہ معمول پر آنے لگیں۔ شیریں کی دعا، ایک بے قرار ماں کے دل کی دعا رب نے سن لی تھی۔

مائرہ کی بے ہوشی رفتہ، رفتہ ٹوٹنے لگی۔ دھند میں ڈوبا ذہن بیدار ہونے لگا۔ آہستہ، آہستہ اس کی آنکھیں کھلیں...... ڈاکٹر اس کے پاس ہی کھڑی تھی۔ مائرہ کو آنکھیں کھولتے دیکھ کر اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ یہ پیاری سی لڑکی جو پہلی بار ماں بنی تھی۔ اس کا کیس بہت پیچیدہ تھا۔ ایک بار تو نرس اور ڈاکٹر بھی گھبرا گئی تھیں جو مائرہ کے کیس کو ڈیل کر رہی تھیں۔ مائرہ نئی زندگی کو وجود میں لاتے ہوئے اوھ موئی ہوئی جا رہی تھی۔ اس کی سانسیں اکھڑ گئی تھیں لیکن خدا نے کرم کیا تھا۔ مائرہ کو مکمل طور پر ہوش آ گیا تھا۔ اب وہ خطرے سے باہر تھی۔

☆☆☆

شیریں بے تابی سے اندر مائرہ کی طرف بھاگی...... فوزیہ اور دُرِ یکتا اس کے پیچھے، پیچھے تھیں۔ مائرہ کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی پر وہ ماں کو دیکھ کر مسکرا دی۔ شیریں نے اس کے ماتھے پر جھک کے پیار کیا۔

''میری بیٹی کیسی ہے؟ اب کیسا محسوس کر رہی ہو......؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' مائرہ کی آواز میں نقاہت تھی۔ اتنے میں نرس ننھے منے وجود کو اپنے ہاتھوں میں اٹھائے ان کی طرف بڑھی۔

''بہت ہی خوب صورت بچہ دیا ہے اللہ نے آپ کو...... شکر ادا کریں کہ آپ کی بیٹی اور نواسا بالکل ٹھیک ہیں۔'' نرس نے بچہ شیریں کی طرف بڑھایا۔ اس نے منہ اپنی بیٹی کی طرف پھیر لیا تب دُرِ یکتا نے آگے بڑھ کر بچے کو خود نرس کے ہاتھوں سے لیا۔ نرس کو تائی کے اس بیگانگی بھرے رویے پر زیادہ دیر حیران ہونے کا موقع نہیں ملا...... وہ خوب صورت سی لڑکی، جس نے بچے کو اس کے ہاتھ سے لیا تھا۔ بچے کو چومتے ہوئے روئے جا رہی تھی ساتھ کچھ بول رہی تھی۔ فوزیہ چچی نے تھوڑی دیر بعد بچہ دُرِ یکتا کے ہاتھوں سے لے لیا۔

''ماشاء اللہ بہت خوب صورت ہے، لگتا ہے شاہ زیب نے دوسرا جنم لیا ہے۔ ہو بہو اس کی ہی کاپی ہے۔ بچپن میں شاہ زیب بالکل ایسا ہی تھا۔ دیکھیں تو شیریں بھابی اپنے نواسے کو ذرا......'' فوزیہ نے بچہ ان کی طرف بڑھایا پر انہوں نے ہاتھ آگے نہیں کیے۔

''دُرِ یکتا کو دو اسے...... میں مائرہ کے پاس ہوں...... دیکھ نہیں رہیں وہ موت کی دہلیز کو چھو کے لوٹی ہے۔'' وہ مڑ کے مائرہ کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ فوزیہ نے سمجھ نہ آنے والے انداز میں کندھے اچکائے۔ اتنے میں اسی نرس نے بچہ دوبارہ ان سے لے لیا تھا۔ فوزیہ اور دُرِ یکتا دونوں سائڈ پر آ کے بیٹھ گئیں۔ دُرِ یکتا، تائی شیریں کے رویے کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ انہوں نے نواسے کو دیکھ کے کسی بھی قسم کی خوشی کا اظہار نہیں کیا

تھا۔ لاتعلقی سے مائرہ کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔ دُرِ یکتا ہولے، ہولے رو رہی تھی۔ فوزیہ نے اسے اپنے سے لگا لیا تھا۔

''اب کیوں روتی ہو؟ دیکھو کتنا خوب صورت بیٹا دیا ہے اللہ نے مائرہ کو اور تم پھپھو بن گئی ہو...... عمر بھائی جب دیکھیں گے تو ہو سکتا ہے کہ ان کی ذہنی صحت پر اچھا اثر پڑے...... پر یہ شیریں بھابی کا رویہ میری عقل سے بالاتر ہے۔ نواسے کو دیکھ کر ذرا خوش نہیں ہوئیں۔ ٹھیک ہے مائرہ نے بہت تکلیف اٹھائی ہے پر......'' فوزیہ چچی تاسف زدہ تھیں۔ دُرِ یکتا نے کوئی تبصرہ نہیں کیا...... وہ تو اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی سوچ رہی تھی اگر شاہ زیب بھائی خود زندہ ہوتے تو اپنے بیٹے کو دیکھ کر کتنا خوش ہوتے...... پپا اگر ٹھیک ہوتے تو وہ شاہ زیب کی نشانی کو پا کر اپنے سب دکھ بھول جاتے۔ اس کی زندگی میں کتنے 'اگر' اور کتنے 'کاش' جمع ہو گئے تھے۔

☆☆☆

نرس فیڈ کروانے کے لیے بچے کو مائرہ کے پاس لائی تو اس کے پاس بیٹھی شیریں نے دھیرے سے انکار میں سر ہلایا اور مائرہ کو آنکھوں سے اشارہ کیا۔

''میری بیٹی کی حالت ابھی اس طرح کی نہیں ہے کہ وہ فیڈ کروا سکے۔ آپ اسے فی الحال اوپر کا دودھ ہی دے دیں۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔'' نرس کچھ بولنا چاہ رہی تھی پر شیریں کا دوٹوک انداز دیکھ کر الٹے قدموں لوٹ گئی۔ جب بچے کی ماں کو خود ہی بچے کی پروا نہیں تھی تو اسے کیا پڑی تھی کچھ بتانے کی یا ماں کے دودھ کے فوائد گنوانے کی...... ان بڑے لوگوں کے بڑے کام تھے۔ بڑی، بڑی سوچیں تھیں جو ان جیسے چھوٹے لوگوں سے نہیں ملتی تھیں۔

☆☆☆

نرس کے جانے کے بعد شیریں کچھ بڑبڑانے لگیں۔

''ارے جسے دیکھو سر پر چڑھا آ رہا ہے بچے کا...... اب تم نے پہلے ہی اتنی تکلیف اٹھائی ہے، اب بچے کو فیڈ بھی کراؤ...... ان اسپتال والوں کو تو کسی پر بھی رحم نہیں آتا۔ انسان ہی نہیں ہے کوئی ان کی نظر میں...... اب تم بھی بے وقوفی میں آ کے خود فیڈ کروانا شروع نہ کر دینا۔ اب اس دُرِ یکتا کو ہی دیکھ لو۔ ماں پیدا کرتے ہی مر گئی تھی تو کیا اسے ماں کا دودھ ملا تھا۔ فیڈر پی کے بڑی ہوئی۔ اب بھرپور جوان اور صحت مند ہے۔ بچے کو ماں جب اپنا دودھ پلاتی ہے تو بچے کی محبت ماں سے بڑھ جاتی ہے۔ کل کو جدائی اور دوری کا شاعذاب لگنے لگتا ہے۔ اس لیے بچے کو گلے کا ہار مت بناؤ۔ اپنے بارے میں سوچو...... اپنے آنے والے کل کے بارے میں سوچو...... جو مائیں بچوں کے پیچھے اپنی زندگی تباہ کر دیتی ہیں ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ ارے یہ اولاد بڑی خود غرض ہوتی ہے۔ پال پوس کے بڑا کرو تو کسی احسان کو نہیں مانتی۔ خاص طور پر یہ لڑکے تو ماں کو خاطر میں لاتے ہی نہیں ہیں۔'' وہ پتا نہیں کون، کون سی منطق سنا رہی تھیں۔

''تم نے ابھی زندگی کی خوشی دیکھی ہی کہاں...... شادی ہوئی، سال بعد شاہ زیب تمہیں چھوڑ گیا۔ اس کے جانے کے بعد تمہیں ماں بننے کا پتا چلا...... شادی کے ایک سال آٹھ ماہ بعد تم ماں بن گئیں۔ اس عرصے میں کیا خوشی دیکھی یا پائی تم نے؟ کچھ بھی تو نہیں...... ارے عورت کے لیے اس کا شوہر اور اپنا گھر ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ اپنی گزشتہ زندگی بھول جاؤ...... سب کچھ بھول جاؤ۔ صرف اور صرف خود کو یاد رکھو......'' شیریں اپنا فلسفہ اس کے دماغ میں انڈیل رہی تھیں۔ مائرہ سر ہلا رہی تھی۔ شیریں مطمئن تھیں کہ ان کی باتیں مائرہ کی سمجھ میں آ رہی تھیں۔

☆☆☆

عمر حسبِ معمول بیٹھے کسی غیر مرئی شے کو گھور رہے تھے۔ آج وہ بڑ بڑا بھی نہیں رہے تھے۔ کافی دیر سے خاموش تھے۔ مائرہ اسپتال سے گھر آ چکی تھی۔ (ملازمہ زبین نے چھوٹے بچے کو اٹھایا ہوا تھا) مائرہ تو لیٹی ہوئی تھی۔ انہیں آئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی۔ وہ تو آتے ساتھ ہی اپنے کمرے میں گھس گئی تھی۔ شیریں

بھی تھکن کی شکایت کر رہی تھی۔ اس نے زبین کو اشارہ کیا کہ بچے کو یہاں سے لے جاؤ۔ وہ اٹھا کے باہر لے آئی۔ دُرِّ یکتا نے دیکھا تو اسے لے لیا۔ عمر خاموش تھے۔ دُرِّ یکتا خوش فہمی کا شکار تھی کہ شاید پپا، شاہ زیب کے بچے کو دیکھ کے خوش ہو جائیں اور جس طرح فلموں میں ہوتا ہے کہ کوئی حادثہ ایک پل میں ساری زندگی بدل دیتا ہے۔ ہوسکتا ہے اس طرح وہ ایک دم ٹھیک ہو جائیں۔ اسی خوش فہمی اور ڈھیروں توقعات کے ساتھ وہ ننھے سے فرشتے کو لے کر پپا کے پاس آئی۔ جو بالکل گم صم سے تھے۔

''پپا یہ دیکھیں شاہ زیب کا بیٹا......'' اس نے بچے کو ذرا سا اُن کی طرف آگے کیا تا کہ وہ اسے دیکھ سکیں پر وہ اس طرف متوجہ ہی نہیں تھے۔ اسی غیر مرئی نکتے کو گھورتے رہے جس طرح اس کے آنے سے پہلے گھور رہے تھے۔ وہ کچھ دیر پُرامید نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتی رہی کہ شاید خون کی کشش ہی اپنا اثر دکھا جائے پر ایسا کوئی معجزہ نہیں ہوا۔ ہاں البتہ بچے نے کسمسا کے رونا شروع کر دیا۔ اس کی آواز سے عمر زیب کا ارتکاز ٹوٹ گیا تب انہوں نے دُرِّ یکتا اور بچے کی طرف دیکھا پر ان نگاہوں میں شناسائی یا پہچان کی کوئی رمق نہیں تھی۔ بلکہ ان کی آنکھوں میں عجیب سی جارحیت در آئی۔ انہوں نے دُرِّ یکتا کے کچھ سوچنے سمجھنے سے بیشتر تقریباً جھپٹ کے بچے کو اس سے لے لیا۔ دُرِّ یکتا نے گھبرا کر زور سے چیخ ماری۔ اس کے چیخ مارنے کی دیر تھی۔ عمر نے بچے کو وہیں بیڈ پر پٹخا اور خود دُرِّ یکتا کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ بچے نے زور، زور سے چلّانا شروع کر دیا۔ یہ اس کی تکلیف کا اظہار تھا۔ دُرِّ یکتا نے بری طرح چیخیں مارنا شروع کر دیں۔ عمر نے اسے بالوں سے پکڑ لیا اور زور دار جھٹکا دیا۔ باہر سے بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ یہ دوسرے ملازم اور زبین تھے اور ساتھ سائرہ بھی۔ بچے کے رونے کی آواز اور دُرِّ یکتا کی چیخوں میں بے پناہ خوف اور درد تھا۔

دو ملازموں نے آ کر دُرِّ یکتا کو عمر زیب سے چھڑایا اور زبین نے بڑھ کر بری طرح سے روتے بچے کو اٹھایا اور تقریباً بھاگ کے وہاں سے نکلی۔ دُرِّ یکتا کھانس رہی تھی۔ عمر اس کا گلا دباتے رہے تھے۔ اس کی گردن پر نشان سے پڑ گئے تھے۔ کوئی جا کے نوید کو بلا لایا تھا۔ انہوں نے عمر کو انجیکشن لگایا تو وہ پُرسکون ہوئے۔ سائرہ، دریکتا کو دیکھ کے ڈر گئی تھی۔ جب وہ آوازیں سن کے اِدھر آئی تو عمر دُرِّ یکتا کا گلا دبا رہے تھے اور اس کی آنکھیں جیسے باہر کی طرف ابلی پڑ رہی تھیں۔ سائرہ اسے وہاں سے لے آئی۔ دُرِّ یکتا کے حلق میں بہت درد ہو رہا تھا۔ عمر نے تو جیسے سارا غصہ اور طاقت اسی پر صرف کر دی تھی۔

''تمہیں جب پتا ہے کہ عمر چچا کو دورہ پڑتا ہے تو تم ان کے پاس کیوں جاتی ہو۔ میں تو حیران ہوں کہ تم اس کمرے میں رہتی کیسے ہو۔ تمہیں اپنی جان عزیز نہیں......'' سائرہ حیرانی سے اس سے سوال کر رہی تھی۔ دُرِّ یکتا کے چہرے پر ابھی تک تکلیف کے آثار تھے۔

''وہ میرے پاپا ہیں، میں انہیں کیسے چھوڑ سکتی ہوں اور مجھے کیا پتا کہ ان پر دورہ پڑ جائے گا۔ میں تو شاہ زیب بھائی کا بیٹا انہیں دکھانے لے گئی تھی کہ ہوسکتا ہے ان کی ذہنی حالت میں کوئی تبدیلی آ جائے...... پر کیا پتا تھا کہ ایسا ہو گا۔''

''لو پاگلوں کا کیا بھروسا...... کسی وقت بھی کیا کر جائیں۔ تمہیں خود احتیاط کرنی چاہیے۔'' سائرہ نے بڑوں کی طرح نصیحت کی۔ ''ارے ہاں سنا ہے کہ ابو تمہارے سسرال جائیں گے اور خلع کی بات کریں گے کیونکہ ان کا رویّہ بہت خراب ہے۔'' سائرہ نے سنی سنائی بات اس کے سامنے دُہرائی تو دُرِّ یکتا کے سارے اعصاب تن سے گئے۔

''ویسے تمہارا ہزبینڈ ہے بہت ڈیشنگ...... دیکھنے میں تم سے سات آٹھ سال بڑا لگتا ہے پر اس کی میچورٹی میں بھی بہت اٹریکشن ہے۔ میں نے جھٹ سے دعا مانگ لی کہ مجھے بھی ایسا ہی لائف پارٹنر

ملے...... میں تمہیں بہت لکی کہتی تھی کہ اتنا ڈیشنگ، ہینڈسم ہزبینڈ ہے پر اب افسوس ہوتا ہے کہ وہ تمہیں چھوڑ دے گا۔ میں نے سنا ہے کہ عمر چچا نے خود ان لوگوں کو تمہارے رشتے کا کہا تھا۔'' سائرہ اس کی دلی حالت سے بے خبر اپنی ہانکے جا رہی تھی اور دُرِّ یکتا کو اپنے رخسار احساسِ توہین سے لال ہوتے محسوس ہوئے تھے۔ گویا یہ بات سب کو پتا چل گئی ہے۔ سائرہ اس سے زیادہ بات نہیں کرتی تھی پر ابھی اپنی اس کزن پہ اسے بہت ترس آ رہا تھا جسے اس کا شوہر رخصتی سے پہلے ہی چھوڑنے والا تھا۔ اس بات سے اسے عجیب سی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ شیریں نے کہا تھا کہ اِدھر اشعر لغاری سے خلع ملتے ہی وہ دُرِّ یکتا کو اپنی بہو بنالیں گی۔ عاشر بھائی موٹے، غصیلے چڑچڑے، ذرا ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جانے والے، بھلا دُرِّ یکتا ان کے ساتھ کیسی لگے گی۔ وہ اکثر یہ تصور کرتی...... امی نے سختی سے منع کیا ہوا تھا کہ اس بات کا ذکر کسی سے مت کرنا ورنہ فوزیہ اور فرح چچی کا مزاج بگڑ جائے گا۔ وہ اسی امید پر اپنا کوئی حصہ نہیں مانگ رہیں کہ اورنگزیب، دُرِّ یکتا کو خلع دلوا کے ان کے بیٹے کے ساتھ شادی کروائیں گے۔ انہوں نے دونوں بھائی، بھابیوں کو الگ، الگ یہ بات کہی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے قاسم یا امجد میں سے دُرِّ یکتا جس کی بھی بیوی بن جاتی اس کے وارے نیارے ہو جاتے۔ باقی کا حصہ اورنگزیب کا تھا آخر وہ بھی تو عمر کے بھائی تھے۔ کچھ برا تو نہیں سوچ رہے تھے۔ دُرِّ یکتا کی شادی اگر اپنے خاندان میں ہی ہو جاتی تو اس میں کیا برائی تھی۔ آخر کو اپنے تھے۔ خاندان کی جائداد بھی خاندان میں رہ جاتی۔

نوید اس دوڑ سے باہر ہو چکے تھے۔ امجد نے صاف کہہ دیا تھا کہ دُرِّ یکتا اس کے لیے بہن جیسی ہے۔ ''میں کبھی اس سے شادی نہیں کروں گا۔'' وہ اس بات پر ماں، باپ سے لڑا بھی تھا۔ ''آپ کی سوچ کیسی ہے ایک بیٹی کی سازشوں سے خلع کروائیں گے اس سے آپ کو کیا ملے گا۔ میری بھی دو بہنیں ہیں، کل کو ان کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوسکتا ہے۔''

اس کے سمجھانے کا اثر کافی خوشگوار تھا۔ نوید باز آ گئے تھے ان کا ضمیر بیدار تھا انہوں نے اورنگزیب بھائی سے بھی صاف کہہ دیا تھا کہ مجھے عمر بھائی کی دولت میں سے کچھ نہیں چاہیے سو انہوں نے خاموشی اختیار کر لی تھی اور باقیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

اورنگزیب تو خوش تھے کہ دُرِّ یکتا کے امیدواروں میں سے ایک کی کمی ہو گئی تھی۔ باقی قاسم رہ گیا تھا۔ انہوں نے بالا ہی بالا خلع کے بعد اپنے بیٹے عاشر کے ساتھ دُرِّ یکتا کے نکاح کا پلان بھی مکمل کر لیا تھا۔

نکاح کے بعد کسی نے کیا بگاڑ لینا تھا۔

عمر زیب نے دُرِّ یکتا کا نکاح خاندان سے باہر اپنے دوست کے بیٹے کے ساتھ کیا تھا۔ عمر کا فیصلہ کسی کو بھی پسند نہیں آیا تھا۔ اس ناپسندیدگی میں اورنگزیب بھی شامل تھے۔ وہ کوئی برا تو نہیں کر رہے تھے اگر دُرِّ یکتا کی شادی پھر سے خاندان میں کرنے کی سوچ رہے تھے تو...... آخر انہوں نے بھی تو مائرہ کی شادی خاندان میں کی تھی۔ پھر عمر کیوں خاندانی روایات سے بغاوت پر اتر اتھا۔ اس بغاوت کی سزا اسے ملنا ضروری تھی۔

شیریں کے دل میں زہر بھرا تھا اور نگزیب ان کی ہر بات مانتے تھے اب نہ عائلہ رہی تھی اور نہ عمر پہلے جیسا ہوش مند رہا تھا پر شیریں کے دل میں وہی رنجش تھی کہ عمر نے دوبارا ان کی بہن کو بیٹا کو ٹھکرایا اور اس کی سزا اسے قدرت سے مل رہی تھی۔ (شیریں کے خیال میں)

☆☆☆

زبین روتے دھوتے بچے کو اٹھائے مائرہ کی طرف گئی تو شیریں سے ٹکراؤ ہو گیا۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' ان کی آواز میں کڑک تھی۔

''جی، مائرہ بی بی کی طرف لے کے جا رہی ہوں۔ یہ بہت دیر سے رو رہا ہے۔ جب سے سو کے اٹھا ہے روئے جا رہا ہے۔''

''تو مائرہ کیا کرے گی، یہ رو رہا ہے تو...... جا کے دُرِّ یکتا کے حوالے کرو...... اور تم نہیں سنبھال سکتیں

چھنانک بھر کے بچے کو...... جھٹ مائرہ کی طرف بھاگتی ہو۔'' شیریں نے چٹاخ سے ایک تھپڑ زیبن کے منہ پر جڑا...... تو اپنی جھونک میں وہ لڑکھڑا سی گئی۔'' نمک حرام کس بات کے پیسے لیتی ہے۔ اسے سنبھالنا تمہاری ذمے داری ہے اور اس کی پھوپی بھی یہیں ہے۔ اس کا بھی کچھ فرض بنتا ہے۔ جب دیکھو مائرہ کے سر پر سوار ہو جاتی ہو۔ جاؤ اسے فیڈر بنا کے دو...... بھوکا ہوگا یہ اسی لیے رو رہا ہے، جاؤ شاباش۔'' آخر میں شیریں نے خود ہی لہجہ نرم کرلیا تو زیبن کی جان میں جان آگئی۔ ورنہ وہ تھپڑ کھا کے سہم گئی تھی۔

ابھی تک بچے کا نام نہیں رکھا گیا تھا اور نہ ہی کسی نے دلچسپی لی تھی۔ مُوتریکا نے خود ہی اسے طیب کہہ کے بلانا شروع کردیا تھا۔ آخر بچے کا کوئی نام ہونا تو ضروری تھا۔ زیبن کے لیے بھی آسانی ہوگئی تھی۔ اب وہ روتا تو وہ مُوتریکا کے پاس آ کے کہتی کہ طیب رو رہا ہے۔ یہ کررہا ہے، وہ کررہا ہے۔ وہ روتا بھی تو بہت زیادہ تھا۔ جیسے چیخ، چیخ کے ماں کی بے رخی کا احتجاج کررہا ہو۔ جس نے ابھی تک اسے غور سے دیکھا تک نہیں تھا۔ شروع میں اسپتال سے آنے کے بعد کچھ دن طیب، مائرہ کے کمرے میں ہی سویا۔ ساتھ زیبن بھی ہوتی۔ چار دن بعد شیریں نے حکم صادر کردیا کہ طیب کو مائرہ کے پاس سے لے جاؤ۔ زیبن کو مائرہ کے برابر والا کمرا دے دیا گیا۔ اب وہ طیب کے رونے پر پہلے کی طرح مائرہ کی طرف نہیں بھاگتی تھی۔ خود ہی شانے سے لگائے تھپکتی یا پھر مُوتریکا کو بتاتی۔ وہ اسے مائرہ بی بی کی طرح جھڑکتی نہیں تھی بلکہ طیب کو اس کی گود سے لے لیتی اور حیرت انگیز طور پر طیب اس کے پاس جاتے ہی اس کے سینے سے لگ کے خاموش ہو جاتا اور زیبن کو تھوڑی دیر کمر سیدھی کرنے کا ٹائم مل جاتا۔

☆☆☆

بینا اسے سینے سے لگائے کتنی دیر اپنی ممتا اس پر نثار کرتی رہی۔ باسط آ گیا تھا، اس بار وہ کچھ دیر سے آیا تھا۔ اس لیے بینا بے قرار سی تھی۔

''اس بار بڑے دن لگا دیے۔'' وہ اس کا چہرہ ہاتھ میں تھامے دیکھ رہی تھی۔

''امی اب میں نے وہاں اپنا کاروبار شروع کردیا ہے ایک دوست کے ساتھ۔ اس لیے کافی روز بعد آیا ہوں۔ اپنا کاروبار ہے...... سو میری ذمے داری بھی زیادہ ہے۔''

''اللہ تمہیں اور ترقی اور کامیابی دے۔ خیر بیٹھو میں خود اپنے ہاتھوں سے تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔'' بینا جانے لگی تھی۔ باسط نے روک لیا۔

''امی اس وقت کسی چیز کا بھی دل نہیں ہے...... میرے پاس بیٹھیں کچھ دیر......'' وہ اسے نثار ہوجانے والی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں حمزہ احمد بھی چلے آئے اور باسط کے باقی بھائی بہن بھی اس کے گرد جمع ہوگئے۔ اس نے سب کو ان کے لیے لائے ہوئے تحفے دیے۔

''امی اب میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ دو گھنٹے بعد مجھے جگا دیجیے گا۔ یہاں ایک بندے سے ملنا ہے اپنے کام کے سلسلے میں۔'' باسط نے صوفے سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے ایک زوردار انگڑائی لی۔

''ہاں سو جاؤ جا کر...... ارے میں ایک بات بتانا بھول ہی گئی کہ مائرہ کے گھر بیٹا پیدا ہوا ہے۔ بہت خوب صورت اور صحت مند ہے۔ میں ابھی تک اسے دیکھنے جا نہیں پائی ہوں۔ چلو میں اور تم اکٹھے چلیں گے۔'' بینا نے جاتے، جاتے اسے یہ اطلاع دی۔ وہ مائرہ کے گھر بیٹے کی پیدائش کا یوں خوشی، خوشی بتا رہی تھی جیسے باسط بھی خوش ہو جائے گا۔ باسط کے دل میں ناپسندیدگی کی ایک لہر سی اٹھی۔ جسے اس نے مشکل سے دبایا۔

''ہاں امی، ضرور چلیں گے۔'' اتنا کہہ کر وہ کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

''مائرہ کے گھر بیٹا...... شاہ زیب اور اس کی قربتوں، شدتوں، چاہتوں کی یادگار...... جیتی جاگتی نشانی......'' اس نے تکیہ دونوں بازوؤں میں دبا کے

دُہرا کردیا۔ جیسے ساری نفرت، جلن، کڑھن اس تکیے پر نکالنا چاہ رہا ہو......

اب تو مائرہ سے ملنا بہت ضروری تھا۔ بہت ہی ضروری...... اس نے بڑا انتظار کیا تھا اس وقت کا...... اور مائرہ کا پیچھا بھی اس بوجھ سے چھوٹ چکا تھا۔ اب باسط نے اپنی سوچوں کو اپنے خوابوں کو تعبیر کی صورت دینی تھی۔

☆☆☆

اورنگزیب اور ان کے گھر......؟ حیرت کی بات تھی...... ان کے انداز میں کینہ توزی اور جارحیت تو اشعر نے اسی دن محسوس کرلی تھی جب عمرانکل کے آفس میں ان سے ملاقات ہوئی تھی...... اور آج وہی کینہ توزی چہرے پر سجائے وہ ان کے گھر چلے آئے تھے۔ اخلاق کے تقاضے تو پورے کرنے تھے۔ بہرحال ان کے تیوروں سے لگ نہیں رہا تھا کہ وہ کسی اچھی نیت سے ان کے پاس آئے ہیں۔ ملازم نے فوراً ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کے انہیں اندر بٹھایا اور موسم کی مناسبت سے کولڈ ڈرنک اور لوازمات سمیت ان کے آگے لا کے رکھی۔ طاہر لغاری گھر میں ہی تھے اور یہ کیسے ممکن تھا کہ انہیں اورنگزیب کے آنے کی خبر نہ ہو پاتی۔ وہ تو سنتے ہی خوش ہوگئے اور جلد ہی ڈرائنگ روم میں چلے آئے۔

وہ آ کر بڑے خلوص سے اورنگزیب سے بغل گیر ہوئے مگر اورنگزیب کا رویہ قدرے سرد سا تھا۔ بالکل اس کولڈ ڈرنک کی طرح جو اورنگزیب کے سامنے ٹیبل پر رکھی تھی۔ اورنگزیب نے اسے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ طاہر نے خود گلاس ان کی طرف بڑھایا۔

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' انہوں نے گلاس پرے کردیا۔

''کیسے آنا ہوا؟'' طاہر کی خوش مزاجی اورنگزیب کی سردمہری کے باوجود عروج پر تھی۔

''میں بہت ضروری کام سے آیا ہوں...... سوچا تو کچھ اور تھا پر وہ مناسب نہیں لگا سو اس لیے آپ کے گھر پر ہی حاضر ہوگیا۔'' وہ اتنا کہنے کے بعد خاموش ہوگئے...... طاہر بے تابی سے ان کے مزید بولنے کا انتظار کرنے لگے۔

اورنگزیب نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد انہیں حقیقی معنوں میں حیران و پریشان کردیا۔

''میں مُوتریکا کی خلع کے سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔'' وہ یوں کہہ رہے تھے جیسے عام سی بات ہو۔

اشعر کی کنپٹی کی دائیں رگ پھڑکنے لگی جو اس کے شدید غصے کا اظہار تھا۔

''آپ کو معلوم ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' اشعر غصے میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ طاہر نے اس کا بازو پکڑ کر دوبارہ بٹھا دیا۔ انہیں صورت حال کی سنگینی اور اشعر کے غصے کا اچھی طرح پتا تھا۔

''میاں صاحبزادے آرام سے بیٹھو...... آپے سے باہر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود سے

نہیں آیا ہوں اور نہ مجھے اس طرح آنے پر کوئی خوشی ہے۔'' اورنگزیب کا لہجہ اب بالکل ہی بدل گیا۔ صورتِ حال کے مطابق انہوں نے اپنے رویے میں لچک پیدا کرلی تھی۔

''تو پھر آپ کس کے کہنے پر یہاں آئے ہیں؟'' اشعر کے غصے میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔

''میں دُرِیکتا کے کہنے پر..... اس کے زور دینے پر اور مجبور کرنے پر آپ کے پاس آیا ہوں۔ وہ خلع مانگ رہی ہے۔ اپنے شوہر کے ساتھ اس تعلق کو مزید برقرار رکھنا نہیں چاہتی۔ وہ عاقل و بالغ ہے، بااختیار ہے..... کوئی اسے روکنے والا نہیں ہے اور نہ وہ میری سن رہی ہے..... میں نے اپنی اولاد اور اس میں کوئی فرق نہیں رکھا..... اسے پیار سے کہا لاڈ سے کہا کہ یہ اچھا نہیں ہے پر اس کی ایک ہی رٹ ہے کہ اسے خلع چاہیے۔ میں اس پر بے حد شرمندہ ہوں۔ میری ایک بیٹی اور بھی ہے۔ اس کے علاوہ میرے دو بھائیوں کی بھی بیٹیاں ہیں اگر اس خلع کے بدلے آپ ان میں سے جس کا بھی رشتہ طلب کریں میں حاضر ہوں کیونکہ وہ کسی طرح بھی نہیں مان رہی..... اور میں یہاں مجبور ہوں۔'' اورنگزیب کا لہجہ بھرا گیا تھا۔ وہ سچ مچ ایک مجبور باپ نظر آرہے تھے اور جس رعونت سمیت ان کے گھر آئے تھے وہ اب کہیں سے بھی نظر نہیں آرہی تھی۔

طاہر لغاری سر پکڑ کے بیٹھ گئے تھے پر اشعر کے چہرے پر چٹانوں کی سی سختی تھی۔ وہ خاموش ہو کے بیٹھ جانے والوں میں سے نہیں تھا۔

''آپ کو دُرِیکتا نے یہاں میرے پاس بھیجا ہے ناں تو سن لیں اور اسے بھی جا کے بتا دیں کہ میں اسے خلع نہیں دوں گا۔'' اس نے ایک، ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا تو اورنگزیب نے ایک اور کوشش کی۔

''میرے سامنے کی بات ہے وہ تمہارے ساتھ بات تک نہیں کرنا چاہتی۔ جب ایک فریق راضی ہی نہیں ہے تو اس سے بندھن زبردستی جوڑے رکھنے کا کیا فائدہ.....؟''

''مجھے فائدے اور نقصان سے کچھ نہیں لینا دینا..... بس اگر میں نے کہہ دیا ہے کہ میں خلع نہیں دوں گا تو نہیں دوں گا۔''

''تو ٹھیک ہے پھر عدالت میں آ جائیں آپ دونوں.....'' اورنگزیب نے کھڑے ہو کر طاہر لغاری سے کہا اور ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھا دیا پر اشعر نے اپنا ہاتھ آگے نہیں بڑھایا۔ ''میں ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں کہ بات عدالت سے باہر ہی طے ہو جائے کیونکہ اس نے مجھے یہ کہہ کر بھیجا تھا کہ میں فیصلہ کُن جواب لے کر آؤں۔ آپ بھی عزت دار ہیں اور ہم لوگ بھی روایتی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میری طرح طاہر صاحب آپ بھی نہیں چاہیں گے کہ گھر کی باتیں عدالت میں ڈسکس ہوں۔ آپ ماشاء اللہ سمجھدار ہیں، شعر کو بھی سمجھائیں۔''

''مجھے کچھ بھی بتانے یا سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سب سمجھتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ہم عزت اور غیرت کے پیچھے جان دینے والے لوگ ہیں اور دُرِیکتا صاحبہ کو معلوم نہیں ہے کہ اس کا پالا کس شخص سے پڑا ہے۔ بہت جلد سمجھ جائے گی۔ میں خود آؤں گا اسے سمجھانے۔''

طاہر لغاری پریشانی سے کبھی اورنگزیب کو اور کبھی اشعر کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں بہت ساری باتوں کا کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ اس لیے وہ الجھ رہے تھے۔ اشعر نے انہیں اس لیے نہیں بتایا کہ وہ پریشان ہوں گے۔ اب اورنگزیب کے ذریعے انہیں وہ باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ وہ اس سے پوچھنا چاہ رہے تھے کہ دُرِیکتا اور عمر زیب کب آئے ہیں واپس مگر موضوع اس وقت اتنے گمبھیر طریقے سے زیرِ بحث تھا کہ کوئی سوال کر ہی نہیں پا رہے تھے یا انہیں موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔

''اچھا میں چلتا ہوں اگر صلح صفائی سے بات طے ہو جاتی تو اچھا تھا پھر بھی میں انتظار کروں گا آپ کے مثبت جواب کا کیونکہ میں جگ ہنسائی سے بچنا چاہ رہا ہوں۔'' جاتے، جاتے اورنگزیب نے پھر کہا تو اشعر بھڑک گیا۔

''ہماری طرف سے کوئی مثبت جواب نہیں ہے۔ آپ میرے گھر بیٹھ کے میری توہین کر رہے ہیں۔ آپ عمر انکل کے بھائی ہیں، اس ناتے میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔ آپ کی جگہ یہ بات کوئی اور کرتا تو میں اسے شوٹ کر چکا ہوتا۔ بس بہت ہو چکا ہے..... بات عدالت میں جائے یا کہیں اور..... میں اپنی عزت اور انا کی خاطر کچھ بھی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ آئندہ میرے گھر میں دُرِیکتا کے ترجمان بن کے مت آیئے گا اورنگزیب انکل..... ورنہ پھر میں بھی آپ سے کسی اور طرح ملوں گا۔'' اشعر کا لہجہ کسی کمزور دل انسان کے لیے برداشت کرنا مشکل تھا..... اورنگزیب بھی ایک ثانیے کے لیے سوچ میں پڑ گئے..... پھر سر جھٹک کے اس کی طرف دیکھا اور طاہر لغاری سے ہاتھ ملا کے رخصت ہو گئے۔

وہ ابھی تک پریشانی سے نظریں جمائے ڈرائنگ روم کے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جہاں سے ابھی، ابھی اورنگزیب نکل کے گئے تھے۔

''اشعر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ عمر واپس کب آیا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا..... اور دُرِیکتا..... وہ خلع کا مطالبہ کیوں کر رہی ہے۔'' طاہر لغاری حد سے زیادہ پریشانی کا شکار تھے۔

''پپا سب پتا چل جائے گا کہ ایسا ویسا کیوں ہو رہا ہے۔ یہ اورنگزیب انکل جن کو ان محترمہ نے ترجمان بنا کے یہاں بھیجا، در پردہ دھمکی دے رہے تھے عدالت جانے کی۔ میں عدالت سے نہیں ڈرتا۔''

''تم ذرا سکون سے مجھے بات کرنے دو خود دُرِیکتا سے۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔'' طاہر لغاری کو تھوڑی امید کی روشنی نظر آئی۔

''نہیں پپا، آپ کسی سے کوئی بات نہیں کریں گے۔ جو کرنا ہے میں خود کروں گا۔ رشتہ آپ کی مرضی سے طے ہوا ہے اور اسے میں اپنی مرضی سے نبھاؤں گا۔ آپ کسی بات کی فکر مت کریں۔'' وہ ضد کا شکار لگ رہا تھا۔ طاہر لغاری خاموشی سے کچھ سوچنے لگے۔

نظم

گھر، گھر میں
خوشیوں کی شہنائی ہے
عید آئی ہے
میری خاطر
کیا، کیا تجھے لائی ہے
عید آئی ہے
آنسو ہیں
یادیں ہیں
تنہائی ہے
عید آئی ہے

ثمیلہ لطیف، جودھالہ

☆☆☆

جب سے عمر کو شدید دورہ پڑا تھا اس کے بعد نوید چچا نے دُرِیکتا کو اپنا کمرا الگ کرنے کو کہا تھا۔ ان کے سمجھانے اور اپنی حفاظت کے نقطۂ نظر سے تھوڑی سی پس و پیش کے بعد وہ راضی ہو گئی تھی۔ اس کے پپا اب اکیلے ہوتے تھے، دُرِیکتا کو یہ بات پسند تو نہیں تھی پر مجبوری تھی۔ وہ پپا کے ساتھ ایک کمرے میں تھی تو اسے ایک تحفظ کا احساس تھا جو الگ کمرے میں رہنے، سونے سے ختم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اورنگزیب تایا اور شیریں تائی دونوں دُرِیکتا کے ارد گرد موجود تھے۔ انہوں نے آج کی ملاقات، ان کے گھر جانے کی تفصیل زیبِ داستان کے ساتھ شیریں اور دُرِیکتا کو بتائی تھی۔

''دُرِیکتا تم میرے لیے سائرہ اور مائرہ کی طرح ہو..... میں تمہارا برا نہیں سوچ سکتا۔ اشعر ایک کرپٹ پولیس آفیسر ہونے کے ساتھ، ساتھ اخلاقی لحاظ سے

بھی نہایت گیا گزرا انسان ہے۔ آج جب میں ان کے گھر گیا کہ آخر ان کے سرد رویّے کا سبب کیا ہے تو انہوں نے مجھے بہت ذلیل کیا۔ میری تو عقل میں کچھ سما ہی نہیں رہا ہے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ عمر نے آخر یہ غلطی کیوں کی...... اشعر لغاری نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ ملک سے باہر گزارا...... وہ وہاں کیا تھا، کیا کرتا تھا...... کیسے رہتا تھا، کن لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا۔ اس کی سوسائٹی کیسی تھی۔ بھائی عمر کو کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ بس۔۔۔ بیوقوفی کی جو جلدی میں تمہارا نکاح وہاں کروا دیا۔ ان باپ، بیٹے کے ارادے کچھ اور ہی ہیں۔ اب تم بتاؤ میں کیا کروں؟ میں تمہیں تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے صرف تمہاری اجازت درکار ہے۔ کیا میں عدالت میں خلع کی درخواست دائر کروں......؟'' دُرِ یکتا خاموش تھی۔ اس سے شیریں نے دوبارہ پوچھا تو اس نے ہولے سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

''تمہاری بھلائی اور بہتری کے لیے یہ بہت ضروری ہے ورنہ اگر تمہاری مرضی یہ نہیں ہے تو میں تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کروں گا۔ دھوم دھام سے تمہیں رخصت کروں گا بیٹیوں کی طرح......''

''نن نن، نہیں تایا جو آپ کہتے ہیں وہ ہی ٹھیک ہے۔'' یک دم وہ ہڑبڑا سی گئی۔ جیسے اس خیال سے ہی گھبرا گئی ہو...... اشعر کے ساتھ رخصت ہونے کے خیال سے ہی اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ اشعر کا غراہٹ بھرا لہجہ اور جنگلی گرفت اس کی یادداشت میں تازہ تھی۔ اسے کیا پڑی ہے ایک فضول اور کرپٹ شخص کے ساتھ پوری زندگی گزارنے کی۔ تایا جان اس کے بھلے کی ہی بات کر رہے تھے۔ بڑے تھے بہتر جانتے تھے سب کچھ۔

اس کے ساتھ، ساتھ ذہن کے کسی چور گوشے میں کہیں کچھ غلط تو نہیں ہو رہا۔ یہ سوال بھی کھلبلی مچا رہا تھا۔

☆☆☆

شوخ رنگ کی میرون شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس مائرہ نہا کے ابھی ابھی باتھ روم سے باہر نکلی تھی۔ گیلے بال سنوارنے کے بعد اس نے کپڑوں کا ہم رنگ دوپٹا اٹھا کے شانوں پر ڈالا اور خود کو آئینے میں غور سے دیکھا۔ آج کتنے عرصے بعد خود کو یوں دیکھا تھا۔ ورنہ بھدے، بے ڈول سراپے سوجے ہاتھ پاؤں، زرد رخساروں سمیت خود کو دیکھنے سے اسے ڈر لگتا رہا تھا۔ اب نہ تو اس کا سراپا بے ڈول اور بھدا تھا، نہ ہاتھ پاؤں سوجے تھے اور نہ رخسار زرد تھے۔ اس کا جسم پرانی وضع قطع میں واپس آچکا تھا۔ نازک کمر، پیٹ پہلے کی طرح اندر اور اضافی چربی کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ اس نے گھوم، گھوم کے ہر زاویے سے خود کو دیکھا۔ کہیں سے بھی تو کوئی کمی نہیں لگ رہی تھی اور نہ یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے تین ماہ پہلے کسی بچے کو جنم دیا ہے۔ آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے ایک مغرور مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھری۔

باسط ڈرائنگ روم میں آیا بیٹھا تھا۔ مائرہ کو اطلاع مل چکی تھی پر ابھی تک وہ خالہ اور باسط سے جا کے ملی نہیں تھی۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ ان کے سامنے جانا چاہ رہی تھی۔ باسط کی بے تاب نگاہیں اسے ڈھونڈ رہی تھیں۔

وہ پُرغرور چال چلتی خالہ بینا کے سامنے جا رکی اور سلام کیا...... انہوں نے کھڑے ہو کے اس کا ماتھا چوما اور کتنی دیر سینے سے لگائے رکھا۔ مائرہ کو دیکھ، دیکھ کر بینا کا کلیجا جیسے خون ہو جاتا تھا۔ اتنی کم عمری میں مائرہ کو یہ داغ لگ گیا تھا اور ایک بچے کی ماں بھی بن گئی تھی۔ اس کا دکھ بینا دل میں محسوس کرتی تھی۔ میرون کپڑوں میں ملبوس کھلے بالوں اور دھلے دھلائے چہرے کے ساتھ بھلا کون کہہ سکتا تھا کہ یہ ایک بچے کی ماں بھی ہے۔ وہ اور شاہ زیب تقریباً ہم عمر تھے چند ماہ کا ہی فرق تھا۔ وہ بھی اتنی کم عمری میں یہ دنیا چھوڑ گیا اور مائرہ بھی یہ صدمہ برداشت کر گئی۔ ''اب آئندہ کے لیے اسے کوئی دکھ نہ دکھانا میرے رب......'' بینا کے دل سے اس کے لیے دعا نکلی۔ مائرہ، بینا خالہ سے ملنے کے بعد باسط کی طرف متوجہ ہوئی جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ نگاہوں میں شوق و وارفتگی، لگن اور ایک انجانا سا پیغام کتنا واضح تھا۔ اس خاموش پیغام کو مائرہ نے بہت جلد پڑھ لیا تھا۔

''کیسے ہیں باسط آپ...... پاکستان کب آئے؟'' اس کا اندازِ تخاطب بدل چکا تھا۔ باسط کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ مائرہ نے اسے آپ کہہ کر مخاطب کیا۔ اس کی سماعتوں کو دھوکا تو نہیں ہوا تھا۔

''میں تو بالکل ٹھیک ہوں، تم سناؤ کیسی ہو۔'' وہ بہت شگفتہ لہجے میں مخاطب تھا۔ مائرہ، باسط کے ساتھ ہی صوفے پر قدرے فاصلے پر بیٹھ گئی۔ وہ اسی کو دیکھے جا رہا تھا۔

شیریں، بہن کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔''

''ارے مائرہ کا بیٹا کہاں ہے، ابھی تک دیکھا نہیں ہے۔'' بینا کو خود ہی خیال آیا کہ انہیں آئے کافی دیر ہو گئی ہے مگر ابھی تک انہوں نے طیب کو نہیں دیکھا ہے۔

''وہ سو رہا ہوگا، میں زبین سے کہتی ہوں لے آئے۔'' شیریں آواز دینے لگی تھیں کہ بینا نے روک دیا۔

''رہنے دیں آپا جب جاگے گا تب ہی دیکھ لوں گی۔''

''چلو ٹھیک ہے۔'' شیریں نے شکر ادا کیا۔ مائرہ کے بیٹے کے ذکر پہ باسط کا چہرہ عجیب سا ہو گیا جیسے اسے اچھا نہ لگا ہو......

''آپا دُرِ یکتا کیسی ہے؟'' بینا نے جان بوجھ کے عمر کا نام لینے سے گریز کیا۔ ''وہ بھی ٹھیک ہے، کالج گئی ہوئی ہے پر میں آج کل بہت پریشان ہوں۔'' شیریں نے اپنے تاثرات میں تاسف پیدا کر ہی لیا تھا۔

''کیوں، اس کے کالج جانے سے آپ کیوں پریشان ہیں آپا۔'' بینا کو دُرِ یکتا کے کالج جانے اور شیریں کی پریشانی کی وجہ میں کوئی تال میل محسوس نہیں ہوا تھا۔

''ارے یہ کب کہا کہ میں اس کے کالج جانے سے پریشان ہوں۔ بات اصل میں کچھ اور ہے۔'' شیریں نے لہجے میں از حد پُراسراریت بھر لی۔

''کیا بات ہے آپا...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔''

''ارے دُرِ یکتا اپنے شوہر سے خلع مانگ رہی ہے۔'' شیریں اپنی بات کہنے کے بعد اب بینا کے چہرے پر اس کا ردِعمل تلاش کر رہی تھی۔

''نہیں آپا...... ایسا کیسے ہو سکتا ہے، دُرِ یکتا ایسی لگتی تو نہیں اور رخصتی سے پہلے ایسا کیا ہوا ہے جو وہ خلع مانگ رہی ہے؟'' بینا کی نگاہوں میں دُرِ یکتا کا حیران اور معصوم سا چہرہ گھوم گیا۔ جس پر وقت نے ابھی کوئی پختگی تحریر نہیں کی تھی۔ وہ دُرِ یکتا جس کی آنکھوں میں اب اداسی نے ڈیرے ڈال لیے ہیں۔ وہ کیسے اتنی بڑی بات کر سکتی ہے۔

''بس تاریخ اپنے آپ کو دُہرا رہی ہے۔'' شیریں کی آنکھوں میں نفرت تھی۔ انہوں نے یہ جملہ بہت آہستہ آواز میں کہا۔ ''عمر نے کسی کو ٹھکرایا تھا اور آج کوئی اس کی بیٹی کو ٹھکرا رہا ہے۔ عمر نے خود دُرِ یکتا کے رشتے کے لیے اپنے دوست سے کہا تھا اور بیٹی اب خود ہی اپنے منہ سے خلع مانگ رہی ہے۔'' شیریں نے اپنے تئیں جیسے کوئی عظیم انکشاف کیا تھا۔ بینا کو آپا کی یہ باتیں بہت بری لگیں۔ اتنے برس گزر گئے وہ ابھی تک پرانی کڑواہٹوں کو دل میں رکھے ہوئے تھیں۔ شکر تھا کہ باسط نے ان کے وہ جملے نہیں سنے جو آپا نے اس کے اور عمر زیب کے حوالے سے کہے تھے۔ وہ مائرہ کے ساتھ باتوں میں لگا تھا جانے اس پر کیا اثر ہوتا۔ انہوں نے اپنے ماضی کے بدصورت باب کو اپنی اولاد سے پوشیدہ ہی رکھا تھا۔

بینا نے کوئی تبصرہ کرنے سے گریز کیا۔ جانے کیا بات تھی جو بات خلع تک آپہنچی تھی۔

''ویسے آپا آپ کو سمجھانا چاہیے تھا اسے یہ حماقت نہ کرے۔''

''بھئی وہ خود مختار ہے، دولت و جائداد کا غرور ہے، فرح نے اپنے قاسم کے لیے امید لگائی ہوئی ہے کہ خلع ہو جائے تو وہ فائدہ اٹھائے۔ ویسے ایک لحاظ سے ٹھیک ہی ہے۔ ارے وہ دُرِ یکتا کا شوہر کوئی اچھا لڑکا

نہیں ہے۔ پولیس آفیسر ہے اور تمہیں تو پتا ہے کہ پولیس والے کیسے ہوتے ہیں۔ پھر ہمارے خاندان کا بھی نہیں ہے۔ اچھا ہے دُرِّ یکتا کو خلع مل جاتی ہے تو......''

بینا کو آپا شیریں کی پل پل بدلتی باتوں پر حیرت ہو رہی تھی۔ کہاں تو پہلے وہ خوش ہو رہی تھیں اور اب دُرِّ یکتا کو حق بجانب تصور کر رہی تھیں۔ اس نے شکر کیا کہ گفتگو کا موضوع تبدیل ہوا۔

عمر زیب بھی اسی حویلی میں تھے پر بینا کو جرأت نہیں ہوئی کہ انہیں ایک نظر دیکھ سکے۔ سب کہتے تھے وہ پاگل ہو گئے ہیں، دیوانے ہو گئے ہیں۔ شاہ زیب کی موت نے انہیں ہوش سے بیگانہ کر دیا ہے۔ اسے دکھ ہوتا تھا، اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ عمر کو اس طرح اس حال میں دیکھنے کا...... بس دل مسوس کر رہ گئی۔

☆☆☆

باسط اور مائرہ باہر آ گئے تھے۔ باسط پرانی باؤلی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ مائرہ کا کندھا اس کے کندھے سے ٹکرا رہا تھا۔ دونوں اردگرد سے بے خبر تھے۔

''پھر کیا سوچا آئندہ کا......؟'' بہت دیر کی چھائی خاموشی کو باسط نے ہی توڑا۔

''میں کیوں سوچوں آئندہ کا...... جس کا کام ہے وہ سوچے۔'' مائرہ شانے پر آنچل درست کرتی اس سے دور ہو کے بیٹھ گئی۔ ڈوبتے سورج کی الوداعی کرنیں اس کے بالوں اور ماتھے کو بوسہ دے رہی تھیں۔ باسط یک ٹک دیکھے گیا۔ کیا تھا اس چہرے میں...... کیسا سحر تھا اس وجود میں...... جس نے کسی اور طرف دیکھنے ہی نہیں دیا تھا۔ نہ اتنی فرصت دی تھی کہ کسی اور کو سوچے...... وہ پرائی ہو کے بھی پرائی نہیں تھی۔ باسط نے بارہا خوابوں، خیالوں میں اسے اپنے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کی لگن، اس کی چاہت کی شدت میں کچھ ایسا جنون کچھ ایسا خلوص ضرور تھا جو قدرت نے پھر سے باسط کے ساتھ مائرہ کے ملاپ کی راہ ہموار کر دی تھی۔

وہ اپنے جذبے پر نازاں تھا۔ اپنی محبت پر غرور تھا اسے وہ اسے پھر سے حاصل کرنے جا رہا تھا۔ اب کوئی رکاوٹ نہیں تھی جو اسے مائرہ کے ساتھ ہونے سے روک سکتی۔ وہ اس پوزیشن میں تھا کہ سب رکاوٹوں کو عبور کر سکے۔ اب شیریں خالہ کی بھی تو یہی آرزو تھی کہ مائرہ، بینا کی بہو بن جائے۔ وہ اس انتظار میں تھیں کہ بینا کب اپنے منہ سے اس کا اظہار کرتی ہے۔ باسط کما رہا تھا اور اچھا خاصا کما رہا تھا۔ اس عمر میں ہی کماؤ پوت بن گیا تھا۔ جب لڑکے اپنے مستقبل کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔

''میں سوچ تو رہا ہوں۔''

''کیا......؟'' مائرہ بے تابی سے بولی۔

''وہی جو مجھے کرنا چاہیے اس بار میں اسی لیے آیا ہوں۔'' باسط نے واضح اشارہ دے دیا۔

مائرہ کا چہرہ کھل اٹھا۔

''اب میرے پاس سب کچھ ہے، تمہیں حاصل کر سکتا ہوں۔'' اپنی خوشی میں مائرہ کو باسط کی حقارت بھری نظر کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔

''اب تو شیریں خالہ انکار بھی نہیں کریں گی بلکہ شکر کریں گی۔ کیوں، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟'' باسط اس کی طرف جھکا۔ مائرہ انکار ہی نہیں کر سکی۔ بے بسی سے زمین کو تکنے لگی۔

آج باسط نے اپنی فتح کی طرف پہلا قدم بڑھا دیا تھا۔

مائرہ اب ناقابلِ حصول نہیں رہی تھی۔ ایک بچے کی ماں، جوان بیوہ، داغ لگا چاند...... باسط کا جی چاہ رہا تھا زور، زور سے قہقہے لگائے، اس کا پورا چہرہ ہلکی سی مسکراہٹ سے روشن تھا۔

☆☆☆

ننھا طیب بہت بے چین تھا۔ زبین سے چپ ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ اسے کندھے سے لگائے ٹہل ٹہل کے تھک گئی تھی۔ دُرِّ یکتا اسائنمنٹ بنا رہی تھی۔ رات کو اسے پڑھنے میں آسانی ہوتی تھی۔ بچے کے رونے کی آواز اسے یہاں تک آ رہی تھی۔ اس نے پین بند کر کے رکھ دیا۔ اسے اس کے رونے سے عجیب سی بے قراری ہو رہی تھی۔

اس نے بڑھ کر زبین کے ہاتھوں سے طیب کو لے لیا تو اس نے سکون کی سانس لی۔ وہ شل سی ہو رہی تھی۔

''زبین یہ کیوں رو رہا ہے اتنا زیادہ......؟''

''چھوٹی بی بی اس کو بخار ہے ساتھ موشن بھی لگے ہوئے ہیں۔''

''تو کوئی اسے ڈاکٹر کے پاس لے کے نہیں گیا......؟'' دُرِّ یکتا اب بچے کو تھپک رہی تھی۔

''میں نے شیریں بی بی سے کہا کہ طیب کو بخار ہے انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا کہ میں کوئی ڈاکٹر ہوں جو مجھے بتا رہی ہو۔ کوئی دوا دے دو...... تو فریج میں جو ایک سیرپ پڑا تھا وہ میں نے دے دیا۔'' زبین نے سادگی سے بتایا تو دُرِّ یکتا سر پر ہاتھ مار کے رہ گئی۔

''تو تم مائرہ بھابی کو جا کے بتاتی ناں...... خود سے اسے سیرپ دینے کی کیا ضرورت تھی؟'' دُرِّ یکتا اس پر غصے ہوئی تو زبین نے نہ سمجھ آنے والی نگاہوں سے اسے دیکھا کہیں وہ انجان پنے کا مظاہرہ تو نہیں کر رہی تھی۔ کیا اسے اپنے گرد و نواح میں ہونے والی تبدیلیوں کی خبر نہیں ہے۔

''مجھے شیریں بی بی نے منع کیا ہوا ہے کہ بچے کے معاملے میں مائرہ بی بی سے کوئی بات نہیں کی جائے۔ جب سے ان کی بہن اور ان کا بیٹا آیا ہے انہوں نے سختی سے کہا ہے کہ طیب کو مائرہ بی بی کی طرف نہ لایا جائے۔ اب اس میں میری کیا غلطی ہے۔'' وہ واقعی سچ کہہ رہی تھی۔ اس میں کیا دوش تھا ایک نوکرانی کا۔ وہ تو ایک معمولی سی تنخواہ پانے والی عورت تھی۔ مالکوں کو کیا کہہ سکتی تھی اور مالک بھی بے حس، انسانیت سے عاری۔ وہ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتی تھی۔ مائرہ نے بچے کو کبھی خود فیڈ نہیں کرایا تھا۔ رات کو وہ زبین کے پاس ہوتا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ اپنے بیٹے کو پیدا کر کے بھول گئی ہے۔ ایسی بے حس ماں...... اس نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔

''اچھا تائی شیریں نے ایسا کہا ہے؟'' دُرِّ یکتا نے خود کلامی کی۔

''جی ہاں......'' زبین نے اس کی ہلکی سی بڑبڑاہٹ بھی سن لی تھی۔ ''بیچارہ بچہ ساری رات روتا ہے چپ ہونے میں ہی نہیں آتا۔'' زبین بیچارگی سے بولی۔

''میں اسے خود بہلا لوں گی، تم آرام کرو۔'' دُرِّ یکتا، طیب کو کندھے سے لگائے، لگائے اسی طرح اپنے کمرے میں آ گئی۔ زبین اس کے پیچھے، پیچھے طیب کا بستر بھی لے آئی۔ دُرِّ یکتا نے اس کی دیگر چیزیں بھی لانے کو کہا تو وہ خوش ہو گئی۔ کیونکہ طیب بہت چڑچڑا بچہ تھا۔ اپنی پیدائش کے وقت وہ موٹا تازہ اور سرخ و سپید تھا۔ پر اب دو تین ماہ میں وہ بالکل مرجھائے پھول جیسا زرد ہو گیا تھا۔ اوپر کا دودھ پینے سے اس کا پیٹ اکثر خراب ہی رہتا۔ رات کو بستر گیلا کرتا تو زبین نیند کے نشے میں مدہوش ہوتی...... کبھی تو وہ تبدیل کرتی کبھی سوئی رہتی۔ وہ روتا رہتا اور خود ہی تھک کے ہار کے نڈھال ہونے لگتا تو سو جاتا۔

زبین سب کچھ لے آئی۔ اس کی حرکات میں پھرتی تھی۔ ''اب یہ رات کو میرے پاس ہی رہے گا۔ ہاں، دن کو تمہارے پاس ہو گا...... اس کا اچھے طریقے سے خیال رکھنا۔ میں کل اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گی تم میرے ساتھ چلنا۔''

''ٹھیک ہے، میں ضرور چلوں گی۔'' زبین نے سر ہلایا۔

☆☆☆

طیب اس کی گود میں آتے ہی پُرسکون ہو گیا۔ دُرِّ یکتا اسے دیکھتے، دیکھتے رو پڑی۔ اس کے ایک، ایک نقش میں شاہ زیب کی شباہت تھی۔ دُرِّ یکتا کے بے آواز آنسو طیب کے معصوم چہرے پر گرے تو وہ کسمسانے لگا۔ دُرِّ یکتا نے انگلی کی پوروں سے اس کے چہرے سے آنسو صاف کیے تو وہ اپنی حیران آنکھیں کھولے اسے تکنے لگا۔ دُرِّ یکتا نے اپنے ہونٹ اس کے ماتھے پر رکھ دیے۔ طیب اب ذرا بھی نہیں رو رہا تھا۔ کچھ منٹ بعد وہ بے خبر سو گیا تو دُرِّ یکتا آہستگی

سے کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر آ گئی۔ اس کا رخ برآمدے سے آگے باغ کی طرف تھا۔ اس وقت دل بے حد گھٹن کا شکار تھا۔ وہ کھلی فضا میں سانس لینا چاہ رہی تھی۔ صحن سے آگے برآمدے کے اختتام پر دیوار تھی جس کے بیچوں بیچ چھوٹا سا لکڑی کا دروازہ بنا ہوا تھا۔ اس دروازے کے دوسری طرف باغ تھا۔ کبھی کبھی وہ اِدھر گھومنے چلی جاتی تھی۔ وہاں اسے سکون ملتا تھا۔ مگر رات کے اس وقت وہ سکون سے وہاں بیٹھ کے کچھ سوچنا چاہ رہی تھی۔ دروازہ پہلے سے کھلا ہوا تھا۔ اس نے زیادہ غور نہیں کیا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی آگے بڑھتی گئی۔ کچھ فاصلے پر سنگ مرمر کی بنچ بنی ہوئی تھی۔ وہ وہاں بیٹھ گئی اور پھر اپنے آپ کو ڈھیلا ڈھالا چھوڑ دیا۔ کچھ دیر میں ہی اسے احساس ہوا کہ اس کے ارد گرد کوئی اور بھی موجود ہے۔ وہ اکیلی نہیں ہے۔ اس خیال کے آتے ہی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ ہلکی، ہلکی آوازیں اس کی سماعتوں سے ٹکرائی ساتھ ہی قدموں کی آواز ابھری۔ قدموں کی چاپ اسی طرف آتی لگ رہی تھی۔ اس کے جسم کے مساموں نے ٹھنڈا پسینہ اگلنا شروع کر دیا۔

درختوں کے سائے سے دو ہیولے ابھرے......

قریب آنے پر اس نے پہچان لیا کہ یہ مائرہ اور اس کا کزن باسط ہے۔ کل شام ہی تو وہ لوگ آئے تھے اور دریکتا ان سے ملی تھی۔ شیریں نے کچھ دن کے لیے یہیں رکنے پر اصرار کیا تھا سو وہ لوگ اِدھر ہی تھے۔

مائرہ کا نقرئی قہقہہ دُرِیکتا کی سماعتوں سے ٹکرایا تو وہ فوراً پیچھے ہو گئی ان دونوں کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی۔ وہ باتیں کرتے، چلتے ہوئے دوسری سمت کی طرف مڑ گئے۔ دریکتا نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مائرہ کا کندھا چلتے ہوئے باسط سے ٹکرا رہا تھا۔ دونوں ساتھ، ساتھ ہی تو چل رہے تھے۔ دُرِیکتا کی آنکھوں میں کچھ چبھنے لگا۔ دل پہلے بھی گھٹن کا شکار تھا۔ اب اور بھی بوجھل ہونے لگا۔ دکھ، افسوس، حیرانی، بیچارگی، بے بسی یا کچھ اور...... وہ اس وقت اپنے احساسات کو کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھی۔

ہاں آنکھوں میں جیسے ریت چبھ رہی تھی۔

مائرہ اور باسط دوسری طرف مڑ گئے۔ ان کی پشت دُرِیکتا کی طرف تھی۔ باسط کا ہاتھ مائرہ کی کمر پر تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے اس نے بے دھیانی میں یہ فعل سر انجام دیا ہے اور مائرہ بھی بے خبر ہے۔

دُرِیکتا کے دماغ میں جیسے ایک خیال خود بہ خود ہی پختہ ہو گیا کہ طیب نے باپ کے بعد ماں کو بھی کھو دیا ہے۔ یہ خیال کتنا سفاک اور بے رحم تھا کوئی دُرِیکتا سے پوچھتا۔ اس کی ٹانگوں نے تو اس کا بوجھ ہی سہارنے سے انکار کر دیا...... وہ کتنی دیر سے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی رہی۔

''کہیں طیب جاگ نہ گیا ہو......؟'' اس خیال نے اس کے حوصلوں کی گرتی دیوار کو مضبوط کیا اور وہ اٹھنے کے قابل ہوئی۔

طیب اسی طرح بے خبری کی نیند سویا ہوا اپنے ساتھ ہونے والے ظلم اور ناانصافی سے لاعلم تھا۔ کبھی، کبھی یہ لاعلمی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔

☆☆☆

طاہر لغاری فون کان سے لگائے دوسری طرف سے آتی آواز کو خاموشی سے سن رہے تھے۔

''طاہر بھائی میں اور آپ سے کیا کہوں...... عمر میرا چھوٹا بھائی ہے اس کے ناتے سے آپ میرے بھی چھوٹے بھائی ہو۔ اشعر میاں کو سمجھائیں کہ اپنی ضد چھوڑ دے۔ میں نے دُرِیکتا کو بہت سمجھایا ہے، میں اسے مار تو نہیں سکتا نہ اس کے ساتھ زبردستی کر سکتا ہوں۔ آپ کیوں چاہتے ہیں کہ دونوں خاندانوں کی عزت عدالت میں اچھلے...... اشعر خود ہی خلع دے دے...... آپ بات کریں بیٹا ہے آپ کا......'' اورنگزیب کی ایک ہی رٹ تھی۔

''میں خود دُرِیکتا سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس سے ایک بار اس کا سبب معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ہم سے بدظن کیوں ہو گئی ہے۔''

''طاہر بھائی وہ نہیں ملنا چاہتی، بات تک نہیں کرنا چاہتی۔ میں نے اسی لیے تو آپ کو فون کیا ہے۔ اشعر جذباتی ہے، جوان خون ہے۔''

''میں کچھ نہیں کر سکتا...... اتنے چاؤ اور ارمانوں سے عمر نے یہ رشتہ، نکاح کیا اور اب ہم اسے ختم کر دیں...... آپ کس طرح کی بات کر رہے ہیں، یہ کوئی گڈے گڑیا کا کھیل تو نہیں ہے......'' وہ پُرتاسف لہجے میں بول رہے تھے۔

''میں اشعر سے کس طرح کہوں کہ وہ خلع دے دے...... عمر اپنے حواسوں میں ہوتا تو اور بات تھی۔ دُرِیکتا کم سن ہے، بے وقوف ہے اور آپ بھی اس کی بے وقوفی میں اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔'' طاہر اب کے قدرے غصے میں آ گئے تو دوسری طرف موجود اورنگزیب کے لیے بھی مزید اداکاری جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔

''ٹھیک ہے پھر اب عدالت میں ہی ملاقات ہوگی۔ آپ گھر کی بات گھر میں نہیں رکھنا چاہتے تو آپ کی مرضی۔'' انہوں نے کھٹاک سے فون ہی بند کر دیا۔ شکر کا مقام تھا کہ اشعر نہیں تھا اور اس نے کوئی بات نہیں سنی تھی۔ ورنہ اسے سنبھالنا ایسا ہی تھا جیسے کسی بپھرے ہوئے شیر کو واپس پنجرے میں داخل ہونے پر مجبور کرنا......

ان کا ذہن مختلف سمتوں میں سوچ رہا تھا اور ہر سوچ ایک ہی بات پر ختم ہو رہی تھی کہ خلع کا فیصلہ دُرِیکتا کا اپنا نہیں ہے۔ اسے یقیناً مجبور کیا گیا ہے یا تو دھمکی دی گئی ہے یا کوئی اور بات ہوئی ہے جو وہ انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہوئی۔ طاہر لغاری اب ہر صورت اس سے ملنا چاہ رہے تھے۔ وہ نہ صرف ان کے عزیز دوست کی بیٹی بلکہ ان کے بیٹے کی منکوحہ بھی تھی۔ کوئی انہیں اس سے ملنے سے روک نہیں سکتا تھا۔ بس یہ بات اشعر کو معلوم نہیں ہونی چاہیے تھی کہ وہ دُرِیکتا سے ملنے گئے ہیں۔

وہ گاؤں میں حویلی میں تھی اور گاؤں اتنا دور نہیں تھا۔ اشعر سے کوئی مناسب سا بہانہ کیا جا سکتا تھا۔ حالات خطرناک رخ اختیار کر رہے تھے۔

''اللہ عمر اور اس کے خاندان پر رحم کرنا۔'' انہوں نے ہاتھ اٹھا کے دعا کی۔

☆☆☆

طاہر لغاری جلدی، جلدی ناشتا کر رہے تھے۔ ان کے برعکس اشعر آرام، آرام سے کھا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے جاگنگ کر کے آیا تھا نہا کے فریش ہونے کے بعد ناشتے کی ٹیبل پر آیا تو پپا اسی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ اس کے آتے ہی انہوں نے چائے کے لمبے، لمبے گھونٹ بھرے اور سلائس کے دو تین نوالے لیے۔

''پپا آج بہت جلدی میں ہیں کہیں جانا ہے؟'' اشعر ہاتھ روک کے انہیں تکنے لگا۔

''ہاں، میں نے سیالکوٹ جانا ہے۔ فاروقی صاحب سے ملنے...... ایک ضروری کام ہے، ڈرائیور کے ساتھ ہی جاؤں گا اور رات تک آ جاؤں گا بلکہ پہلے ہی لوٹ آؤں گا۔ کون سا میں نے وہاں پہ قیام کرنا ہے۔'' وہ نظریں چرائے، چرائے بتا رہے تھے۔

''او کے پپا میں بھی نکلتا ہوں، آفس کے لیے فاروقی انکل کو میرا بھی سلام کہیے گا۔''

''ہاں بیٹا ضرور کہوں گا۔''

''او کے پپا اللہ حافظ۔'' اس نے ٹیبل سے موبائل فون اور گاڑی کی چابی اٹھائی۔

''خیریت سے جاؤ اور خیریت سے آؤ۔'' لمبے چوڑے خوبرو سے بیٹے کو انہوں نے دل سے دعا دی۔

ڈرائیور طاہر لغاری کے انتظار میں تھا۔ اشعر کے نکلتے ہی طاہر نے بھی اسے گاڑی اسٹارٹ کرنے کا اشارہ کیا۔

☆☆☆

شیریں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ طاہر لغاری یہاں گاؤں ان کے گھر بھی آ سکتے ہیں۔ نہ اورنگزیب نے اس حوالے سے انہیں گائیڈ کیا تھا۔ انہیں سجے ہوئے خوب صورت ڈرائنگ روم میں بیٹھا چھوڑ کر وہ خود دُرِیکتا کے پاس آ گئیں۔ اسے بتانا اور پڑھانا

ضروری تھا۔ ورنہ ساری محنت پر پانی پھر جاتا تھا۔

''اٹھو دُرِ یکتا میرے ساتھ ڈرائنگ روم تک چلو...... طاہر لغاری آیا ہوا ہے، وہ تو لڑنے کے موڈ میں ہے۔ تم نے بس یہ کہنا ہے کہ تمہیں خلع چاہیے۔ اگر اس موقع پر تم نرم پڑ گئیں تو ساری زندگی روتی رہو گی اور یہ لوگ تمہیں طعنے دے دے کر مار ڈالیں گے۔ پہلے خود اس کے بیٹے نے فائرنگ کروائی تمہارے گھر...... پھر اورنگزیب سے بدتمیزی کی اور اب لڑنے کے لیے گھر چلے آئے ہیں۔ آؤ اپنا دل مضبوط کرو اور میں نے جو کہا ہے وہ سب طاہر لغاری سے کہہ دو تاکہ اسے یقین آجائے کہ تمہارے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کر رہا...... ورنہ یہ لوگ ہماری جان کو آجائیں گے۔'' شیریں کے ہاتھوں کے طوطے اڑے ہوئے تھے۔ ورنہ وہ اس قدر اور اتنی جلدی حواس باختہ ہونے والوں میں سے نہیں تھیں۔

''ٹھیک ہے تائی، آئیں میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔'' اپنی توہین کا احساس رگ، رگ میں جاگ پڑا تھا۔ اس کے قدموں میں تیزی تھی۔ طاہر لغاری اسے دیکھ کے فرطِ محبت سے اس کی طرف بڑھے...... پر وہ ان سے بچتی ان سے گریزاں...... انہیں نظر انداز کرتی جاکے دور بیٹھ گئی۔ طاہر لغاری کے اٹھے ہوئے ہاتھ ان کے پہلو میں گر گئے۔

''کیسی ہو بیٹا؟'' ان کے دل کا دکھ ان کے لہجے سے جھانک رہا تھا۔ دُرِ یکتا کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں مسلا...... اسے لگا... جیسے وہ ٹھیک نہیں کر رہی ہے۔

''ہاں بھائی صاحب، دُرِ یکتا آگئی ہے۔ جو کہنا ہے کہیں جلدی۔'' شیریں کا انداز اہانت آمیز تھا۔ طاہر کو بڑی مشکل سے ہضم ہوا۔ نظر انداز کر کے وہ دُرِ یکتا کی طرف متوجہ ہوئے جو سر جھکائے ہاتھ گود میں دھرے بیٹھی یہاں ہوتے ہوئے بھی اس ماحول اور اس منظر کا حصہ نہیں لگ رہی تھی۔

''بیٹا تمہیں مجھ سے یا اشعر سے کوئی شکایت ہے تو بتاؤ...... میں تمہارے خلع کے مطالبے سے بہت اپ سیٹ ہوں اور اشعر بھی...... میں اسی لیے تمہارے پاس آیا ہوں کہ جو شکوے، شکایت تمہارے دل میں ہیں انہیں سنوں اور پھر دور کردوں......'' وہ کتنی محبت سے بول رہے تھے۔

''نہیں، نہیں طاہر انکل ایسے نہیں ہوسکتے جس طرح اس نے سنا ہے۔'' اس نے بے بسی سے سر دائیں، بائیں جھٹکا۔ شیریں کی وارننگ دیتی نگاہ اس سے ٹکرائی تو جیسے اس ہوش آگیا۔ ساری سوچیں فنا ہوگئیں یاد رہا بھی تو اتنا کہ طاہر انکل اور اشعر کوئی اچھا انسان نہیں ہے۔ اس کی نسوانیت اور عزتِ نفس کے نازک شیشے کو کرچی کرنا چاہتا ہے۔ اس میں تو کوئی شک ہی نہیں تھا۔ دو بار کا تصادم دُرِ یکتا کو ابھی تک یاد تھا۔ اسپتال میں تو اس نے صاف دھمکی بھی دی تھی۔ اس نے اشعر کے متعلق عزائم کو سمجھنے کی کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ اس کا رویہ ہی منہ بولتا ثبوت تھا۔

''جی انکل مجھے خلع چاہیے...... میں اس رشتے کو مزید آگے بڑھانا نہیں چاہتی۔ میری طرف سے اسے آج ختم سمجھیں۔ میرے ساتھ کسی نے زور زبردستی نہیں کی۔ یہ سراسر میرا اپنا ذاتی فیصلہ ہے۔'' اس نے بہت صاف اور مضبوط لہجے میں کہا...... ایک، ایک لفظ کا مفہوم واضح تھا۔ کوئی ابہام نہیں تھا۔ اتنا کہہ کر دُرِ یکتا باہر آگئی۔ اسے ایسے لگا کہ اگر کچھ دیر اور وہاں بیٹھی تو طاہر انکل کے دھواں ہوتے چہرے کو دیکھ نہیں پائے گی۔ جہاں حیرت، بے یقینی ثبت ہو کے رہ گئی تھی۔

''بھائی صاحب آپ نے سن لیا ہے ناں دُرِ یکتا کی زبان سے سب کچھ...... وہ یہاں بہت خوش ہے۔ ہم سب اس کے اپنے ہیں۔ اس کے دکھ درد کے ساتھی...... یہاں آکے وہ اپنے غم بھول گئی ہے۔ اسے عمر بھائی کا فیصلہ اپنے لیے نامناسب لگا تو اس نے لب کھولے کہ مجھے خلع چاہیے۔ یہ اس کا حق ہے کہ وہ اپنے لیے جو بھی پسند کرے...... کوئی اس کے ساتھ زبردستی نہیں کرسکتا۔ ہمارا مذہب اسلام بھی لڑکی کو اپنی پسند ناپسند بتانے کا، بڑوں تک اپنی بات پہنچانے کا پورا، پورا

حق دیتا ہے۔ یہ کوئی پرانا زمانہ نہیں ہے جب لڑکیوں کے ساتھ زبردستی کی جاتی تھی۔ عمر بھائی نے اس سے بغیر پوچھے آپ کے بیٹے سے اس کا نکاح کردیا...... اب وہ اس بات کا اختیار رکھتی ہے کہ چاہے تو اس نکاح کو برقرار رکھے، چاہے تو ختم کردے۔ آخر وہ ایک پڑھی لکھی سمجھدار لڑکی ہے۔ اس کے انکار کی ایک وجہ اس کی اپنی پسند بھی ہے......'' شیریں کچھ دیر سانس لینے کے لیے رکیں تو طاہر لغاری بے تاب ہوگئے کہ جانے ان خاتون کے منہ سے کون سا انکشاف سامنے آئے۔

''وہ میرے بیٹے عاشر کو پسند کرتی ہے اور عاشر بھی......'' طاہر کے حواس تھرا گئے۔ اس طرف تو ان کا خیال کبھی گیا ہی نہیں تھا کہ دُرِ یکتا کسی کو پسند بھی کرسکتی ہے...... طاہر لغاری نے عمر زیب کے آفس میں ایک بار عاشر کو دیکھا تھا۔ چھوٹے قد کا موٹا سا لڑکا جو شکل سے ہی جھگڑالو اور چالاک نظر آتا تھا۔ اس میں کوئی ایسی خاص کشش نہیں تھی جو دُرِ یکتا اسے پسند کرتی۔ پر انہیں یقین دلایا جارہا تھا کہ ایسا ہوسکتا ہے۔ ان کی طبیعت مکدر سی ہوگئی۔ جلد از جلد وہ یہاں سے نکلنا چاہ رہے تھے مگر جانے سے پہلے وہ ایک نظر عمر کو دیکھنا چاہ رہے تھے پر سامنے جو خاتون بیٹھی تھیں وہ اس خواہش کو پورا نہیں کرسکتی تھیں۔ سو خاموشی سے حویلی کا آہنی گیٹ عبور کر کے باہر آگئے۔

ڈرائیور خلافِ توقع انہیں اتنا جلدی آتا دیکھ کر الرٹ ہو کے بیٹھ گیا اور گاڑی اسٹارٹ کردی۔ طاہر خاموشی سے پچھلی سیٹ پر نیم دراز ہوگئے جیسے میلوں دور سے پیدل چل کے آئے ہوں۔

واپسی کا سفر بڑا تکلیف دہ تھا۔ آتے ہوئے امید کے ہزاروں ننھے منے جگنو ان کی مٹھی میں تھے۔ جو راستے میں ہی کہیں رہ گئے تھے۔

اشعر کو کیسے بتائیں گے، کیا دلائل دیں گے کس طرح وہ ان کی بات مانے گا۔

اب یہی پریشانی ان کے دماغ پر سوار تھی۔

☆☆☆

دُرِ یکتا، طیب کو کندھے سے لگائے ٹہل ٹہل کر سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ آج پھر اس کی طبیعت خراب تھی اور وہ چڑچڑا ہو رہا تھا۔ صبح سے الٹیاں کر کر کے بے حال ہو رہا تھا۔ اس نے تائی شیریں کو بتایا تو انہوں نے بے پروائی سے زبین کے ساتھ کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔ مائرہ ان کے پاس ہی بیٹھی تھی۔

''بھابی آپ طیب کو پکڑیں، میں چادر اوڑھ لوں پھر جاتی ہوں ڈاکٹر کے پاس۔'' دُرِ یکتا نے طیب کو مائرہ کی طرف بڑھایا۔ اس نے ہاتھ آگے کر کے طیب کو گود میں اٹھانے کے بجائے کہا۔

''یہاں صوفے پر لٹادو۔'' وہ اپنے ناخنوں کی تراش خراش میں لگی ہوئی تھی۔ دُرِ یکتا ناچار طیب کو صوفے پر لٹا کے چادر لینے آئی۔ وہ جیسے ہی اسے لٹا کے گئی اس نے پیچھے سے گلا پھاڑ، پھاڑ کر رونا شروع کردیا۔ مائرہ نے روتے ہوئے طیب کو ایک نظر دیکھا۔ اتنے میں شیریں نے زبین کو آوازیں دینی شروع کردیں۔ وہ بھاگی، بھاگی آئی۔

''طیب کو اٹھاؤ رو رہا ہے۔'' انہوں نے شانِ بے نیازی سے حکم دیا۔ اتنے میں دُرِ یکتا واپس آگئی اور بچے کو زبین سے واپس لے لیا۔ مائرہ اسی بے نیازی سے ناخنوں کے ساتھ مصروفِ عمل تھی۔ اس اعلیٰ درجہ کی بے حسی کے مظاہرے پر دُرِ یکتا دل ہی دل میں بل کھا کے رہ گئی۔

اس نے بیٹے کا پوچھا تک نہیں بس اپنے آپ میں مگن تھی۔ جیسے اپنے ناخنوں کو شیپ دینے کے علاوہ کوئی ضروری کام ہے ہی نہیں۔

''دُرِ یکتا نے طیب کو اچھے طریقے سے سنبھال لیا ہے۔ زبین بھی ساتھ دیتی ہے اس کا۔'' ان دونوں کے جانے کے بعد شیریں تعریفی لہجے میں بولیں تو مائرہ سر ہلا کے رہ گئی۔ وہ دل ہی دل میں حساب لگا رہی تھی کہ باسط مینا خالہ کو کب بھیجے گا۔ وہ وعدہ کر کے گیا تھا کہ ایک ہفتے کے اندر، اندر امی رشتے کے لیے آئیں گی۔ اسے گئے ہوئے پانچ دن ہوگئے تھے۔

''مائرہ تمہارا دھیان کہاں ہے میں کتنی دیر سے بول رہی ہوں۔'' شیریں نے اس کی عدم توجہی محسوس کرلی۔

''اوہو...... جی، جی امی آپ نے کچھ کہا۔'' وہ ہڑبڑا کے ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

''کن سوچوں میں گم ہو؟''

''وہ امی......'' مائرہ کہتے کہتے ذرا دیر رکی۔ ''باسط نے کہا تھا کہ جا کے امی کو بھیجوں گا رشتے کے لیے۔''

''ہاں، مجھے بھی اس نے ایسا اشارتاً کہا تھا۔ اگر ایسا ہو جاتا ہے تو بہت اچھی بات ہے۔ تمہارے تو نصیب کھل جائیں گے۔ باسط کا بزنس بہت اچھا ہے، پتا نہیں حمزہ بھائی مانیں گے کہ نہیں۔'' شیریں، بہنوئی کی طرف سے تھوڑا سا مایوس ہوئیں۔ پہلے انہوں نے بہت چاؤ سے رشتہ مانگا تھا۔ اس وقت شیریں نے بہانہ کیا کہ اورنگزیب اپنے بھائی کو زبان دے چکے ہیں ساتھ یہ بھی کہ مائرہ ابھی پڑھ رہی ہے۔

تب شیریں کے بہنوئی حمزہ نے کہا تھا کہ باسط بھی تو پڑھ رہا ہے ابھی...... ہم کون سا ابھی شادی کرنے والے ہیں۔ حمزہ بھانپ گیا تھا کہ اس کی سالی بہانہ کر رہی ہے۔ اب شیریں کو اسی بات کا ڈر تھا۔

''امی میرے دل میں بھی یہ بات تھی کہ ہو سکتا ہے حمزہ خالو نہ مانیں پر باسط نے کہا ہے کہ اس کی بات ٹالنے کی جرأت گھر والوں میں نہیں ہے۔'' شیریں کا مرجھایا چہرہ کھل سا اٹھا۔

''یہ تو وہ ٹھیک کہتا ہے۔ آخر کو کما کے سب کو کھلا رہا ہے ہر سکھ دیا ہوا ہے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو...... اور پھر تم میں کیا کمی ہے جو کسی کو اعتراض ہوگا۔ بیٹے کی ماں اگر بنی ہو تو تمہارا بیٹا دُرِّ یکتا سنبھال رہی ہے۔ کون سا شادی کے بعد اسے ساتھ رکھو گی جو کوئی اعتراض کرے گا۔ بینا اور حمزہ آئے تو میں یہ بات ان کے کانوں میں ڈال دوں گی۔ اس سے اچھا اثر پڑے گا۔'' مائرہ اپنی ماں کی عقل مندی پر دل میں داد دیے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ کتنی معاملہ فہم اور دور اندیش تھیں۔

☆☆☆

حمزہ احمد اور بینا حیرت سے باسط کی طرف دیکھ رہے تھے جس نے ابھی، ابھی کچھ عجیب سی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

''ابو میں مائرہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں، وقت کم ہے میرے پاس اس لیے آپ کو جلدی گاؤں جا کے بات کرنی ہوگی۔'' اس کا انداز دوٹوک اور غیر لچکدار تھا۔

بینا کو یہ تو پتا تھا کہ باسط کسی زمانے میں مائرہ کو پسند کرتا تھا...... پر وہ پسندیدگی اور جنون ابھی تک...... برقرار تھا، اس کا اندازہ آج سے پہلے اسے نہیں ہوا تھا۔

''ایک بات بتا دوں...... اگر مائرہ نہیں تو کوئی بھی نہیں...... میں انکار اور مخالفت برداشت نہیں کروں گا کسی بھی صورت...... اس لیے میری خوشی میں آپ بھی خوش ہو جائیں۔'' وہ نہ جانے ان کی خاموشی سے کیا سمجھا تھا کہ تھوڑا تلخ ہو گیا۔

بینا نے شوہر کی طرف دیکھا...... وہ پہلے ہی ہار تسلیم کر چکے تھے۔ باسط کا باپ ہونے کے ناتے اس کی ضد سے وہ اچھی طرح واقف تھے اور اب تو وہ ایسی پوزیشن میں بھی تھا کہ اپنی ضد منوا بھی سکتا۔ یہاں قدرت بھی اس کا پورا، پورا ساتھ دے رہی تھی۔ سب راستے ہموار ہوتے چلے جا رہے تھے۔ کسی جگہ کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اسے اپنی خوش قسمتی پہ ناز تھا، ایک خوشی کی اطلاع دبئی سے اس کے پارٹنر نے بھی دی تھی کہ اس دفعہ کا مال مارکیٹ میں بہت اچھے داموں بکا ہے۔ انہیں اعلیٰ کوالٹی کی ہیروئن ضرورت سے زیادہ کم ریٹ پہ ملی تھی اور وہی ہیروئن بعد میں ان کے اندازے سے زیادہ مہنگے داموں فروخت ہوئی۔ باسط کی خوشی حد سے سوا تھی۔

اور اب امی ابو نے بھی خاموشی کی زبان میں اقرار کر لیا تھا کہ انہیں اس کی خواہش اس کی خوشی ہر چیز سے عزیز ہے۔

وہ شیریں خالہ کے گھر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ سب کچھ ٹھیک ہو رہا تھا۔ اس کی خواہش کے عین مطابق......

☆☆☆

''کیا قسمت پائی ہے مائرہ نے بھی۔'' بینا اور حمزہ احمد اس وقت شیریں اور اورنگزیب کے گھر موجود تھے اور اپنا مدعا زبان پر لا چکے تھے۔ شیریں نے سب کا منہ میٹھا کرایا۔ فرح اور فوزیہ بیک وقت مائرہ کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔ شیریں نے بڑے، بڑے لڈو ان دونوں کے منہ میں ٹھونسے تھے۔

''اللہ اس بار مائرہ کے نصیب اچھے کرے۔'' فوزیہ نے پُرخلوص دعا دی تو شیریں نے دل کی گہرائی سے آمین کہا۔

''پہلی بار بھی مائرہ کے لیے شاہ زیب کا رشتہ آیا اور اب باسط کا...... کتنے اچھے نصیب پائے ہیں اس نے۔'' فرح چچی نے آہستہ آواز میں اظہارِ خیال تو فوزیہ نے ہاتھ دبا کے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ شیریں سن لیتیں تو خواہ مخواہ نئی بحث چھڑ جاتی۔

فرح ویسے بھی آج کل شیریں اور اورنگزیب سے کبیدہ خاطر ہو رہی تھی، نہ جانے کیوں اسے ان دونوں کی نیت پر شک ہو گیا تھا۔

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں جانے باسط کو کیسے قابو کیا ہے...... اور خود مائرہ کو تو اپنے معصوم بیٹے کی کوئی پروا ہی نہیں ہے۔ زیبن کے حوالے کیا ہوا ہے۔ ایسی ماں ہم نے تو نہیں دیکھی۔'' فرح نے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے۔ فوزیہ دیکھ کے رہ گئی۔ کہہ تو وہ ٹھیک ہی رہی تھی۔ مائرہ کو بیٹے کا ہوش ہی نہیں تھا۔ کبھی دُرِّ یکتا تو کبھی زیبن کے پاس ہوتا۔ شیریں کو بھی تو اس سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ ان ماں، بیٹی پر عجیب سی بے حسی طاری تھی۔ دُرِّ یکتا ٹھہری ایک کنواری ناتجربہ کار لڑکی اسے بچے پالنے یا سنبھالنے کا وہ خاص سلیقہ نہیں تھا جو قدرت کی طرف سے ایک ماں کو ودیعت کیا جاتا ہے۔ اپنی طرف سے وہ جو ہوتا، کرتی تھی پھر بھی کوئی نہ کوئی کمی رہ جاتی تھی۔ طیب کبھی پیٹ کبھی کان کے درد سے روتا تو دُرِّ یکتا کو سمجھ ہی نہیں آتی۔ یہ سب ایک ماں ہی جان سکتی تھی اپنے بچے کی ادائیں، عادتیں، سونے، جاگنے کے اوقات اور طیب

تجھ بن عید

عید کے دن بھی میرے بجنا
تجھ بن سونا میرے گھر کا انگنا
نہ کوئی کنگن پھولوں کا
نہ کوئی موسم جھولوں کا
نہ لب پر اپنے لالی ہے
آنکھ کا کاجل بھیگا، بھیگا
چپ، چپ کان کی بالی ہے
جب عید کا چاند نکلتا ہے
پیار سے ہر کوئی ملتا ہے
ہوا بھی خوشبو لٹاتی ہے
سکھی گیت ملن کے گاتی ہے
میرے دل کو بڑا ترپاتی ہے
جب عید شوال کی آتی ہے

شاعرہ: یاسمین اقبال، سنگھ پورہ لاہور

مرہم

دل جب درد نہ سہہ پائے
آنسو آنکھوں سے بہہ جائے
تو میری بھیگی پلکوں کو
اپنے ہونٹوں سے وہ چومے
ہاتھوں میں میرا ہاتھ ہے
دھیرے سے بس یہ کہہ دے
تیرے سارے دکھ اب میرے
میرے سارے سکھ اب تیرے

کلام: عالیہ ضیا، کراچی

آہستہ سے

جانے کب تک تیری تصویر نگاہوں میں رہی

ہو گئی رات تیرے عکس کو تکتے، تکتے
میں نے پھر تیرے تصور کے کسی لمحے میں
تیری تصویر پر لب رکھ دیے آہستہ سے

از: ناظمہ شاہین اعوان، واہ کینٹ

کی ماں بے حس ہو چکی تھی۔

زیبن نوکرانی تھی رات میں مُدّثِر یکتا سنبھال لیتی......دن میں اسے ہی دیکھ بھال کرنی پڑتی۔ طیب اس کے پاس آتے ہی گلا پھاڑ کر رونے لگتا۔ وہ اٹھا، اٹھا کے زچ پڑ جاتی۔ اس کی کوٹھری میں افیم پڑی رہتی تھی جو اس کا میاں استعمال کرتا۔ زیبن چپکے سے تھوڑی سی افیم طیب کو بھی چٹا دیتی۔ وہ بھی سکون سے سویا رہتا اور زیبن بھی فارغ ہو جاتی۔

شیریں یا مائرہ میں سے کوئی بھی پوچھنے والا نہیں تھا کہ طیب اتنی، اتنی دیر کیوں سویا رہتا ہے۔ جس دن مُدّثِر یکتا گھر میں ہوتی اس دن زیبن، طیب کو افیم نہیں چٹاتی تھی۔

☆☆☆

مائرہ شادی کی شاپنگ شروع کر چکی تھی۔ کبھی فوزیہ یا فرح چچی میں سے کوئی ساتھ جاتی اور کبھی شیریں جاتیں۔ زیادہ تر شیریں ہی ساتھ جاتیں۔ مائرہ بہت خوش تھی۔ ایک، ایک چیز اپنی پسند سے دیکھ بھال کے لے رہی تھی۔ ٹائم بہت کم تھا کیونکہ باسط کو واپس بھی جانا تھا۔ وہ لمبے بکھیڑوں کے حق میں نہیں تھا۔ چاہتا تھا سیدھے، سیدھے نکاح کر کے مائرہ کو گھر لے آئے۔

ماں کی حیثیت سے بینا کے دل میں باسط کی چھوٹی بہنوں کے دل میں بڑے ارمان تھے۔ انہوں نے بڑے پروگرام بنا رکھے تھے۔ بھائی کی شادی میں یہ کرنا ہے، وہ کرنا ہے۔ وغیرہ وغیرہ......کارڈ چھپنے کے لیے دیے جا چکے تھے۔

☆☆☆

کل باسط کی مہندی تھی۔ دوستوں رشتے داروں اور کزنز نے خود ہی سب کچھ ارینج کیا تھا۔ اس کے ذہن پر اِک فکر سوار ہو گئی تھی کیونکہ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اس کا ایک کارندہ ائرپورٹ پر ہیروئن لے جاتے ہوئے شک کی بنا پر پکڑا گیا تھا بعد میں تلاشی لینے پر مشکوک اشیا برآمد کر لی گئیں۔ اب وہ لاک اپ میں تھا اور پوچھ گچھ کے کڑے مراحل سے گزر رہا تھا۔ باسط کو خوف تھا کہ ایسا نہ ہو وہ اس کا نام اگل دے......اس کے پارٹنر نے یقین دلایا تھا ایسا کچھ ہوا تو وہ سب سنبھال لے گا پر باسط پھر بھی پوری طرح پُرسکون نہیں تھا۔

وہ اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ آنکھ ہی نہیں لگ رہی تھی۔ سائڈ ٹیبل پر اس کا موبائل فون پڑا تھا۔ باسط کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ وقت گزر ہی نہیں رہا تھا اور نہ ہی نیند آ رہی تھی۔ اس نے مائرہ کو کال کر دی۔

وہ بھی اسی کی طرح جاگ رہی تھی۔ باسط بہت دن سے ایک بات کہنا چاہ رہا تھا پر وہاں مائرہ کے ہاں جانے کے باوجود اس سے وہ بات کہنے کا موقع نہیں ملا......آج اور ابھی وہ مائرہ سے اپنی وہی بات کرنا چاہتا تھا۔

''مائرہ میں نے تمہیں تو اپنا لیا ہے مگر میں تمہارے بچے کو ہرگز نہیں اپناؤں گا، تم نے میرے ساتھ رہنا ہے تو اپنے بچے کو وہیں چھوڑ کے آنا ہوگا......میں اسے قبول نہیں کر سکتا......اسے دیکھ کر مجھے بہت کچھ یاد آئے گا جو تمہارے حق میں اچھا نہیں ہوگا......''

باسط نے صاف اور دوٹوک بات کی۔ اس کا خیال تھا کہ مائرہ یہ بات سن کے روئے گی، اس کی منت کرے گی کہ نہیں، نہیں مجھے میرے بچے سے الگ مت کرو......اسے بہت دکھ ہوگا پر مائرہ بولی تو اس کا لہجہ بہت نارمل سا تھا جیسے یہ کوئی بات ہی نہیں ہو۔

''ٹھیک ہے باسط ایسا ہی ہوگا۔ طیب حویلی میں ہی رہے گا۔''

باسط کے ذہن سے یہ بوجھ بھی اتر گیا۔ مائرہ نے خلافِ توقع آرام سے اس کی بات مان لی تھی۔

یہی بات باسط نے جب بینا کو بتائی تو کتنی دیر وہ خاموش رہی اس سے بولا ہی نہیں گیا جیسے اسے رنج ہوا ہو۔

''باسط ایک بچے کو اس کی ماں سے مت الگ کرو، اس کا دل بچے میں ہی اٹکا رہے گا وہ تمہیں خوش نہیں رکھ پائے گی۔ اسے دو کشتیوں کا سوار مت بناؤ۔''

''امی پلیز......یہ میری زندگی ہے۔ میں اس پر

کسی اور کے بچے کا سایہ بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ نہ میرا ظرف اتنا بڑا ہے کہ میں مائرہ کے بچے کو باپ کا پیار دے سکوں میں اتنا عظیم نہیں ہوں۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں مزید کچھ بولنے سے روک دیا۔

☆☆☆

مائرہ کی رخصتی میں صرف دو دن باقی تھے اور اب بھی اسے بہت سی وہ چیزیں یاد آ رہی تھیں جن کی شاپنگ ضروری تھی، شیریں نے آج نہ جانے کس طرح مُدّثِر یکتا کو بھی مائرہ کے ساتھ جانے کا کہہ دیا۔

''تم بھی جاؤ سائرہ بھی جا رہی ہے اپنے لیے کپڑے وغیرہ لے لینا جب سے تم گاؤں آئی ہو ایک بار بھی شاپنگ کے لیے نہیں کہا ہے تم نے......سو ضروریات ہوتی ہے لڑکی ذات ہو کوئی اچھا سا سوٹ لینا مائرہ کی رخصتی پہ پہننے کے لیے۔'' وہ اس کے دل کی حالت سے بے خبر بولے جا رہی تھیں مُدّثِر یکتا نے نفی میں سر ہلایا پر شیریں نے ہاتھ اٹھا کے روک دیا۔ اسے یاد آیا کہ طیب کے کپڑے تنگ، تنگ اور چھوٹے ہو گئے ہیں کیوں نہ طیب کے لیے کچھ خریداری کر لی جائے اس خیال سے وہ ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئی ورنہ دل اندر سے بے پناہ اداس تھا۔

شاپنگ کے بعد وہ لوگ اسی شاپنگ مال کے فوڈ کورٹ میں آ گئے جہاں اور بہت سے لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے سائرہ اور مائرہ کی نظر دور پولیس یونیفارم میں ملبوس بیٹھے اشعر پر پڑی اور سائرہ لپک کر اس کی طرف بڑھ گئی اور اس سے دعا سلام کی سامنے جا کر سائرہ اس کی شخصیت کے دل فریب پیچ و خم میں کھو سی گئی۔

مائرہ نے اسے دور سے ہی ملامتی نگاہوں سے گھورا اور اپنی طرف واپس آنے کا اشارہ کیا، اتنے میں اشعر بھی انہیں دیکھ چکا تھا وہ اپنی کرسی سے اٹھ گیا۔ مُدّثِر یکتا اسے اپنی طرف آتا دیکھ رہی تھی کاش وہ کہیں چھپ سکتی پتا نہیں کیوں وہ خوف زدہ ہو رہی تھی۔

اشعر اکثر یہاں لنچ کرنے آتا تھا اس کا آفس یہاں سے قریب ہی تھا۔ آج بالکل غیر متوقع طور پر اورنگزیب کی بیٹیوں سے اس ریسٹورنٹ میں اس کا سامنا ہو رہا تھا ان کے ساتھ وہ بھی تھی جس کا تصور کرتے ہی اشعر کا جی چاہتا تھا کہ شوٹ کر دے۔

''کیسی ہیں آپ؟'' وہ اس کے سر پر کھڑا تھا اس کا مخاطب مائرہ اور نگاہیں دریکتا پر تھی جس نے ادھ کھایا برگر واپس پلیٹ میں رکھ دیا تھا۔

''مائرہ کی شادی ہو رہی ہے ہم شاپنگ کرنے آئے ہیں۔'' سائرہ مسلسل بول رہی تھی اِدھر مائرہ نے اخلاق کا تقاضا نبھایا اور بادلِ ناخواستہ اسے ہیلو ہائے کی۔ اشعر سائرہ کی خالی کی گئی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ اس کے دائیں طرف مُدّثِر یکتا تھی جس کا دل اس وقت پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

''آپ نے پھر کسی کو ابھی تک بھیجا نہیں میرے پاس ترجمان بنا کر......خود ڈرتی ہیں مجھ سے بات کرتے ہوئے۔'' ابھی یقیناً اس کا مخاطب مُدّثِر یکتا ہی تھی اس نے امداد طلب نگاہوں سے مائرہ کی طرف دیکھا۔

مائرہ نے نگاہیں چرالیں وہ خود اشعر سے خائف تھی باقی لوگ بھی آہستہ، آہستہ ان کی طرف متوجہ ہو رہے تھے۔

''مجھ سے جو بات کرنی ہے ڈائریکٹ کریں محترمہ......مجھے اپنے تایا کے ذریعے عدالتوں کی دھمکیاں مت دیں۔ میں ان سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ خیر یہاں ان باتوں کا موقع نہیں ہے میں بہت جلد آپ کے پاس آؤں گا۔'' اشعر کی آواز دھیمی پر لہجہ بہت سخت تھا۔ مُدّثِر یکتا نے سہارے کے لیے مائرہ کا ہاتھ پکڑ لیا اس کے چہرے پر پھیلتی گھبراہٹ اشعر کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں تھی مزید تماشا بننے کے خیال سے اشعر وہاں سے اٹھ گیا اور جاتے، جاتے مائرہ کو شادی کی مبارک باد دی۔

سائرہ ابھی تک اسے دیکھ رہی تھی اس کے جاتے ہی مائرہ بہن کو ڈانٹنے لگی۔

''تمہیں کیا ضرورت تھی اس کے پاس جانے کی۔ پپا بتا چکے ہیں کہ یہ بہت خطرناک آدمی ہے تم پھر سلام کرنے پہنچ گئیں اس کے پاس۔''

''اتنا ڈشنگ ہے، مجھے تو افسوس ہو رہا ہے۔'' سائرہ ذرا بھی اس کی ڈانٹ کو خاطر میں نہیں لا رہی تھی۔
مُدرِیکا خوف زدہ تھی اور مسلسل واپسی کا کہہ رہی تھی۔ سائرہ کو غصہ آ گیا۔
''تم اتنا ڈرتی کیوں ہو، وہ کوئی خون آشام بلا تو نہیں ہے۔ ایک پولیس آفیسر ہی تو ہے۔ تمہارا نکاح ہوا ہے اس کے ساتھ کچھ دنوں تک یہ نکاح ختم ہو جائے گا پھر بھی تم ڈرو گی؟''
مُدرِیکا بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ سائرہ کو خوشی ہو رہی تھی مُدرِیکا کے خوف اور اشعر لغاری کے انداز پر۔
''کیا زور دار جوان ہے، ایک مرد کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔''
''تم اس کی اتنی تعریفیں کر رہی ہو جیسے بہت متاثر ہو۔'' مائرہ نے اس کی طرف عجیب سی نگاہوں سے دیکھا۔
''ہاں، میں پہلی بار ہی متاثر ہو گئی تھی۔ مجھے مُدرِیکا پر حیرت ہے جو اس سے خلع لے رہی ہے۔'' سائرہ آہستہ آواز میں بولی پر مُدرِیکا تو اپنے ہی خیالوں میں گم تھی۔ مائرہ نے اس کا ہاتھ دبا کر کہا۔
''بس کرو، مُدرِیکا اتنی تعریفوں پر کیا سوچے گی۔''
شیریں تو عاشر کے لیے اس کے حوالے سے خواب دیکھ رہی تھیں۔ مُدرِیکا کو خلع مل جاتی تو اشعر کے آسیب سے جان چھوٹ جاتی۔ عاشر سے شادی کے بعد طیب کی ذمے داری کے بوجھ سے شیریں ہلکی ہو جاتیں۔ شیریں جانتی مائرہ نے شادی کے بعد تو باسط کے ساتھ چلے جانا تھا۔ ساری عمر کے لیے طیب کو کون سنبھالتا۔ ننھا سا بچہ تھا اس کی عمر کے ابتدائی چار پانچ سال بہت مشکل تھے، مُدرِیکا شادی کے بعد اس گھر میں رہتی تو شیریں کے لیے آسانی ہی آسانی تھی۔

☆☆☆

اشعر بہت غصے میں تھا طاہر لغاری اس کا مطالبہ سن کے چپ ہو گئے تھے۔ مُدرِیکا کو ریسٹورنٹ میں دیکھ کر اشعر کو جیسے آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ فوراً سے بھی بیشتر کوئی فیصلہ کرنا چاہ رہا تھا۔
''پپا مجھے مُدرِیکا کو اس گھر میں لانا ہے۔ میری بیوی ہے وہ۔''
اورنگزیب عدالت کی دھمکیاں دے رہا تھا، مُدرِیکا نے خود کہہ دیا تھا کہ میں اس رشتے کو ختم کرنا چاہتی ہوں اور اشعر اسے گھر میں لانے کی بات کر رہا تھا۔ طاہر لغاری نے گاؤں جانے والی بات اشعر کو نہیں بتائی تھی کہ اسے اور غصہ آئے گا لیکن اب چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔
''گڈ پپا آپ مجھے اب یہ بتا رہے ہیں کہ آپ گاؤں گئے تھے، کیا ضرورت تھی بتانے کی...... بہر حال میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ مجھے اپنی بیوی کو اس گھر میں لانا ہے پپا، اب یہ میری عزت، انا اور غیرت کا معاملہ ہے۔ میں کسی صورت پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔''
''اشعر وہ لوگ نہیں مان رہے ہیں، میں پہلے یہی سمجھتا رہا کہ مُدرِیکا کو ڈرایا گیا ہے خوف زدہ کیا گیا ہے یہ سب کہنے کے لیے۔ میں اپنا شک دور کرنے گاؤں گیا، مجھے خود مُدرِیکا نے کہا کہ وہ اس رشتے کو ختم کرنا چاہتی ہے بلکہ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ میری طرف سے اس رشتے کو ابھی اور اسی وقت ختم سمجھیں۔ اب تم بتاؤ جب وہ خود راضی نہیں ہے تو تم کیوں اپنا خون جلا رہے ہو۔'' طاہر لغاری نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اشعر نے ہٹا دیا۔
''پپا یہ رشتہ ختم نہیں ہو سکتا، ہاں مُدرِیکا ختم ہو سکتی ہے۔'' اشعر کا لہجہ بلا کا سفاک اور سرد تھا طاہر لغاری دہل گئے۔
''تم پولیس ڈیپارٹمنٹ میں آ کر اتنے سفاک ہو گئے ہو مجھے نہیں پتا تھا۔''
''پپا آپ جو بھی سوچیں، یہ رشتہ میری انا کے لیے زندگی موت کا سوال بن گیا ہے۔ میں ایک عورت کو اپنی مردانگی سے کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ کسی قیمت پر بھی نہیں۔'' اس کے لفظ لفظ میں آہنی سختی تھی۔
(باقی آئندہ)

ضرورت مند

شائستہ انجم

بہت شوق تھا اسے کبھی کوئی دن مختلف بھی ہو۔

''ہوگیا ناں آج شوق پورا۔'' رخسانہ اپنی سوچوں میں گم گاڑی ڈرائیو کررہی تھی۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر اس کے دو ننھے منے بچے بیٹھے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آمنہ باجی کتنی خوش قسمت تھیں تعلیم مکمل کرنے کے فوراً بعد ان کی شادی ہوگئی مگر انہوں نے بڑی کامیابی سے اپنی لیکچررشپ جاری رکھی' وجہ یہ تھی کہ اپنے بچے پالنے کا انہیں کبھی مسئلہ نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے بچے اماں کے پاس



چھوڑ جاتیں اور بے فکر ہو کر جاب کرتیں؛ اماں کی بوریت بھی دور ہوگئی تھی اور بچے بھی بحفاظت پل گئے۔

رخسانہ مقامی کالج میں لیکچرار تھی اور بڑی بہن آمنہ سے کچھ ہی سال عمر میں چھوٹی تھی۔ شادی کے بعد اپنی ساس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود اس نے جاب جاری رکھی پھر ساس نے بھی ہری جھنڈی دکھادی کہ ”ارے بھئی اپنے بچے خود ہی سنبھالو۔“ لہٰذا رخسانہ اب روزانہ صبح، سویرے اٹھتی دو سال کے حمزہ اور تین سال کی یمنیٰ کو تیار کرکے کالج جانے سے پہلے اپنی اماں کے حوالے کرجاتی اور پھر کالج سے واپسی پر انہیں واپس لے آتی۔ بچوں کے ساتھ ایک نوکری میں ان کی ضرورت کی چیزیں اور کھانے پینے کی اشیا بھی ہوتیں اور بچوں کے ساتھ یہ سب بھی ڈھو کے لانا ہوتا یہ روز کا تھکا دینے والا معمول تھا مگر آج آٹھ بجے وہ اپنی اماں کے گھر بچوں کو لے کر پہنچی تو اماں کی طبیعت کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہو رہی تھی اور وہ کچھ چڑ چڑی بھی نظر آرہی تھیں۔

”مجھ میں اب اتنی طاقت نہیں کہ بچوں کے پیچھے، پیچھے بھاگ سکوں...... جب شادی شدہ ہو تو اپنی ذمے داریاں بھی خود ہی پوری کرو...... جاب چھوڑو اور اپنی میاں کی تنخواہ پر گزارہ کرو اور اپنا گھر سنبھالو...... بھلا تمہیں نوکری کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟“ انہوں نے صاف کہہ دیا اسے اماں پر سخت غصہ آیا تھا۔

”واہ جی واہ...... آمنہ باجی بہت لاڈلی تھیں ان کے بچے کتنے شوق سے اماں نے سنبھالے، ریٹائرمنٹ کے بعد ان کے گھر کے بجلی، پانی اور گیس کے بل تو ابو ہی ہمیشہ جمع کرواتے اور اب میری باری آئی تو ان کی صحت جواب دے گئی۔ میں سب سمجھتی ہوں جب سے بھائی صاحب نے امریکا سے انہیں موبائل سیٹ بھیجا ہے۔ بس دن بھر موبائل پر تمام رشتے داروں اور سب سے گپ شپ کے علاوہ اور کوئی کام نہیں...... آخر اماں کو بھلا موبائل کی کیا ضرورت تھی۔ گھر میں ٹیلی فون تو تھا ہی ناں......“ اس نے خود غرضی کی انتہا پر پہنچ کر سوچا۔

”اگر اماں میرے بچوں کی دیکھ بھال نہیں کرسکتیں تو سعدیہ کو تو کچھ خیال کرلینا چاہیے آخر میں دن بھر اتنی محنت کرتی ہوں۔ نوکری اور گھر سنبھالنا آسان کام تو نہیں...... مگر مجال ہے جو کسی کو میرا خیال ہو یا مجھ پر ترس کھائے......“ اس نے چھوٹی بہن سعدیہ کے متعلق سوچا جو سہیلیوں سے موبائل پر چیٹنگ کرتی رہتی یا کانوں میں ہینڈ فری گھسیڑ کر گانے سنتی رہتی...... البتہ اپنے موبائل کی پوری گیلری... اس نے حمزہ اور یمنیٰ کی تصاویر سے بھر دیں۔ ”بس یہی اس کی محبت ہے میرے بچوں کے لیے......“

”اور روفی (اب اس نے چھوٹے بھائی کے متعلق سوچا) فارغ وقت میں ویڈیوز ڈاؤن لوڈ کرتا رہتا ہے سب گھر والوں کو دکھا، دکھا کر خوش ہوتا رہتا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ جس مسیج نامی لڑکے سے وہ دن رات دھڑلے سے ابو کے پاس بیٹھ کر چیٹنگ کرتا رہتا ہے وہ یقیناً مسیج نہیں کوئی سمیعہ ہوگی...... گرمیوں میں چھت پر جا کر اور سردیوں میں باتھ روم جا کر کال سنتا رہتا ہے اور اماں انتہائی سادگی سے اس کی طرفداری کرتی ہیں کہ اس کے موبائل پر تو سگنلز ہی نہیں آتے کہ بچہ سکون سے ایک جگہ بیٹھ کر ضروری کال سن لے...... آفس والے تو اسے چین ہی نہیں لینے دیتے۔“ اور وہ صرف ایک گہری سانس لے کر رہ جاتی۔

اسے موبائل کی ایجاد سے ہی پرخاش ہونے لگی۔ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کچھ سال پہلے تک جب ہر کسی کے پاس موبائل نہیں تھا تو زندگی کتنی آسان تھی۔ سب کے پاس ایک دوسرے کے لیے وقت ہی وقت تھا۔ اب تو بھری مجلس میں بھی ہر شخص اپنی الگ ہی دنیا بسا کے بیٹھا ہے۔ چلو بیچارے تنہا اور ریٹائرڈ لوگوں کو بھی موبائل نے اکیلے پن سے بچالیا ہے۔ پھر اسے یاد آیا۔ شادی کے بعد جب وہ رخصت ہو کر سسرال پہنچی تو اس نے بھی اسی وقت سے موبائل استعمال کرنا شروع کردیا تھا۔ جب بھی وہ اپنے کمرے میں اکیلی ہوتی تو اپنے گھر والوں اور سہیلیوں کو سسرال کی رپورٹنگ کرتی کہ یہاں کون کیا کرتا ہے، کیا کھایا پکایا جاتا ہے وغیرہ تب تو موبائل بہت کارآمد شے تھا۔ بلکہ اس کے لاکھوں کے جہیز میں سب سے قیمتی اور اہم چیز موبائل ہی تھا...... میاں سے بھی مستقل رابطے میں رہنے کا اہم ذریعہ......

انہی سوچوں میں گم وہ مارکیٹ پہنچ گئی۔ اس نے مطلوبہ دکان کے سامنے گاڑی روکی ہی تھی کہ ایک خواجہ سرا جس نے اپنے سانولے چہرے پر میک اپ کی گہری تہ جما رکھی تھی... اور تیز سرخ لپ اسٹک اس کے ہونٹوں پر سجی تھی۔ اس کا گلابی چہرہ اس کی سانولی گردن سے بالکل میل نہیں کھا رہا تھا۔ کالی پھول دار شلوار قمیص میں ملبوس اور کالا ہی دوپٹا اوڑھے ہوئے وہ اس کے پاس چلا آیا اور انتہائی لجاجت اور مسکینیت سے بولا۔

”میری پیاری باجی کچھ خیرات دے دو۔“ رخسانہ پہلے ہی بھری بیٹھی تھی۔ کوئی جواب دیے بغیر گاڑی سے اتری اور گاڑی لاک کیے بغیر تیزی سے دکان میں داخل ہوگئی۔ چند ہی لمحوں میں وہی خواجہ سرا بھاگتا ہوا اس کے پیچھے دکان میں داخل ہوا اور جلدی سے بولا۔

”پیاری باجی، پیاری باجی آپ کی گاڑی کی بریک نہیں لگی ہوئی اور وہ پیچھے کی طرف جا رہی ہے۔“

”کیا......“ اس نے خوف سے چلّا کر کہا۔ اسے گاڑی میں بیٹھے ہوئے اپنے معصوم بچوں کا خیال آیا۔ وہ اپنے کاغذات جو فوٹو کاپی کرانے کے لیے لائی تھی وہیں چھوڑ چھاڑ جلدی سے دکان سے باہر نکلی...... خواجہ سرا بھی...... تیزی سے اس کے ساتھ آیا۔ گاڑی واقعی پیچھے کی جانب آہستہ، آہستہ کھسک رہی تھی اور بچے بالکل اطمینان سے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں معاملے کی سنگینی کا قطعاً کوئی احساس نہیں تھا۔ رخسانہ سخت گھبرا گئی اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے کیونکہ گاڑی پارکنگ والی جگہ سے کھسکتے، کھسکتے سڑک پر آرہی تھی اس کی گاڑی کسی بھی شخص یا مخالف سمت سے آنے والی گاڑی سے ٹکرا سکتی تھی، حادثے کا اندیشہ منڈلا رہا تھا۔ وہ تو بالکل ہی بدحواس ہوگئی۔ خواجہ سرا نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر اگلے ہی لمحے اچک کر پھرتی سے گاڑی کا اگلا دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر فوراً بریک لگا کر گاڑی قابو میں کرلی...... شاید گاڑی سے اترنے سے پہلے وہ جلدی میں ہینڈ بریک لگانا بھول گئی تھی یا بچوں نے شرارت میں ہینڈ بریک نیچے کردی تھی وہ سمجھ نہ پائی۔ خیر اس نازک وقت میں اس خواجہ سرا نے رخسانہ کی بروقت مدد کرکے اسے حیران کردیا بلکہ ارد گرد کے لوگ بھی اس خواجہ سرا کو تحسین کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ جبکہ رخسانہ خوف اور شرمندگی سے پسینے، پسینے ہو رہی تھی۔ اس نے اس بیچارے کا... بے حد شکریہ ادا کیا۔ خواجہ سرا نے اسی مسکینیت سے کہا۔

"کوئی بات نہیں پیاری باجی بس خیرات دے دو۔ اللہ بچوں کو زندگی اور صحت دے۔" اس نے جھٹ پرس سے پانچ سو کا نوٹ نکالا اور اس کو پکڑا دیا۔ خواجہ سرا کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

رخسانہ نے اللہ کا کروڑ ہا شکر ادا کیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی اور اپنے حواس بحال کرنے لگی پھر بچوں کی طرف دیکھا جو ہر بات سے بے خبر مطمئن بیٹھے تھے۔ اتنے میں اسی دکان سے دکاندار نکلا اور اس کے کاغذات اس کے حوالے کیے جو وہ جلدی میں دکان میں چھوڑ آئی تھی۔ گاڑی کے چکر میں وہ بھول گئی تھی کہ وہ کیا کرنے گاڑی سے دکان پر اتری تھی۔ ساڑھے نو بجنے والے تھے۔ اس نے کالج پہنچنا تھا۔ حواس بحال کرکے اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور دس پندرہ منٹ میں کالج پہنچ گئی۔ کالج پہنچتے ہی سب سے پہلے اس نے اپنے بچے کالج کی بوڑھی آیا کے حوالے کیے اور خود اسٹاف روم پہنچی۔ کالج میں ڈسپلن انچارج ہونے کے ناتے وہ طالبات کے ہاتھوں میں موبائل کی موجودگی سے سخت زچ تھی اس بلوٹوتھ اور gprs نے بچوں کو کہیں کا نہیں چھوڑا۔ کتابوں سے تو دلچسپی ختم ہی ہوتی جا رہی ہے۔ کتابیں خریدنے اور پڑھنے کے بجائے معلومات کا ماخذ اب صرف گوگل کو ہی سمجھا جاتا ہے۔

دراصل کالج میں آج فورتھ ائیر کی الوداعی پارٹی بھی تھی۔ وہ تو چھٹی کرنا چاہتی تھی مگر ڈسپلن کی انچارج ہونے کی حیثیت سے اسے کالج میں اپنی خصوصی ذمے داریاں پوری کرنا تھیں۔

آج لڑکیاں رنگے برنگے لباس میں پوری تیاری کے ساتھ تتلیوں کے مانند پورے کالج میں گھوم رہی تھیں۔ الوداعی پارٹی کا انتظام کالج کے گراؤنڈ میں کیا گیا تھا۔ حاضرین کو محظوظ کرنے کے لیے رنگا رنگ پروگرام ترتیب دیے گئے تھے۔ اس نے اسٹاف روم میں آکر کرسی پر اپنا پرس رکھا اور بیٹھنا ہی چاہتی تھی کہ کالج کے تنومند چوکیدار نے اسٹاف روم میں داخل ہونے کی اجازت چاہی اور پھر اسے اطلاع دی کہ کالج کے باہر گیٹ کے قریب کچھ نوجوان لڑکے خواہ مخواہ منڈلا رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے موبائل سے لڑکیوں کی تصاویر لینا چاہتے ہیں۔ وہ فوراً چوکیدار کے ہمراہ کالج سے باہر نکلی جہاں ایک سرسبز گھنے شہتوت کے درخت کے نیچے بظاہر بے نیازی سے کچھ لڑکے بیٹھے تھے اسے اور چوکیدار کو دیکھتے ہی لڑکوں نے قلانچیں بھریں اور یہ جا وہ جا۔ سوائے ایک لڑکے جو شاید موبائل میں بیلنس لوڈ کرنے میں اتنا مگن تھا کہ اسے بھاگنے میں دیر ہوگئی۔ وہ لڑکا کچھ جانا پہچانا معلوم ہو رہا تھا۔ چوکیدار نے اسے گردن سے دبوچا اور میڈم رخسانہ کے پاس لے آیا۔ رخسانہ نے اسے غور سے دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا یہ تو صبح والا لڑکا تھا جو کچھ دیر پہلے خواجہ سرا کے روپ میں بھیک مانگ رہا تھا اور جس نے اس کی گاڑی کو بروقت بریک لگا کر اس پر اور اس کے بچوں پر احسان کیا تھا۔

"میڈم جی ان لڑکوں کو تو پولیس کے حوالے کر دینا چاہیے، یہ صرف لڑکیوں کے کالج کے آس پاس نہیں منڈلاتے بلکہ خواجہ سرا کے روپ دھار کر دن بھر بھیک بھی مانگتے ہیں۔" چوکیدار نے غصے سے سرخ ٹماٹر ہوکر تیزی سے کہا۔

"میڈم جی کیا کروں پہلے گھریلو ڈرائیور کے طور پر کام کرتا تھا مگر آج کل بیروزگار ہوں۔ مجبوراً خواجہ سرا کا بھیس بدل کر بھیک مانگنا پڑتی ہے۔ آخر اپنا اور موبائل کا پیٹ بھی تو بھرنا ہے ناں۔" لڑکا اس کی بات پر جلدی سے بولا۔ رخسانہ نے تاسف سے سر ہلایا اور گہری سانس لے کر رہ گئی۔

وہ جو کالج لیکچرر کی حیثیت سے اپنی طرف سے نئی نسل کو آگہی اور شعور دے رہی تھی مگر اس لڑکے کو جو کبھی خواجہ سرا کا روپ دھارے سامنے آیا تھا، کبھی نوجوان لڑکا بن کر، وہ اسے کچھ نہ کہہ سکی۔ آخر کہتی بھی تو کیا......

عیدِ مبارک

عقیلہ حق

"سائرہ ...... سائرہ ...... اٹھو سائرہ ......" گہری نیند میں اسے سرگوشیاں خواب سی لگیں...... وہ سوتی رہی...... سرگوشیاں، آوازوں میں بدلیں اور پھر آوازوں نے اسے جھنجوڑ کر اٹھا دیا...... اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں کہ سارے دن کی تھکن کے بعد چور، چور بدن کے ساتھ بہت مشکل سے تو اسے نیند آئی تھی۔

جب وہ سوئی تھی تو گھر خالی تھا، گھر میں خاموشی



تھی، سناٹا تھا لیکن اس وقت کمرا، بہت سارے مختلف چہروں سے بھرا ہوا تھا۔ خوش، باش، ہنستے مسکراتے چہرے، فکر مند چہرے، سوالیہ چہرے، خوشی اور جذبات سے پُر چہرے۔

اس نے گھبرا کر ایک بار پھر سامنے کمزی نمرہ بھابی کی طرف دیکھا اور پھر ان کے بولتے چہرے پر سے اس کی نظر پھسلتی ہوئی ایک بار پھر ان کی کلائی پر ٹک گئی۔

اور پھر اس کی نظر دیوار پر لگی کلاک پر جم سی گئی......وہ تقریباً دو گھنٹوں تک سوتی رہی تھی لیکن اس کا نصیب......

☆☆☆

"ساری زندگی گزر گئی میکے اور سسرال والوں کی جوتیاں سیدھی کرتے، کرتے اور ملا کیا، خالی ڈھول۔ ساری زندگی میں تو سب ہی کی سنتی رہی اور مانتی رہی لیکن جب چونڈا اسفید ہوگیا تو سمجھ میں آیا نہ بی بی......زندگی اپنی مرضی سے گزارو...... کچھ نہیں ہوتا......زندگی ان ہی کی گزرتی ہے جو لڑکیاں اپنی من مانی کرتی ہیں۔

ہماری اماں کہتی تھیں جو لڑکیاں میکوں میں عزت سے رہتی ہیں، باپ بھائیوں کی عزتوں کو سنبھال کر رکھتی ہیں، خاندان کی ناک اونچی رکھنے کے لیے نہ اپنی آواز اونچی کرتی ہیں اور نہ ہی پیروں کی چاپ......ان کے نصیبے بہت اچھے کھلتے ہیں۔ سو میں بھی ساری زندگی اماں، خالہ اور پھپو کے ارشاداتِ گرامی پر عمل کرتی رہی اور ملا کیا......؟"

"کیا ملا بیگم صاحبہ......؟" رخشندہ بیگم جیسے ہی سانس لینے کے لیے رکیں توفیق احمد جو کانوں میں تیل ڈالے اخبار میں منہ گھسائے بیٹھے تھے ظاہر تو وہ یہی کر رہے تھے جیسے ان کی سانس کی رفتار بھی اس وقت زوجہ محترمہ کے غصے کے ساتھ چل رہی ہے لیکن درحقیقت ان کے غصے کی اصل وجہ جاننے کے باوجود وہ ان کے غصے کو انجوائے ہی کر رہے تھے۔

"لو وہ پوچھ رہے ہیں کیا ملا......؟"

"ارے آپ ملے، جو ملتے اور نہ ملتے تو کوئی فرق ہی نہیں پڑتا......" رخشندہ بیگم تڑخیں تو وہ دیکھتے ہی رہ گئے۔

☆☆☆

آج نیلوفر کی منگنی ہوئی تھی زبردست افیئر کے بعد......نہ نیلوفر کے گھر والے راضی اور نہ ہی فراز کے گھر والے راضی تھے لیکن دونوں کی ضد کے آگے سب کو ہتھیار ڈالنے پڑے......سو نیلوفر کا موقف تھا جوڑے آسمانوں پر نہیں زمینوں پر بنتے ہیں جبکہ ردا بضد تھی نہیں جوڑے آسمانوں پر ہی بنتے ہیں لیکن زمین پر ملتے ہیں۔ ردا اور نیلوفر کے ساتھ، ساتھ کچھ دوستیں اور بھی شامل ہوگئیں اور دوستوں کا وہ گروپ جو اتفاق، محبت اور دوستی میں مثالی تھا دو دھڑوں میں بٹ گیا۔

خاموش بیٹھی، سائرہ کو بھی ردا نے شاملِ گفتگو کرنا چاہا جو صرف سن رہی تھی۔

"محترمہ سائرہ صاحبہ......آپ کیا فرماتی ہیں اس بارے میں......؟" ردا نے ایک، ایک لفظ چباتے ہوئے خاموش بیٹھی سائرہ کو شاملِ گفتگو کیا۔

"جوڑے......" سائرہ کے منہ سے آہستگی سے نکلا۔

☆☆☆

وہ تیزی سے باریک، باریک پیاز کاٹتی رہی، یہ پیاز بھی عورتوں کے لیے اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے، کتنے آنسو اس پیاز کی آڑ میں عورت بہا لیتی ہے، کتنی دفعہ سرخ، ڈبڈباتی آنکھوں کا عورت ایک ہی جواب دیتی ہے۔

"ابھی پیاز کاٹی ہے۔"

لیکن موسم تو سارے اندر ہوتے ہیں، باہر کے موسم کا دارومدار اندر کے موسم پر ہوتا ہے۔

اسے آج پیاز کے سہارے کی ضرورت پڑی

اور نہ ہی سرخ آنکھوں کے حوالے سے کوئی جھوٹی دلیل دینی پڑی۔

سائرہ بھی آج بہت خوش تھی، آج انعم کی چوڑی مہندی آئی تھی اور افطار کے بعد سے انعم کے ساتھ مل کر سب تیاریاں مکمل کرنی تھیں۔

"باجی، آج انعم باجی کی چوڑی، مہندی آ رہی ہے ناں؟" کچن میں اس کے ساتھ مدد کرتی ملازمہ نذیراں نے پوچھا۔

"ہاں......" سائرہ کا جواب مختصر تھا۔

"باجی چوڑی، مہندی کیا ہوتی ہے؟" اس نے دوسرا سوال کیا۔

"جسے تم لوگ عیدی کہتے ہو، ہم دہلی والے اس رسم کو چوڑی مہندی کہتے ہیں۔ لڑکی کی سسرال سے اس کا عید کا جوڑا، چوڑیاں، مہندی اور حیثیت کے مطابق کوئی سونے کی چیز بھی آ جاتی ہے، دلہن کے ساتھ، ساتھ خاندان کی تمام لڑکیوں کے لیے بھی چوڑیاں آتی ہیں، بہت خوب صورت رسم ہے مجھے بہت پسند ہے......اور......"

"باجی، جی آپ کی تو کبھی چوڑی، مہندی نہیں آئی ناں......اللہ آپ کا بھی کہیں رشتہ طے کر دے تو اللہ آپ کی خواہش بھی پوری کرے اور بڑی باجی (رخشندہ بیگم) کو بھی اطمینان ہوا۔" نذیراں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ہمدردانہ لہجہ میں کہا تو سائرہ کا دل چاہا اس کا سر پھاڑ دے۔

"ارے میں کیا شادی کے لیے مرے جا رہی ہوں......" لیکن پھر اس بیچاری کی محبت کی گہرائی کو محسوس کرتے ہوئے......وہ خاموش ہوگئی۔

گو کہ عمر کی چھبیس بہاریں دیکھ چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ بچہ جب ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو اس کا مقدر لکھ دیا جاتا ہے۔ اس کی زندگی موت، شادی بیاہ رزق سب اللہ کے ہاں لکھا ہوا ہے......اس کے نصیب میں کون ہے یا وہ کس کی تقدیر میں لکھی ہوئی ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی لیکن ہاں وہ اس بات پر ایمان رکھتی تھی، ہوگا وہی جو اللہ چاہے گا اور جب چاہے گا......ان تمام حقیقتوں پر ایمان کی حد تک یقین رکھنے والی وہ تھی ایک لڑکی ہی ناں......ریشم اور شہد سے گندمی، نرم و نازک، حساس دل رکھنے والی ایک لڑکی......اور لڑکی تو بس لڑکی ہوتی ہے......ہاں سب لڑکیوں کا دل ایک جیسا ہی تو ہوتا ہے۔

☆☆☆

اس پھولوں سے ڈھکے چھوٹے سے محبت دلا میں دو خاندان آباد تھے۔ نچلے پورشن میں توفیق احمد اور ان کی بیوی رخشندہ بیگم رہتے تھے۔ توفیق احمد کے

دو بچے تھے بڑے بیٹے جاوید احمد، ایم بی اے کر کے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے جبکہ بیٹی سائرہ زولوجی میں ایم فل کر رہی تھی۔

اوپر والے پورشن میں توفیق احمد کے چھوٹے بھائی راحت علی ان کی بیگم رقیہ اپنی چار بیٹیوں کے ساتھ رہتے تھے..... راحت علی کی چاروں بیٹیاں درمیانی صورت شکل کی تھیں لیکن قسمت ایسی کہ کہیں واں لگا نہیں اور سسرال سدھاریں اور اب سب سے چھوٹی بیٹی انعم بی ایس سی کی طالبہ ہی تھی کہ اس کی منگنی بھی ہوگئی۔

گوکہ رخشندہ بیگم اور رقیہ خاتون میں کبھی جیٹھانی اور دیورانی والے روایتی معاملات نہیں رہے..... دونوں کا بہناپا مشہور تھا لیکن اب رخشندہ بیگم کے دل نے رقیہ خاتون سے خود ساختہ ناراضی باندھ لی ان کی سوچ تھی کہ انہوں نے کبھی سائرہ اور ان کی بچیوں میں فرق نہ سمجھا اور نہ کبھی کہا..... لیکن رشتے طے کرتے وقت رقیہ بیگم ڈنڈی مار گئیں..... اور انہوں نے سائرہ کی فکر نہیں کی۔

جبکہ رقیہ بیگم، درحقیقت سائرہ کو بے حد پسند کرتی تھیں اور اس کے لیے بہت کوشش بھی کرتی تھیں... لیکن قسمت.....

☆☆☆

''شام کو اوپر چلنا ہے.....'' توفیق احمد نے رخشندہ بیگم سے کہا۔

''ارے میرا بس چلے تو بالکل ہی اوپر چلی جاؤں، میرا دل نہیں چاہ رہا..... میں نہیں جاؤں گی ویسے بھی آپ کی بیٹی منہ میں مجبور رکھتے ہی اوپر دوڑے گی..... سمجھاتے، سمجھاتے تھک گئی لیکن ہماری بیٹی..... ہماری بیٹی کو تو کسی کے چہرے پر ماسک ہی نظر نہیں آتا۔''

''توبہ ہے اماں کی بدگمانیاں.....'' سائرہ کا دل برا ہوا۔

''اس قدر تو چچی جان مجھ سے محبت کرتی ہیں، تف ہے شادی نہ ہوئی، پاکستان میں لوڈ شیڈنگ کا مسئلہ ہو گیا..... جو کبھی ختم ہی نہیں ہوتا..... بجلی آ رہی ہو تب بھی لوگ بجلی..... بجلی کر رہے ہوتے ہیں اور سب جانتے ہیں بجلی کا جب دل چاہے گا جائے گی اور جب دل چاہے گا آئے گی.....'' سائرہ نے جلدی، جلدی جگ کے ٹھنڈے پانی میں اورنج ٹینگ گھولتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔

اس کی اکلوتی بھابی میکے گئی ہوئی تھیں اور اسے آج اکیلے ہی سب سمیٹنا تھا اور وہ خاصی کام کا جو سلیقہ مند لڑکی تھی اس بات میں کوئی شک نہیں تھا.....

☆☆☆

رخشندہ بیگم کو سائرہ کی شادی کا بڑا ارمان تھا..... ایسا لگتا تھا جس دن سائرہ پیدا ہوئی تھی انہوں نے اس دن اس کے جہیز کا صندوق خرید لیا تھا..... جو اب ان کے ارمانوں سے زیادہ ابل رہا تھا۔ رخشندہ سولہ سال کی عمر میں بیاہ کر توفیق احمد کے گھر میں پائل چھنکاتی پھرتی تھیں..... نرم و نازک، نیلی آنکھوں والی سائرہ کو دیکھ کر وہ سوچتیں کہ ان کی بیٹی اتنی حسین ہے کہ شاید بابل کی دہلیز پر سولہ سال بھی پورے نہ کر پائے..... لیکن بیٹی کے چہرے کو دیکھ کر شاید وہ بھول گئی تھیں شادی بیاہ صورت شکل سے نہیں بلکہ نصیبوں سے ہوتے ہیں۔

سائرہ کا بیاہ سولہ سال کی عمر میں تو نہ ہو سکا لیکن وہ سولہ جماعتیں ضرور پڑھ گئی۔

''اماں..... ابا جلدی سے آجائیں افطار میں بس چند منٹ رہتے ہیں۔'' دسترخوان پر سموسوں کی پلیٹ سجاتے ہوئے سائرہ نے صحن میں بیٹھے اماں، ابا کو آواز دی۔ اماں کے ماتھے کے بل بتا رہے تھے کہ موڈ قطعی بحال نہیں ہوا۔

''ہائے میری پیاری اماں، مجھ سے کتنی محبت کرتی ہیں۔'' سائرہ نے ان کے غصے کو ایک مثبت پہلو سے سوچا.....

☆☆☆

بیٹیاں اللہ کی رحمت ہوتی ہیں لیکن بہت سی مائیں انہیں بوجھ بنا دیتی ہیں..... شادی کے علاوہ بھی لڑکیوں کی بہت سی خواہشات اور ارمان ہوتے ہیں، کاش وہ مائیں سمجھ جائیں جو بیٹیوں کی شادی کو زندگی و موت کا مسئلہ بنا دیتی ہیں..... اور رخشندہ بیگم..... رخشندہ بیگم کا بس نہیں چلتا تھا کہ سائرہ کی شادی کے لیے اقوام متحدہ میں قرارداد پیش کردیں..... ہر اس شامیانے میں آگ لگا دیں جہاں بیٹھی دلہن سائرہ نہیں ہو.....

کبھی کبھی چپ چاپ بیٹھی رخشندہ بیگم سے کوئی سوال کرتا۔ ''کیا چھبیس سال اتنی بڑی عمر ہے؟'' تو ان کے اندر بیٹھی ایک عورت جو ماں نہیں ہے وہ سمجھداری سے کہتی ''نہیں.....'' لیکن ان کے اندر فوراً ارمانوں، خواہشوں سے لدی پھندی ماں کہتی۔ ''لڑکیوں کی چھبیس سال عمر، کوئی عمر نہیں ہوتی لیکن ''بیٹی'' کی عمر بہت بڑی ہوتی ہے۔'' اور سائرہ تو ان کی بیٹی تھی ناں.....

☆☆☆

''چچی جان دیکھیے تو سہی یہ دوپٹا کس قدر خوب صورت ہے، یہ تو انعم پر بہت ہی اچھا لگے گا۔'' سائرہ نے ملٹی شیڈ نسلی اور دبکے کے کام کا دوپٹا پھیلاتے ہوئے رقیہ خاتون سے کہا۔

''ہاں ماشاء اللہ سارا ہی سامان بہت اعلیٰ اور نفیس ہے۔'' کمرے میں موجود چند خواتین میں سے ایک خاتون بولیں جو غالباً رقیہ خاتون کی کالج کے زمانے کی دوست تھیں اور آج کل امریکا سے آئی ہوئی تھیں۔

''میں عید پر پہن لوں امی؟'' انعم نے للچائی نظروں سے دوپٹے کو دیکھتے ہوئے ماں سے پوچھا۔ لڑکے والے جاچکے تھے اور اب سامان سلیقے سے رکھنے کے ساتھ، ساتھ قریبی عزیزوں کے حصے بخرے بھی لگ رہے تھے۔

''کوئی کچھ نہیں پہن رہا، پہلے کہا تھا دو سال بعد شادی کریں گے اور اب تاریخ کی ضد کر بیٹھے اور تاریخ لے کر ہی ٹلے.....'' انعم کی نانی جو سب کی اماں جان تھیں نے محبت بھری خفگی کا اظہار کیا۔

رخشندہ بیگم کے دل میں ہوک سی اٹھی.....

''اچھا اماں جان میں سونے کے لیے جا رہی ہوں، اللہ سب کام خیر و خوبی سے کروائے..... سائرہ تم بھی جلدی نیچے آجانا پھر سحری میں اٹھتے وقت تنگ کرتی ہو۔'' رخشندہ بیگم نے دل میں اٹھتی ٹیس کو دباتے ہوئے پُرسکون لہجے میں سب سے اجازت طلب کی اور کھڑی ہوگئیں۔

''میرے اللہ کوئی ایسا معجزہ کردے، میری بچی، انعم سے پہلے بیاہ دی جائے..... بس اللہ میاں، میری یہ خواہش پوری کردے، انعم تو بہت چھوٹی ہے۔''

ایک ممتا کی فریاد کاتبِ تقدیر نے بہت غور سے سنی..... اور معجزے تو ہر دور میں ہوتے ہیں ناں.....

☆☆☆

سارے گھر میں سکوت طاری تھا، رخشندہ بیگم کے کمرے کے دروازے کی جھری سے آتی روشنی بتا رہی تھی کہ وہ جاگ رہی ہیں۔ ہاتھ میں لفافہ لیے جاگ تو وہ بھی رہی تھی.....

زندگی میں پہلی بار اس کا دل، اس کی آنکھ اس تحریر کی سچائی کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھی کارڈ پر لکھا نام مٹ جائے.....

کارڈ پر لکھا جملہ اس کی مرضی کے مطابق تبدیل ہوجائے لیکن انسان کی مرضی اور خواہش کاتبِ تقدیر کی رضا کی محتاج ہوتی ہے اور کاتبِ تقدیر کی رضا..... کون جان سکتا تھا۔

☆☆☆

''جی کیا فرمایا آپ نے، میں اندر جا کر کیا کہوں؟'' وہ دروازے پر کھڑی اس کے جملے پر

حیرانی سے دوبارہ پوچھ بیٹھی۔
چھ فٹ سے نکلتا قد، کھلتا ہوا صاف رنگ، بڑی، بڑی گہری کچھ بولتی شرارتی مسکراتی حسین آنکھیں...... آنکھوں سے مطابقت رکھتے گہرے براؤن بال، آستینوں کے کف چڑھائے، بالوں سے ڈھکی مردانہ کلائیاں، کھلے گریبان سے جھلکتا چوڑا سینہ اور سینے پر جھولتی خوب صورت سونے کی چین...... یہ انسان ہے یا یونانی کہانیوں کا کوئی دیوتا......سیاہ شلوار، قمیص میں ڈھکے سجے اس کے وجود سے ہوتی سارہ کی نظر سیاہ پشاوری چپلوں میں بند اس کے حسین، گداز، سفید پیروں پر جیسے گڑ سی گئیں۔
''محترمہ اگر آپ میرا جائزہ لے چکی ہوں تو میں آپ کی بات کا جواب دے دوں۔'' اس نوجوان نے اس کی چوری کو نہ صرف پکڑا بلکہ جتایا بھی.
سارہ کو ایک عجیب سی شرمندگی نے آگھیرا......
''لعنت ہو سارہ......ایسی بھی کیا بے خودی......'' دماغ نے جھڑکا لیکن دل......؟
''ہاں تو محترمہ آپ اندر جا کر کہیے کہ جن خاتون کا بیٹا سب سے زیادہ خوب صورت ہے وہ آجائیں کہ ان کا بیٹا انہیں لینے آیا ہے۔''
اور سارہ نے یہ کہہ بھی دیا تھا پھر واقعی اس کے جملے پر رقیہ خاتون کی سہیلی ہنستی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

☆☆☆

''یا اللہ تجھ سے زیادہ دلوں کے بھید کون جانتا ہے، میں نصیب پر صابر اور شاکر رہنے والی لڑکی ہوں...... بچپن سے لے کر آج تک میں نے کبھی ضد نہیں کی...... کیونکہ مجھے تیری رحمت پر ایمان ہے......
لیکن اللہ میاں جی آدمی اپنے پیاروں سے دینے والوں سے ہی تو ضد کرتا ہے ناں...... میرے اللہ مجھے بھی...... میرے نصیب میں حیدر کو لکھ دے...... اللہ میاں آپ کے لیے کون سی بات بڑی ہے، تقدیر کا قلم تو آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اے اللہ میاں، میری دعائیں سن لے......'' وہ بہت جذب کے عالم میں محو دعا تھی۔ اس کی آنکھ سے چند آنسو اس کے چہرے پر سے ہوتے ہوئے اس کے گریباں میں جذب ہوگئے۔

☆☆☆

''جی امریکا میں رہتی ہیں، حیدر کمپیوٹر انجینئر ہے، جی بچپن ہی سے رشتہ طے ہے اب نکاح کرنے آئے ہیں تاکہ لڑکی کے پیپرز تیار ہوسکیں۔'' رقیہ خاتون نے رخشندہ بیگم کے سوالوں کا جواب دیا......
''تو تم سارہ کے لیے کوشش کرتیں......''
رخشندہ بیگم کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔
''ارے بھابی، سارہ میری اپنی بچی ہے، یقین جانیں اگر کوئی میرا بیٹا ہوتا تو میں سارہ کو کہیں جانے تھوڑی دیتی...... لیکن حیدر کا رشتہ بچپن ہی سے اس کی خالہ زاد کے ساتھ طے ہے جبکہ شہلا (حیدر کی ماں) کے میاں کی اس کے بہنوئی سے ذرا نہیں بنتی لیکن اس کے باوجود شہلا اور اس کی بہنیں اس رشتے کو گھسیٹ رہے ہیں......''
پھر رخشندہ بیگم چپ ہوگئیں، جب سے انہوں نے حیدر کو دیکھا انہیں لگا ان کی پریوں جیسی بیٹی کے لیے ایسا ہی لڑکا ہونا چاہیے اور زندگی میں پہلی مرتبہ انہیں سارہ کے چہرے پر بھی ایک خواہش لکھی نظر آئی...... جو صرف ایک ماں ہی پڑھ سکتی ہے......
اور رخشندہ بیگم نہ صرف پڑھ رہی تھیں بلکہ سارہ کے حق میں اللہ کے بہترین فیصلے کی دعا بھی کر رہی تھیں......

☆☆☆

سارہ وہ لڑکی تھی جس نے اپنے اندر اٹھتے کسی غیر مرد کی محبت یا پسندیدگی کے جذبے کو ہمیشہ کچلا لیکن حیدر وہ سارے ارادے توڑتا اس کے اندر براجمان ہوگیا تھا۔
اسے زندگی میں پہلی بار وہ مرد پسند آیا جس کی زندگی میں وہ کہیں نہیں تھی لیکن کیا واقعی، سارہ، حیدر کی زندگی میں کہیں نہیں تھی۔

☆☆☆

''میں تم سے بات کر رہی ہوں اور تم...... تم نہ جانے کہاں گم ہو۔'' میریٹ کے یخ بستہ ماحول میں بوبی نے غصے سے کہا...... سیدھی سادی شلوار قمیص پر، سینے پر بڑا سا دوپٹا پھیلائے...... کمر پر جھولتی لمبی چوٹی سے نکلتی شریر لٹوں کو بار، بار بے دردی سے کانوں کے پیچھے اڑستی، آنکھوں میں حیرت لیے دروازے کے پٹ کو تھامے سوال کرتی حیران' حیران سی مسکراتی وہ لڑکی، جس کا وہ نام بھی نہیں جانتا تھا اسے سونے نہیں دے رہی تھی......اور اس کا تو آج کل وہ حال تھا بقول مومن......

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

گہرے نیلے رنگ کی کھلے گریبان کی ٹاپ اور جینز، layers میں کٹے بال اور خوب صورتی سے کیے گئے میک میں وہ اچھی لگ رہی تھی...... اور چند دن پہلے تک بوبی اسے بہت خوب صورت لگتی تھی اور آج صرف اچھی لگ رہی تھی۔
وہ تیزی سے بدلتی اپنی فیلنگز پر حیران تھا۔
''حیدر...... میں تم سے کچھ کہہ رہی ہوں۔''
بوبی نے اپنی خوب صورت سی ناک سکوڑی۔
''سن رہا ہوں یار...... سن رہا ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ تم الجھتی بہت ہو......''
''تم کیسے مڈل کلاس مردوں جیسا بی ہیو کرنے لگے ہو حیدر، میں چند دن سے نوٹ کر رہی ہوں...... جیسے آج تمہیں میری شرٹ کی فٹنگ پر اعتراض ہو رہا ہے اور ...remember یہ شرٹ تم ہی نے بھیجی تھی۔'' بوبی کو ابھی تک اس بات پر غصہ تھا کہ اس کی تعریف کرنے کے بجائے حیدر نے اس کی تیاری پر آج زندگی میں پہلی بار اعتراض کیا......

کاجل

دیکھو میری آنکھ کا کاجل
بھیگ رہا ہے کیسے پل پل
دیکھو میری ذات سمندر
جس کا نہ ہے کوئی ساحل
دیکھو میرا صحرا جیون
جس میں سایہ نہ ہی بادل
دیکھو ہم تو ایک ازل سے
دور ہوا کیوں میرا سانول
یاد ہے پورے چاند کی شب تھی
میں اور تم، اور پاگل سا دل
دیکھو زیست کا عنواں تم ہو
تم بن ہے یہ زیست لاحاصل

شاعرہ: غزل شاہین، رحیم یار خان

نظم

ماں مجھے نیند کیوں نہیں آتی
یک دم اک دلفریب مدھری آواز
جیسے کلیوں کے چٹخنے کی صدا
بہتے جھرنوں کی صدا
میری سماعتوں کو چھونے لگی
لوری سناتی، سہلاتی اور گدگداتی
میں نے چونک کر آنکھ کھولی تو روبرو ماں کو پایا
مسکراتی، ہنستی ہوئی، قہقہے لگاتی فرما رہی تھی
میں تیرے پہلو میں ہوں...... تیری سوچ اور خیالوں میں بھی
میری بانہوں کے جھولے میں، سرو دسحر تک سوجاؤ
میری رانی، میری جانی
آج بھی تاریک راتوں میں
تاروں اور چاند کی گھاتوں میں
اپنے تصور میں جب ماں کی رفاقت کو پاتی ہوں
تو پل میں میٹھی نیند میں چلی جاتی ہوں

شاعرہ: رفاقت جاوید، اسلام آباد

ہر مرد اندر سے کنزرویٹو ہی ہوتا ہے وہ لاکھ عشق چلائے، منہ مارتا پھرے لیکن بیوی اسے ڈھکی چھپی ہی اچھی لگتی ہے...... وہ لاکھ فائیو اسٹار ہوٹلز میں کھانا کھائے لیکن کچن میں دال کو بگھار دیتی، توے پر روٹی سینکتی عورت ہی مرد کو اچھی لگتی ہے...... کیونکہ اس دال روٹی میں اس کی محبت...... اس کا خلوص اور وفا شامل ہوتی ہے۔

مرد لاکھ حسن پرست ہو لیکن اسے اپنے لیے وہ عورت جو صرف اس کے لیے سجتی، سنورتی ہو...... وہی اچھی لگتی ہے۔ بوبی مسلسل بول رہی تھی اور حیدر...... حیدر جو ایک ماڈرن لڑکا تھا اس کا دل معجزاتی طور پر بدل رہا تھا۔

☆☆☆

''تم بھی چلو سائرہ، انہوں نے بہت محبت اور تاکید سے بلایا ہے۔''

''نہیں اماں میں بہت تھک گئی ہوں، سارا دن کام کرتے، کرتے میری ٹانگیں شل ہو گئی ہیں۔ آپ بھابی کو لے جائیں پھر چچا جان کی بھی تو پوری فیملی جارہی ہے۔''

''ہاں، ہاں نمرہ بھی جارہی ہے۔'' رخشندہ بیگم نے اپنی اکلوتی بہو کے حوالے سے کہا۔

آج عید تھی اور اتفاقاً چاند تمیس کا ہو گیا تو عین عید والے دن بارات ٹھہری سو سب حیدر کی بارات کے ساتھ جارہے تھے اور پھر سب کے اصرار کے باوجود وہ نہ جاسکی...... کہ وہ حساس دل رکھنے والی ایک لڑکی تھی۔

ہو سکتا ہے وہ حیدر کو یاد بھی نہ ہو...... وہ بھول چکا ہو کہ ان چند دنوں میں اس پتھر جیسی لڑکی کے وجود میں اس کی محبتوں نے دراڑیں ڈال دیں۔

وہ حیدر کی شادی میں شریک ہو نہیں سکتی تھی، اسے اندھی محبت ہوئی تھی، تکیوں میں سر دیے وہ اس شخص کے لیے رو رہی تھی۔ اللہ سے اسے مانگ رہی تھی۔

وہ اس سے مانگ رہی تھی جسے پھیلے ہوئے ہاتھ پسند ہیں اور وہ پھیلے ہوئے ہاتھ بھر دیتا ہے......

وہ اسے مانگ رہی تھی جسے اس نے دوبارہ دیکھا تک نہیں تھی...... لیکن اس سے محبت کی دعویدار تھی...... وہ اس کی محبت کی اس کی رفاقت کی طلبگار تھی۔

وہ سجدے میں اپنی بے نام کیفیت پر رو رہی تھی اور کاتب تقدیر اس کے آنسوؤں پر ہنس رہا تھا۔

☆☆☆

''یہ سب کیا ہے بھابی......'' سب کمرے سے باہر جاچکے تھے اور نمرہ اسے باتھ روم کی طرف دھکیل رہی تھی اور انعم جلدی، جلدی سرخ حسین دیکے، سلمی اور نگینے سے سجا قیمتی غرارہ سوٹ استری کررہی تھی۔

''آپ کی آج بارات ہے، ابھی اسی وقت آپ کی رخصتی ہے، جتنی دیر کریں گی، آپ کا اپنا ذاتی نقصان ہے لہٰذا فوراً باتھ روم میں گھس جائیں اور پانچ منٹ میں شاور لے کر باہر آجائیں۔''

''رخصتی ہے...... مگر کیسے؟ اور کس کے ساتھ......؟'' سائرہ سراپا سوال تھی۔

☆☆☆

''ارے بس بات تو کچھ بھی نہیں تھی حیدر میاں امریکا میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے، بچپن کی منگنی تھی، عین نکاح کے وقت حیدر میاں نے شرط رکھ دی کہ لڑکی کو وہ برقع اڑھائیں گے گو کہ بات معمولی تھی لیکن بہت بڑھ گئی...... نہ حیدر میاں اپنی بات سے ہٹنے کے لیے تیار اور بھئی لڑکی کا باپ بھی بہت ضدی آدمی تھا۔

سو بارات لوٹا دی گئی...... شہلا بیگم کہتی تھیں، بغیر دلہن کے گھر جاؤں گی تو بہت سبکی ہوگی...... میں تو چپ چاپ بیٹھی سب دیکھ رہی تھی میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی...... حیدر میاں خود...... ہاں، ہاں خود میرے پاس چل کر آئے اور مجھ سے سائرہ کو مانگا......

سو بس حیدر میاں کے منہ سے نکلنا تھا کہ سب ہی میرے اور سائرہ کے ابا کے پیچھے پڑ گئے...... اور ہاں کروا کر ہی چھوڑی...... ہاں بس ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے۔ لڑکیاں، بالیاں سائرہ کو تیار کررہی ہیں، پوری بارات گھر میں بیٹھی ہے، میرے تو ہاتھ پیر پھولے جارہے ہیں، تم بس فوراً چلی آؤ...... ہاں ہاں رخصت ابھی کررہی ہوں...... جہیز انشاء اللہ دو دن بعد بھیجوں گی...... بس جلدی چلی آؤ اور بڑے بھیا کو بھی کہہ دو ان کا فون نہیں مل رہا۔'' رخشندہ بیگم نے ساری تفصیل اپنی چھوٹی بہن کو فون پر بتائی۔

☆☆☆

''مبارک ہو......لو بھئی...... عید ہو تو ایسی......''

نمرہ نے بجی سنوری، حیدر کے پہلو میں بیٹھی، سائرہ کو اپنے بازوؤں میں لے کر بھینچتے ہوئے نکاح کی مبارک باد دے دی......

''اور یہ مٹھائی بھی کھاؤ...... جو نماز کے بعد جب ابا لائے تو آپ نے یہ کہہ کر مٹھائی واپس رکھ دی کہ اس عید پر مٹھائی کھانے کا دل نہیں چاہ رہا...... اور اب......؟'' انعم نے ہنستے ہوئے برفی کا ٹکڑا زبردستی سائرہ کے منہ میں ٹھونسا......

''اور اب، اب تو دل چاہ رہا ہے، ساری مٹھائی میں ہی کھا جاؤں۔ شاید آج شہر میں ساری مٹھائی میری خوشیوں کے لیے بنائی گئی اور خریدی گئی۔'' سائرہ کے دل نے گواہی دی۔

حیدر نے محبت سے پہلو میں بیٹھی اپنی رفیقۂ حیات سائرہ کا محبت سے ہاتھ تھام لیا، جس کے لیے زندگی میں شاید پہلی بار اس نے سجدے میں گر کر اللہ سے معجزے کی التجا کی......

ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھے، دولہا، دلہن بنے دونوں یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک دوسرے سے کوئی عہد و پیمان کیے بغیر دونوں نے ایک دوسرے کو چاہا تھا...... کوئی جانے یا نہ جانے لیکن آسمان کی وسعتوں میں بیٹھا کاتب تقدیر بخوبی جانتا تھا۔

''میں نے صحیح کہا تاں ردا کہ جوڑے آسمانوں پر ہی بنتے ہیں اور معجزے بھی اس دنیا میں ہی ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ہم کسی سے ملتے ہیں اور اس کو طلب کر بیٹھتے ہیں، وہ ہم کو آسمان والے کی رحمت سے ملتا ہے اور ہم کفر بولنے لگتے ہیں کہ ہم نے چاہا، ہم نے پالیا اور جوڑے زمین پر ہی بنتے ہیں، نہیں، جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں اور میں اپنے رب کی شکر گزار ہوں، جس نے میری دعا سنی، جس نے میری طلب کو میری تقدیر میں لکھ دیا۔ افسانے ناول پڑھ کر میں کتنا ہنستی تھی کہ زندگی میں ایسا کہیں کچھ نہیں ہوتا لیکن ہوتا ہے۔'' آدھی رات کو بستر سے سوتے، سوتے اٹھ کر دلہن بنی سائرہ نے کن انکھیوں سے ہنستے مسکراتے ہوئے انعم کی چھیڑ خانیوں کا جواب دیتے، گھونگٹ کی آڑ سے نظر آتے حیدر کو دیکھتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے کہا اور سر جھکا کر مسکرادی۔

☆☆☆

رخشندہ بیگم نے بجی سنوری مطمئن خوش، حیدر کے پہلو میں بیٹھی بیٹی کو دیکھا......

''واقعی شریف لڑکیوں کے نصیب سرخ ریشمی رومال میں لکھے ہوتے ہیں، شریف، صابر اور باحیا لڑکی کا نصیب قابل دید ہوتا ہے اور ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ اللہ تو اتنا بڑا منصف ہے کہ میرے بدگمان دل کو صاف کرنے کے لیے رشتہ بھی رقیہ کے توسط سے جوڑا۔ میرے مالک مجھے معاف کردے، میں بہت ناشکری اور بدگمان ہو گئی تھی۔''

رخشندہ بیگم نے اپنے آپ کو سرزنش کی...... رات کے ڈھائی بج رہے تھے، شہلا رخصتی کا شور مچا رہی تھیں۔

ہر طرف خوشیاں تھیں، قہقہے تھے، مسکراہٹیں تھیں اور رخشندہ بیگم بے ساختہ رقیہ بیگم کو سینے سے لگا کر کہہ رہی تھیں...... عید مبارک......







منی ناول



زندگی خاک نہ تھی

شیریں حیدر

دوسرا حصہ



میری جگہ کوئی اور لڑکی بھی ہوتی تو عمر کی کنپٹی پر رکھی ہوئی انگوٹھی اور ریوالور میں سے ریوالور نہ اٹھاتی...... میں عمر کی محبت کی شدت سے متاثر صرف متاثر ہی نہیں ہوئی بلکہ ڈر گئی تھی، ان کی اتنے دھڑلے اور دھونس کی محبت کا اور بھلا کیا نتیجہ نکل سکتا تھا...... مجھے عمر کے جذبوں کی سچائی کو ماننا پڑا...... اس کے بعد کا مرحلہ سب سے اہم تھا یعنی اس بات کا انکشاف میرے پاپا اور مما کے سامنے کرنا اور انہیں منانا۔ عمر کو اپنے

جذبوں کی صداقت پر یقین تھا اور وہ کہتے تھے کہ میری رضا کو اپنی رضا میں شامل کرنا ان کے لیے مشکل ترین مرحلہ تھا، میرے ماں باپ کو وہ اسی طرح منالیں گے جس طرح وہ اپنی اماں سے بحث و تمحیص کر کے انہیں منا چکے تھے...... جانے کہاں، کہاں سے رابطے ڈھونڈ نکال کر انہوں نے میرے پاپا کو کہلوایا اور اپنے لیے بات کرنے کی راہ ہموار کی۔

کاروباری حلقوں میں اگر پاپا کا بڑا نام تھا تو عمر بھی کچھ کم نہ تھے، وہ تو چیمبر آف کامرس کے صدر بھی تھے اور اتنی سی عمر میں ان کی کامیابیاں کاروباری حلقوں میں بہت رشک سے دیکھی جاتی تھیں۔ عمر نے اپنے انہی دوستوں اور کاروباری حلقوں کے روابط کو استعمال کیا تھا اور پاپا تک اپنا مسئلہ ان دوستوں کے ذریعے پہنچایا تھا۔ پاپا کے دل میں یہ خیال تھا کہ شاید وہ مجھ پر ظلم کر رہے ہیں مگر میرا عندیہ دریافت کیا تو میں نے اپنی رضامندی دے کر ان کے سر سے ایک بڑا بوجھ اتار دیا تھا۔ یہ شہر کی ایک بڑی کاروباری شادی تھی۔ دو بڑے بزنس ٹائیکون آپس میں نئے رشتے میں بندھ رہے تھے، برسوں تک لوگوں نے اس شادی کو یاد رکھا تھا، سسرال میں بھی مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔

عمر سے میری بات طے ہونے اور ہماری شادی کے درمیان بہت تھوڑا عرصہ تھا، میری رخصتی سے پہلے ہی عمر نے اماں کے کہنے پر ملیحہ کو فارغ کر دیا تھا، انہوں نے عمر سے کہا تھا کہ ملیحہ اس گھر میں یوں بھی فالتو سامان کی طرح پڑی رہتی تھی، عمر کی نئی شادی کے بعد اس کی حیثیت اور بھی کم تر ہو جاتی، عمر شرعی طور پر دو شادیاں تو کر سکتے تھے مگر دل کے ہاتھوں مجبور تھے کہ دو بیویوں کے ساتھ ایک سا سلوک روا نہیں رکھ سکتے تھے...... اس ناانصافی کے لیے انہیں اللہ کے روبرو جواب دہ ہونا ہوگا اس لیے بہتر ہے کہ ملیحہ کو اس کی زندگی اپنے ڈھب سے جینے کا اختیار دیا جائے۔ ماں تھی نا...... قطعی نہیں چاہتی تھیں کہ ان کا بیٹا آخرت میں بھی اپنے کسی کیے کے ہاتھوں خدا کے حضور شرمندہ کھڑا ہو۔ ہماری شادی کے چند ماہ کے بعد ملیحہ کی اپنے خاندان میں ہی ایک امیر رنڈوے سے شادی ہو گئی تھی، بچے پہلے ہر ہفتے ماں سے ملنے جاتے تھے مگر آہستہ، آہستہ اس میں وقفہ بڑھنے لگا تھا، ہفتے، مہینے میں اور مہینہ کئی مہینوں میں بدل گیا۔

شادی کی پہلی رات ہی عمر نے اپنی وارفتگیوں کے اظہار کے ساتھ مجھے بتا دیا تھا کہ مجھے ان کی ہم سفر اور ہمنوا بن کر رہنا ہے اور مزید بچوں کی خواہش نہیں کرنی، ان کے ملیحہ سے چار بچے تھے اور اسی گھر میں رہتے تھے، بڑی بیٹی ہادیہ جسے سب بلی کہتے تھے اور اس کے بعد تین بیٹے...... سکندر، حاشر اور خضر تھے، خضر سب سے چھوٹا بھی ہماری شادی کے وقت پانچ برس کا تھا، مزید بچوں کی انہیں خواہش نہ تھی۔ اس وقت تو میں بھی عمر کے اس حصے میں تھی کہ ایک پیار کرنے والا جیون ساتھی پا کر یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ دنیا میرے قدموں میں ڈھیر ہو گئی...... اس لیے عمر کا مطالبہ مجھے نہ اتنا اہم لگا اور نہ ہی بے جا۔

محبت کا نشہ سر چڑھ کر بول رہا تھا، عمر نے کوئی خواہش میرے منہ سے نکلنے دی نہ دل میں پنپنے، اس سے پہلے ہی سب کچھ میرے قدموں میں ڈھیر کر دیتے تھے، کوئی عورت اور کیا خواہش کر سکتی ہے...... انہیں محبت کے سارے ڈھنگ آتے تھے۔ جو مجھ سے کوئی پوچھتا کہ میری کوئی ادھوری خواہش تو میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ ہوتا، دنیا کی کون سی خوب صورت جگہ ہے جہاں عمر مجھے لے کر نہیں گئے...... رانیہ کے بیٹے مصطفیٰ کی پھیپھڑوں کی سرجری تھی تو وہ مجھے اپنے ساتھ کینیڈا لے کر گئے، جب تک رانیہ اسپتال میں رہی ہم دونوں ایک ہوٹل میں رہے، دن بھر میں رانیہ کے ساتھ وقت گزارتی اور رات کو ہم واپس لوٹ آتے...... مصطفیٰ اسپتال سے فارغ ہوا تو ہم سیر و تفریح کے لیے نکلے اور کئی ملکوں سے گھومتے گھامتے واپس وطن لوٹے تھے۔

میری بہنوں کی شادیوں پر عمر نے بڑے بھائی کی کمی پوری کر دی، پاپا کے ساتھ وہ ہر کام میں پیش پیش ہوتے بلکہ پاپا کو آرام کرنے کا کہتے اور خود کام کرتے۔ مما اور پاپا کو اپنے فیصلے پر اگر کوئی کسک تھی بھی تو عمر کے رویے نے انہیں سب کچھ بھلا دیا۔ میں خوش تھی، عمر میری... خوشی کا خیال کرتے تھے تو بدلے میں مجھے ان کا، ان کی اماں کا اور ان کے بچوں کا خیال رکھنا تھا۔ بچوں سے میری دوستی ہو گئی تھی، عمر نے ہماری شادی سے قبل اپنے بچوں کو بھی اعتماد میں لیا تھا...... عمروں میں کم مگر ماں باپ کے حالات کی وجہ سے وقت نے انہیں پہلے ہی سمجھدار بنا دیا تھا اور میں نے بھی ان سے کبھی سوتیلی ماں کی طرح برتاؤ نہیں کیا تھا بلکہ مجھے ان پر ترس آتا تھا کہ ماں اور باپ دونوں نے دوسری، دوسری شادی کر لی تھی، انہیں پیار کی ضرورت تھی۔ میں ماں نہیں بنی تھی مگر میرے اندر مامتا تو تھی سو میں ان پر لٹاتی۔

میری ساس بھی مجھ سے خوش تھیں۔ ساس بہو کے مسائل وہاں پیدا ہوتے ہیں جہاں غالباً مالی مسائل ہوتے ہوں گے، اس گھر میں ہر چیز وافر تھی اس لیے کسی کو کسی سے بغض تھا نہ اختلاف۔ ہاں گھر میں اگر ملیحہ بھی ہوتی تو چاہے وہ گھر میں کسی فالتو چیز کی طرح پڑی ہوتی مگر اس کا وجود غالباً مجھے مانند خار کھٹکتا رہتا کہ بچوں کی ماں ہونے کی حیثیت سے اس کی اہمیت تو بہر طور قائم رہتی اور بچوں کی زندگیوں کے بارے میں فیصلے کرتے وقت اس کی رائے کو اہمیت دی جاتی۔ عمر نے زندگی کو بہت اعتدال میں رکھا تھا، ماں کی رضا سے خاندان میں شادی کر کے اولاد بھی پیدا کر لی تھی اور بعد میں ان کی رضا حاصل کر کے مجھ سے شادی کر لی تھی جس سے ان کے اپنے دل کی مراد بھی پوری ہو گئی تھی اور ان کے بچوں کو ایک پڑھی لکھی ماں مل گئی تھی۔

مما ان دنوں صدف کی اچانک طے پا جانے والی شادی کے لیے پریشان ہو رہی تھیں تو میں ان کی مدد کے خیال سے وہاں چلی گئی۔ ثانیہ خالہ بھی ملتان سے آئی ہوئی تھیں، میری اور خالہ کی عمروں میں چند ایک سال کا تفاوت ہی تھا، مما سب سے بڑی بہن تھیں پھر چار بھائیوں کے بعد ثانیہ خالہ اس وقت پیدا ہوئیں جب مما جوان ہو چکی تھیں اور ان کی شادی کی تاریخ بھی طے ہو چکی تھی...... مما نے ثانیہ خالہ کو اس طرح پیار دیا اور پالا تھا جیسے وہ ان کی بیٹی ہوں۔ خالہ اور میں نے مل کر صدف کی شادی کی تیاری کے سلسلے میں مما کی مدد کی تھی۔ پاپا کاروباری سلسلے میں ملتان گئے تھے تو واپسی پر خالہ کو لے آئے تھے...... مما کے لیے کام ڈھیروں کام تھا، رانیہ پاکستان نہیں آ سکتی تھی، صدف اپنے ویزے کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کر رہی تھی اور فاطش اپنی پڑھائی میں مصروف......

پڑھائی میں مصروف فاطش کی کتابوں اور کاپیوں کے بیچ ...سارا دن اس کے موبائل پر ٹنک، ٹنک کی آواز آتی رہتی۔ میں نے اس سے پوچھا بھی مگر اس نے سنی ان سنی کر دی۔ ہم نے تو اپنی زندگی ماں باپ سے ڈر کر، ان کے احترام میں اور ان کی عزت کا پاس کرنے میں گزاری تھی مگر اب یہ موبائل ٹیلی فون جانے کس طرح کا روگ ہے جو ہماری پوری نسل کو برباد کر رہا ہے......

''اپنی دوستوں سے پڑھائی کے سلسلے میں ہی دن بھر کچھ نہ کچھ پوچھنا پڑتا ہے یار، تم کیوں پریشان ہوتی ہو......'' اس نے مجھے بہلا دیا مگر میں اس کے بدلتے انداز دیکھ رہی تھی۔ میری اور رانیہ کی شادیوں کی نسبت، صدف کی شادی تو بالکل سادگی سے ہوئی تھی، اس کا لندن میں داخلہ ہو گیا تھا جہاں مما بالخصوص اسے تنہا نہیں بھیجنا چاہتی تھیں، احمد سے اس کی منگنی تو بہت سال پہلے ہو چکی تھی، دونوں کزن ہی نہیں، کلاس فیلو بھی تھے سو فوراً نکاح اور رخصتی کا پلان بنا اور نکاح کی تقریب کے تین دن کے بعد وہ دونوں لندن روانہ ہوئے۔ میں نے اس دوران فاطش کا عجیب و غریب سا رویہ دیکھا، پاپا کے ساتھ، مما کے ساتھ اور خالہ کے ساتھ بھی۔

خالہ اپنا گھر بار چھوڑ چھاڑ کر مما کی مدد کے خیال سے اپنا سب کچھ بھلا کر ہمارے ہاں اٹھ آئی تھیں اور

فاطش ان سے اتنی بدمزاجی سے بات کرتی تو مجھے دل سے دکھ محسوس ہوتا، وہ کیا سوچتی ہوں گی، مجھے خیال آتا مگر فاطش کی کڑوی کسیلی باتوں کے جواب میں خالہ کے ماتھے پر بل بھی نہ آتا۔ خالہ کو تو اللہ نے اولاد کی نعمت سے بھی محروم رکھا تھا...... ان کا دکھ کون سمجھ سکتا تھا، میں اب خود بھی اپنی اس محرومی کو بہت بری طرح محسوس کرتی تھی، اس لیے میں خالہ کی دلی کیفیت کو محسوس کر سکتی تھی۔

صدف اور احمد کے نکاح کے اگلے روز ہی عمر نے مما پاپا اور احمد کے گھر والوں کی ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں شاندار دعوت کی تھی۔ میرے خاندان کے سب لوگ عمر کی عادات اور اخلاق کے گرویدہ تھے، ان میں صلاحیت بھی تھی دوسروں کے دل جیتنے کی...... میرا دل بھی تو انہوں نے اسی طرح جیتا تھا۔ کھانے کے دوران فاطش میرے ساتھ ہی بیٹھی تھی، وہاں بھی میز کے نیچے اس کا موبائل فون اس کے ہاتھ میں تھا اور اس پر مسلسل ٹک، ٹک ہو رہی تھی۔ ”مما سے بات کرنی پڑے گی، یقیناً فاطش بھی کسی چکر میں مبتلا ہو گئی ہے، یونیورسٹی میں پڑھتی ہے، ممکن ہے کہ کسی لڑکے کے جال میں پھنس گئی ہو۔“ مجھ میں اور اس میں عمروں کے تفاوت کے باعث ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کے برابر تھی کیونکہ میں سب سے بڑی اور وہ سب سے چھوٹی...... صدف کو لندن چلے جانا تھا۔ ”جانے کون فاطش سے باز پرس کر سکتا ہے۔ مما!“ میں نے سوچا۔ ”ہاں...... مما کو بتانا پڑے گا کہ انہیں فاطش پر نظر رکھنی چاہیے، اس کی سرگرمیوں پر اور اس کے فون کے استعمال پر بھی۔“

☆☆☆

”رانیہ آپی!“ پیغام کی ٹون بجی تو میں نے فون آن کیا، صدف کا پیغام تھا۔ ”جاگ رہی ہیں؟“ عابد نے اگلے ہی دن میری سم اپنے ایک پرانے فون سیٹ میں ڈال دی تھی مگر پہلا فون دھل جانے کے باعث مجھے سارے فون نمبرز ایک ایک کر کے اس میں محفوظ کرنا تھے یا پھر وقت ملتا تو کمپیوٹر سے اس میں سارا ڈیٹا منتقل کرتی، پہلے مرحلے میں، میں نے گھر والوں کے فون نمبر اس میں ڈالے اور باقی کام میں نے کسی اور وقت کے لیے چھوڑ دیا۔

”تمہارے تو رات کے دو بجے ہیں، تم کیوں جاگ رہی ہو ابھی تک......؟“ میں نے بستر چھوڑتے ہوئے سوال لکھا۔

”بس پریشانی میں نیند ہی نہیں آئی آپی......“

”خیریت ہے میری جان؟“ میں گھبرا گئی۔

”سب ٹھیک تو ہے ناں، احمد ٹھیک ہے؟“

”میں اور احمد تو ٹھیک ہیں آپی، مما کی طرف سے پریشانی ہے......“ اس نے کہا تو میں نے گہری سانس لی۔

”ہم م م......“ میں نے کچھ سوچ کر پیغام ٹائپ کیا۔ ”کیا ہوا مما کو؟“

”مما نے ایک عجیب سی بات کی ہے آپی!“ اس نے جواب دیا۔ ”ممکن ہے کہ انہوں نے آپ سے بھی وہ بات کی ہو، اگر نہیں بھی کی تو بھی مجھے سب سے پہلے خیال آیا کہ میں آپ سے بات کروں......“

”کیا عجیب بات کی ہے مما نے؟“ تو گویا جو کچھ مما نے مجھ سے کہا تھا وہ صدف سے بھی کہا تھا، اس کا مطلب ہے کہ یہ مذاق نہیں ہو سکتا...... مگر پھر بھی میں صدف سے پوچھ کر تصدیق کرنا چاہ رہی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مما نے اسے کوئی اور پیغام بھیجا ہو۔

”مما نے......“ وہ کچھ کہتے، کہتے رکی۔ ”عابد بھائی کہاں ہیں؟“

”عابد چلے گئے ہیں اور میں بھی تھوڑی دیر میں نکلنے والی ہوں......“

”کوئی اور تو پاس نہیں آپ کے...... فون کا اسپیکر تو آن نہیں؟“

”بے فکر ہو کر بات کرو صدف، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

”مما نے میرے ساتھ بات کی تھی کل اسکائپ پر...... اچانک کہنے لگیں کہ انہوں نے پاپا سے خلع لینے کا فیصلہ کر لیا ہے......“ بات کرتے ہی وہ دھواں دار

رونے لگی جبکہ میرے خاموش نوحے آنسوؤں کی صورت میرے گالوں پر پھسل رہے تھے۔

”آیا تھا مجھے بھی مما کا پیغام......“ میں نے آنسو ہاتھ کی پشت سے مسل کر صاف کیے، برش پر ٹوتھ پیسٹ لگایا۔ ”میں دفتر پہنچ کر تم سے بات کروں گی جب تمہارے صبح کے سات بجیں گے، تم یونیورسٹی نہیں جا رہی ہو کیا؟“

”ہاں مجھے جانا ہے، اس وقت میں ٹیوب میں ہوں گی......“ اس کا جواب آیا۔ ”مگر میں کوئی بہانہ کر کے آج احمد سے فون لے جاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے اب تم سونے کی کوشش کرو، مجھے بھی تیار ہونا ہے......“ میں نے کہا۔ ”لو یو میری جان!“

”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے آپی، نیند بھی نہیں آ رہی۔“ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

”احمد کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا، حیران تھی کہ وہ کس طرح بات کر رہی ہے، کیا وہ احمد کے سامنے ہی بات کر رہی تھی۔

”احمد کی آج رات کی ڈیوٹی ہے، صبح چار بجے آ جائے گا۔“

”درود شریف پڑھو اور کوشش کرو تو نیند آ جائے گی۔“ میں نے کہہ کر فون بند کیا اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے آئینہ دیکھنے لگی۔ ’آخر ایسا کیوں کہا مما نے؟‘ میں نے دل میں سوچا۔ ’اس وقت تو شام ہو گی وہاں اور پاپا بھی گھر پر ہوں گے، کیا انہیں فون کر کے پوچھوں...... نہیں، شام کو کروں گی جب ان کی صبح ہو گی۔‘

”مجھے واپسی پر نہ لینے آیئے گا عابد، مجھے کسی کولیگ کے ساتھ کافی پر جانا ہے، وہی مجھے گھر پر چھوڑ دے گی۔“ میں نے عابد کو پیغام بھیجا۔

”تم وقت بتا دو اور کہاں سے لینا ہے، میں تمہیں لے لوں گا، کسی اور کو کیوں زحمت دیتی ہو۔“ ان کا جواب آیا۔

”نہیں، آپ مصطفیٰ کو لے کر پھر گھر پر ہی رہیں، اسے سردی میں بار، بار باہر نہ نکالیں۔“ میں نے گھر لاک کر کے باہر نکلتے ہوئے پیغام بھیجا۔ میں نے سوچا تھا کہ کہیں باہر سے مما کو کال کروں گی جس وقت پاپا گھر پر نہ ہوں...... فاصلوں اور اوقات کے فرق نے ایک مسئلے پر بات کرنے کو بھی مشکل بنا دیا تھا۔

اپنے دفتر پہنچ کر فون کی گھنٹی کی آواز بند کی تاکہ معمول کے دفتر کے کام کا آغاز کر سکوں، فون بیگ میں رکھا تھا، گیارہ بجے کافی کا وقفہ ہوا تو مجھے فون کا خیال آیا کہ مجھے تو صدف کو فون کرنا تھا، فون باہر نکالا تو اس پر نیلم کی کئی مسڈ کالیں تھیں اور فاطش کا پیغام...... ”آپی آپ سے کس وقت بات کی جا سکتی ہے؟“ تو گویا معاملہ بہت سنجیدہ تھا، میں نے مما سے جلد ہی بات کرنے کا سوچا اور پہلے صدف کا نمبر ملانے لگی، کئی بار گھنٹی بجتی رہی مگر اس نے فون نہ اٹھایا، میں نے وقت دیکھا، اس وقت تو یقیناً وہ اپنی کلاس میں ہو گی...... بعد میں کال کرنے کا سوچ کر میں کافی ختم کر کے اپنے کام پر لگ گئی۔

☆☆☆

”عمر مجھے مما کی طرف جانا تھا......“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”خیریت؟“ انہوں نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

”خیریت ہی ہے......“ میں مسکرائی، اس مسکراہٹ نے کتنے ہی آنسوؤں کو اپنے قدموں تلے روندا تھا۔ ”مما اداس ہو رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ میں چکر لگا لوں ان کی طرف۔“

”ان کے یہاں آنے پر پابندی تو نہیں...... میں انہیں واپسی پر لیتا ہوا آؤں گا۔“ چائے کا کپ رکھ کر انہوں نے کہا۔

”نہیں نہیں......“ میں نے فوراً کہا۔ ”وہ نہیں آئیں گی۔“ ان کے یہاں آنے پر کوئی پابندی تھی نہ انہیں آنے پر کوئی اعتراض ہوتا، عمر جاتے تو وہ انہیں انکار بھی نہ کرتیں...... مگر مسئلہ یہ تھا کہ نہ تو مما نے کال کر کے مجھے آنے کو کہا تھا اور نہ ہی ان کے میرے گھر آنے پر میں ان کے ساتھ کھل کر اس مسئلے پر بات کر سکتی تھی۔

’’تمہیں معلوم ہے ناں کہ کل ناہید آ رہی ہے؟‘‘ عمر نے سوال کیا۔

’’ہاں...... بتایا تھا اماں نے مجھے...... اسی لیے سوچ رہی ہوں کہ جا کر مما کو مل آؤں کہ اس کے بعد چند دن تک نکلنا مشکل ہوگا۔‘‘

’’چلو پھر فوراً تیار ہو جاؤ تو میں تمہیں چھوڑتا ہوا چلا جاتا ہوں۔‘‘

’’آپ کو دیر ہو جائے گی، میں ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤں گی اور مجھے ابھی اماں سے اجازت بھی لینی ہے۔‘‘

’’اماں سے میں بات کر لیتا ہوں اور ڈرائیور میرے ساتھ جا رہا ہے اس لیے تم تیار ہو جاؤ جلدی سے۔‘‘ عمر کے اصرار پر مجھے کوئی بہانہ نہیں سوجھ رہا تھا۔ ’’میری بھی ملاقات ہو جائے گی انکل اور آنٹی سے، آخر وہ میرے لیے بھی تو اداس ہوں گی ناں۔‘‘ میرے پاس کوئی راہِ فرار نہ تھی سو تیار ہونے چل دی۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی مجھے یاد آیا کہ چند روز قبل اماں نے مجھ سے کہا تھا کہ ناہید کے بیٹے نبیل کے متعلق عمر سے بات کروں، مجھے یہ وقت اور موقع مناسب لگا......

’’عمر آپ کو علم ہے کہ ناہید آپی کیوں آ رہی ہیں؟‘‘ میں نے انگریزی میں سوال کیا کیونکہ عقبی نشست پر ڈرائیور بھی بیٹھا تھا۔

’’ہاں...... نبیل کی شادی کرنے کے لیے آ رہی ہوں گی!‘‘ عمر کا لہجہ اور انداز دونوں سرسری تھے۔

’’اماں نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کی خواہش تھی کہ ناہید آپی نبیل کے لیے بیلی کا رشتہ لیتیں؟‘‘ میری بات ختم ہوتے ہی عمر نے سر گھما کر میری طرف دیکھا، ان کے چہرے پر تناؤ تھا۔

’’تم میری محبت، میری چاہت اور میری من پسند بیوی سہی مگر مجھے اچھا نہیں لگا کہ اماں نے تم سے اس مسئلے پر بات کی اور تمہیں بتایا کہ......‘‘ میرے دل پر گھونسا سا لگا۔

’’کیوں اس میں کیا قباحت ہے......؟ کیا میں اس گھر کی فرد نہیں یا میں اس قابل نہیں کہ مجھ سے آپ اپنے بچوں کے بارے میں بات کریں...... اتنے سال سے میرا اور آپ کا ساتھ ہے، کیا میرے کسی عمل سے آپ کو ایسا لگا کہ میں ان بچوں کو اپنے بچے نہیں سمجھتی؟‘‘ میرے آنسو تواتر سے بہنے لگے۔

’’ایسی کوئی بات نہیں نیل پیاری......‘‘ عمر نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ’’مجھے اچھا نہیں لگتا کہ کسی کو یہ علم ہو کہ میں نے خود بول کر ناہید سے اپنی بیٹی کا رشتہ دینے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور خود میں نے اماں سے کہلوایا تھا۔ ناہید کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوا اور وہ خوشی، خوشی پاکستان آئی، ارادہ تھا کہ نبیل اور بیلی کی منگنی کر دیں گے، ہم دونوں بہن بھائی سارا پروگرام طے کر چکے تھے، منگنی کی تاریخ تک مقرر ہو چکی تھی...... اسی دوران وہ اپنے سسرال والوں سے ملنے کے لیے گئی اور وہاں جا کر اس کے بیٹے کو......‘‘

’’جانتی ہوں سب عمر......‘‘ میں نے انہیں ٹوکا۔ ’’اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اگر آپ نے اپنی طرف سے خواہش کا اظہار کر دیا؟‘‘

’’بیٹیوں کے باپ اپنے منہ سے بھلا کب کہتے ہیں ایسی بات؟‘‘ عمر نے فوراً کہا۔

’’آپ کو معلوم ہے ناں عمر.... کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ کو شادی کا پیغام حضرت خدیجہؓ نے خود بھجوایا تھا، وہ ان سے شادی کی خواہش مند تھیں، کہیں ایسا نہیں لکھا ہوا ہے کہ لڑکی کی طرف سے شادی کا پیغام نہیں دیا جا سکتا...... ایک رواج بن گیا ہے ہمارے ہاں مگر لڑکی والوں کی طرف سے شادی کی خواہش کا اظہار کرنا کوئی گناہ تو نہیں۔‘‘

’’اب گڑے مردے اکھاڑنے کا کیا فائدہ......‘‘ عمر نے بے دلی سے کہا۔ ’’اب تو وہ نبیل کی شادی کرنے کے لیے آ رہی ہے سو آئے، کرے اور واپس جائے...... اسے غالباً ہمارے گھر میں رہ کر ہی شادی کرنا پڑے گی کیونکہ اس کی سسرال کا گھر چھوٹا ہے اس کے علاوہ اس میں اس کی سسرال کے ڈھیروں لوگ

رہتے ہیں اور اس کا اپنا کوئی گھر یہاں نہیں ہے سو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میری بیٹی کے نصیب اس گھر میں نہ تھے تو کیا ہوا۔ اللہ نے اس کے لیے کچھ بہت اچھا رکھا ہوگا، تم اس کی ماں ہو دعا کیا کرو۔‘‘ عمر کے کہنے پر میرا سیروں خون بڑھ گیا تھا۔

’’کیا معلوم کہ ہماری بیٹی کے نصیب کتنے اچھے ہوں۔‘‘ میں نے مسکرا کر کہا۔ ’’کیا معلوم کہ اللہ کو آپ کی کون سی ادا پسند آ گئی کہ اس نے آپ کی خواہش کو پورا کرنے کے اسباب پیدا کر دیے۔‘‘

’’میں سمجھا نہیں...... کیا اماں نے بیلی کے لیے کوئی رشتہ ڈھونڈا ہے جس کا مجھے علم نہیں؟‘‘

’’آپ کی خواہش تھی ناں کہ بیلی کا رشتہ نبیل سے ہو......‘‘ میں رکی۔ ’’تو اللہ نے آپ کی سن لی ہے اور ناہید آپی اسی لیے پاکستان آ رہی ہیں کہ آپ کے سامنے بیلی کے لیے دوبارہ دستِ سوال دراز کریں۔‘‘ گاڑی کے ٹائر چرچرائے اور پوری قوت سے بریک لگا کر عمر نے گاڑی روکی۔

’’کیا کہا تم نے؟‘‘ عمر نے نہایت حیرت سے پوچھا۔

’’ہاں نبیل...... وہی کہا ہے میں نے جو آپ نے سنا ہے۔‘‘ میں نے آہستگی سے کہا۔ نبیل نے ڈرائیور کو گاڑی سے باہر نکلنے کو کہا، وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

’’آج کے بعد دوبارہ کبھی نہیں۔‘‘ انہوں نے اپنے ہاتھ کی انگلی اٹھا کر مجھے تنبیہ کی۔ ’’دوبارہ اس گھر میں اس موضوع پر کوئی اور بات نہ کرے...... ایسا مذاق مجھے بالکل پسند نہیں!‘‘

’’میں مذاق نہیں کر رہی عمر!‘‘ میں نے بہ مشکل تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

’’مذاق نہیں تو پھر بھی اس موضوع کو یہیں بند کر دو!‘‘ اس کے بعد انہوں نے اپنے لب سختی سے بھینچ لیے، گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کی ڈرائیور سے اندر بیٹھنے کو کہا اور مجھے مما کے گھر کے گیٹ کے سامنے باہر ہی اتار کر چل دیے، میں بھی چاہتی تھی کہ وہ اس غصے کی حالت میں اندر نہ آئیں۔

’’پاپا گھر پر نہیں ہیں کیا؟‘‘ میں نے گیٹ کھلنے پر پاپا کی گاڑی وہاں نہ پا کر چوکیدار سے پوچھا۔

’’وہ شہر سے باہر گئے ہیں بٹیا!‘‘

’’آج ہی گئے ہیں کیا؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’دو تین دن ہو گئے ہیں بٹیا!‘‘ میری اس روز مما سے بات ہی نہ ہوئی تھی نہ ہی مما نے بتایا تھا کہ پاپا گھر پر نہیں ہیں۔ گھر کے اندر داخل ہوئی تو مما لاؤنج میں اسود کو گود میں لیے بیٹھی تھیں۔

’’اسود سکول نہیں گیا مما؟‘‘ میں نے پوچھا۔ ’’طبیعت تو ٹھیک ہے اس کی؟‘‘

’’اسے بخار ہے بیٹا، فاطش کا کالج جانا بہت ضروری تھا، اس کا کوئی اہم لیکچر تھا، جلدی واپس آ جائے گی۔‘‘ مما نے آہستہ سے کہا۔ ’’کیسی ہو تم، کیسے آنا ہوا یوں صبح سویرے؟‘‘

’’آپ ٹھیک ہیں مما، مجھے ٹھیک نہیں لگ رہیں؟‘‘ میں نے ان کے پاس بیٹھ کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔

’’میرے ساتھ کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے بیٹا، ٹھیک ہو بھی نہیں سکتا۔‘‘ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں...... میں نے انہیں ایسا کمزور اور بے بس کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

’’میں آپ سے ملنے کو بہت بے چین تھی مما، آپ کے فون نے میری نیندیں اڑا دی ہیں مما...... ایسا کیا ہو گیا ہے اچانک آپ کی پُرسکون زندگی میں؟‘‘

’’میری زندگی تو طوفانوں کا مجموعہ ہے بیٹا، اس میں سکون نام کی کوئی چیز نہیں ہے، میں نے ہر طوفان کو اپنے وجود کی گہرائیوں میں ہمیشہ چھپا چھپا کر رکھا بیٹا مگر برداشت کا بھی ایک نکتۂ انتہا ہوتا ہے، پیمانہ حد سے زیادہ بھر جائے تو لبریز ہو کر چھلکنے لگتا ہے، میں نے بھی عمر بھر خود پر سب جھیلا اور برداشت کیا ہے مگر اب سوچا ہے کہ اپنی زندگی کو اپنے لیے جیوں، اس کے لیے مجھے تم سب کو اپنا فیصلہ بتانا پڑا، تم سب اب سمجھدار ہو، شادی شدہ ہو...... اب تم لوگ میری زندگی کے

معاملات کی نزاکت کو سمجھ سکو گی۔'' انہوں نے اپنا سر صوفے کی بیک سے لگالیا اور خاموش ہو گئیں، میں نے انہیں کچھ نہ کہا، میں چاہتی تھی کہ وہ اپنا دل خود کھول کر میرے سامنے رکھیں۔

☆☆☆

لنچ بریک کے بعد میں نے دوبارہ نمبر ملایا تو صدف نے تیسری چوتھی گھنٹی پر فون اٹھالیا، سلام کیا اور مجھے انتظار کرنے کو کہا، میں فون کے دوسری طرف ہونے والی کھڑ پڑ کو سن رہی تھی، وہ غالباً کلاس میں تھی، میں نے اسے استاد سے اجازت لیتے ہوئے بھی سنا اور پھر وہ کلاس سے باہر آ گئی۔

''آپ ٹھیک ہیں آپی؟'' اس نے سوال کیا۔

''ہاں میں ٹھیک ہوں، تم سناؤ!''

''آپی میں تو بہت پریشان ہوں، بالکل بھی ٹھیک نہیں ہوں ...... جانے کیا ہونے والا ہے، کیسا طوفان آنے والا ہے...... اس عمر میں...... شادی کے اتنے سالوں کے بعد اور ہم سب کی شادیاں کر کے ...... مما کو کیا ہو گیا ہے، میں تو سوچ رہی تھی کہ کہیں مما کی ذہنی حالت تو خراب نہیں ہو گئی؟'' وہ رو رہی تھی۔

''تم خود کو سنبھالو صدف میری جان! میں دو ایک دن میں فاطمہ سے بات کرتی ہوں اور پھر مما سے بھی، ٹیلی فون پر تو بات اسی طرح ہو سکتی ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''مگر مما نے ایسا سوچا کیونکر آپی؟'' اس کی سسکیاں نہیں رک رہی تھیں۔ ''آپ نیلم سے بات کریں اور اسے کہیں کہ وہ مما سے بات کرے جا کر، مما اس سے پیار بھی بہت کرتی ہیں۔''

''مجھے تو لگتا ہے کہ مما سب سے زیادہ تم سے پیار کرتی ہیں......'' میں نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی۔ ''ہم سب سے مما اتنا ہی پیار کرتی ہیں پیاری کہ کس سے زیادہ اور کس سے کم کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔''

''پھر میں مما سے پوچھوں کہ کیوں ایسا فیصلہ کر رہی ہیں وہ؟'' صدف نے فوراً پوچھا۔ ''مگر میرے لیے احمد کے فون سے اتنی لمبی کال کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اسکائپ پر بات کا وقت بھی عموماً تنہائی میں نہیں ملتا۔''

''تم خود کو پریشان نہ کرو میری جان، تمہارا آخری سمسٹر ہے اور تمہاری چار سال کی محنت ضائع جائے گی جو تم نے خود کو دماغی طور پر پُرسکون نہ کیا تو۔'' میں نے اسے سمجھایا، مجھے علم تھا کہ وہ امتیازی نمبروں سے ڈگری حاصل کرنے جارہی تھی، فائنل سمسٹر میں اس طرح کی پریشانی اس کی کارکردگی کو متاثر کر سکتی تھی۔ میں نے اسے مطمئن کر کے فون بند کیا، کرسی کی پشت سے سر ٹکایا اور آنکھیں موند لیں، میرے آنسو میری آنکھوں کے گوشوں سے بہنے لگے، مما نے ایسا فیصلہ اب کیوں کرنے کا سوچا، انہیں تو یہ فیصلہ برسوں پہلے کر لینا چاہیے تھا، میری بند آنکھوں کے اندر فلم چلنے لگی...... میں غالباً سات آٹھ برس کی تھی، پاپا اور مما کی دوست راحیلہ آنٹی، ہمارے گھر کا ڈرائنگ روم، مما گھر پر نہ تھیں، جانے میں کیوں ڈرائنگ روم میں چلی گئی تھی، مجھے پاپا اور راحیلہ آنٹی کو دیکھ کر کچھ عجیب سا لگا چاہے اصل صورتِ حال کی سمجھ نہ آئی تھی، انہوں نے مجھے نہیں دیکھا تھا...... مگر مجھے میری چھٹی حس نے یہ ضرور بتا دیا کہ کچھ غلط ہو رہا تھا۔ راحیلہ آنٹی، مما کی انتہائی قریبی سہیلی تھیں اور بہت عرصے سے تھیں، ان کا ایسے وقت میں ہمارے گھر آنا جس وقت مما گھر پر نہیں ہوتی تھیں، وہی عجیب تھا اور وہ بھی اکیلے۔

''مما...... مجھے راحیلہ آنٹی بہت گندی لگتی ہیں۔'' میں نے اپنی معصومیت میں مما سے کہا تھا۔

''وہ تو میری بہت پیاری دوست ہے چندا...... ہم بچپن سے بہنوں کی طرح ساتھ رہی ہیں، اسکول، کالج اور پھر اب تک ہماری دوستی قائم ہے ...... ہماری شادیاں ہوئیں تو ہم ایک دوسرے سے جیسے بچھڑ گئیں مگر بعد میں جب انکل ثقلین کی آپ کے پاپا سے دوستی ہو گئی تو اب تو ہمارا یہ دوستی کا رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا ہے۔''

''نہیں مما......'' میں مصر تھی۔ ''وہ اچھی نہیں ہیں پلیز!''

''اچھا چلیں اگر وہ میری بیٹی کو اچھی نہیں لگتیں تو

میں اپنی بیٹی کو ان سے ملنے پر مجبور نہیں کروں گی۔'' مما نے مجھے بہلایا۔ ''مگر وہ میری بیٹی کو اچھی کیوں نہیں لگتیں؟'' انہوں نے میرا سر سہلا کر پوچھا۔

''نہیں مما...... آپ ان کا اپنے گھر میں آنا بند کر دیں، وہ ہمارے گھر میں نہ آئیں۔'' میری آنکھوں سے مما کی شفقت کے باعث آنسو جاری ہو گئے، مجھے یقین تھا کہ جو کچھ ہو رہا تھا وہ میری مما کے علم میں نہ تھا۔

''یہ تو بڑی گستاخی کی بات کی ہے میری بیٹی نے..... میں تو آپ کو ایسا نہیں سمجھتی تھی۔'' مما کے چہرے پر ناراضی ثبت تھی، میں اس ناراضی سے خوفزدہ رہتی تھی، وہ مجھ سے بات نہ کرتیں تو میرے دل کی دنیا اتھل پتھل ہو جاتی۔

''مما......'' میں نے ان کا ہاتھ تھام کر، انہیں وہ سب بتا دیا تھا جو میں نے دیکھا تھا، معصوم عمر تھی، میں ان معاملات کی نزاکتوں کو نہ سمجھتی تھی اس لیے میں نے کچھ نہ چھپایا تھا، ان کا چہرہ دھواں، دھواں ہو رہا تھا، میں خود ساری داستان سنا کر ان کا چہرہ دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔

''بس...... اب میری بیٹی نے مجھے تو بتا دیا ہے مگر کسی اور کو کچھ نہیں بتانا...... کسی کو بھی نہیں بیٹا!'' مما نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ ''میں آئندہ خیال رکھوں گی کہ راحیلہ آنٹی میرے گھر میں نہ آئیں۔'' مما نے میرے گال پر بوسہ دیا، میں نے ان کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے ستارے دیکھے تھے۔ جانے بعد میں مما نے راحیلہ آنٹی سے کیا کہا ہوگا، ان کا ہمارے ہاں آنا جانا بند ہو گیا، مما بھی ان کے ہاں نہ جاتیں اور وہ ہر روز کی گھنٹوں لمبی کالیں بھی منقطع ہو گئیں، نہ صرف راحیلہ آنٹی کے ہاں...... مما نے تو گھر سے نکلنا ہی بند کر دیا، ان کا آنا جانا اپنی ویلفیئر تنظیم کے کاموں کے سلسلے میں ہوتا تھا مگر اس کے بعد انہوں نے جانا چھوڑ دیا اور تنظیم کے کاموں کو گھر سے ہی چلانے لگیں۔

''ارے بھئی کہاں گئیں وہ آپ کی سہیلی...... کیا نام تھا ان کا...... راحیلہ!'' پاپا نے ایک دن لاؤنج میں بیٹھے ہوئے مما سے بڑی بے نیازی سے پوچھا، میں اس وقت وہیں بیٹھی اپنا ہوم ورک کر رہی تھی۔

''میری یا آپ کی؟'' مما کے مختصر سوال نے پاپا کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔

''بچی کے سامنے کیسی بے ہودہ بات کر رہی ہیں آپ؟'' پاپا نے غصے سے مما سے کہا۔

''آپ نے جو کچھ بچی کے سامنے اس گھر کے ڈرائنگ روم میں کیا ہے، راحیلہ کے ساتھ...... وہ میری اس بات سے کہیں زیادہ بے ہودہ ہے......'' میں بے نیازی سے اپنا کام کر رہی تھی، ان کی گفتگو میں سن تو رہی تھی مگر ان کے مطالب سے کافی حد تک ناآشنا۔

''میں نے کچھ ایسا نہیں کیا، اسے کیا سمجھ ہے چھوٹی سی بچی ہی تو ہے، جانے کیا سمجھ بیٹھی، مجھے تو یاد بھی نہیں کہ میں کبھی راحیلہ کے ساتھ تنہا......'' پاپا کی زبان ان کے جھوٹ کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

''میں نے خود دیکھا تھا پاپا...... آپ اور آنٹی......'' میں نے پاپا کے سامنے نقشہ کھینچا تو ان کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

''دہ اصل میں......'' وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگے۔ ''اس کے پیٹ میں درد تھا......'' وہ بہانے گھڑ رہے تھے۔

''رانی آپ جاؤ بیٹا، اپنے کمرے میں جا کر کام کرو بہنوں کے ساتھ بیٹھ کر۔'' مما نے حکم دیا تو میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

''مگر مما میں نے آپ سے سوال سمجھنا تھے۔''

''میں تھوڑی دیر میں آ کر سمجھا دوں گی بیٹا!'' میں نے اپنی کتابیں کاپیاں سمیٹیں اور چل دی۔

''دانیال......'' مما کی آواز میں نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سنی۔ ''کیوں کیا آپ نے ایسا؟'' ان کی سسکیاں مجھے سنائی دیں۔

''سوری جان......'' پاپا کی آواز سنائی دی، میں تیز تیز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ پاپا نے یقیناً مما سے معافی مانگ لی تھی کیونکہ گھر کے

حالات اس کے بعد بالکل نارمل ہو گئے تھے، کبھی کوئی لڑائی جھگڑا ہوا نہ کوئی اور ناگوار واقعہ، کم از کم میرے سامنے نہیں، باقی بہنیں تو اس وقت کافی چھوٹی تھیں۔ اب میری یاد کے نہاں خانوں میں اس بھولے بھٹکے واقعے کی یاد تازہ ہو گئی تھی، میں اس منظر کو اب یاد کرتی ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ پاپا اور راحیلہ آنٹی کے بیچ کچھ بہت غلط تھا یا غالباً پہلی اور آخری بار ایسا ہوا ہوگا، مما کا ظرف بہت بڑا تھا جو پاپا کو معاف کر دیا۔ انہوں نے پاپا کو اس وقت معاف کر دیا تھا جو اُن کی جوانی کی عمر کی ایک بڑی غلطی تھی بلکہ بہت بڑا گناہ تھا...... تو اب پاپا نے اس سے برا کیا کر دیا ہے جو مما نے ان سے خلع لینے کا فیصلہ کر لیا ہے؟ سوچ کی حدیں یہاں آ کر ختم ہو جاتی تھیں۔

☆☆☆

رانی آپی سے بات کر کے بھی دل کو سکون نہیں ملا تھا، بے چینی بڑھ گئی تھی، اتنی کہ رگوں میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ میں گھر پر اکیلی تھی، شاید سو گئی تھی، آنکھ کھلی تو میں اپنے گھر پر نہ تھی، عجیب سا کمرا تھا، سفید سفید اور مانوس سی خوشبو والا۔ میں کسی اسپتال میں تھی۔ 'کیا ہوا تھا مجھے؟' میں نے سوچا تو ساتھ ہی احمد کا چہرہ نظر آیا۔

''کیسی ہو میری جان؟''

''میں کہاں ہوں احمد؟'' میں نے کہا تو مجھے لگا کہ میری آواز کسی کنویں سے آ رہی ہو۔

''تم اس وقت اسپتال میں ہو، میں گھر لوٹا تو تم گھر پر بے ہوش پڑی ہوئی تھیں، میں نے ایمر جنسی میں کال کر کے ایمبولینس منگوائی اور تمہیں یہاں لے آیا۔''

''میں بے ہوش کیوں ہو گئی تھی؟'' حیرت سی حیرت تھی۔

''میں تو سمجھا کہ تم نے کچھ کھایا نہیں ہے مگر ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ تمہیں نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے۔'' احمد میرا ہاتھ سہلا رہا تھا۔

''نروس بریک ڈاؤن؟'' میں سوچ کر رہ گئی۔

''مگر...کیوں!''

''تم بے ہوشی میں کچھ بڑبڑا بھی رہی تھیں......''

''اچھا......'' میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''کیا؟''

''تم اپنی مما کو بہت یاد کر رہی تھیں......'' احمد نے کہا۔ ''میں سوچ رہا ہوں کہ تمہیں چند ہفتوں کے لیے پاکستان بھیج دوں، میں تو جا نہیں سکتا، بڑی مشکل سے اتنی اچھی ملازمت ملی ہے اور شام میں میری کلاسز ہوتی ہیں تو میں وقت نہیں نکال سکتا، تم جا کر چند ہفتے مما کے پاس رہ کر آ جاؤ، طبیعت بہتر ہو جائے گی اور اس کے بعد چونکہ ہم نے اپنی فیملی شروع کرنا ہے پھر تو تم کافی عرصے کے لیے نہیں جا سکو گی۔'' شادی کے اتنے سالوں کے بعد بھی احمد کی اس بات پر میرے کان گرم ہو گئے تھے۔

''نہیں احمد، ابھی میں پاکستان جانا افورڈ نہیں کر سکتی، بہت اخراجات ہو جاتے ہیں۔'' میں نے تاویل پیش کی۔ ''اب تو ہمارے اپارٹمنٹ کی قسط بھی جایا کرے گی اور ہم نے تہیہ کیا ہے کہ اپنے والدین سے اب کوئی مدد نہیں لیں گے......''

''سب جانتا ہوں، میرے پاس کچھ بچت ہے جو تمہارے اکیلے پاکستان جانے کے لیے کافی ہے، تم بے فکر ہو کر جاؤ میری جان۔'' احمد نے اصرار کیا تو میں خاموش ہو گئی۔

دل میں خیال بھی آیا کہ احمد کی امی یعنی میری پھپھو سوچیں گی کہ میں نے اپنے والدین سے ملنے کے لیے آنے میں خود غرضی دکھائی ہے۔ ''پھر دونوں چلتے ہیں احمد!''

''ابھی نہیں ڈیئر!''

''میں آخری بار پاپا سے رقم منگوا لیتی ہوں احمد!''

''رقم منگوانا یا نہ منگوانا اہم نہیں...... ابھی میں اپنی نئی ملازمت سے چھٹی نہیں لے سکتا ورنہ مستقل چھٹی مل جائے گی...... ہزاروں، ایسی ملازمتوں کے انتظار میں فارغ بیٹھے ہیں، کسی اور کو رکھ لیں گے کمپنی والے......''

احمد کی اس دلیل کا جواب نہ تھا میرے پاس۔

اگلے روز مجھے کچھ سکون آور دوائیں دے کر اسپتال سے رخصت کر دیا گیا، ابھی تک مجھے سمجھ میں نہ آیا تھا کہ مجھے نروس بریک ڈاؤن کیوں ہوا تھا، میں احمد سے پوچھتی تو وہ ٹال جاتے تھے۔ کیا میں نے مما کی بات کا اتنا اثر لیا تھا یا کچھ اور ہوا تھا؟

☆☆☆

میری بہنوں کو مجھ سے اس بات کا گلہ ہے کہ میں ان سے اپنے دل کی باتیں شیئر نہیں کرتی، پر میں سوچتی ہوں وہ سب اپنے، اپنے گھروں میں خوش ہیں، انہیں میرے مسائل سے کیا غرض...... اور ان سے اگر کہہ دوں گی تو کیا میری تکالیف اور میرے مسائل، میری سوچیں ختم ہو جائیں گی؟

نیلم تو مجھ سے بارہا تقریباً لڑ چکی ہے کہ میں تانیہ خالہ کے ساتھ بہت برا رویہ رکھتی ہوں ...... مگر کیا کروں، جس خالہ کو ہم نے اپنے گھر میں بہنوں کی طرح دیکھا اور سمجھا اب، وہی خالہ......؟ کیا کہے کوئی، ان کے بارے میں بات کرو تو اپنا پیٹ ہی ننگا ہوتا ہے۔ خالہ کے بارے میں بہت بچپن سے ہی میری یادیں ایسی خوشگوار نہیں ہیں حالانکہ خالہ سب بہنوں میں مجھ سے سب سے زیادہ پیار کرتی تھیں۔ کئی کئی دن ہمارے ہاں آ کر رہتیں، خالہ بہت خوب صورت اور تعلیم یافتہ تھیں مگر ان کی شادی جس خاندان میں ہوئی اس خاندان میں غالباً ان کے سوا کوئی اور خاتون پڑھی لکھی نہ تھی، مردوں میں بھی تعلیم کا رواج نہ تھا کہ اپنے خاندانی کاروبار تھے۔ خالو کا بھی منڈی میں آڑھت کا کام تھا، روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی اس لیے خالہ اچھا پہنتی اوڑھتی تھیں۔

پاپا کا ملتان میں آٹھ دس دن کا کام تھا، خالہ نے کال کر کے مما سے کہا کہ فاطش کو بھجوا دیں، میں اس وقت تیسری جماعت میں پڑھتی تھی غالباً...... پاپا کے ساتھ خوشی، خوشی چلی گئی۔ پاپا کو مجھے خالہ کے گھر چھوڑ کر ہوٹل میں قیام کے لیے جانا تھا مگر خالو اور ان کے والدین نے اصرار کیا کہ وہ بھی وہیں گھر پر رکیں تو پاپا

کو ''مجبوراً'' رکنا پڑا تھا، خالو صبح کے گئے رات کی خبر لاتے، خالہ کے ساس سسر جانے کیا کھا کر سوتے تھے کہ دن بھر سوئے رہتے، پاپا تیار ہو کر نکلتے، شاید کوئی کام کرنے جاتے ہوں گے مگر جلد ہی لوٹ آتے اور باقی دن گھر میں گزارتے، شام کو خالو کے آنے سے پہلے دوبارہ چلے جاتے اور رات گئے لوٹتے۔ میں صبح دیر تک سوتی تھی، اکثر میری آنکھ کھلتی تو اس وقت کمرے میں میرے علاوہ پاپا اور خالہ بھی ہوتے تھے، میری اس وقت سے متعلق کوئی اچھی یادیں نہیں تھیں، خالہ مجھے کچھ عجیب سی لگتیں، اپنے گھر میں بھی وہ اکثر اسی کمرے میں ہوتی تھیں جس میں میں اور پاپا سو رہے ہوتے تھے۔

ملتان سے واپسی پر خالہ ہمارے ساتھ جانے کو تیار تھیں، خالو سے انہوں نے اجازت طلب کی، خالو اس روز گھر پر ہی تھے......

''ابھی تو فاطش تمہارے پاس کچھ دن گزار کر جا رہی ہے، چند دن کے بعد میں خود تمہیں چھوڑ آؤں گا، ابھی اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے......'' خالو نے کہا تھا۔

''فاطش بہت اصرار کر رہی ہے......'' خالہ منمنائی تھیں۔ ''اماں کو تو مستقل کوئی نہ کوئی مرض رہتا ہے، ان کی وجہ سے کیا میں پابند ہو کر رہ جاؤں؟ ابھی تو دانیال بھائی آئے ہوئے ہیں، ان کے ساتھ چلی جاؤں گی، بعد میں......'' خالہ نے خاصا اصرار کیا تھا۔

''میں چلا جاؤں گا تمہارے ساتھ۔'' خالو نے پیش کش کی۔

''کہاں سے آئے گا ایسا دن جب آپ کو میرے ساتھ جانے کی فرصت ملے گی، آج تک تو سورج کسی ایسی سمت سے نکلا نہیں کہ ایک مختلف دن طلوع ہو۔'' خالہ نے طنز کے تیر چلائے، ساری گفتگو ہمارے سامنے ہو رہی تھی۔

''بھئی بھیج دیں ناں ہماری بیٹی کو ہمارے ساتھ۔'' پاپا کا کہا خالو ٹال نہ سکے۔ خالہ نے اپنا سامان پہلے سے ہی تیار کر رکھا تھا۔ ''اجازت'' ملنے کی دیر تھی کہ ہم جانے کو تیار تھے، گھر سے نکلتے وقت میں گاڑی میں آگے پاپا کے ساتھ بیٹھی تھی اور خالہ پچھلی سیٹ پر تنہا...... شہر کی حدود سے نکلتے ہی پاپا نے گاڑی روکی اور خالہ سے آگے آنے کو کہا، خالہ نے گاڑی سے نکل کر مجھے باہر نکالا، خود پہلے بیٹھیں اور اس کے بعد کھڑکی کی طرف مجھے بٹھایا......

''میری بیٹی کھڑکی سے باہر دیکھے گی۔'' خالہ نے کہا تو مگر میرا تجسس مجھے بار، بار اندر دیکھنے پر مجبور کر دیتا، مجھے چاہے لاکھ برا لگ رہا تھا مگر میں کچھ کہہ نہ سکی۔ گھر سے تھوڑے فاصلے پر ہی پاپا نے گاڑی روکی اور خالہ واپس پچھلی سیٹ پر چلی گئیں۔

میں نے انہیں بارہا پاپا کے بہت قریب دیکھا، مما کے سامنے تو پاپا، خالہ کو اپنی بیٹیوں کی طرح کہتے تھے مگر نہیں...... کچھ ٹھیک نہیں ہو رہا تھا، میں چھوٹی سی بچی سہی مگر مما کے ساتھ دھوکا ہو رہا تھا یہ بات میں سمجھ رہی تھی۔ اپنے گھر میں اتنے دھڑلے سے وہ پاپا کے ساتھ...... مجھے بھی غالباً وہ دودھ میں کچھ ملا کر دیتی تھیں کہ جب میں جاگتی تھی تو میں اس طرح تازہ اور چاق و چوبند نہیں ہوتی تھی جیسی میں اپنے گھر میں ہوتی تھی۔ پاپا کی خالہ کے ساتھ ''شفقت'' مجھے عروج پر نظر آتی۔ ہمارے گھر میں بھی میں نے کئی مواقع پر انہیں غلط انداز میں دیکھا تھا۔

بڑی ہوئی تو دیکھا کہ اکثر ہی خالہ میکے آئی ہوتیں کیونکہ ان کے ہاں اولاد نہ ہوئی تھی اس لیے وہ بچوں کی پڑھائی کی مجبوری میں بھی نہ بندھ سکی تھیں، دو ایک دن نانی کے پاس رہ کر وہ اپنے باقی ماندہ دن ہمارے ہاں گزارتیں۔ خالہ آ جاتیں تو مما کے کئی رکے ہوئے کام شروع ہو جاتے، ان کے ہوتے ہوئے وہ اپنی دوستوں سے ملتیں، پارٹیاں اٹینڈ کرتیں، اپنے رفاہی کاموں کے منصوبوں کو وقت دیتیں، خریداری کرتیں، گھر کے کئی رکے ہوئے کام شروع ہو جاتے اور مما اتنی مصروف ہو جاتیں کہ سارا گھر تنہا خالہ کے کندھوں پر آن پڑتا۔ شروع شروع میں مجھے محسوس

ہوتا کہ مما کو خالہ کو بھی وقت دینا چاہیے۔

ہم ساری بہنیں خالہ کے ساتھ مل کر خوب ہلا گلا کرتیں، پاپا بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جاتے، مما گھر پر ہوتیں تو اور بھی سماں بندھتا، میں نے اکثر کھیل اور ہلے گلے کے دوران پاپا اور خالہ کو زبانی اور عملی مذاق کرتے ہوئے پکڑا مگر کچھ کہہ نہ سکی، باقی کسی اور کو شک نہ ہوتا کیونکہ انہوں نے کبھی وہ نہ دیکھا تھا جو میں نے دیکھا تھا، اب وہ سب ایک دھندلی سی یاد کی طرح میرے ذہن کے نہاں خانوں میں تھا مگر میرا دل خالہ کی طرف سے کبھی صاف نہ ہوا تھا۔ جب آپ کسی کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں تو شک کی تسکین کو کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے، میں نے بارہا خالہ اور پاپا کو مما کی گھر میں عدم موجودگی میں مختلف اوقات میں یوں اکٹھے کسی نہ کسی کمرے میں دیکھا جہاں انہیں نہیں ہونا چاہیے تھا...... یا کم از کم ان کمروں کے دروازے لاک نہیں ہونا چاہیے تھے۔ کبھی کبھار سوچتی کہ بہنوں سے شیئر کروں مگر رک جاتی، جانے وہ میرے ساتھ کس طرح پیش آتیں، مما کیا سوچتیں کہ میں پاپا اور ان کی بہن پر بہتان لگا رہی ہوں۔

☆☆☆

''خالہ......'' میں دسویں جماعت میں تھی جب ایک بار میں نے خود ہی خالہ سے بات کرنے کا سوچا تھا، اس کے بعد میری ہمت نہ پڑی کہ میں کسی اور کے سامنے بات کرتی۔ ''خالو میں کیا کمی ہے؟''

''تمہارے خالو میں نہیں بلکہ مجھ میں کمی ہے فاطش بیٹا...... میں نے تو انہیں بارہا کہا ہے کہ وہ اولاد کے لیے دوسری شادی کر لیں مگر وہ مانتے ہی نہیں۔'' خالہ نے فخر سے بتایا۔ ''مجھ سے وہ پیار ہی اتنا کرتے ہیں......''

''اگر وہ آپ سے اتنا پیار کرتے ہیں تو آپ بدلے میں ان کے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟'' میں نے ابرو اچکا کر ان سے پوچھا۔

''میں نے کیا، کیا ہے بدلے میں؟'' انہوں نے جواباً ابرو اچکا کر میری طرف دیکھا۔

''آپ صرف خالو کے ساتھ ہی نہیں بلکہ میری مما کے ساتھ بھی دھوکا کر رہی ہیں، وہ آپ سے اتنا پیار کرتی ہیں اور آپ بدلے میں......'' میری آواز بھرا گئی۔

''کیا بات کر رہی ہو فاطش...... کچھ عقل ہے تم میں کہ بڑوں کے ساتھ بات کس طرح کرتے ہیں؟'' خالہ کی آواز بلند ہونے لگی۔

''اب میں وہ چھوٹی بچی نہیں رہی خالہ...... جس کے دودھ میں آپ جانے کیا ملا کر اسے سلاتی تھیں...... مگر کبھی کبھار ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ دودھ ہضم نہیں ہوتا خالہ اور قے ہو جاتی ہے۔ شاید قدرت نے کسی بچی کو شعور دینا ہوتا ہے، اسے زندگی کی بدترین سچائی سے آگاہ کرنا ہوتا ہے...... قے ہو جائے خالہ تو بے ہوشی کی دوا اثر نہیں کرتی کیونکہ وہ قے کے ساتھ نکل جاتی ہے اور کمرے میں کوئی عجیب سی آواز آئے تو بھی بچی کی نیند ٹوٹ جاتی ہے...... کمرے میں اندھیرا بھی ہوتا ہے تو تھوڑی دیر کے بعد آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو جاتی ہیں...... دو لوگوں کے آپس میں باتیں کرنے کی آوازیں بھی آتی ہیں اور آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہونے پر وہ اتنی بھیانک حقیقت دیکھتی ہیں کہ کیا ہی کوئی خواب ایسا بھیانک ہوگا......''

''میں تمہاری بات کو سمجھی نہیں فاطش......'' وہ میری بات کو سمجھ کر بھی انجان بننے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''آپ اچھی طرح سمجھ رہی ہیں خالہ......'' میں نے غصے سے کہا۔ ''تب میں آپ کی اور پاپا کی ایسی قربت کا مطلب نہیں سمجھتی تھی مگر اب سمجھتی ہوں......''

''تم بہت عجیب اور بے ہودہ الزامات لگا رہی ہو مجھ پر۔'' وہ چیخیں۔

''میں اپنی مما کو کچھ بتا کر انہیں دکھ نہیں دینا چاہتی، بہتر ہے کہ آپ خود کو درست کر لیں...... پاپا سے اپنا تعلق ختم کر لیں۔'' میں نے سفاکی سے کہا۔ ''ورنہ میں کسی دن آپ کو اور پاپا کو مما کے سامنے کھڑا کر دوں گی اور دونوں سے اس سوال کا جواب مانگوں گی۔''

''دکھ ہو رہا ہے تمہاری سوچ پر......'' ان کی

آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''وہ میرے بڑے بھائیوں کی طرح ہیں، بیٹا کہتے ہیں مجھے اور اپنی بیٹیوں جیسا ہی سمجھتے بھی ہیں اور اسی طرح میں ان کی عزت کرتی ہوں، تم نے ایسا سوچا بھی کیونکر؟'' وہ ہچکیوں سے رونے لگیں، مما جانے اس غلط وقت پر کیوں کمرے میں آ گئیں۔

'' کیا ہوا تانو میری جان، کیوں رو رہی ہو بیٹا؟'' انہوں نے بیٹھ کر خالہ کو گلے سے لگا لیا، وہی خالہ جو اُن کی پیٹھ میں خنجر گھونپ رہی تھیں۔

'' کچھ نہیں حنا آپی...... بابا یاد آ گئے تھے...... میں نے تو ہوش سنبھالتے ہی دانیال بھائی کو باپ جیسا دیکھا ہے، اسی لیے بھاگ کر یہاں آتی ہوں کہ یہ گھر مجھے اپنے میکے جیسا لگتا ہے......''

''ہے ناں تمہارا میکا......'' مما بھی جذباتی ہو گئیں۔ ''کس نے کہا ہے کہ نہیں ہے ایسا؟''

''یونہی دل میں خیال آیا کہ کہیں کسی کو میرا یہاں آنا، یہاں آ کر کئی کئی دن تک رہنا کھٹکتا نہ ہو!''

''ارے کیوں پاگلوں جیسی سوچ پالے بیٹھی ہو تم، میں اور دانیال دونوں تمہیں اپنی بیٹیوں کی طرح چاہتے ہیں اور بچیاں سب کی سب تم پر جان دیتی ہیں۔'' مما نے پیار سے ان کے بالوں میں انگلیاں پھیریں، خالہ مکاری سے آنسو بہا رہی تھیں...... اس کے بعد میری کسی سے کچھ کہنے کی کیا تاب ہوتی۔

☆☆☆

پاپا کے ساتھ بھی ڈھکے چھپے الفاظ میں اس پر بات ہو چکی تھی...... جب اشعر کا معاملہ میں نے گھر پر اٹھایا تو مما اور پاپا دونوں کی طرف سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، پاپا ہم بیٹیوں کے معاملے میں نسبتاً دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے اس لیے میں نے انہیں ہی قائل کرنے کا سوچا، وہ مان جاتے تو مما کو خود ہی منا لیتے۔ میں نے مما اور پاپا کے درمیان شروع سے ہی انتہا کی ذہنی ہم آہنگی دیکھی تھی، مما کو پاپا پر بے حد اعتماد تھا، جس کے ٹھوس ہونے میں مجھے شکوک تھے۔

''بیٹا...... میں نے اس کے بارے میں پوچھ تاچھ کی ہے، مجھے اشعر کے بارے میں کچھ اچھی رپورٹیں نہیں ملیں، سنا ہے کہ اشعر اور طرح کا نوجوان ہے، دل پھینک سا، لاابالی سا...... اس کی کئی لڑکیوں سے دوستی ہے۔''

''مردوں کا کیا ہے پاپا، انہیں دوسری عورتوں سے دوستیاں پالنے کے لیے تو کسی جواز، کسی وجہ اور کسی عمر کی قید نہیں...... لڑکپن میں بھی پالتے ہیں، بیاہ سے پہلے بھی اور بیاہ کے بعد بھی، بچے نہ ہوں تب بھی اور ہوں تب بھی...... گھر میں چار، چار بیٹیاں ہوں تو بھی بیوی کی آنکھوں میں دھول جھونک دیتے ہیں۔'' پاپا جانے میرے اشاروں کو سمجھے یا نہ سمجھے مگر انہوں نے اس رشتے کی مخالفت کرنا چھوڑ دی۔ بعد میں انہوں نے ہی مما کو قائل کر لیا تھا۔

''جس شخص کے بارے میں شادی سے پہلے سے ہی علم ہو کہ وہ ایسا ہے...... ایسا تو آنکھ دیکھی مکھی نگلنے کے برابر ہے بیٹا!'' پاپا نے دلیل دی۔

''کم از کم اعتماد کرنے والے کو دھوکا دینے سے تو کم بڑا جرم ہے یہ پاپا......'' میں نے کہا۔ ''جانتی ہوں گی کہ وہ ایسا ہے تو اس پر نظر رکھوں گی...... مما کی طرح جو عورتیں اپنے شوہروں پر اندھا اعتماد کرتی ہیں ان کے ساتھ کیا اچھا ہوتا ہے پاپا؟ ان کے شوہر انہیں دھوکا نہیں دیتے کیا؟''

''تم کیا اول فول بات کر رہی ہو بیٹا...... اس معاملے میں جو بات ہو رہی ہے اس پر میں نے اپنی رائے دی ہے......''

''میری رائے بھی آپ کی رائے کا جواب ہے پاپا!'' میں نے ان کی طرف دیکھ کر دکھ سے کہا۔

''میں کوشش کروں گا بیٹا کہ تمہاری مما کو اس معاملے میں قائل کر سکوں......'' پاپا نے خود ہتھیار ڈالے اور مدعا مما پر ڈال دیا۔

''مما آپ پر اعتماد کرتی ہیں پاپا اور آپ کی بات مانتی ہیں...... وہ آپ کو خدا کے بعد اس دنیا میں سب سے معتبر سمجھتی ہیں، آپ کی بات ان کے لیے

مستند ہوتی ہے، چاہے آپ اس کے مستحق ہوں یا نہ ہوں۔'' میری آنکھوں میں خواہ مخواہ آنسو آ گئے تھے۔

☆☆☆

''مما...... اتنی بڑی بات آپ نے کیونکر سوچ لی، ہوا کیا ہے؟'' میں نے اسود کے سو جانے کے بعد اسے مما کے کمرے میں لٹا کر واپس آ کر مما سے پوچھا۔

'' میں برسوں سے سوچ رہی تھی بیٹا، بہت برداشت کے ساتھ رہ رہی تھی، اب مجھ میں مزید برداشت کی گنجائش نہیں رہی۔'' مما نے گہری سانس لی۔

'' پھر بھی مما، ایسا کیا مختلف ہوا ہے اب آپ کے اور پاپا کے بیچ؟'' میں نے مما سے پھر سوال کیا۔

''ہم دونوں میں بظاہر جتنی ذہنی ہم آہنگی نظر آتی ہے وہ دوسروں کو نظر آتی ہے بیٹا، اندر سے ہم دریا کے ان دو کناروں کی طرح ہیں جو عمر بھر ساتھ، ساتھ چلتے ہیں مگر کہیں مل نہیں پاتے، جہاں دریا کے کنارے ملتے ہیں وہ دریا کا اختتام ہوتا ہے......''

''میں سمجھی نہیں مما!''

'' تمہارے پاپا نے ہر راہ جاتی عورت سے مراسم رکھے ہیں بیٹا...... میں ہی کافی عرصہ لاعلم رہی، اب معلوم ہوا ہے تو اندازہ ہوا کہ میں تو ان کی زندگی میں کہیں تھی ہی نہیں۔'' مما کی آنکھیں نم تھیں۔ انہوں نے نہ تو کوئی سہیلی چھوڑی ہے میری، نہ رشتے دار اور نہ ہی کوئی ملازمہ...... مجھے تو تم سے یہ سب باتیں کرتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے مگر میں کس سے بات کروں، نہ کروں تو دل پھٹ جائے گا میرا!''

''مما...... آپ مجھ سے جو بات بھی کریں گی وہ ہم دونوں کے بیچ ہی رہے گی، فکر نہ کریں، آپ یقین رکھیں کہ ہم سب بیٹیاں آپ کے ہر فیصلے میں آپ کے ساتھ ہوں گی۔'' میں نے یقین دلایا۔ مجھے بھرپور اعتماد اور یقین تھا کہ جب سب بہنیں مما کی بات کو سنیں گی تو انہیں حق بجانب سمجھیں گی۔ مما کی آخری بات پر مجھے کچھ یاد آیا۔ ''مما کیا نام تھا ہماری اس ملازمہ کا جسے آپ نے گھر سے نکال دیا تھا؟''

ہوتا ہے ہر روز

بہت مصروف ہوں میں
وقت بالکل بھی نہیں ملتا
کبھی بچوں کے جھگڑے ہیں......
کبھی گھر کی پریشانی......
کبھی ہیں جاب کے مسئلے......
کبھی ٹیچرز کی من مانی......
صبح سے شام ہو جاتی ہے
کیا کھانا پکانا ہے؟
اور یہ سوچوں بھی کہ
بچوں کے سنگ
کیا لنچ جانا ہے؟
کیا اسکول کا بھی کام
یا
مجھ کو کرانا ہے
قضا ہو جاتی ہے اکثر نماز
اس حیل وحجت میں
میاں بھی ہوتے ہیں شامل
برابر اس فضیحت میں
میں تھک کر سو رہا تھا
کس لیے مجھ کو جگاتی ہو
پرانی دشمنی ہے کیا؟
جو ہنگامہ مچائی ہو
یوں ہی دن ڈوبتا ہے
رات کا آغاز ہوتا ہے
نئے دن کے لیے اک
سوچ کا آغاز ہوتا ہے
پھر تھک کر لیٹتی ہوں
سوچ کو خاموش کرتی ہوں
تھکاوٹ سے میں سونے کو
یہ آنکھیں موند لیتی ہوں

شاعرہ: خولہ عرفان، کراچی

''پائل.....نام تھا اس کا!'' مما جیسے نیند میں بولی تھیں، انہوں نے ذہن پر ایک لمحے کو بھی زور نہیں ڈالا۔

میرے ذہن کے نہاں خانوں میں اس کی یاد اتنی بری طرح ثبت تھی کہ اس کی تفصیل یاد آتے ہی میرے جسم کا سارا لہو گرم ہونے لگا، کیسی بے حیا لڑکی تھی وہ، میں ہمیشہ سوچتی۔ اس زمانے میں مما تو ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنے بوتیک چلی جاتیں اور ہم ساری بہنیں اپنے اسکول، کالج چلی جاتیں تو اس وقت وہ آیا کرتی تھی، ہم اسے صرف اپنی چھٹی کے دن دیکھتے تھے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم سب گھر پر ہوتیں اور مما کے جاتے ہی اپنا، اپنا کام لے کر لاؤنج میں بیٹھ جاتیں، پاپا تیار ہو کر نکلتے، ہم سب کے ساتھ بیٹھتے، وہیں لاؤنج میں ناشتا کر کے ہم سب کے ساتھ تھوڑی دیر گپ شپ لگاتے۔ پائل آتی تو وہ اٹھ کر اپنے اسٹڈی روم میں چلے جاتے اور اوپر سے آواز لگاتے۔

''پائل! جلدی سے آ کر میرے اسٹڈی روم کی صفائی کر دو، پھر مجھے جانا بھی ہے..... میری چیزیں یہاں ترتیب سے پڑی ہوتی ہیں، میری عدم موجودگی میں کوئی صفائی کرے تو سب الٹ پلٹ ہو جاتا ہے۔''

پائل صفائی کا سامان اٹھا کر اوپر چلی جاتی۔

ہم سب بہنیں لاؤنج میں ہی بیٹھ کر اپنا کام کرتیں، جب کمرے کی صفائی کر کے پائل نیچے آ جاتی تو پاپا اس کمرے کو لاک کر کے، نیچے آ کر ہم سب بہنوں کو خدا حافظ کہہ کر دفتر چلے جاتے، پائل باقی گھر کی صفائی کا کام اس کے بعد کرتی تھی۔ پاپا کے کمرے کی صفائی کے بعد میں نے بار ہا اس کے گریبان سے جھانکتے لال، لال نوٹ دیکھے، جو فرش پر جھاڑو، پوچا لگاتے ہوئے اس کی قمیصوں کے بھاڑ سے گلوں میں سے جھانک رہے ہوتے تھے۔ کبھی کبھار میں سوچتی کہ اس سے پوچھوں کہ کیا اس نے وہ نوٹ کہیں سے چوری کر کے اپنے گریبان میں چھپائے ہیں مگر کبھی پوچھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

اس روز میں لاؤنج میں باقی بہنوں کے ساتھ کام کرنے کے بجائے نہانے کے لیے چلی گئی، نہا کر آئی تو باقی سب لاؤنج میں حسب معمول اپنے کام میں مصروف تھیں، نصف سیڑھیوں تک پہنچ کر مجھے اسٹڈی روم میں سے گھٹی، گھٹی آوازیں سنائی دیں، میں نے دروازے کو ہلکا سا دبایا تو وہ کھلتا چلا گیا..... کاش میں نے اس دروازے کو نہ کھولا ہوتا تو میں عمر بھر اس تاثر میں رہتی کہ میرے پاپا فرشتوں جیسے ہیں..... میں لاکھ چاہ کر بھی کسی سے وہ بات شیئر نہ کر سکی، مما کو بتانا چاہتی تھی مگر سوچا کہ وہ بہت دکھی ہوں گی۔ پھر وہ دن بھی یاد ہے جب اسے مما نے چیخ، چیخ کر گھر سے نکالا تھا، تب مجھے سمجھ میں آیا کہ مما نے ضرور اس کی چوری پکڑی ہو گی، ہم بہنوں نے مما سے پوچھا بھی تو انہوں نے کچھ نہیں بتایا، ہم بھی اس واقعے کو بھول بھال گئے تھے، آج اتنے سالوں کے بعد مما نے باتوں ہی باتوں میں کہا کہ پاپا نے کسی ملازمہ کو بھی نہیں چھوڑا تو مجھے یاد آ گیا۔

☆☆☆

''صدف کو نروس بریک ڈاؤن کیوں ہوا احمد؟''

میں جاننا چاہتی تھی کہ اس نے مما کی بات کا ہی اتنا اثر لیا تھا یا کچھ اور مسئلہ تھا، صبح جاگتے ہی فون کو آن کیا تو اسکرین پر احمد کے نام کا پیغام تھا، میں نے اسے پڑھا اور میرا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا۔ وہ مما کے سب سے قریب تھی، اسے مما سے بہت زیادہ پیار تھا اور مما بھی اسے بہت چاہتی تھیں، وہ ہم سب سے الگ سی تھی، حساس طبیعت رکھنے والی اور اسے اچانک نروس بریک ڈاؤن ہونا باعث تشویش تو تھا ہی۔

''کچھ معلوم نہیں رانیہ آپی.....'' احمد نے کہا۔

''بس بے ہوشی میں بہت عجیب، عجیب باتیں دہراتی رہی ہے، مما کے لیے اداس ہے شاید!''

''ہوں!'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''تم نے سنا نہیں غور سے کہ وہ بے ہوشی میں کیا بڑبڑاتی رہی ہے؟'' میں نے یہ جاننے کو کہ کہیں صدف نے..... بے ہوشی میں اس راز کو فاش نہ کر دیا ہو جسے ہم خود سے بھی چھپاتی پھر رہی تھیں۔

''بس آپی، وہ یہی کہہ رہی تھی کہ مما آپ اداس نہ ہوں، پریشان نہ ہوں، اسی لیے میں نے سوچا ہے کہ اسے کچھ ہفتوں کے لیے پاکستان بھجوا دوں آپی!''

''ہوں!'' میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''میں تو اس کا سن کر پریشان ہو گئی تھی اور عابد سے کہہ رہی تھی کہ دو ایک دن کے لیے میں اسے دیکھنے کے لیے لندن چلی جاؤں، مصطفیٰ کو عابد کے پاس چھوڑ آؤں گی.....'' میں نے احمد کو اپنا پروگرام بتایا۔

''اچھا.....'' احمد نے کہا۔ ''آپ بھی پاکستان کا پروگرام کیوں نہیں بنا لیتیں آپی؟'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''ممانی جان کو آپ لوگوں کی مدد کی ضرورت ہے، میرا خیال ہے!''

''کیوں..... مما کو ہماری مدد کی کیا ضرورت پڑ گئی؟'' میں نے حیرت سے پوچھا، شک ہو رہا تھا کہ اسے کچھ نہ کچھ علم تو ہے۔

''وہ صدف ہی بے ہوشی میں بڑبڑا رہی تھی کہ مما پریشانی میں اکیلی ہیں، انہیں میری ضرورت ہے، وہ تنہا ہیں..... اور ایسی ہی کئی باتیں۔'' اس کے انکشاف نے میرے شک کو تقویت دی کہ صدف نے اس سے بڑھ کر بھی کچھ نہ کچھ انکشافات کیے ہوں گے۔

''مما کیوں تنہا ہوں گی احمد..... پاپا جو ہیں وہاں، گھر میں فاطش ہے، اسود ہے..... اور پاپا مما کا کتنا خیال رکھتے ہیں، تم سے بڑھ کر اپنے ماموں کو کون جانتا ہو گا۔'' میں نے رسان سے کہا۔

''کبھی کبھار لوگوں کی بھیڑ اور میلے میں بھی انسان تنہا ہو جاتا ہے آپی!'' اس نے فلسفہ بھگارا تھا۔

''ارے مما بہت زندہ دل خاتون ہیں، تم تو جانتے ہی نہیں کہ مما ہم سب سے بہادر ہیں، ہم سب مل کر بھی اتنی بہادر نہیں ہو سکتیں۔''

''بہادری کا دلوں کی شکست و ریخت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا آپی!''

''صدف کی بیماری نے تو تمہیں فلسفی بنا دیا ہے۔''

میں نے ہنس کر اس کی بات کو اڑایا۔ ''چلو دیکھو لو کیا پروگرام بنتا ہے صدف کا، پھر بتانا مجھے.....''

''صدف کی تو اس ویک اینڈ کی فلائٹ پر سیٹ بک کروا دی ہے میں نے۔'' اس نے کہا تو میں نے اسے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ فاطش اور نیلم تو وہیں ہیں..... صدف بھی چلی جائے گی، میں دیکھتی ہوں اگر ایک ہفتے کی چھٹی مل جائے تو میں بھی چلی جاتی ہوں، مما جانے کس مشکل میں ہیں؟ میں نے سوچا۔

☆☆☆

''شکر ہے کہ آپ کا واپس آنے کو من چاہا۔'' رات دیر سے لوٹی تو عمر نے مذاق سے کہا تھا۔

''میرا تو من چاہ ہی نہیں رہا تھا واپس آنے کو، بس ناہید آپی کے آنے کا سوچ کر واپس آ گئی۔'' میں نے بھی جواباً مذاق سے کہا۔

''اچھا.....'' انہوں نے لمبی سی اچھا کی۔ ''کیا ضرورت ہے اتنی پروا کرنے کی ناہید آپی کی بھی، چلی جانا واپس صبح سویرے۔''

''کرنا پڑتی ہے ناں پروا بابا!'' میں نے ان کے شانے سے سر لگا کر کہا۔

''کیوں، اتنی مجبوری ہے پروا کرنے کی؟''

''وہ میرے جان سے پیارے شوہر کی جان سے پیاری بہن جو ہیں.....'' میں نے ادائے دلربائی سے کہا، شاید یہ وقت تھا ان سے اپنی بات منوانے کا۔ مما سے مل کر آئی تو حد درجہ پریشان تھی مگر مما کا ہی سکھایا ہوا سبق تھا کہ سسرال کے مسائل کو میکے ساتھ نہ لے کر آؤ اور میکے کے مسائل کی فکر میں دبلے ہوتے ہوئے اپنی ازدواجی زندگی کو متاثر نہ کرو، اسی لیے میں نے مما کی پریشانی میں اپنے ڈوبتے ہوئے دل کی بھی پروا نہ کی اور عمر سے اس پیار سے بات کی... جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ جو بھی کچھ مما اور پاپا کے بیچ چل رہا تھا وہ جانے کس طرح ہماری زندگیوں پر اثر انداز ہوتا مگر اب ہمیں اپنے، اپنے گھروں میں خود ہی نارمل رہنے کی کوشش کرنا تھی۔

''اچھا......'' عمر نے مسکرا کر مجھے اپنے قریب کرلیا۔ ''میری جان سے پیاری نیل!'' میرے اندر سکون اترنے لگا اور میں ہر فکر کو تھوڑی دیر کے لیے بھول گئی۔

''عمر......'' میں نے ہولے سے پکارا۔

''جانِ عمر!'' جواب آیا۔

''اگر میں آپ سے کہوں کہ بلی بھی نبیل کو پسند کرتی ہے تو؟'' میں نے سر اٹھا کر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔ جواباً عمر نے اپنی آنکھیں موند کر سینے کی گہرائی سے سانس لی، ان کے لب بھینچے ہوئے تھے۔

''میں ایک بار بہت بے عزت ہو چکا ہوں نیل......'' انہوں نے کرب بھرے لہجے میں کہا۔ ''اس کے بیٹے نے ایک بار میری بیٹی کو پسند کیا۔ پھر اسے ٹھکرایا، اب کسی کے ہاتھوں وہ خود ٹھکرایا گیا ہے تو اسے دوبارہ میری بیٹی پسند آنے لگی ہے؟''

''اس نے تو جو کیا سو کیا عمر...... میں تو بلی کے دل کی بات کر رہی ہوں۔'' میں نے پھر کہا۔ ''لڑکیوں کی آنکھوں میں کچی عمروں میں جو خواب سج جاتے ہیں عمر، وہ پورے نہ ہوں تو لڑکیاں کم ہی خوش رہتی ہیں۔''

''میں اپنی بیٹی کو کسی ایسے شخص سے نہیں بیاہ سکتا نیل جس کے دل پر، سوچوں پر، میری بیٹی سے پہلے کسی اور کا قبضہ رہا ہو...... میری بیٹی کسی کی دوسری چوائس ہو، میں یہ برداشت نہیں کرسکتا۔''

''برداشت تو انسان کو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے عمر!'' انہوں نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا، میں نے ہمت جمع کی۔ ''لوگ اپنی کنواری بیٹیوں کی شادیاں ایسی جگہ بھی تو کر دیتے ہیں جہاں نہ صرف دل اور سوچوں پر کسی اور کا قبضہ رہا ہوتا ہے بلکہ ان کے تعلق کی کئی، کئی نشانیاں بھی موجود ہوتی ہیں۔'' میری بات عمر کو یوں لگی جیسے کسی پر آسمانی بجلی گرتی ہے...... ''مگر ماں باپ ایسا کرنے کو اس لیے تیار ہو جاتے ہیں کہ انہیں معلوم ہوتا ہے جہاں محبت ہو جاتی ہے وہاں کچھ نظر نہیں آتا، جہاں ماں باپ اپنی اولاد کی نظروں میں پسندیدگی دیکھ لیتے ہیں وہاں باقی سب کچھ پس پشت چلا جاتا ہے......''

میری بات ابھی جاری تھی کہ عمر نے کروٹ بدلی اور اپنی سائڈ ٹیبل کی دراز کھولی، میرا دل دھڑکنے لگا کہ اب جانے اس میں سے کیا نکلے گا، شاید ریوالور! میں اندر سے ہولے ہولے کانپ رہی تھی، انہوں نے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور سگریٹ سلگائی اور اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑے ہوئے۔

''تمہیں بلی نے خود بتایا ہے کہ اسے نبیل پسند ہے یا اماں نے تمہیں بتایا ہے؟'' ان کا سوال انتہائی پیچ دار تھا، میں بلی کا کہتی تو وہ اس کے سامنے جا کھڑے ہوتے اور اس سے پوچھتے، اماں کا کہتی تو جا کر اماں سے جواب طلبی کرتے، دونوں ہی مشکل صورتِ حال تھیں کیونکہ اماں نے کہا تھا کہ ان کا ذکر بیچ میں نہ آئے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ کسی دوسرے کے کیس کو لڑنا، وہ بھی اس صورت میں کہ مدعی خود سامنے نہ آنا چاہتا ہو، کس قدر مشکل ہوتا ہے۔

''کیا میں بلی کی ماں نہیں عمر؟ کم سن لڑکیوں کے دلوں کی گیلی مٹی میں جب محبت کا بیج گرتا ہے تو مائیں فوراً محسوس کرلیتی ہیں......'' میں نے دل کڑا کر کے وہ کہا جو فوری طور پر میرے ذہن میں آیا تھا۔ ''کیا ایک ماں کو بیٹی کے دل کا حال جاننے کے لیے اسی کی زبان سے سننا ہوتا ہے؟'' عمر گہری نظر سے میرے چہرے کو گھور رہے تھے۔

''کون سی ماں...... کس کی ماں؟'' عمر پوچھ رہے تھے...... ''تم یا اماں؟''

زندگی کبھی کبھی کن راہوں پر لاکھڑا کرتی ہے کہ راستے سامنے نظر آتے ہوئے بھی قدم نہیں اٹھتے...... ایسی ہی ایک عورت کی کہانی کا اگلا قدم...... آئندہ شمارے میں پڑھیے۔

انمول دولت

غزالہ عزیز



ماں نے کہا تھا کہ اس دنیا میں ہر شے کی کوئی نہ کوئی قیمت ہوتی ہے۔ سوائے عزت کے...... عزت کا کوئی مول نہیں ہوتا۔ یہ انمول شے ہوتی ہے۔ کسی قیمتی خزانے کی طرح...... اور ماں کی تربیت میں اس نے بھی ہوش سنبھالتے ہی اس قیمتی خزانے کی قدم، قدم پر حفاظت کی تھی۔ کسی کی میلی آنکھ کی چبھتی تیز نظر بھی برداشت نہیں کی تھی۔ اس کا مزاج بھی فطرتاً تیکھا تھا مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ وقت کے دھارے

میں بہتے، گھات لگائے حالات کی تندی و تختی کے تھپیڑے ایک دن اس کے مضبوط قدم ڈگمگا دیں گے یا شاید ماںتا کا جذبہ، اولاد کی محبت ہی اتنی زور آور ہوتی ہے۔ وہ مضبوط سے مضبوط ارادوں کی چٹانوں میں شگاف ڈال دیتی ہے۔

چنداں کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ لیکن اس نے حالات کی سختی کو مجبوری کی بیڑی بنانے کے بجائے حالات کو اپنے فیصلے کی ثابت قدمی سے شکست دے دی۔

☆☆☆

لال حویلی میں آج کل جشن کا سماں رہتا تھا۔ چھوٹے ملک یاور خان کے بیاہ کا سلسلہ چل رہا تھا۔ سو گاؤں کے ہر گھر کی بیٹھک سے لے کر چوپال اور چوپال سے لے کر چوک اور تھڑوں پر ملک یاور خان کے بیاہ کا چرچا رونق لگائے تھا۔ ہر زبان پر ملک یاور کے بیاہ کا قصہ تھا۔ چھوٹے ملک کا بیاہ ساتھ والے گاؤں کے زمیندار چوہدری دلدار خان کی اکلوتی بیٹی شہزادی سے طے ہوا تھا۔ جو جہیز میں پورے پچاس مربع زمین ساتھ لا رہی تھی۔ جس کے باعث بڑے ملک کے ساتھ، ساتھ چھوٹے ملک کا سینہ بھی فخر سے پھولا، پھولا رہنے لگا تھا۔

ماں، باپ کی آنکھ کا تارا شہزادی بڑی بھاگوں والی تھی۔ میکے کی طرح اب سسرال میں بھی بختاں والی مشہور ہوگئی تھی۔ چھوٹے ملک کے تو خوشی سے پاؤں ہی زمین پر ٹک نہیں رہے تھے۔ برادری میں اس بیاہ کے بعد اس کی حیثیت مزید با اثر اور مستحکم ہونے جا رہی تھی تو دوسری طرف اس کے باپ بڑے ملک سخاوت کا بھی شملہ اور اونچا ہوگیا تھا۔

شہزادی صرف نام کی شہزادی نہ تھی۔ روپ سروپ میں بھی شاہوں کے محلوں کی رانیوں جیسی آن بان رکھنے والی حسینہ تھی۔ سو یاور ملک اپنے بیاہ پر بہت خوش تھا۔

البتہ گاؤں کے ایک غریب کچے مکان میں رہنے والے مختارے اور ریشماں کی اکلوتی بیٹی چنداں بھی کسی شہزادی سے کم نہیں تھی اپنے ماں، باپ کے لیے...... جنہوں نے اسے رانی کی طرح نازوں سے پالا تھا۔

وہ اپنے ماں، باپ کی لاڈلی، دونوں کی آنکھوں تارا تھی۔ ریشماں ان پڑھ تھی مگر اس نے چنداں کی بہت اچھی تربیت کی تھی۔ اور چنداں تو سارے گاؤں میں اپنے سوہنے روپ سروپ کی وجہ سے مشہور بھی تھی۔ نام چنداں رکھا تھا ماں، باپ نے تو وہ بھی چاند کی طرح رج کے سوہنی تھی۔ اوپر سے دونوں کے لاڈ پیار نے اس کے مزاج بھی شاہانہ کردیے تھے۔ وہ سارے گاؤں میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ راج ہنس کی طرح گردن اٹھائے اٹھکیلیاں کرتی پھرتی تھی۔

کم سنی اور بے فکری کی زندگی نے اس کی ساتھی ہم جولیاں کو اس پر رشک بھری نگاہوں سے دیکھنے پر مجبور کردیا تھا۔ لڑکیاں تو لڑکیاں گاؤں کے لڑکے بالے بھی چنداں سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈا کرتے تھے۔

لال حویلی میں چھوٹے ملک کے بیاہ کی وجہ سے حویلی کے کاموں میں اضافہ ہوگیا تھا۔ سو بڑی ملکانی نے حویلی کی ملازماؤں پر حکم صادر کردیا کہ اپنے، اپنے گھروں سے حویلی کے کام کاج کے لیے اپنی بیٹیوں کو ساتھ لے کر کام پر آئیں تاکہ حویلی میں پھیلے بیاہ کے بکھیڑوں کے چھوٹے بڑے سارے کام جلدی، جلدی نبٹ جائیں۔ ریشماں اور شاداں کو بھی یہی تاکید کی گئی تھی جو آپس میں نند بھاوج تھیں۔ ریشماں اور شاداں کے مرد گاؤں کے سرخ اینٹوں کے بھٹے پر کام کرتے تھے۔ اور گاؤں کے صدیوں پرانے رواج کے مطابق گاؤں کے غریب مرد ملکوں کے کھیت کھلیانوں کی ذمے داری سنبھالتے تھے اور

ان کی عورتیں حویلی کے بکھیڑے نبٹاتے نبٹاتے سویرے اندھیرے سے شام کرتی تھیں۔ اس لیے ریشماں اور شاداں بھی یہ بیگاری کرنے پر مجبور تھیں۔ اب یہ زمیندار کی بیگاری تھی یا پشتی غلامی جو گاؤں کے ہر، ہر غریب پر حویلی کی چاکری لازم تھی۔ گاؤں میں پیدا ہونے والا ہر غریب گاؤں کے زمیندار کا پیدائشی غلام تھا۔ اور یہ غلامی ان کا مقدر بن چکی تھی۔

بڑی ملکانی کی حکم عدولی کی بھلا کسے جرأت تھی مگر ریشماں اور شاداں پریشان ہوگئی تھیں۔ شاداں کی بیٹی رانی تو ابھی بہت چھوٹی تھی۔ صرف گیارہ برس کی جبکہ ریشماں کی لاڈو رانی چنداں سولہ برس کی ہو کر بھی بچوں کی طرح ماں، باپ سے لاڈ اٹھواتی تھی۔ لہٰذا ریشماں اور مختارے نے بھی اس کی کوئی خواہش کبھی رد نہیں کی تھی۔

شاید ماں، باپ کی طرف سے ملے پیار و محبت نے چنداں کی ذات میں حد درجہ خود اعتمادی پیدا کردی تھی۔ وہ کسی سے ڈرتی نہیں تھی۔ وہ خود کو اپنے ماں، باپ کے گھر کی رانی سمجھتی تھی۔ دوسرے قدرت نے روپ سروپ بھی جی کھول کر فیاضی سے عطا کیا تھا۔ دودھیا رنگت پر سرخ ٹماٹر جیسے گال اور ہونٹوں کی لالی نے چنداں کے نوخیز حسن کو جو تازگی و رعنائی دی تھی۔ عمر کی اس نوخیزی اور جوانی کے الھڑ پن نے اس کی دوشیزگی میں خاص کشش پیدا کردی تھی۔ جس پر گاؤں کا ہر گبرو جوان مر مٹنے کو تیار تھا لیکن چنداں کسی کو گھاس نہیں ڈالتی تھی۔ کچھ ماں کی تربیت کا اثر تھا تو کچھ کمالے کی محبت کا خمار تھا۔ جس نے ہمہ وقت چنداں کے دل و دماغ کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ کمال اس کی پھپھو شاداں کا بیٹا تھا۔ شاداں اور رحیم داد کے دو ہی بچے تھے۔ بڑا بیٹا کمال جسے پیار سے سب کمالے کہتے تھے۔ اور چھوٹی بیٹی رانی...... کمال اٹھارہ برس کا گبرو جوان تھا۔ شاداں اور رحیم نے بچپن میں ہی چنداں کو کمال کے لیے مختار اور ریشماں سے مانگ لیا تھا۔ یوں وہ بچپن سے کمالے کی منگ (منگیتر) تھی۔

کمال بھی باپ اور ماموں کی طرح گاؤں کے اینٹوں کے بھٹے پر مزدوری کرتا تھا مگر چنداں سے اسے بہت پیار تھا۔ چنداں بھی اسے جی جان سے پسند کرتی تھی۔ اگلے سال ان کا بیاہ بھی طے تھا۔ یوں وہ دونوں ہی ایک، ایک دن گن رہے تھے کہ اب اچانک بڑی ملکانی کے حکم نے ریشماں کو تذبذب میں مبتلا کردیا۔ وہ تو یہ سوچ، سوچ کر ہلکان ہوتی جا رہی تھی کہ وہ چنداں کو اپنے ساتھ حویلی کام پر لے جانے کے لیے کیسے تیار کرے گی۔ شاداں بھی یہ بات جانتی تھی لیکن وہ ریشماں اور چنداں کے لیے چاہ کر بھی کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ البتہ ریشماں کو تسلی ضرور دی تھی مگر گھر آکر بھی ریشماں پریشان ہی رہی تھی۔ مختارے کو پتا چلا تو وہ بھی چنداں کے لیے فکر مند ہوگیا تھا وہ دونوں اچھی طرح جانتے تھے کہ بڑے، بڑے زمین دار، جاگیر دار صرف اور صرف ظالم و جابر نہیں ہوتے بلکہ ان کی حکم عدولی کی سزائیں بھی بڑی ظالم ہوتی ہیں۔ بدن سے روح کھینچ لیتی ہیں۔ جیتے جاگتے گوشت پوست کے انسانوں کو مٹی میں ڈال دیتی ہیں۔ جیسے وہ زمین پر رینگنے والے حقیر سے کیڑے مکوڑے ہوں۔

غرض زمین پر اس خدائی فوج دار کا بڑا دبدبہ تھا غریب انسانوں پر جو چوہدری سخاوت کی غلامی کی موٹی، موٹی مضبوط زنجیروں میں آج بھی جکڑے ہوئے بے بس و کمزور تھے۔

سو ریشماں اور مختار بھی اسی خوف میں مبتلا تھے۔ جس کی دھاک بڑے ملک کے مظالم نے پورے گاؤں کے غریبوں پر بٹھا رکھی تھی۔

ریشماں نے جب حویلی سے واپسی پر گھر آکر مختارے سے بات کی تو وہ بھی حقے کی نے چھوڑ کے گم صم ریشماں کے تھکے ہوئے چہرے کے ماتھے کی

لکیریں گننے لگا۔

''مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہا چنداں کی ماں...... یہ کیسے ہوگا...... اپنی چنداں تو حویلی جانے کے لیے کبھی نہیں مانے گی...... اور تو نے تو اسے ہتھیلی کا چھالا بنا کے رکھا ہے...... وہ نمانی بھلا حویلی کے ڈھیروں کام کیا کرے گی۔ اسی لیے تجھ سے کہتا تھا...... لڑکی ذات ہے وہ...... کل کو اسے بیاہ کر سسرال بھی روانہ کرنا پڑے گا...... مگر تو میری سنتی کب تھی۔'' مختارے نے چارپائی کے کونے پر پریشان بیٹھی ریشماں کو شکایتی نگاہوں سے دیکھا تھا۔

''مجھے پتا ہے...... لڑکی ذات ہے وہ...... پر وہ میری ایکو ایک تو دھی رانی ہے، بڑے نازوں سے پالا ہے اسے...... مگر حویلی کی چاکری نہیں کرانی ہے ہم نے...... رہی بات چولھا چوکی کی تو بیاہ کے بعد ہر لڑکی کو یہ ذمّے داری اٹھانا ہی پڑتی ہے پر وہ اس کے گھر کا کام ہوتا ہے، اپنی چنداں بھی وقت آنے پر کرلے گی۔'' اور ریشماں کے کورے جواب پر مختار فکر مندی سے سوچنے لگا تھا۔

''مگر اب بڑی ملکانی جی کے حکم کا کیا ہوگا؟''

''ہونا کیا ہے...... کل سے چنداں کو حویلی ساتھ لے کر جانا پڑے گا۔ بڑی ملکانی کے غصے سے بڑا خوف آتا ہے مجھے...... اس لیے مجبوری ہے، چنداں کو راضی کرنا ہی پڑے گا...... لیکن ڈر لگ رہا ہے مختارے...... بیاہ والا گھر ہے، اگر ہماری چنداں سے کوئی غلطی ہوگئی تو بڑی ملکانی کے غصے کو تو، تو جانتا ہے۔'' ریشماں کے خدشوں میں گھرے دل کا ہراس اس کے کملائے چہرے سے صاف جھانک رہا تھا۔

''کہہ تو تو ٹھیک رہی ہے چنداں کی ماں...... اور اپنی چنداں کو حویلی میں جانے کے لیے راضی کون کرے گا...... وہ تو کبھی نہیں مانے گی۔ اسے حویلی والوں کی چاکری سے تپ چڑھتی ہے، جانے ہم غریبوں کے جھونپڑے میں ایسے شاہانہ مزاج والی کہاں سے پیدا ہوگئی ہے۔ ہم تو جدی پشتی غلام ہیں ملکوں...... (زمینداروں) کے!'' مختارے نے بے بسی سے کہا تھا۔ وہ چارپائی کے کونے پر ٹیک لگائے بیٹھا حقے کی نے منہ میں دبائے کش لے رہا تھا۔ پریشانی سے اور بے مزہ ہوکر حقے کو پرے کیا تھا اس نے......

''میں بھی یہی سوچ رہی ہوں چنداں کے ابا...... چنداں سے کیسے بات کروں صرف چھوٹے ملک کے بیاہ تک کی تو بات ہے۔ پھر ہم نے کون سا اسے ساری عمر حویلی کی چاکری کے لیے بھیجنا ہے۔'' ریشماں نے بالآخر تھکے ہوئے دل و دماغ کے ساتھ مسئلے کا حل نکالا تھا۔

''ٹھیک ہے پھر تو خود ہی اپنی لاڈو رانی سے بات کرلینا مگر میں نے تو سوچ لیا ہے۔ اس بڑے تہوار پر شاداں بہن اور رحیم بھا سے کمال اور چنداں کے بیاہ کی پکی تاریخ مانگ لوں گا۔ لڑکی ذات بڑی بھاری ذمّے داری ہوتی ہے۔ اب چنداں کا بیاہ بھی ہوجانا چاہیے۔ بیٹی کو وقت پر رخصت کردینا ہی سمجھداری ہے۔ ہمیں بھی اپنے کاندھوں کو جلد ہی اس ذمّے داری سے ہلکا کرلینا چاہیے۔'' مختارے نے اپنی سوچ کے مطابق سمجھداری کی بات کی تھی اور ریشماں بھی جہاندیدہ عورت تھی۔ مختارے کی بات کی گہرائی میں چھپے مفہوم کو اچھی طرح سمجھ گئی تھی جبکہ مختارے نے حقہ ایک طرف کرکے پاؤں پسارے تھے۔

''بالکل ٹھیک کہا ہے تم نے چنداں کے ابا...... میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ اس عید تہوار پر چنداں کے ہاتھ پیلے ہوجانے چاہئیں...... پر تو فکر مت کر حویلی جانے کے لیے اپنی دھی رانی کو آپے ہی منالوں گی۔ کام کاج نہ سہی، پر بیاہ کے گھر کی رونق، میلے کا سن کر چنداں مان ہی جائے گی۔ تو بے فکر ہوکر آرام کر...... میں تب تک رات کے لیے روٹی ڈال لوں جاکر...... پھر اس سے بات بھی کرلوں گی۔'' ریشماں اپنے دُکھتے ہوئے گھٹنوں پر ہاتھوں کا دباؤ ڈالتے ہوئے چارپائی سے اٹھ کر صحن کی ایک طرف بنے چولھے کی جانب بڑھ گئی تھی۔ اور مختارے نے کمر سیدھی کرنے کے لیے کروٹ لی تھی۔

دن بھر سرخ اینٹوں کے بھٹے کی گرمی اور سختی اس کے سانولے چہرے پر تھکن کی صورت بکھری پڑی تھی۔ اب اس نے مغرب کے بعد روٹی کھانے کے لیے ہی اٹھنا تھا۔ ریشماں مطمئن ہوکر کام میں جُت گئی۔

☆☆☆

''اماں...... لال حویلی میں تو بڑی رونق میلا لگا ہوگا۔ ڈھولک رت جگا بھی ہوگا...... اور میٹھے گڑ والے گولے بھی بنیں گے...... جیسے بڑی ملکانی کی دھی رانی کے بیاہ پر بنے تھے۔ نوری نے بتایا تھا مجھے...... ہے ناں اماں......'' چنداں نے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا تھا۔ جواباً ریشماں مسکرانے لگی تھی۔

''ہاں وہ تو روز ہی ہوتا ہے، بڑی رونق لگی ہے حویلی میں۔''

چنداں رسوئی میں روٹی پکاتی ریشماں کے پاس بڑی چوکی پر بیٹھی اشتیاق سے ریشماں سے حویلی میں ہونے والے بیاہ کی تیاریوں کے بارے میں ریشماں کی باتیں سن رہی تھی۔ اور ریشماں نے بھی بڑی سمجھداری سے کام لے کر چنداں کو حویلی ساتھ لے جانے کے لیے کام کاج کی بات گول کرکے چھوٹے ملک کے بیاہ کے جشن میلے کی لالچ دی تھی۔

''ہاں دھی رانی...... میٹھے گڑ کے گولے بھی بنیں گے اور نمکین میٹھے چاول بھی...... کھوئے والی مٹھائی بھی بنے گی پھر تو کل سویرے ساتھ حویلی چلے گی ناں......؟'' ریشماں نے چنداں کی اشتیاق اور خوشی سے چمکتی آنکھوں کی معصوم روشنی سے نگاہیں چراتے ہوئے پوچھا تھا۔

''ضرور چلوں گی اماں...... مجھے ڈھولک رت جگا دیکھنے کا بڑا شوق ہے۔ نوری بتا رہی تھی بڑا رونق میلا ہوتا ہے۔ نوری کہہ رہی تھی۔ یہ وڈی حویلی ہے ملکوں کی۔'' چنداں نے معصومیت سے کہا تھا۔ اس نے حویلی اندر سے نہیں دیکھی تھی مگر اب نوری کی زبانی حویلی دیکھنے کا اشتیاق اسے بھی ہونے لگا تھا لیکن اس معصوم نے حویلی کے مکینوں کو نہیں دیکھا تھا۔ اگر دیکھ لیتی تو کبھی ان پتھر کی اونچی ظالم دیواروں کی طرف رخ کرنے کا کبھی سوچتی بھی نہ......!

اور چنداں کی ہاں سن کر ریشماں نے خوش ہو کر کہا تھا۔

''ٹھیک ہے، کل تو سویرے اٹھ کر ہاتھ منہ دھو کر تیار ہو جانا۔ کل سے تجھے بھی میرے ساتھ لال حویلی جانا ہوگا۔''

حالانکہ ریشماں نے چہرے پر مسکان جبراً سجائی تھی۔

''اچھا...... تو جا کر اپنے ابا کو اٹھا دے۔ صحن میں اندھیرا پھیل رہا ہے۔ سیانے کہتے ہیں، اس وقت بندے کا سونا ٹھیک نہیں ہوتا۔''

''اچھا اماں...... ابھی جاتی ہوں۔'' چنداں چوکی سے اٹھ کر رسوئی سے باہر چلی گئی تو ریشماں باقی کی روٹیاں جلدی، جلدی بنانے لگی۔ ابھی مغرب کی نماز بھی پڑھنی تھی۔ پھر مختارے اور چنداں کو روٹی کھلانے کے بعد ہی سب کاموں سے فارغ ہونے کے بعد اسے کمر سیدھی کرنا نصیب ہوتا...... اس لیے ریشماں کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔

☆☆☆

حویلی کے مردان خانے میں اس وقت چھوٹے ملک کے دوستوں کی محفل جمی تھی۔ ریشماں سویرے ہی چنداں کو اپنے ساتھ حویلی لے آئی تھی اور چھوٹی ملکانی کے کمرے میں بھیج دیا تھا۔ چنداں پانچ جماعتیں پاس تھی۔ اس لیے چھوٹی ملکانی اپنے پاس بٹھائے بری میں چڑھائے بھاری بھرکم جوڑوں اور زیورات کے ساتھ چھوٹے ملک کے سسرے (سسرال) والوں کو لینے دینے کے سامان کا حساب کتاب لکھوا رہی تھی۔ اس لیے ریشماں بے فکر ہو کر شاداں کے ساتھ زنان خانے میں رسوئی کے کاموں میں مصروف تھی۔

چھوٹے ملک کے دوست شکار سے واپس آئے تھے۔ اب کھانے پینے اور مشروبات کا سلسلہ چل رہا تھا۔ جبکہ شاداں نے رانی کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے بڑی ملکانی سے معذرت کر لی تھی کہ رانی کے بدلے وہ شام دیر تک کام کر لے گی اور بڑی ملکانی کو کام سے غرض تھی۔

شام میں حویلی کے کاموں سے فارغ ہو کر ملازمائیں ڈھولک رت جگا کی رونق لگاتی تھیں۔ اس لیے چنداں بھی بے چینی سے شام ہونے کی گھڑیاں گن رہی تھی۔ اور پھر شام ہوتے ہی حویلی کے قدرے الگ تھلگ حصے میں بڑے سے دالان کے چکنے فرش پر بچھی سرخ اور سبز چٹائیوں پر حویلی کی نوجوان، بوڑھی ملازمائیں اور گانے بجانے والی زنتکیاں، بیٹھ کر (گانے بجانے والی عورتیں) ڈھولک کی تھاپ پر سہاگ کے رسیلے گیت گانے لگیں۔ چنداں بھی ان کے درمیان بیٹھ کر جوش و خروش سے تالیاں پیٹنے لگی۔ شاداں اور ریشماں ایک طرف بیٹھی چنداں کا خوشی سے چمکتا چہرہ دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ یہ سوچ کر کہ بیٹیاں کتنی معصوم اور نمانی ہوتی ہیں۔ دن بھر چھوٹی ملکانی کے ساتھ بیٹھ کر دیر تک سر کھپانے کے باوجود اس وقت چنداں کے چہرے پر تھکن کے آثار تک نہیں تھے۔

تب ہی مردان خانے سے چھوٹا ملک یاوادھر نکل آیا تھا۔ کھانے کے بعد جام کا خمار تھا یا پھر ہوا کے دوش پر سفر کرتی سُریلی آوازوں کا جادو جو چھوٹا ملک حویلی کے زنان خانے میں کھنچا چلا آیا تھا اور دالان میں بیٹھی حویلی کی ملازماؤں کے درمیان گلابی جوڑے میں ملبوس بے پروائی سے گلے میں دوپٹا ڈالے جوش و خروش سے تالیاں پیٹتی چنداں کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا تھا۔ اس کی بے اختیار اٹھنے والی نگاہیں چنداں کے روپ سروپ سے پلٹنے پر انکاری ہو گئی تھیں۔ وہ دور کھڑا چنداں کے بیٹھے روپ سروپ کی مے کو آنکھوں کے رستے دل میں اتار رہا تھا۔ شراب اور شباب کا نشہ مستی بن کر اس کے وجود پر چھانے لگا۔

اس نے پاس سے گزرتی ملازمہ کو آواز دے کر

کچھ کہا تھا۔ ملازمہ گھبرا کر بدکی تھی مگر چھوٹے ملک کی لال، لال ڈوروں والی آنکھوں پر نظر پڑتے ہی خوف زدہ ہو کر الٹے قدموں حویلی کے زنان خانے والے حصے کی جانب بھاگی تھی۔ جہاں چنداں اس وقت ڈھولک کی تھاپ پر گیت گانے والی عورتوں کے پاس بیٹھی تھی۔ شاداں اور ریشماں کچھ دیر پہلے ہی کسی کام سے حویلی کے ...... زنان خانے بڑی ملکانی کے کمرے تک گئی تھیں۔ اور ملازمہ کے لیے یہ موقع غنیمت تھا۔ معصوم چنداں حویلی کے عیاش مردوں کی روایتوں سے کب واقف تھی۔ ملازمہ نے چنداں کے پاس پہنچ کر اس کے کان میں کچھ کہا تھا۔ اور چنداں اٹھ کر ملازمہ کے ساتھ چل پڑی تھی۔ یہ سوچے بغیر کہ چھوٹے ملک کے حکم پر وہ حویلی کی جس ملازمہ کے ساتھ آنکھ بند کر کے حویلی کے مردان خانے کی طرف جا رہی تھی۔ وہاں شکاری معصوم چڑیا کے شکار کے لیے گھات لگائے بیٹھا ہے مگر وہ چنداں تھی۔ جس کی تربیت میں ریشماں نے عزت کے سبق کو سب سے اوپر رکھا تھا۔ اور چنداں نے ماں کی تربیت کو بے مول ہونے نہیں دیا تھا۔ ورنہ ملازمہ تو اسے چھوٹے ملک کے کمرے میں دھکیل کر بھاگ گئی تھی۔

☆☆☆

چھوٹا ملک حویلی کے مردان خانے کے مخصوص کمرے میں اتھرے شیر کی طرح غراتا پھر رہا تھا۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ حویلی میں کام کرنے والی دو ٹکے کی غریب مختارے کی بیٹی چنداں اتنی بڑی جرأت کا مظاہرہ کرے گی۔ اپنے گال پر چنداں کے زوردار تھپڑ کی گونج اب بھی چھوٹے ملک کے کانوں میں گونجتی اسے غصے سے دیوانہ بنا رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ اس کی رگوں میں ابلتا خون اسے آپے سے باہر کرنے اور انتہائی قدم اٹھانے پر اکسا رہا تھا مگر ہوش مندی کا تقاضا تھا۔ اس نے اپنے غصے کو اپنی جوانی اور طاقت کے غرور پر

سنو

عید کے روز اور عید کے بعد بھی
خوشیاں منانے سے
فرصت ملے تو
اتنا سوچنا ضرور
تمہاری یاد کا لمحہ لمحہ
کسی کے ساتھ رہا ہے

از: صبا نور، لیہ

حاوی آنے نہیں دیا تھا۔ وہ چاہتا تو اسی وقت مختارے کی بیٹی چنداں کو دن دیہاڑے گھر سے اغوا کر کے بھوکے کتوں کے آگے ڈال سکتا تھا۔ مگر وہ ایسی فاش غلطی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ گاؤں میں تو چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ہوا کے دوش پر سفر کرتی کوٹھوں چڑھ کے بولنے لگتی تھی۔ اور پھر چنداں تو جیتی جاگتی لڑکی تھی۔ اگر وہ چھوٹے ملک کی دست درازی کے قصے کو زبان زدِ عام کر کے گاؤں کی پنچایت تک لے جاتی تو ساتھ والے گاؤں کے زمیندار اور چھوٹے ملک کے سسرے (سسرال) سے چھوٹے ملک کی دلہن کی ڈولی کے بجائے چھوٹے ملک کی ذلت کا جنازہ اٹھایا جاتا۔ وہ اپنے بیاہ کے موقع پر چنداں کو اس کی جرأت کی سزا دے کر گھاٹے کا سودا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اگر یہ خبر ساتھ والے گاؤں کے زمیندار دلدار خان تک پہنچ جاتی تو چھوٹے ملک بیاہ کی گھوڑی چڑھنے سے پہلے ہی بدنامی کی اڑتی گرد میں مٹی رُل جاتا۔ اس نے جوش پر ہوش کو ترجیح دیتے اپنے اندر رگوں میں ابلتے آتش فشانی بگولوں کو ٹھنڈا رکھنے میں ہی عافیت سمجھی...... مگر چنداں کی سزا کا یقین اس نے اپنے حساب کتاب میں اسی وقت درج کر لیا تھا۔ بس اب موقع کا انتظار تھا۔ دوسری جانب چنداں کے گھر پہنچنے پر مختارے اور ریشماں کے گھر میں قیامت برپا تھی۔ مختار تو ملکوں کے غیظ و غضب کا سوچ کر ہی تھر، تھر کانپ رہا تھا۔ جیسے دسمبر کی یخ ٹھنڈ نے اس کے بدن پر رعشہ طاری کر دیا ہو۔

چنداں کی جرأت نے اسے خوف و اندیشوں کے گہرے کنویں میں دھکیل دیا تھا۔ جس کے باہر کالے طوفان والی آندھی بڑی تیزی سے بھاگی چلی آرہی تھی۔ کیونکہ چنداں حویلی کے دروازے سے اپنی عزت کا جنازہ ساتھ اٹھا کر لانے کے بجائے چھوٹے ملک کی مردانہ غیرت پر تازیانہ لگا کے آئی تھی۔ چنداں کے تھپڑ کی گونج حویلی کی دیواروں نے بھی بڑی حیرت سے سنی ہوگی۔ چھوٹے ملک کی دست درازی کی کوشش پر چنداں کے غیظ و غضب میں بھرے ایک ہی تھپڑ نے چھوٹے ملک کو گنگ کردیا تھا۔ وہ نشے کی حالت میں لڑکھڑا کے مردان خانے کے خاص کمرے کے بیچوں بیچ میں گرا تھا اور چنداں وہاں سے بھاگ آئی تھی گھر آکر اس نے ساری بات ماں، باپ کو بتادی تھی۔ جس کے بعد مختارے اور ریشماں اس وقت لال حویلی سے اٹھنے والی لال آندھی کو لمحہ لمحہ اپنے کچے مکان کی دہلیز کی جانب بڑھتے ہراساں دیکھ رہے تھے۔

''اب کیا ہوگا چنداں کی ماں...... تجھے ضرورت کیا تھی چنداں کو حویلی لے جانے کی۔ کوئی بہانہ کردیتی بڑی ملکانی سے۔ میں تو کہتا ہوں سامان باندھ لے، ہم راتوں رات یہ گاؤں چھوڑ دیں گے۔''

مختارے نے خوف زدہ لہجے میں چارپائی کے کونے پر دم سادھے بیٹھی ریشماں کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ مگر ریشماں بولی تو مختارے کو سانپ سونگھ گیا۔ وہ مرد ہو کر حویلی والے ملکوں کے غیظ و غضب سے کانپ رہا تھا اور ریشماں کے لہجے میں کمزور عورت ہو کر بھی مردوں والا دبدبہ بول رہا تھا۔

''ہم کیوں گاؤں چھوڑ کے بھاگیں گے چنداں کے ابا...... ہم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے...... اگر چھوٹا ملک زبان کھولے گا تو بات دور تک جائے گی۔ گاؤں کی پنچایت بیٹھے گی...... اور میں اپنی بیٹی کی ڈھال بنوں گی۔ ہم کہیں نہیں جائیں گے۔''

اور ریشماں کے جواب نے مختار کے کمزور پڑتے حوصلوں کو یک دم ہی سہارا دیا تھا مگر وہ پھر بھی خوف زدہ تھا۔ ملکوں کا ظلم مشہور تھا۔ وہ تو حویلی کا جانور مارنے پر بھی معاف نہیں کرتے...... یہاں تو معاملہ چھوٹے ملک کی عزت و وقار کا تھا۔ مختار دل میں حیران تھا کہ حویلی کی خاموشی اسے حیرانی میں مبتلا کررہی تھی۔ اس کے اندازوں کے مطابق تو اب تک لال حویلی سے اٹھنے والی کالی آندھی نے اس کے کچے مکان کو اپنی لپیٹ میں لے لینا تھا۔ یا شاید یہ طوفان کی آمد سے پہلے والی خاموشی تھی۔ اسی لیے مختار طوفان کی آمد سے پہلے کی خاموشی پر بند باندھنا چاہتا تھا۔ اس لیے ریشماں کو راہ دکھائی تھی۔ وہ حویلی والوں کی سزا کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔

''دیکھ چنداں کی ماں...... ہم غریب، مسکین اور کمزور ہیں، حویلی والوں کی طاقت کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ ہمیں اپنی عزت بھی بچانی ہے اور جان بھی...... اس لیے میں نے سوچا ہے کہ ہم اسی ہفتے چنداں اور کمالے کا بیاہ کردیں گے۔ جوان بیٹی کی ذمے داری اب میرے کاندھوں کو توڑ ڈالے گی...... اس سے پہلے کہ حویلی والوں کے غضب کا طوفان ہماری عزت و جان کی بلی چڑھادے، ہم امانت دار کو اس کی امانت پہنچادیتے ہیں۔ میں کل صبح ہی رحیم بھائی سے جاکر چنداں کے بیاہ کی بات پکی کرتا ہوں۔''

مختارے کی بات ریشماں کے دل کو بھی لگی تھی۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ طاقتور، کمزور پر غلبہ پا کے ہی رہتا ہے اور ریشماں اس سچائی سے بہادر ہو کر بھی منہ موڑ نہیں سکتی تھی۔

''ٹھیک ہے چنداں کے ابا...... ہماری تیاری تو پوری ہے اور حالات کو دیکھ کر آپا شاداں اور رحیم بھا بھی انکار نہیں کریں گے۔ ہمیں واقعی دیر نہیں کرنی چاہیے۔''

اور اندر کمرے میں بیٹھی چنداں ماں، باپ کی

باتیں سن کر سوچ رہی تھی کہ اس نے اپنے غریب ماں، باپ کو کس آزمائش میں مبتلا کردیا ہے۔ اور یوں سرخ حویلی کی پُراسرار خاموشی سے فائدہ اٹھا کر ریشماں اور مختار نے چنداں کے بیاہ میں دیر نہیں کی۔ دو دن کے اندر، اندر چنداں کو کمالے کے ساتھ بیاہ کر عزت سے رخصت کردیا۔ اُدھر حویلی میں چھوٹے ملک کی دلہن کی ڈولی اتری تھی۔ اور اُدھر غریب کمالے کے چھوٹے سے آنگن میں چنداں نے اپنے بخت آور قدم رکھے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کمالے کے چھوٹے سے آنگن میں خوشیوں کی بارات اتر آئی۔ کمال کی تو خوشی کا ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ اس نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنی جلدی اس کے من کی مراد بر آئے گی۔ اس کا اور چنداں کا بیاہ تو عید تہوار پر طے ہوا تھا۔ اور تب سے اب تک کمال دن گن، گن کر کاٹ رہا تھا۔ اور اب اچانک چنداں مہینوں پہلے ہی دلہن بن کر اس کے گھر آچکی تھی۔

بیاہ والی رات کمالے نے سرخ جوڑے میں لپٹی ارمانوں بھری دلہن چنداں کے زرتار آنچل میں اپنی سچی محبت کے اتنے اقرار ستاروں کی طرح ٹانکے تھے۔ چنداں تو جیسے ایک ہی رات میں سیراب ہوگئی تھی۔ کمالے کی محبت نے اسے سرشار کردیا تھا۔ وہ ہر غم و فکر اور خوف سے آزاد ہوگئی۔ جب کمالے نے اپنے پیار کا اقرار نامہ اس کے ہاتھوں میں تھمایا۔

''سچ کہہ رہا ہوں چنداں...... مجھے تو اپنی قسمت پر رشک آرہا ہے، تو ہمیشہ کے لیے میری بن چکی ہے، اب تجھے مجھ سے کوئی دور نہیں کرسکتا۔ میں وعدہ کرتا ہوں تجھ سے...... تیری آنکھ میں کبھی نمکین پانی آنے نہیں دوں گا۔'' کمالے نے لال جوڑے میں حیا سے سمٹی بیٹھی چنداں کا ہاتھ تھام کر پیار کا عہد نبھایا تھا۔ اور چنداں ملن کی ان انمول گھڑیوں میں سارے واہمے، خدشے بھلا کر کمالے کے کشادہ سینے میں منہ چھپا کر پُرسکون ہوگئی۔ اب اس کی ہر مشکل آزمائش میں کمال اس کے ساتھ تھا۔ اس کا محافظ، اس کی ڈھال بننے والا۔ اس کی ذمے داری اٹھانے والا...... اسے ملکوں کی لال حویلی کی ملازمہ کبھی نہیں بننا تھا۔

☆☆☆

زندگی چنداں کے لیے بہت خوب صورت ہوگئی تھی۔ کمال نے جہاں اسے پلکوں پر بٹھایا تھا تو ساس، سسر بھی بہو کے بیٹی کی طرح لاڈ اٹھا رہے تھے تو پھر چنداں نے بھی ان کی ماں، باپ کی طرح خدمت اور عزت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ چنداں چھوٹی نندرانی کا بھی بہت خیال رکھتی تھی اور اس نے شاداں کو صاف منع کردیا تھا کہ رانی کو اپنے ساتھ حویلی کام پر لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ رحیم دادا اور شاداں نے ایسا ہی کیا تھا۔

سال کے اندر، اندر چنداں کا پاؤں بھاری ہوگیا تو میکے اور سامرے (سسرال) میں خوشی کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔

کمالے کے ساتھ، ساتھ ساس، سسر نے بھی اسے ہتھیلی کا چھالا بنا ڈالا۔ شروع کے چند ماہ تو شاداں نے سچ مچ چنداں کو پلنگ سے پاؤں اتارنے نہ دیا۔ پہلا بچہ تھا، احتیاط ضروری تھی۔ اس کے بعد چنداں نے خود ہی گھر کی ذمے داری اٹھالی تھی۔

اور پھر بیاہ کے دس ماہ بعد ہنستا مسکراتا گول مٹول جمال اس کی گود میں آیا تو سارا گھر اس چابی کے گڈے کا دیوانہ ہوگیا۔ رانی تو سارا دن اس کے آس پاس پروانے کی طرح منڈلاتی رہتی۔ شاداں حویلی سے واپس آکر گھنٹوں جمال کو گود میں لیے بیٹھے رہتی۔ رات کو بھی اپنے پاس ہی سلاتی تھی تاکہ چنداں اور کمال کی نیند خراب نہ ہو...... چنداں تو خوشیوں کے ہنڈولے میں جھول رہی تھی۔ یہ سوچے بغیر کہ خوشیوں کی مدت تو بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ دکھ اور مصائب و حالات انسان کی آزمائش بن کر ساتھ چلتے ہیں۔

اور شاید غریب کی خوشیوں کے دن بھی تھوڑے دنوں کے لیے ہی ہوتے ہیں۔ چنداں اور کمالے کی خوشیوں کو بھی کسی بدنظر کی کالی نظر کھا گئی۔

☆☆☆

دوسری جانب چھوٹے ملک یاور خان کی بیوی شہزادی پہلے بچے کی پیدائش کے سلسلے میں اپنے میکے روانہ ہوچکی تھی۔ رواج کے مطابق پہلا بچہ میکے میں تولد ہونا تھا۔ بس آج کل میں خوش خبری متوقع تھی۔ حویلی میں ایک بار پھر جشن، میلے کا سا سماں تھا۔ جیسے سال بھر پہلے چھوٹے ملک یاور کے بیاہ پر ہوا تھا۔ یاور بہت خوش تھا کیونکہ الٹرا ساؤنڈ رپورٹ کے مطابق شہزادی کے یہاں بیٹے کی آمد متوقع تھی۔ لہٰذا حویلی میں بھی بڑی اور چھوٹی ملکانی حویلی کے نئے وارث کی آمد کی خوشی میں تیاریاں کرنے میں مصروف تھیں۔ اور بیٹے کی خوش خبری نے چھوٹے ملک کا سر اور سینہ فخر و انبساط سے پھلا دیا تھا مگر اس سینے میں جلتے بھانبھڑوں کی آگ اب تک سرد نہیں پڑی تھی۔ چنداں کے تھپڑ کا حساب بے باق ہونا باقی تھا۔

شکاری گھات لگائے بیٹھا تھا۔ کب وہ اپنے اندر جلتے ابلتے انتقام کی آگ کو چنداں کے جھکے ہوئے ... شرمسار سر کی جھکی گردن کی سرنگوں صراحی سے بدلے کی آگ کو بجھا سکے گا۔

اور حالات کی ستم ظریفی وہ وقت بہت قریب لے آئی تھی۔ اس برس ساون ٹوٹ کر برسا تھا۔ چنداں کے گاؤں میں بھی بارشوں نے سیلابی تباہ کاریاں مچائی تھیں اور اس طوفانی آفت کا لقمۂ اجل چنداں کے ماں، باپ بھی بنے تھے۔ وہ ساسرے (سسرال) میں چھلے میں بیٹھی تھی۔ جب گھر سے ریشماں اور مختارے کی موت کی خبر آئی تھی۔ سیلابی پانی ان کے کچے مکان میں داخل ہوگیا تھا۔ کرنٹ لگنے پر ریشماں اور مختار موقع پر ہی جاں بحق ہوگئے تھے۔

چنداں پر تو غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ بیک وقت ماں، باپ کی اندوہ ناک موت نے اسے راتوں رات یتیمی کی میلی چادر میں لپیٹ دیا تھا۔ کمالے نے بڑی مشکل سے غم سے نڈھال چنداں کو سنبھالا تھا۔ اس کی گود میں چند دنوں کا بیٹا تھا۔ جس کی ابھی خوشی جشن بھی منانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ریشماں نے اس کے سوا مہینے پر بچے کے لیے کیا کچھ اکٹھا نہ کیا تھا مگر موت کے خونی پنجوں نے مہلت ہی نہیں دی تھی خوشی منانے کی......

اور پھر اچانک ہی ننھے جمال کی بیماری...... وہ سیلابی آلودگیوں کا شکار ہوکر گاؤں میں پھیلنے والی وبائی بیماری کی لپیٹ میں آگیا تھا۔

جمال کو بھی ڈاکٹر نے ڈائریا کی شکایت بتائی تھی۔ چند دنوں میں پھول سا بچہ سوکھ کر کانٹا بن گیا تھا۔ گاؤں کی واحد ڈسپنسری سے جمال کا گاؤں کے دیگر بچوں کی طرح علاج چل رہا تھا۔ ضروری ادویات گاؤں کی ڈسپنسری میں ناکافی تھیں۔ شہروں سے پہنچنے والی امداد کی ترسیل سست روی کا شکار تھی۔ کچھ انتظامیہ کی ازلی غفلت بھی تھی۔ ڈاکٹر نے جمال کو شہر کے بڑے اسپتال لے جانے کو کہا تھا۔

چنداں کے جہیز کی ایک، ایک چیز جمال کے علاج پر خرچ ہوچکی تھی۔ اب تو کہیں سے ادھار، قرض کا آسرا بھی نہیں تھا۔ اتنے ارمانوں سے بنایا چنداں کا جہیز ایک، ایک کر کے بیٹے کی زندگی پر قربان ہوگیا مگر ہاتھ کچھ نہیں آیا تھا۔

جمال کی حالت بدستور بگڑتی جا رہی تھی۔ جمال کو اچھے علاج کے لیے شہر لے جانا تھا اور اس کے لیے کمالے کو رقم کی ضرورت تھی۔ اس نے بڑی کوشش کی تھی کہیں سے قرض کا انتظام کرنے کی مگر سیلاب زدہ علاقے میں بے سروسامانی میں آدھا گاؤں عارضی نقل مکانی سے خالی ہوچکا تھا اور چنداں اپنی گود میں روز بروز موت کی طرف بڑھتے جمال کو سسکتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ کمالے کو روز مایوس خالی ہاتھ گھر واپس آتے دیکھ کر فیصلے پر پہنچ گئی تھی۔ اسے جمال کی زندگی کے لیے اپنا عہد توڑنا تھا۔ اسے لال حویلی جانا تھا۔ وہ جمال کو کمالے کے حوالے کر کے اُس حویلی چلی آئی۔

کمالے نے اس سے کوئی سوال جواب نہیں کیا تھا۔ کیونکہ وہ بھی اب اپنی جان کے جگر گوشے کو موت کے منہ میں جاتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ رہی بات چنداں کی تو وہ اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے چنداں کی کوئی فکر نہیں تھی۔

لال حویلی کے پھاٹک کے باہر کھڑی چنداں سوچ رہی تھی کہ سال بھر پہلے اس نے یہاں کبھی نہ آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر اولاد کی محبت نے اس کے پکے فیصلے کو کچی مٹی کی طرح ڈھا دیا تھا۔ وہ بڑی ملکانی کے پاس قرض کے طور پر کچھ مانگنے آئی تھی تاکہ جمال کو شہر والے اسپتال لے جا کر علاج کرا سکے۔ یہاں آ کر پتا چلا کہ چھوٹی اور بڑی ملکانی تو چھوٹے ملک کی سسرال جا چکی ہیں۔ چھوٹے ملک کی بیوی شہزادی نے بیٹے کو جنم دیا تھا۔

اسی خوشی میں وہ..... بہورانی کے میکے روانہ ہوئی تھیں۔ سو چنداں مایوس ہو کر پلٹنے لگی تھی۔ تبھی حویلی کی پرانی ملازمہ مائی آکاں نے بتایا تھا کہ چھوٹا ملک حویلی میں موجود ہے۔ چنداں اپنی عرض اس کے حضور پیش کر سکتی ہے اور چنداں تذبذب کا شکار ہوگئی۔ کیا اسے چھوٹے ملک کے سامنے مدد کے لیے ہاتھ پھیلانا چاہیے؟

چنداں کو خاموش دیکھ کر مائی آکاں حویلی کے مردان خانے چلی گئی تھی۔ مائی آکاں نے اس کی عرض چھوٹے ملک تک پہنچا دی تھی۔ اور چنداں مایوس ہو کر پلٹنے لگی تھی کہ مائی آکاں نے آ کر بتایا کہ چھوٹا ملک اسے بلا رہا ہے۔ ایک لمحے کے لیے سال بھر پہلے والا واقعہ چنداں کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ اس کے پاؤں پھر سے زمین نے جکڑ لیے تھے۔ خوف کی وجہ سے نہیں..... خوف زدہ تو وہ سال بھر پہلے بھی نہیں ہوئی تھی۔ حویلی کے مردان خانے میں چھوٹے ملک جیسے توانا خوں مرد کے سامنے...... جب وہ کنواری تھی۔ اب تو وہ شادی شدہ عورت تھی، ایک ماں تھی۔ اور آگے کا فیصلہ ایک ماں نے اس سے کرایا تھا۔ وہ بڑے اعتماد سے حویلی کے مردان خانے کی جانب چھوٹے ملک کے مخصوص کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ یہ سوچ کر کہ قرض کی رقم جلد ہی لوٹا دے گی۔ اسے کب معلوم تھا کہ وہاں دنوں پہلے گھات لگائے بیٹھا شکاری چنداں کے تھپڑ کا حساب کھاتا کھول کر بیٹھا ہوگا..... چھوٹا ملک اب تک اس تھپڑ کی گونج کو نہیں بھولا تھا جو حویلی کے مردان خانے میں اب تک بازگشت بن کر چکراتی تھی۔ شاید حساب کا وقت آن پہنچا تھا۔

زندگی کے میلے میں

کب کوئی ساتھ چلتا ہے
ساتھ چھوٹ جاتے ہیں
اپنے روٹھ جاتے ہیں
وقت گزرتا جاتا ہے
کب کوئی پلٹ کے آتا ہے
خواب ٹوٹ جاتے ہیں
نیندیں روٹھ جاتی ہیں
زندگی کے میلے میں
پھول کھلتے رہتے ہیں
زخم سلتے رہتے ہیں
اِک بار جو بچھڑ جائیں تو یہ
بھلا پھر وہ کب ملتے ہیں

مرسلہ: بشریٰ باجوہ......اوکاڑہ

چھوٹا ملک اونچے رنگین پایوں والی مسہری پر غرور سے گردن تانے بیٹھا مونچھوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ سامنے چنداں سر اٹھائے کھڑی تھی۔ وہ تو پہلے سے زیادہ جاذب نظر ہوچکی تھی۔ چہرے پر ممتا کے نور کی چمک پھیلی تھی مگر چھوٹے ملک کو اس کی اٹھی ہوئی گردن نوکیلی سلاخ کی طرح اندر چبھ رہی تھی۔ وہ وقار سے اٹھی اس گردن کو شرمساری سے جھکا دیکھنے کا متمنی تھا۔

''میں جانتا ہوں اس وقت اپنے بچے کے علاج کے لیے گروی رکھنے کے لیے تیرے پاس کچھ بھی نہیں ہے مگر ایک چیز اب بھی تیری دسترس میں ہے۔ جسے تو گروی رکھ کر اپنے مرتے ہوئے بچے کو موت کے خونی پنجے سے آزاد کرا سکتی ہے۔ اب فیصلہ تجھے کرنا ہے۔'' اپنی بات ختم کر کے چھوٹا ملک خباثت سے مسکرانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ہوس تھی۔ وہ تحقیر بھری نوکیلی نظروں سے گھورتے ہوئے چنداں کے فیصلے کا منتظر تھا اور لمحوں میں ممتا کی ماری چنداں کی گیلی ساون آنکھوں میں جمال کی بند ہوتی آنکھوں کے منظر نے فیصلہ خود بخود کرا دیا تھا۔

گھات لگائے شکاری کی جیت ہوئی تھی اور ممتا کی ماری عورت ہار گئی۔ چھوٹے ملک نے سال بھر پہلے چنداں کے تھپڑ کا بدلہ لے لیا تھا۔ ریشماں کی تربیت میں سیکھے عزت کے انمول ہونے کا سبق رٹنے والی چنداں کی عزت صرف ایک سبز نوٹ کے عوض بے مول ہوگئی تھی۔ لال حویلی کے مردان خانے کے خاص کمرے کے ٹھنڈے فرش پر اجڑی بیٹھی ممتا کی ماری چنداں اولاد کی محبت کی خاطر بے مول ٹھہری تھی۔ اس کی انمول عزت کی قیمت صرف پانچ سو کا ہرا نوٹ تھا۔ جو جانے کتنے لمحوں سے اس کی گیلی مٹھی میں دبا ہوا تھا۔ جسے جاتے ہوئے چھوٹا ملک بڑی حقارت سے اس کی خالی ہتھیلی میں دبا گیا تھا۔

☆☆☆

شاید زندگی کی تلخ حقیقتوں کی سچائی ایسی ہی کڑوی ہوتی ہے۔ کوئی بھی ممتا کی ماری عورت ان حالات میں یہی کرتی شاید چنداں کی کہانی کا انجام بھی ایسا ہی ہونا چاہیے تھا مگر بات چنداں کی ماں کی تربیت کی تھی۔ چنداں کے عزم و حوصلے اور اعتماد کی تھی جس پر اس کی ذات کا وقار ہر قیمتی شے پر مقدم تھا۔ چھوٹے ملک نے اگرچہ اس کی مجبوری کو اپنے انتقام کی آگ بجھانے کا چارہ بنانا چاہا تھا۔ اس نے فیصلہ چنداں پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ اولاد کی زندگی بچاتی ہے یا اپنی عزت کی انمول دولت .... اور آج بھی چنداں کا فیصلہ وہی تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر خدا نے اس کے بچے کی زندگی لکھی ہے تو کوئی اسے زندگی سے محروم نہیں کرسکتا۔ اولاد چلی بھی گئی تو وہ رب کی رضا مان کر شاکر ہو جائے گی۔ مگر عزت جیسی دولت ایک بار لٹ جائے تو کبھی کمائی نہیں جاسکتی۔

ایک بار پھر شراب اور طاقت کے نشے میں چور چھوٹے ملک کی میلی نگاہوں کے جواب میں حویلی کے مردان خانے کے خاص کمرے کی دیواروں نے ایک بار پھر چنداں کے تھپڑ کی گونج بڑی شرمساری سے سر جھکا کے سنی تھی۔ یہ چھوٹے ملک کی سودے بازی کے جواب میں چنداں کا جواب تھا۔ چنداں کے تھپڑ کی بازگشت اونچی دیواروں نے اپنے اندر سمیٹ لی تھی خاموشی سے...... کیونکہ وہ چھوٹے ملک پر ہنس نہیں سکتی تھیں۔ اگر یہ بازگشت حویلی کے باہر چلی جاتی تو بدنامی و رسوائی حویلی کے ماتھے کا داغ بن جاتی۔ چنداں ایک بار پھر چھوٹے ملک کو صدمے سے گنگ حالتِ مرگ میں مبتلا چھوڑ کے بڑے فخر کے ساتھ حویلی کی دہلیز پار کر کے سرخرو ہو کر بھرے دل کے ساتھ خالی ہاتھ نکل آئی تھی۔

آج کی چنداں (عورت) کی کہانی کا یہی انجام ہونا تھا۔





مہرو کی عید

نزہت جبیں ضیا

مہرو پھپو آج وقت سے تھوڑا پہلے ہی افطار کی تیاری کے لیے کچن میں گھس گئی تھیں...... اس وقت پکوڑوں کے لیے بیسن گھولتے ہوئے مسلسل... بڑبڑا رہی تھیں۔ آج ان کا موڈ خاصا خراب تھا اور وہ سارا غصہ بیسن پر نکال رہی تھیں۔

''لو بتاؤ مہر النسا نہ ہوئیں کوئی بچوں کا کھلونا ہوگئیں۔ جب دل چاہا کھیل لیا، جب دل چاہا پھینک دیا، سمجھ کیا رکھا ہے ہمیں ریاست بیگ نے......؟

اتنے گرے پڑے ہیں ہم کہ ہمیں اپنی مرضی سے جینے کا حق بھی نہیں، جب ضرورت نہ ہو تو اٹھا کر کچرے کے ڈبے میں پھینک دیا، جب ضرورت پڑی تو اٹھا کر سینے سے لگا لیا' واہ جی واہ......! یہ بھی خوب رہی...... نہیں ضرورت ہے ہمیں کسی سہارے کی، جی لیں گے جیسے جیتے آئے ہیں۔'' مہرو پھپو کا غصہ عروج پر تھا ویسے میں نے انہیں اتنے غصے میں کبھی نہیں دیکھا تھا مگر اب ان سے ڈر لگنے لگا تھا۔ میں نے کچن میں جانا مناسب نہ سمجھا...... بس خاموشی سے فریج سے فروٹس نکال لائی اور باہر تخت پر بیٹھ کر فروٹ چاٹ بنانے لگی۔ چاٹ تیار کر کے فریج میں رکھی پھر شربت بنایا اور کام نمٹا کر لان کی طرف آ گئی سامنے گارڈن چیئرز پر ریاست ماموں بیٹھے تھے...... سر جھکائے سوچوں میں گم...... مجھے دیکھا تو مسکرا دیے پر بے جان اور پھیکی مسکراہٹ......

''آؤ گڑیا بیٹھو......'' کرسی کی طرف اشارہ کیا...... میں سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''ماموں آپ سچ مچ دبئی لوٹ جائیں گے ہمیشہ کے لیے......؟'' میں ان کے بجھے، بجھے چہرے کی طرف تاسف سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''جی گڑیا...... کیا کروں گا یہاں رہ کر جس کے لیے آیا تھا وہ مقصد تو پورا نہ ہوا۔'' ان کے لہجے میں دکھ بول رہے تھے۔ میرا دل بھر آیا اگر مجھے مہرو پھپو سے بہت پیار تھا تو ریاست ماموں سے بھی دلی لگاؤ تھا...... میں تاسف سے انہیں دیکھنے لگی ان کے چہرے پر دکھ کے سائے رقصاں تھے۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا گھر میں دادا جی، دادو، مما، پاپا، عاتکہ آپا، نوروز بھیا اور مہرو پھپو کو دیکھا تھا...... مہرو پھپو دادا جی کے کزن کی بیٹی تھیں۔ والدین کی ڈیتھ ہو چکی تھی کوئی قریبی رشتے دار نہ تھا۔ دادا جی کو اپنی وہ کزن بہت عزیز تھیں اس لیے دادا جی مہرو پھپو کو اپنے گھر لے آئے۔ مہرو پھپو جن کا اصل نام مہرالنسا تھا...... دادا جی نے مہرو پھپو کو اپنی بیٹی کی طرح سے ہی رکھا تھا۔ انہیں کبھی اس بات کا احساس بھی نہیں ہونے دیا کہ وہ ان کی سگی بیٹی نہیں ہیں۔ نازک سی، دبلی، پتلی دراز قد، سفید رنگت، بھوری آنکھوں، ملیح چہرے والی مہرو پھپو مجھے بہت پیاری لگتی تھیں۔ دھیمے لہجے میں بولنے والی، چہرے پر ہمیشہ میٹھی سی مسکان سجی ہوتی، معصوم سے انداز میں وہ جب بات کرتیں اور خصوصاً جب وہ خود کو ہم کہتیں تو مجھے ان پر پیار آ جاتا...... ہمیشہ میں نے انہیں چوڑی دار پاجاموں کے ساتھ کلیوں والے لمبے، لمبے کرتے پہنے دیکھا، بڑے بڑے ململ کے دوپٹوں میں ان کا چہرہ اور بھی حسین لگتا...... میں ان کو دیکھے جاتی۔ میں گھر میں سب سے زیادہ ان سے اٹیچ تھی۔ سر جھکائے وہ سارا دن کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتیں۔ نوروز بھیا اور عاتکہ آپا میں دو سال کا فرق تھا جبکہ میں عاتکہ آپا سے پندرہ سال چھوٹی تھی۔ مہرو پھپو گھر کے کام کاج کرتیں، سلائی کڑھائی اور پکوان میں ماہر تھیں اور تمام کاموں سے فارغ ہو کر وہ اپنی میرون مخملی ڈائری لے کر بیٹھ جاتیں میں ان کے ساتھ چپکی رہتی۔

پھر گھر میں ریاست ماموں آ گئے، ویسے بھی بڑا سا پرانے طرز کا بنا ہوا یہ گھر دادا جی نے ہر ایک کے لیے کھلا رکھا تھا۔ ریاست ماموں، دادو کے دور پرے کے رشتے دار تھے۔ بیچارے مالی لحاظ سے کچھ کمزور تھے۔ والد حیات تھے، بہنیں' والدہ اور ایک بڑی معذور بہن کے ساتھ حیدرآباد میں رہتے تھے۔ دادا جی نے ریاست ماموں کے لیے یہاں اچھی جاب کا بندوبست کیا تو وہ بھی مختصر سے سامان کے ساتھ ہمارے یہاں شفٹ ہو گئے...... دراز قد اسمارٹ سے ریاست بیگ جن کے چہرے پر ہمیشہ ایک تمکنت، ایک وقار رہتا...... گریس فل اور جاذب نظر تھے۔ مجھے ریاست ماموں بھی بہت اچھے لگے کیونکہ وہ میرے لیے چاکلیٹس، آئس کریم اور پاپ

کارن جو لاتے تھے۔ مجھے گھمانے کبھی، کبھی قریبی پارک بھی لے جاتے، میں وہاں جا کر بہت خوش ہوتی۔ وہاں میری عمر کی بہت سی بچیاں ہوتیں، ہم لوگ گول گپے کھاتے، آئس کریم کھاتے، میں جھولوں میں بیٹھتی اور پھر واپس آ جاتے، گھر میں ریاست ماموں کے آنے سے اپنے ساتھ، ساتھ میں نے مہرو پھپو میں بھی خاصا چینج دیکھا۔ مہرو پھپو کی آنکھوں میں ایک خاص چمک دکھائی دینے لگی تھی۔ بات، بات پر مسکراتی رہتیں...... کبھی کبھی دھیرے، دھیرے گنگناتی تو میں ان کی آواز کے سحر میں ڈوب جاتی ان کی آواز بھی ان کی شخصیت کی طرح مسحور کُن تھی۔ گو کہ میں بہت چھوٹی تھی مگر مجھے یہ تبدیلیاں محسوس ہو رہی تھیں۔

جون کی تپتی دوپہر میں جب پاپا، دادا جی اور بھیا آفس میں ہوتے، دادو، مما اور آپا دوپہر کے کھانے کے بعد اپنے، اپنے کمروں میں سو رہی ہوتیں تب میں مہرو پھپو کے ساتھ ان کے کمرے میں بیٹھی ہوم ورک کر رہی ہوتی...... مہرو پھپو مجھے پڑھاتی بھی تھیں ساتھ، ساتھ اپنی میرون ڈائری پر نہ جانے کیا، کیا لکھتی رہتیں۔ اس پر رنگین پینسلوں سے خوب صورت بیل بوٹے بھی بناتی رہتیں۔ مجھے ان کی وہ ڈائری بہت اچھی لگتی تھی۔ میں اکثر پوچھتی کہ پھپو آپ کیا لکھتی رہتی ہیں، وہ مسکرا دیتیں، میرے گالوں پر ہلکے سے چٹکی بھر کر کہتیں۔

''گڑیا تم ابھی بہت چھوٹی ہو جب بڑی ہو جاؤ گی تب سمجھ آئے گی تم کو۔'' اور میں پیار سے ان کے چہرے کو تکا کرتی جہاں بے شمار خوب صورت رنگ دکھائی دیتے۔ عاتکہ آپا اور نوروز بھائی کی شادیاں طے ہو چکی تھیں۔ اس عرصے میں مہرو پھپو کے لیے رشتے آئے مگر انہوں نے منع کر دیا کہ ابھی کچھ وقت چاہیے' پہلے ان دونوں کی شادیاں کر دیں' عاتکہ چلی جائے گی تو بھابی (میری مما) اکیلی ہو جائیں گی اس لیے میری شادی کی جلدی نہ کریں۔ دادا جی نے ان کی مرضی کے آگے اپنا کوئی فیصلہ مسلط نہ کیا پھر ریاست ماموں کچھ عرصہ چھٹی لے کر گھر جانے لگے تب میں نے مہرو پھپو کے چہرے پر گہری اداسی اور آنکھوں میں نمی دیکھی عجیب سی بے چینی کا شکار تھیں وہ میں نے پوچھا بھی......

''پھپو آپ کی طبیعت ٹھیک ہے ناں......؟''

''جی گڑیا......'' دھیرے سے جواب دیا اس رات میں نے مہرو پھپو اور ریاست ماموں کو لان میں دیر تک باتیں کرتے بھی دیکھا تھا پھر ریاست ماموں چلے گئے اور مہرو پھپو دن بھر سارے گھر میں بولائی، بولائی پھرتیں...... ایسے لگتا جیسے کوئی چیز گم ہو گئی ہو میں خاموشی سے مہرو پھپو کو دیکھتی رہتی اور پھر ہفتے بعد ریاست ماموں لوٹ آئے تو گویا مہرو پھپو کے چہرے کی رونق لوٹ آئی۔ میرے چھوٹے سے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ جب ریاست ماموں ہوں تب پھپو خوش رہتی ہیں، ہنستی اور گنگناتی اور بھی حسین لگتی ہیں۔

پھر گھر میں شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔ عاتکہ آپا اور نوروز بھیا کی شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ مہرو پھپو، مما سے زیادہ گھن چکر بن کر رہ گئیں۔ بازاروں کے چکر، کپڑوں کی سلائی، جہیز کی تیاری اور بری کے لوازمات ہر بات کی ذمے داری، ہر چیز کا پتا مہرو پھپو کو تھا۔ انہوں نے ہر ذمے داری بڑی اچھی طرح سے سنبھالی تھی۔ مما اور اور دادو انہیں دعائیں دیتے نہ تھکتیں...... مگر وہ اتنا سب کچھ کرتے، کرتے بھی مسکراتی رہتیں کبھی تھکن، جھنجلاہٹ یا بیزاری کی رمق ان کے چہرے پر دکھائی نہیں دیتی۔ ایسے میں ریاست ماموں نے بھی گھر کے فرد کی طرح پاپا کا ساتھ دیا۔ مہرو پھپو کام کے ساتھ، ساتھ ریاست ماموں کی شوخ نظروں کے حصار میں رہتیں، اس لمحے ان کے چہرے پر شرمگیں

مسکراہٹ انہیں اور زیادہ حسین بنا دیتی۔ عاتکہ آپا شادی کے بعد ارسلان بھائی کے ساتھ دبئی شفٹ ہوگئیں۔ اسی دوران ریاست ماموں نے باقاعدہ اپنا رشتہ مہرو پھپو کے لیے دیا، دادا جی سے بات کی اور باقی باتیں ریاست ماموں کی والدہ نے طے کرلیں۔ ان دنوں مہرو پھپو کی خوشی دیدنی تھی۔ ہر دم مسکرانا گو کہ ان کی فطرت تھی مگر اب اس مسکراہٹ میں شرم ہوتی۔ آنکھوں میں ان گنت خوب صورت سپنے سجائے وہ مجھے اتنی حسین لگتیں کہ میرا دل چاہتا ان کو چومتی رہوں اور میرا دل چاہتا کہ ریاست ماموں کو بہت ساری دعائیں دوں کہ ان کی وجہ سے میری مہرو پھپو اتنی خوش رہنے لگی تھیں مگر کبھی، کبھی میں یہ سوچ کر پریشان ہو جاتی ہوں کہ مہرو پھپو بھی ریاست ماموں کے ساتھ ایک دن یہ گھر چھوڑ کر چلی جائیں گی جیسے کہ عاتکہ آپا، ارسلان بھائی کے ساتھ چلی گئیں ہیں۔ تب مہرو پھپو مجھے سینے سے لگا کر مسکرا کر کہتیں۔

”نہیں گڑیا...... ہم کہیں نہیں جائیں گے اپنی گڑیا کو چھوڑ کر۔ ہم یہیں رہیں گے اپنی گڑیا کے ساتھ......“

”ہاں گڑیا...... تمہارے ریاست ماموں بھی یہیں رہ جائیں گے گھر داماد بن کر۔“ ریاست ماموں ٹکڑا لگاتے تو ان کی شوخی پر مہرو پھپو انہیں گھور کر دیکھتیں۔ اس لمحے ان کے چہرے پر قوس قزح پھیل جاتی اور میں اپنی پریشانی بھول کر دونوں کو تکتی رہتی۔ مہرو پھپو کی ڈائری رنگ برنگی بیل بوٹوں اور خوب صورت اشعار سے بھرتی چلی گئی۔ جون کی گرم دوپہروں اور سردیوں کی سرد شاموں میں، میں انہیں ڈائری لکھتے دیکھا کرتی مگر سمجھ نہ پاتی کہ وہ کیا لکھتی ہیں؟

پھر دادا جی نے مہرو پھپو اور ریاست ماموں کی باقاعدہ رسم کی اس پر ریاست ماموں کی والدہ اور ان کی بڑی بہن تمثیلہ آپا بھی آئیں۔ ہائے بیچاری تمثیلہ آپا دیکھنے میں تو اچھی بھلی خوب صورت تھیں مگر وہ بے ساکھی کے سہارے چلتی تھیں، عمر بھی اچھی خاصی تھی۔ ان کا ایک پیر بہت پتلا اور بے جان تھا میں نے انہیں غور سے دیکھا تو مجھے ان پر ترس آگیا۔ رسم والے دن مہرو پھپو نے آتشی کام کا سوٹ پہنا تھا وہ ہلکے میک اپ میں تھیں مما نے ان کو اپنا جڑاؤ سیٹ پہنایا تھا۔ ریاست ماموں نے ......وائٹ کرتا پاجامہ پہنا تھا ہائے مجھے دونوں بالکل گڈے، گڑیا جیسے لگ رہے تھے اتنے حسین کہ میں دیوانوں کی طرح انہیں دیکھے جا رہی تھی۔

ریاست ماموں کی والدہ اور تمثیلہ آپا ایک ہفتے بعد واپس حیدر آباد چلی گئیں۔ جاتے، جاتے پاپا اور مما کو تاکید کر گئیں۔ ”آپ لوگ کہیں نہ کہیں تمثیلہ کے لیے بھی شادی کی بات چلائیں۔ میں دل کی مریضہ ہوں بڑی فکر رہتی ہے کہ کل کو مجھے کچھ ہوگیا تو......“

”اللہ نہ کرے......“ مما نے ان کی بات کاٹی۔ ”اللہ پاک بہتر کرے گا آپ فکر نہ کریں۔“ پھر وہ لوگ لوٹ گئے۔

مہرو پھپو اپنے جہیز کی تیاریوں میں لگ گئیں، بیڈ شیٹیں، دوپٹے، سوٹ، سب کچھ گھر میں تیار کر رہی تھیں۔ بہت مسرور اور شاداں رہتی تھیں۔ اور خدا کا لاکھ، لاکھ شکر ادا کرتیں کہ جسے چاہا اللہ نے اسے اپنا بنانے کی امید دلا دی تھی، میں چوبیس گھنٹے ان کے ساتھ لگی رہتی۔ ہر چیز کے بارے میں پوچھتی۔ ہر چیز میں دلچسپی لیتی اور وہ مسکرا، مسکرا کر مجھے سب بتاتیں۔ دن بہت اچھے گزر رہے تھے تو اسی دوران نوروز بھیا کو دبئی جاب آفر ہوئی اور وہ وہاں شفٹ ہوگئے۔ گھر میں تھوڑی سی ٹینشن ہوئی پھر رفتہ، رفتہ حالات معمول پر آتے گئے۔ اچانک ریاست ماموں کو حیدر آباد جانا پڑا کیونکہ تمثیلہ آپا کا فون آیا تھا کہ اماں کی طبیعت خراب ہے، وہ بیچارے پریشان ہوکر عجلت میں حیدر آباد روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

”کب آئیں گے......“ مہرو آپا کا دل نہ جانے کیوں انجانے خدشات سے گھر رہا تھا۔

”جیسے ہی اماں کی طبیعت سنبھلی لوٹ آؤں گا۔“ انہوں نے تسلی دی تھی...... نہ جانے کیوں مہرو پھپو کو رونا آئے چلا جاتا تھا۔ انہیں لگ رہا تھا کہ ریاست ماموں اب آگئے تو لوٹ کر نہ آئیں گے بے شمار دعاؤں کے حصار میں انہوں نے دل میں ہزاروں خدشات لیے انہیں رخصت کیا اور ریاست ماموں واقعی ایسے گئے کہ لوٹ کر نہ آئے...... ہفتہ، دو ہفتہ، مہینہ اور پھر دو مہینے...... پاپا نے رابطہ کیا، نہ جانے کیا بات ہوئی کیا ہوا کہ سارے گھر والے اداس ہوگئے...... مہرو پھپو کے ہاتھ سے رنگ برنگی کھنکتی چوڑیاں اتر گئیں، اب انہوں نے آنکھوں میں کاجل لگانا بھی چھوڑ دیا تھا؛ ان کی مسکراتی آنکھوں میں ہمیشہ آنسو نظر آنے لگے۔ ان کے حسین اور مسکراتے چہرے پر اداسیوں نے ڈیرے ڈال لیے۔ ان کی گنگناہٹیں کہیں کھو گئیں۔ ان کی چال میں لڑکھڑاہٹ آگئی۔ ان کے چہرے پر کرب اور محرومی نظر آنے لگی۔

”یہ سب کیا ہوا...... کیسے ہوا......؟ ریاست ماموں واپس کیوں نہیں آئے......؟“ مجھے کسی نے کچھ نہ بتایا۔ دادا جی اور دادو، مہرو پھپو سے شرمندہ رہنے لگے تھے جیسے ساری غلطی ان کی ہی ہو...... مجھ سے مہرو پھپو کی یہ حالت دیکھی نہ جاتی تھی، میں ان سے لپٹ کر رو دیتی تھی۔

”پھپو کیا ہوا......؟ آپ چپ چاپ کیوں رہتی ہیں؟ ریاست ماموں کیوں نہیں آئے......؟“ میرے سوال کے جواب میں وہ مجھے سینے میں بھینچ لیتیں۔

”نہ گڑیا روتے نہیں...... ہم بھلا کب روتے ہیں ہم لڑکیاں ہیں ناں......؟ لوگ ہمارے پیدا ہونے پر فکرمند کیوں ہوتے ہیں؟ اس لیے نہیں کہ ہم بیٹیاں پیدا ہوئیں بلکہ اس لیے کہ ہمارے نصیب نہ جانے کیسے ہوں...... ہمیں بھی وہی ملا جو ہم نے نصیب میں لکھوایا ہوا تھا۔ ہمیں کوئی گلہ نہیں ہے گڑیا...... آپ کیوں روتی ہو دعا کرو کہ اللہ پاک ہمیں صبر عطا کرے۔“

”نہیں پھپو...... آپ نے اپنے جہیز کی چیزیں ٹرنک میں کیوں ڈال کر بند کر دیں ہیں، مجھے وہ سب اچھا لگتا ہے آپ نکالیں ناں وہ سب...... آپ کی شادی ہوگی ناں پھپو......“ میں معصومیت سے کہتی۔

”گڑیا ہم کہتے تھے ناں کہ تمہیں چھوڑ کر ہم کہیں نہیں جائیں گے تو بس ہم کہیں نہیں جائیں گے۔ ہمیشہ آپ کے پاس رہیں گے۔“ مجھے سینے سے لگا

ہمارے تارے اور

ظلم کے اندھیرے سائے ہیں
خوف کے مارے دل سہمے ہیں
کیوں گلشن اجڑا اجڑا ہے
پنچھی اس کو چھوڑ گئے ہیں
چڑیوں کی چہکار کہاں ہے
ان کا دل بھی افسردہ ہے
مہکی، مہکی سی وہ ہوائیں
دھواں، دھواں سی کیوں لگتی ہیں
ماؤں کا دل چھلنی، چھلنی......
باپوں کے کندھے جھک سے گئے ہیں
اپنے لہو سے معصوموں نے
دھرتی کو سیراب کیا ہے
دھرتی ماں کے سینے سے
اب کے نئی فصل اُگے گی
زندہ رہیں گے یہ شہزادے
تابندہ رہیں گے دیس کے تارے

کلام: فریدہ افتخار، اسلام آباد

کر کہتے ہوئے ان کی آواز رندھ جاتی اور خود کو نارمل ظاہر کرتے وہ ضبط کی حدوں کو چھونے لگتیں تو میں ان کی اس حالت پر تڑپ جاتی۔

''پھپو ایسا کیوں ہوا......؟ کیا ہوگیا......؟''

میرا معصوم سا ذہن کچھ سمجھنے سے قاصر تھا بس اتنا جانتی تھی کہ جو کچھ ہوا غلط ہوا، بہت غلط ہوا۔ میری پھپو دکھی ہیں، ان کی ہنستی مسکراتی آنکھیں اداس ہیں، ان کے چہرے کی ہنسی نہ جانے کہاں کھوگئی۔ ان کی میرون ڈائری بند ہوگئی......

''ضروری نہیں کہ ہم جو چاہیں وہی سب ہمارے مقدر میں بھی ہو جو بعض اوقات انسان اپنی اوقات سے بڑھ کر مانگ لیتا ہے یہ سوچے سمجھے بنا کہ اس کے لیے بہتر ہے لیکن ہمارا رب تو سب کچھ جانتا ہے وہ جو ہمارے لیے بہتر ہے۔ وہ جو ہمارے لیے ضروری ہے۔ بظاہر ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ جو ہمارے ساتھ ہوا درست نہیں ہماری مرضی اور منشا کے خلاف ہے مگر...... وہ جو ہے ناں ہمارا رب...... وہ کہیں نہ کہیں ہماری بہتری چاہتا ہے۔''

بس اسی سوچ کے ساتھ مہرو پھپو نے مجھے سمجھانا چاہا میں ان کا منہ تکنے لگی۔

☆☆☆

ڈھیر سارے دن گزرتے چلے گئے اس عرصے میں دادا جی اور دادو کا انتقال ہوگیا۔ پاپا ریٹائرڈ ہوگئے نوروز بھائی بہت اچھی طرح اپنی بیوی اور دو عدد پیارے سے بچوں کے ساتھ امریکا سیٹل ہوگئے اور اب مما اور پاپا کو بھی بلوانا چاہتے تھے۔ عاتکہ آپا کے چار بچے تھے وہ اپنی جگہ مطمئن تھیں۔ پاپا اور مما نے کتنا چاہا کہ مہرو پھپو کی شادی کر دی جائے لیکن وہ کسی صورت نہ مانیں۔ اب جبکہ میری شادی بھی طے ہوچکی تھی۔ مما، پاپا امریکا جانے کو تھے ایسے میں سب اس بات کی وجہ سے فکر مند تھے کہ پھپو بھلا اس طرح کیسے تنہا رہیں گی۔ اب عمر بھی خاصی ڈھل چکی تھی مگر اب بھی بہت سے لوگ ان سے شادی کے خواہاں تھے۔ وقت کے ساتھ، ساتھ مہرو پھپو میں ایک وقار، ایک تمکنت آگئی تھی۔ ریاست ماموں کے بعد مہرو پھپو نے کسی اور کے ساتھ زندگی گزارنے کی سوچ کو بھی خود پر حرام کرلیا تھا ان کا کہنا تھا کہ ''جس کو دل سے دماغ سے اور ہر طرح سے اپنا مان لیا تھا جس کے ساتھ زندگی گزارنے کا عہد کرلیا تھا اب اس کے بعد کسی اور کے ساتھ گزارہ کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی کیونکہ میں کسی کے ساتھ شاید وہ انصاف نہ کر پاؤں جو اس رشتے کا متقاضی ہے۔''

بس یہ سن کر مما، پاپا چپ ہوگئے۔

☆☆☆

رمضان المبارک شروع ہوچکا تھا۔ عید کے بعد میری شادی ہوجانی تھی۔ میں آج بھی ریاست ماموں والے معاملے کی حقیقت سے ناواقف تھی اور کسی حد تک ان سے نفرت بھی کرنے لگی تھی۔ پھپو میری شادی میں بھی بھرپور حصہ لے رہی تھیں ہر چیز کی تیاری اپنے ہاتھوں سے کر رہی تھیں۔ مجھے ان کو دیکھ کر بار، بار رونا آجاتا کہ میں خود اس گھر سے جانے والی ہوں۔ پھپو کا کیا بنے گا......؟ میرے لیے بھی یہ سوچ معنی رکھتی تھی۔

عصر کی نماز سے کچھ دیر پہلے مہرو پھپو نہا رہی تھیں۔ مما قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں۔ میں اپنے کمرے میں تھی۔ پاپا بازار گئے ہوئے تھے کہ کال بیل بجی، میں نے جا کر دروازہ کھولا...... سامنے...... غیر متوقع طور پر ریاست ماموں کھڑے تھے...... میں نے آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے انہیں دیکھا...... میں بھونچکا رہ گئی تقریباً چودہ سال بعد وہ میرے سامنے تھے...... وقت کی گرد نے ماموں پر خاصا اثر ڈالا تھا۔ کنپٹی کے بال سفید ہوگئے تھے...... آنکھوں پر سنہری فریم کی عینک کا اضافہ ہوگیا تھا۔ سر کے بال کچھ کم اور جسامت تھوڑی بھاری ہوگئی تھی۔

''ریاست...... ماموں...... آپ!'' میں اتنی زور سے چلائی کہ مما دوڑی چلی آئیں۔

''مما...... مما...... یہ...... اب...... یہاں کیوں آئے ہیں......؟'' اچانک میرے لہجے میں نفرت امڈ آئی۔ ریاست ماموں نے بیچارگی سے پہلے مجھے اور پھر مما کو دیکھا۔

''اندر آجاؤ۔'' مما نے مجھے گھور کر دیکھا اور ان کے لیے راستہ بنایا، میں تن تن کرتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ مما ان کو لے کر ڈرائنگ روم چلی گئیں۔

''بھابی پلیز، آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔'' ریاست بیگ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''مجھے سب پتا ہے ریاست......'' مما کے ایک جملے پر ان کے چہرے پر ڈھیروں اطمینان اتر آیا گویا کہ مما ان کی مجبوریوں سے واقف تھیں۔ پاپا نے ان کو سب کچھ بتادیا تھا کیونکہ وہ باتیں صرف پاپا جانتے تھے۔

''مما......'' میں نے ڈرائنگ روم میں جا کر مما کو آواز دی۔

''گڑیا...... اپنے ماموں کی بات نہیں سنو گی......؟ کیا تم اپنے ماموں کو اتنا گرا ہوا سمجھتی ہو......؟'' ان کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا میں پگھلنے لگی۔

''مجھے تو کچھ پتا نہیں ماموں لیکن آپ نے جو مہرو پھپو کے ساتھ کیا وہ قابلِ معافی نہیں ہے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں ماموں کہ پھپو نے گزشتہ چودہ سال کس اذیت میں گزارے...... بہت اذیت ناک ہیں وہ پل جو میں نے دیکھے ہیں، وہ راتیں، وہ دوپہریں اور شامیں...... جب میں نے پھپو کو تڑپتے دیکھا ہے، انہوں نے خوشیوں کے تمام دروازے خود پر بند کرلیے صرف اور صرف آپ کی وجہ سے...... اور آپ...... ایسے خود غرض نکلے کہ جاتے

ہوئے، انہیں ٹھکراتے ہوئے آپ کو ایک پل احساس تک نہیں ہوا......؟ یوں بھی کرتا ہے کوئی......؟ آپ تو اس طرح غائب ہوگئے کہ پلٹ کر ایک بار بھی نہیں دیکھا......'' میری برداشت ختم ہوئی تو میں پھٹ پڑی......

''گڑیا تمہارا کہنا بجا ہے لیکن میں جس حالات سے گزرا ہوں، جتنی اذیت میں نے سہی ہے...... تمہیں اس کی حقیقت معلوم نہیں ہے ناں...... اس لیے مجھے الزام دے رہی ہو۔''

تب ہی ہم سب کی نظر دروازے پر جم گئی......

وہاں مہرو پھپو کھڑی تھیں سفید چوڑی دار پاجامہ، فیروزی اور سفید کرتا، وائٹ ململ کا دوپٹا اور لمبے بالوں سے ٹپکتے ہوئے پانی کے قطروں کے ساتھ آج بھی وہ ریاست بیگ کے دل میں اترتی چلی گئیں۔ ریاست بیگ نے انہیں غور سے دیکھا...... ان کی آنکھوں میں غصے کے ساتھ نفرت نمایاں تھی۔ ان کے چہرے پر غصے کی وجہ سے پسینے کے ننھے، ننھے قطرے نظر آرہے تھے ضبط کی کوششوں میں ناکام وہ چیخ پڑیں۔

''بھاوج! ان سے کہو یہ یہاں سے واپس لوٹ جائیں اب اس گھر کو ان کی صورت اور ان کا وجود برداشت کرنے کی عادت نہیں رہی۔''

''مہرو پلیز......! میری بات تو سنو......'' ریاست ماموں کھڑے ہوگئے اور ملتجی لہجے میں گویا ہوئے۔

''بس ایک لفظ بھی سننے کی ہمیں ضرورت نہیں ہے آپ جیسے آئے ہیں ویسے ہی لوٹ جائیں۔'' اتنا کہہ کر مہرو پھپو واپس پلٹ گئیں۔ میں بھی اٹھ کر ان کے پیچھے بھاگی۔

مہرو پھپو افطار کے وقت پر بھی کمرے سے باہر نہیں آئیں۔ پاپا بھی آگئے تھے، میں مہرو پھپو سے چپکی ہوئی تھی۔ مما نے ان کا کھانا کمرے میں ہی بھیج دیا تھا۔

مہرو پھپو بالکل خاموش تھیں چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا اور میں بے چین کیونکہ مجھے ریاست ماموں

کی آنکھوں میں بھی مجبوریاں نظر آئی تھیں مجھے وہ بھی کہیں نہ کہیں بے قصور لگے تھے۔ رات کو وقت سے پہلے ہی پھپو کمرا بند کر کے سونے لیٹ گئیں نہ جانے یہ کیسا احتجاج تھا۔

مجھے نیند نہیں آ رہی تھی...... میں بھی اپنے کمرے میں بے چین تھی۔ میں نے کمرے کی کھڑکی سے لان میں دیکھا۔ ریاست ماموں تنہا بیٹھے تھے‘ میں بھی اٹھ کر باہر آ گئی۔

’’آ جاؤ گڑیا......‘‘ انہوں نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا تو میں ان کے قریب بیٹھ گئی۔

’’مبارک ہو، ہماری ننھی سی گڑیا کی بھی شادی ہونے والی ہے۔‘‘ انہوں نے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی تو میری آنکھیں چھلک پڑیں۔

’’ریاست ماموں! آپ نے ایسا کیوں کیا......؟‘‘ برسوں سے جو سوال میرے دل و دماغ میں چھایا ہوا تھا۔ آج پھر میرے لبوں پر آ گیا۔ ’آپ نے پھپو کے ساتھ ایسا کیوں کیا......؟‘‘

’’ہاں گڑیا......! میں تمہیں سب کچھ بتانے والا تھا اس وقت تو تم بہت چھوٹی تھیں ناں مگر تم کو یاد ہوگا کہ میری ایک بہن تھیں تمثیلہ آپا......؟‘‘ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

’’جی......! وہ جن کو پیروں کا مسئلہ بھی تھا ناں شاید......‘‘ میں نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔

’’ہاں، ہاں۔‘‘ انہوں نے سر ہلایا۔

’’میری آپا کی شادی کا بہت مسئلہ تھا اور اس وقت بھی ان کی عمر 30 سال سے زیادہ تھی۔ میرے ابا جی تو تھے نہیں اماں تھیں، وہ بھی ہارٹ پیشنٹ...... جب اماں، تمثیلہ آپا کی طرف سے مایوس ہو گئیں تو بادلِ ناخواستہ میری شادی طے کر دی۔ پھر اچانک مجھے حیدر آباد جانا پڑا۔ عین اس وقت جبکہ شادی کی تیاریاں بھی شروع ہو چکی تھیں۔ میں، مہرو کو دل و جان سے چاہتا تھا اور بہت خوش تھا کہ ہم لوگ ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے ایک ہونے والے ہیں پھر اچانک تمثیلہ آپا کی کال پر کہ اماں کی طبیعت بہت خراب ہے مجھے ایمرجنسی میں حیدر آباد جانا پڑا۔ میں وہاں پہنچا تو ایک طرف میری اماں بیمار تھیں اور دوسری طرف ایک نیا مسئلہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ میری آپا کے لیے کوئی رشتہ آیا تھا لیکن ان کی شرط تھی کہ لڑکے کی بہن کی شادی مجھ سے ہو۔ ماں نے مجھ سے بات کی تو میں نے صاف انکار کر دیا کہ میں ایسا کسی صورت نہیں کر سکتا۔ میں کسی معصوم کا دل نہیں توڑ سکتا۔ اماں نے رو، رو کر مجھے سمجھایا کہ مہر النسا حسین ہے، جوان ہے اسے اچھے سے اچھا رشتہ مل سکتا ہے، تمہاری بہن معذور ہے، صورت شکل بھی واجبی سی ہے، عمر بھی زیادہ ہے اسے آنے والا پہلا رشتہ ہی آخری ثابت ہوگا اگر ہم نے انکار کر دیا تو ساری عمر تمہاری بہن کنواری رہے گی۔ میں چین سے مر بھی نہیں سکوں گی۔ میری حالت پر رحم کرو میرے بچے...... میری حالت تو پاگلوں جیسی ہو گئی تھی۔ ایک طرف میری بیمار ماں تھی، دوسری طرف معذور بہن تو دوسری طرف میرا پیار...... میری زندگی ......میرا سب کچھ...... میری نیند، چین، کھانا، پینا سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں یکسر ختم ہو چکی تھیں۔ میری نظروں میں ہر وقت مہرو کا چہرہ رہتا ہمیں اس سے بے وفائی کرنے کا قصور بھی نہیں کر سکتا وہ مجھے دل و جان سے عزیز تھی۔ پھر اچانک اماں کی حالت اتنی خراب ہو گئی کہ ہمارا نکاح ایمرجنسی میں سادگی سے کر دیا گیا، تمثیلہ آپا رخصت ہو گئیں اور سمیرا میرے گھر آ گئی۔ اسی رات اماں کا انتقال ہو گیا...... یہ سب کچھ اتنے ڈرامائی انداز سے میری زندگی میں رونما ہو چکا تھا کہ میرا دل اور دماغ بھی یہ ماننے سے انکاری تھا۔ اماں چلی گئیں، جیتے جی مہرو میری زندگی سے نکل گئی اور......اور نہ چاہتے ہوئے بھی سمیرا میری زندگی میں آ گئی۔ سمیرا نے پہلے دن ہی مجھے بتا دیا تھا کہ وہ ایک ماڈرن اور فیشن ایبل لڑکی ہے جس کا حلقۂ احباب بھی خاصا وسیع ہے‘ مجھے کیا کرنا تھا۔ مجھے تو بس اماں اور تمثیلہ آپا کی صورت سے اس رشتے کو نبھانا تھا جو میرے لیے زبردستی کا تھا مگر رفتہ، رفتہ مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ سمیرا کی دوستوں کی فہرست میں لڑکیاں تو نہیں لڑکے زیادہ ہیں ہر وقت لڑکوں سے باتیں کرتی رہتی۔ نہ گھر کی فکر ہوتی نہ کھانے پکانے اور نہ میری پروا ہوتی، میں آفس سے آتا تو کوئی نہ کوئی دوست گھر پر موجود ہوتا جب محلے والوں نے مجھے احساس دلایا تو مجھے غصہ آ گیا۔ میں بھی مرد تھا کہاں تک برداشت کرتا دو سالوں میں ہی میں عاجز آ گیا تھا۔ آخر میں نے اس پر سختی شروع کی نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے میرا گھر چھوڑ دیا۔ بقول اس کے اسے پابندیوں میں رہنے کی عادت نہیں؛ وہ آزاد رہی ہے اس لیے اسے آزاد کرو......وہ اپنے گھر گئی تو تمثیلہ آپا کو طلاق کے ساتھ واپس آنا پڑا۔ میں نے بھی طلاق بھجوا دی یوں زندگی کا یہ تلخ باب ختم ہوا۔ مگر اب بھی کچھ امتحانات باقی تھے۔ میرے دل و دماغ پر مہرو کا راج ہی تھا میں شدت سے اس کی کمی محسوس کرتا...... تمثیلہ آپا گھٹ، گھٹ کر جینے لگیں۔ نتیجتاً ان کو کینسر جیسا موذی مرض ہو گیا اور ایک دن انہوں نے اماں کی طرح میرا ساتھ بھی چھوڑ دیا۔ میرا دل وہاں سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ مگر یہاں آنے کا منہ نہیں تھا۔ مہرو کے پاس آتا کس منہ سے اور پھر مجھے معلوم بھی نہ تھا کہ اس کی شادی ہوئی بھی یا نہیں...... میں بالکل اکیلا ہو گیا تھا۔ تب ایک دوست کے ذریعے میں دبئی چلا گیا اور گزشتہ دس سال سے وہیں ہوں...... پھر کچھ دن پہلے میری ملاقات دبئی کے ایک شاپنگ مال میں عاتکہ سے ہوئی تب مجھے یہاں کے بارے میں پتا چلا ......عاتکہ نے ہی اصرار کیا کہ آپ ایک بار وہاں جا کر دیکھیں...... تو میں بڑی امید کے ساتھ یہاں آیا

اقرار

میرے دل کے کورے کاغذ پر
دھیرے سے
چپکے سے
کوئی ایک لفظ نقش کر گیا ہے
اپنی چاہت کا اقرار کر کے
میرے خوابیدہ جذبوں کو بیدار کر گیا ہے
اِک نئے احساس سے روشناس کر کے
اپنے جذبوں کا اظہار کر کے
کوئی یہ تحریر کر گیا ہے
مجھے تم سے محبت ہے......
مجھے تم سے محبت ہے......

شاعرہ: یاسمین اقبال، لاہور

اکثر

اس بجھتی تنہائی میں
عمر گزر رہی ہے
اداسی چپکے سے سانسوں میں
اتر رہی ہے
تنہائی اور ہو کا عالم
اور تیری یاد
ایسے میں وہ لمحے ادھوری ملاقاتوں کے
ماہ و انجم کی پاکیزہ روشنی میں
شعر و نغمہ بن کے دل پہ چھاتے ہیں
اندرونِ دل گنگناتے ہیں
خیالات کے جزیروں میں
تیرا چہرہ بن کے جگمگاتے ہیں
وہ لمحے ادھوری ملاقاتوں کے
اکثر مجھے یاد آتے ہیں

شاعرہ: حیا ترمذی، کاغان

تھا..... مگر.....'' وہ کچھ دیر کو رکے..... ان کی بڑی، بڑی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی واضح تھی اور لہجے میں بے پناہ یاسیت تھی۔ میں جو دم سادھے سب کچھ سن رہی تھی غیر محسوس طریقے سے میری آنکھیں ان کے حالات سن کر مسلسل بہہ رہی تھیں۔

''نہ گڑیا، تم کیوں روتی ہو.....؟ ہم بہت رو لیے ناں.....'' ان کے ٹوٹے لہجے پر میں مزید تڑپ گئی۔

''میرے پاس آج دنیا کی ہر آسائش ہے لیکن سکون نہیں ہے میں صدقِ دل سے مہرو سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنا چاہتا ہوں، اسے اپنانا چاہتا ہوں ..... گڑیا تم بتاؤ میرا قصور کہاں ہے.....؟'' ان کے سوال پر میں نے تڑپ کر انہیں دیکھا واقعی ..... مجھے ریاست ماموں بھی دنیا کے مظلوم ترین انسان لگے جو حالات کی چکی میں بری طرح پستے، پستے اس مقام تک پہنچے تھے اور اتنا سب کچھ کر کے بھی وہ تہی داماں تھے۔

''گڑیا! تم اپنے ماموں کی ہیلپ کرو گی ناں.....؟'' ان کے معصومانہ سوال پر میں نے غور سے انہیں دیکھا سوالیہ نظروں سے وہ مجھے دیکھ رہے تھے۔

''جی ماموں ضرور.....'' میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

مما نے پھپو سے ریاست ماموں کے حوالے سے بات کی تو ان کو پتنگے لگ گئے اور اسی غصے کے اظہار کے طور پر آج دوپہر سے ہی وہ کچن میں گھسی افطاری تیار کر رہی تھیں۔ ان کی سرد مہری اور مسلسل انکار پر ریاست ماموں بری طرح ٹوٹ چکے تھے اور وہ واپس لوٹ جانا چاہتے تھے۔

عید میں دو دن باقی تھے پھر سے گھر کا ماحول عجیب سا ہو گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا آخر میں نے مہرو پھپو سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''گڑیا تم بھی ایسے کرو گی.....؟'' میں نے بات اسٹارٹ کی تو مہرو پھپو نے نم، نم آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے سوال کیا.....

''جی۔ کیونکہ مجھے سچائی کا پتا چل گیا ہے پھپو پلیز! آپ ٹھنڈے دل سے سوچیں، کہاں پر ریاست ماموں غلط ہیں؟ اگر آپ ان کی جگہ پر ہوتیں تو کیا کرتیں؟''

''مگر ..... ہمارے چودہ سال.....؟'' انہوں نے بڑی، بڑی آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا۔

''اب اس عمر میں شادیاں رچاتے ہوئے شرم نہیں آئے گی ہمیں.....؟ نہیں، نہیں گڑیا اس موضوع پر ہم سے آئندہ کچھ نہ بولنا.....'' کہہ کر انہوں نے گویا بات ختم کر دی میں اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

میں مایوس ہو گئی، میرے دل میں ایک پھانس سی چبھ گئی تھی ایک جانب ریاست ماموں بیچارے لگتے تو دوسری جانب سے پیاری پھپو کے گزشتہ چودہ سالوں کو یاد کر کے مجھے رونا آ جاتا۔

''پاک پروردگار میرے ماموں اور پھپو پر اپنا کرم کرنا، میرے مولا ان دونوں کے لیے کوئی راستہ نکال دے۔ دونوں کی بھلائی اور بہتری کے لیے کوئی سبیل نکال لے میرے اللہ.....'' میں نے صدقِ دل سے دونوں کے لیے دعا مانگی۔

چاند نظر آ گیا تھا ہر جانب شور تھا، ہنگامہ تھا، خوشیاں منائی جا رہی تھیں میرے دل پر عجیب سا بوجھ آ پڑا تھا، میرا دل بھی نہیں کیا کہ چھت پر جا کر چاند دیکھوں میں نے یونہی دونوں کے لیے دل سے دعائیں مانگ لیں۔ مہرو پھپو اکیلی چھت پر تھیں اور ہمیشہ کی طرح چاند دیکھ کر نہ جانے کیا، کیا دعائیں مانگ لی تھیں۔

دعا مانگ کر جیسے ہی پلٹیں تو عین سامنے ریاست بیگ کھڑے تھے۔ مہرو سٹ پٹا گئیں اور راستہ کاٹنا چاہا۔

''مہرو! میری ایک بات سن لو پلیز.....'' ریاست بیگ کی التجا پر ان کے بڑھتے قدم رک گئے۔

''اب کہنے سننے کو کچھ نہیں رہا ریاست.....''

''مہرو تم..... تم مجھے معاف نہیں کر سکتیں ایک بار ٹھنڈے دل سے میرے حالات کو اپنے سامنے رکھ کر سوچو اس کے بعد فیصلہ کرنا، میں شرمندہ ہوں کہ تمہارے ساتھ۔''

''بس کرو ریاست.....! اب اس شرمندگی سے کیا فائدہ.....؟ کیا آپ ہمیں ہمارے چودہ سال لوٹا سکتے ہیں؟ ہمارا کیا قصور تھا.....؟ ہمیں کس گناہ کی سزا ملی.....؟ ہمیں کیوں تڑپایا گیا؟ ہم سے ہماری جوانی کیوں چھین لی گئی۔'' وہ بپھر کر پلٹی تھیں۔

''مہرو! میں ان سب کوتاہیوں کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں..... میں وہ وقت واپس تو نہیں لا سکتا لیکن..... لیکن..... کوشش کر سکتا ہوں کہ تم ماضی کی تمام تلخیوں کو بھول جاؤ..... میں چاند، تارے توڑنے کا وعدہ نہیں کرتا مگر تم کو ہر آسائش دینے کا وعدہ ضرور کرتا ہوں..... میں تمہاری زندگی کو محبتوں سے آباد کر دوں گا..... تمہارے لیے.....''

''بس کرو ریاست بیگ اس عمر میں یہ سب کرنا نہ تمہیں زیب دیتا ہے نہ ہی ہمیں، اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ کر تم اپنی دنیا میں لوٹ جاؤ۔''

''مہرو..... ایک بار، ایک بار ہماری آنکھوں میں دیکھ کر یہ بات اپنے دل کی تمام تر سچائیوں کے ساتھ کہہ دو کہ تمہارے لیے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔''

''ہاں، ہاں نہیں رکھتے تم ہمارے لیے اہمیت..... ہمیں ضرورت نہیں ہے تمہاری..... ہم بہت خوش ہیں اپنی دنیا میں، ہم اس زندگی سے مطمئن بھی ہیں اور خوش بھی..... ہمیں اسی طرح جینے کی عادت ہو گئی ہے۔ اب ہماری زندگی میں تمہاری ضرورت ہے نہ اہمیت.....''

''پھر..... پھر آج بھی تم راتوں کو کس کے لیے روتی ہو..... آج بھی راتوں کو اٹھ، اٹھ کر تم کیا ڈائری میں کیا لکھتی رہتی ہو..... ہمارے نام پر تمہاری خوب صورت آنکھیں کیوں جھلملانے لگتی ہیں.....؟ بولو جواب دو.....'' ریاست بیگ دو قدم آگے آ گئے تھے اور ان کو کاندھے سے تھام کر ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کر رہے تھے۔

''اُف!'' مہرو نے ان کی آنکھوں میں دیکھا..... وہ لاجواب ہو گئی تھیں۔

''ریاست..... ریاست.....'' ریاست بیگ کو دونوں ہاتھوں سے پرے دھکیلا پر دوسرے لمحے ان کے بازوؤں میں بکھر گئیں۔

''تم بہت برے ہو ریاست بہت برے مگر.....؟'' روتے، روتے وہ خاموش ہو گئیں۔

''مگر کیا.....؟'' ریاست بیگ جو اچانک اس حرکت پر خوشی سے حیران تھے ان کے چپ ہو جانے پر تجسس سے سوال کر بیٹھے۔

''مگر پھر بھی ہماری جان ہو۔'' مہرو یہ مشکل کہہ سکیں..... ہنستے مسکراتے اور آنکھوں میں ڈھیروں آنسو لیے وہ اس حسین امتزاج میں ریاست بیگ کے دل میں اترتی چلی گئیں۔

''تھینک گاڈ.....!'' ریاست بیگ نے طویل سانس لے کر خدا کا شکر ادا کیا۔

''ہرا..... عید مبارک، ملن مبارک..... واہ جی مہرو پھپو کی عید تو زبردست ہو گئی۔'' میں کب سے سیڑھیوں پر کھڑی ڈراپ سین کی منتظر تھی آخر برداشت نہ کر سکی اور خوشی سے زور، زور سے تالیاں بجانے لگی۔ دفعتاً دونوں چونکے۔

''شریر.....'' ریاست ماموں زندگی سے بھرپور ہنسی کے ساتھ میرے سر پر چپت لگا کر بولے جبکہ مہرو پھپو شرم سے جھینپی، جھینپی اس وقت ریاست ماموں کے ہوش و حواس پر بجلیاں گرا رہی تھیں۔



قسط: 2

آخری امید

قیصرہ حیات

مکاں فانی ، مکیں آنی ، ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

ایک ایسی لڑکی کی کہانی . . . جو حق کی جستجو میں اپنے سفر کا آغاز کرتی ہے اور اس ابدی، لافانی حقیقت کو پالینے کے اس سفر میں اسے جن مسائل، جن شدائد کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ہماری مصنفہ نے اپنے ماہرانہ قلم سے اسے بہت خوب صورت اور پُراثر انداز میں اُجاگر کیا ہے۔

اس کہانی کی اشاعت نوجوان نسل کی اسلام کے بارے میں معلومات مطالعے اور علم کو مزید وسعت دے گی۔

مایہ ناز مصنفہ کے منفرد انداز بیاں کا
ایک اور شاہکار

کافی روز بعد کیتھی کی طبیعت قدرے بہتر ہوئی تھی اور وہ اپنے اپارٹمنٹ کی صفائی کرنے میں مصروف تھی...... (ایلن) مام کے کمرے کی صفائی کرتے ہوئے اُن کی الماری میں سے کچھ اور لیٹرز بھی ملے تھے جو ایلن نے جارج کے نام لکھے تھے مگر انہیں کبھی پوسٹ نہیں کیا تھا۔ کیتھی انہیں کھول کر پڑھنے لگی...... اور پڑھتے ہوئے اسے پھر شدید رونا آ گیا...... کیونکہ اس کی مام نے ہر خط میں جارج سے شکوہ کیا تھا کہ اس نے اس کے ساتھ بہت بے وفائی کی تھی۔ اور اس کی بے وفائی نے اس کی زندگی سے ہر قسم کا یقین اور اعتماد چھین لیا تھا۔ اس نے سارے خطوط پڑھ کر انہیں پھاڑ ڈالا اور ماں کی ساری چیزوں کو ایک باکس میں بند کر کے اسٹور میں رکھ دیا۔ اس نے دوسری غیر ضروری چیزیں بھی اٹھا کر اسٹور میں رکھیں، وہ یہ اپارٹمنٹ مسز جیکسن کے بھائی کو دے رہی تھی، اس نے اپنے لیے صرف ایک چھوٹا کمرا رکھا تھا...... اور خود ایک آرٹ کالج میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ پیرن کی باتوں نے اس کے اندر بہت امید پیدا کر دی تھی اور اس نے اپنے ذہن کو اچھی طرح سمجھا کر زندگی میں آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا تھا...... وہ اپنے آپ کو فنانشلی اسٹیبلش کر کے اپنے لیے نئی راہیں منتخب کرنا چاہتی تھی۔ یہ سوچ کر کہ نہ جانے زندگی نے اس کے لیے کیا پلان کر رکھا ہے، اسے وہ تلاش کرنا ہے وہ قدرے مطمئن تھی...... اور اس نے پیرن کا میگزین بھی جوائن کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مسٹر اینڈ مسز جیکسن اس میں یہ چینج دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے اور اسے ہر طرح سے سپورٹ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کیتھی نے ایک چھوٹا سا آرٹیکل ''نیو لائف'' کے عنوان سے لکھا تھا۔ اور وہ کافی فریش موڈ میں اسے لے کر پیرن کے آفس میں گئی تو جم، پیرن کے ساتھ کسی ڈسکشن میں مصروف تھا۔ کیتھی آفس میں داخل ہوئی تو پیرن اسے ایک دم فریش دیکھ کر انتہائی خوش ہو گئی...... کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا اور محبت سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''جم...... یہ کیتھی ہے۔'' پیرن نے بڑی رسانیت سے کیتھی کا جم سے تعارف کراتے ہوئے کہا...... تو جم نے بھی مسکرا کر اسے ہائے کہا۔

''کیتھی...... میں نے تمہیں جم کے بارے میں بتایا تھا ناں...... یہ میرے کولیگ بھی ہیں اور بہت اچھے فیملی فرینڈ بھی۔'' پیرن نے جم کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ کیتھی نے مسکرا کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو جم نے بھی مسکرا کر اس سے ہاتھ ملایا۔

''او کے...... تم لوگ باتیں کرو، مجھے کچھ آرٹیکلز باس کے ساتھ بھی ڈسکس کرنے ہیں۔'' جم نے کیتھی اور پیرن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور فائل اٹھا کر باہر چلا گیا۔ پیرن، کیتھی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

''آج تم بہت خوش اور فریش لگ رہی ہو اور میں تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہو رہی ہوں۔'' پیرن نے کیتھی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... اب میں نے لائف کے بارے میں پازیٹو ہو کر سوچنا شروع کر دیا ہے۔ میں نے آرٹ کالج میں ایڈمیشن بھی لیا ہے اور آپ کے میگزین کے لیے ریگولرلی لکھنے کا بھی سوچا ہے۔'' کیتھی نے اپنے بیگ میں سے آرٹیکل نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا تو پیرن ایک دم انتہائی خوش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''دیٹس ویری گڈ...... اب تم دیکھنا لائف تمہیں کتنی اچھی طرح ٹریٹ کرے گی۔'' پیرن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وہ کیسے......؟'' کیتھی نے حیرت سے پوچھا۔

''جب ہم کسی کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہیں...... تو یقیناً دیکھنے والا بھی ہماری طرف مسکرا کر دیکھتا ہے۔ اسی طرح زندگی ہے جب ہم مسکرا کر اس کے راستوں پر چلنا شروع کر دیتے ہیں تو ہمیں اور نئی، نئی راہیں ملتی ہیں...... مگر جب ہم مایوس ہو کر اپنے کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے ناامیدی سے بیٹھ جاتے ہیں تو کمرے میں تاریکی کے ساتھ، ساتھ ڈپریشن بھی بڑھنے لگتا ہے۔ اس لیے اپنی سوچ کو پازیٹو رکھ کر زندگی کی طرف مسکرا کر دیکھو ہر چیز

تمہیں مسکراتی ہوئی دکھائی دے گی۔'' پیرن نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کا آرٹیکل کھول کر دیکھنے لگی۔ کیتھی اسے متجسس نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''اچھا لگ رہا ہے...... میں اسے جلد میگزین میں شائع کروں گی۔'' پیرن نے مسکرا کر اسے سائڈ پر رکھتے ہوئے کہا۔

''تھینک یو ویری مچ...... آپ میرے لیے بہت بڑی inspiration ہیں...... مجھ میں یہ چینج آپ کی وجہ سے آیا ہے۔ اینڈ آئی ہوپ مجھے آگے لانے میں آپ کا بہت بڑا ہاتھ ہوگا۔'' کیتھی نے مسکرا کر کہا تو پیرن بھی مسکرانے لگی۔

''یہ سنڈے تم نے میرے ساتھ گزارنا ہے۔ تمہیں یاد ہے ناں......'' پیرن نے مسکرا کر پوچھا۔

''ہاں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔'' کیتھی نے مسکرا کر جواب دیا اور اس سے ہاتھ ملا کر آفس سے باہر چلی گئی۔

☆☆☆

جوائے بڑے خوشگوار موڈ میں مسکراتا ہوا گھر میں داخل ہوا تھا تو پیرن بھی مسکراتے ہوئے موبائل آف کر رہی تھی۔ جوائے نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''مام...... کس کا فون تھا۔ آپ بہت خوش دکھائی دے رہی ہیں۔'' جوائے نے مسکرا کر پوچھا۔

''میری ایک بہت پرانی فرینڈ زیب گل پاکستان سے جرمنی آئی ہے۔ ابھی اسی کا فون آیا تھا۔ وہ ہم سے ملنے ہمارے گھر بھی آئے گی۔'' پیرن نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''کیا وہ مسلم ہے؟'' جوائے نے ایک دم حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، کیوں......؟'' پیرن نے چونک کر جواب دیا۔

''کیا آپ کسی مسلم کو اپنے گھر آنے کی اجازت دیں گی؟ اٹس امیزنگ...... کیا آپ نہیں جانتیں کہ وہ کتنے برے لوگ ہوتے ہیں۔'' جوائے نے خفگی سے منہ بنا کر پوچھا۔

''ہاں...... لیکن میں زیب کو منع نہیں کر سکتی کیونکہ اس نے مجھے اور تمہیں مشکل وقت میں جرمنی بھیجنے میں ہماری مدد کی تھی۔'' پیرن نے نظریں چراتے ہوئے آہستہ آواز میں کہا تو جوائے حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''مام...... جم انکل تو انہیں hypocrite (دو رخے) کہتے ہیں اور آپ بھی انکل کے ساتھ مل کر مسلمز پر ہنستی تھیں تو پھر آپ اپنی فرینڈ کو کیسے اپنے گھر میں respect دیں گی؟'' جوائے نے حیرت سے پوچھا تو پیرن بری طرح بوکھلا گئی۔

''سب مسلمز برے نہیں ہوتے۔'' نادانستہ پیرن کے منہ سے نکلا تو جوائے حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا اور پیرن اس سے نظریں چراتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ جوائے اس کی بات سن کر گہری سوچ میں گم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

سنڈے مارننگ کو کیتھی جلدی، جلدی تیار ہونے لگی تو اسے یاد آنے لگا کہ ایلن کی زندگی میں وہ ہر سنڈے کو یونہی چرچ جانے کے لیے تیار ہوا کرتی تھی...... اور تب تیار ہوتے ہوئے اس کے اندر ایک خوف اور خوشی بھی ہوتی تھی مگر آج وہ صرف خوش تھی...... اس نے اچھا سا ڈریس پہنا اور لانگ کوٹ کے ساتھ کیپ پہن کر باہر نکل گئی۔ باہر برف باری ہو رہی تھی مگر اس موسم میں جانا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ جب پیرن کے گھر پہنچی تو جوائے اور پیرن ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے ناشتا کرنے میں مصروف تھے۔ کیتھی کو دیکھ کر پیرن انتہائی خوشی اور محبت سے ملی اور جوائے کے ساتھ اس کا تعارف کروایا۔ دونوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ہائے کہا۔ پیرن نے اسے اپنے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر ہی ناشتے کے لیے بٹھا لیا۔ اور سب مل کر ناشتا کرنے لگے...... ناشتے کے دوران ہی جوائے اور کیتھی ایک

اگر یسو ہو جاتا تھا۔ کیتھی بھی حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''میم...... آپ کی فرینڈ سے جوائے کو کیوں ٹینشن ہو رہی ہے...... کیا یہ ان سے ناراض ہے؟'' کیتھی نے جوائے کے جانے کے بعد انتہائی حیرت سے پوچھا تو پیرن بری طرح ہڑبڑا گئی۔

''نہیں...... نہیں ایسی کوئی بات نہیں، ایکچوئیلی وہ گھر میں ہم دونوں کے علاوہ کسی تیسرے کو برداشت نہیں کرتا اس لیے ڈسٹرب ہو جاتا ہے۔ تم فکر نہیں کرو...... چلو آؤ ہم کچن میں چلتے ہیں تاکہ میں اپنی فرینڈ کے لیے کچھ کوکنگ کر لوں۔'' پیرن نے جلدی سے بات بدلتے ہوئے کہا اور کچن میں چلی گئی۔ کوکنگ کرتے ہوئے کیتھی اس کے ساتھ کام بھی کرتی رہی اور باتیں بھی...... کافی دیر بعد زیب لاؤنج میں داخل ہوئی۔ اس نے لانگ کوٹ کے ساتھ اسکارف اس طرح لے رکھا تھا کہ اس کا سارا چہرہ چھپا ہوا تھا صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ پیرن جب اسے پاکستان آخری بار مل کر آئی تھی وہ بہت لمبی اور دبلی تھی۔ مگر اب وہ قدرے صحت مند اور موٹی ہو گئی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ اور زیادہ دراز قد اور خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔ پیرن انتہائی محبت اور گرم جوشی سے اس سے ملی اور کیتھی کو بھی اپنی little friend کہہ کر تعارف کروایا۔ زیب نے بہت محبت سے کیتھی کو چوما اور اپنے ساتھ لگایا تو کیتھی کو اس سے انتہائی خوش کن محبت بھرا اپنائیت کا احساس ملا...... کیتھی اس سے بہت متاثر ہونے لگی۔ زیب اور پیرن آپس میں باتیں کرنے لگیں۔ کیتھی ٹرالی میں اس کے لیے کافی کے ساتھ مختلف لوازمات لے کر آئی۔ زیب انتہائی خوشگوار موڈ میں پیرن کے ساتھ باتیں کر رہی تھی اور اس سے اس کی زندگی کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ کیتھی متجسس ہو کر دونوں کی باتیں سننے لگی۔

''پیرن کیا تم نے کبھی اب دوبارہ پاکستان آنے کا نہیں سوچا...... اور جوائے کہاں ہے...... وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا......؟'' زیب نے کافی پیتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا تو پیرن ایک دم بوکھلا گئی۔

''آج سنڈے ہے ناں، وہ اپنے ایک انکل سے ملنے گیا ہے۔'' پیرن نے جلدی سے بات بدلتے ہوئے کہا تو کیتھی نے ایک دم چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''اب تو وہ کافی بڑا ہو چکا ہوگا۔'' زیب نے مسکرا کر محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں...... بہت ینگ اینڈ اسمارٹ......'' پیرن نے مسکرا کر جواب دیا۔

''میرے بھی دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ جنہیں میں اماں جان کے پاس چھوڑ کر آئی ہوں۔'' زیب نے مسکرا کر بتایا۔

''اور تمہارے بابا جان کیسے ہیں...... اکثر مجھے بہت یاد آتے ہیں۔ میں سوچتی ہوں اگر وہ میری مدد نہ کرتے تو میں کبھی یہاں نہیں آ سکتی تھی۔'' پیرن نے تشکرانہ انداز میں زیب کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا تو زیب مسکرانے لگی۔

''زیب...... یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا تھا۔ اگر تم اپنے بابا جان کو کنوینس نہ کرتیں...... تو شاید میں کبھی یہاں نہ آ پاتی۔'' پیرن نے زیب کا ہاتھ پکڑ کر گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''ارے ایسا مت کہو...... تم میری بہت اچھی فرینڈ ہو۔'' زیب نے محبت سے پیرن کے چہرے کو چھوتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دی...... کیتھی انتہائی حیرت سے زیب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جس کا لہجہ بہت نرم تھا اور باتیں کرتے ہوئے اس کے تاثرات سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بہت نرم دل اور محبت کرنے والی خاتون ہو...... زیب نے اچانک اپنی رسٹ واچ دیکھی...... اور اپنے جوتے اور موزے اتارتے ہوئے بولی۔

''عصر کی نماز کا وقت ہو رہا ہے اور مجھے نماز پڑھنی ہے۔'' زیب نے ننگے پاؤں اٹھتے ہوئے کہا۔

''او کے...... تم واش روم میں جا کر وضو کر لو لیکن آئی ایم سوری ہمارے گھر میں کوئی prayer mat نہیں......'' پیرن نے آہستہ آواز میں کہا۔

''کوئی بات نہیں...... کوئی چٹائی یا چھوٹا کارپٹ ہے یا پھر کوئی صاف بیڈ شیٹ تو میں اس پر نماز پڑھ لیتی

دوسرے کے بارے میں بہت کچھ جان گئے تھے۔

''جوائے، کیتھی بہت زبردست آرٹسٹ ہے اور بہت اچھی پینٹنگز بھی کرتی ہے۔ تم اسے اپنی بھی ساری پینٹنگز دکھاؤ۔ میں اتنی دیر میں لانڈری سے ہو کر آتی ہوں۔'' پیرن نے کہا تو کیتھی، جوائے کے ہمراہ اس کے کمرے میں چلی گئی...... جوائے خوشی خوشی اسے اپنی مختلف پینٹنگز اور اسکیچز دکھانے لگا۔ کیتھی بھی کافی دلچسپی لے کر ان پینٹنگز کو دیکھ رہی تھی اور آرٹ سے متعلق مختلف سوالات کر رہی تھی۔ کیتھی کا آرٹ میں انٹرسٹ اور نالج دیکھ کر جوائے بہت خوش ہو رہا تھا اور قدرے ایکسائٹڈ ہو کر اس سے باتیں کر رہا تھا۔

دونوں بہت زیادہ خوش تھے۔ کیتھی کو بھی بہت عرصے بعد کوئی ایسا فرینڈ ملا تھا جس کے ساتھ وقت گزار کے وہ بہت انجوائے کر رہی تھی۔ اسی ایکسائٹمنٹ میں کیتھی نے اسے اپنے سامنے بٹھا کر اس کا پینسل اسکیچ بنا ڈالا...... وہ جوائے کے چہرے کو ہر اینگل سے آبزرو کر رہی تھی۔ اور جوائے اس کی اس observation سے محظوظ ہو رہا تھا۔ جب اس نے اسکیچ کمپلیٹ کر کے جوائے کو دکھایا تو وہ بہت حیران ہوا اور کیتھی کو بہت زیادہ appreciat کرنے لگا۔

''یو آر اے ونڈر فل آرٹسٹ...... تم نے تو مجھ سے بھی زیادہ اچھا اسکیچ بنا لیا ہے۔ رئیلی آئی ڈونٹ بلیو اٹ......'' جوائے نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا تو وہ مسکرانے لگی۔

''تھینک یو...... اب تم میرا اسکیچ بناؤ......'' کیتھی نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ جوائے مسکرا، مسکرا کر اس کا اسکیچ بنانے لگا۔ باتوں ہی باتوں میں دونوں یوں ایک دوسرے سے فرینک ہو کر باتیں کرنے لگے جیسے ایک دوسرے کو بہت عرصے سے جانتے ہوں۔ جوائے نے اس کا اسکیچ مکمل کیا تو وہ بھی اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور اس کی تعریفیں کرنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد پیرن واپس آ گئی اور دونوں کے ایک دوسرے کے بنائے گئے اسکیچز دیکھ کر ان کی تعریفیں کرنے لگی۔ کیتھی آج بہت زیادہ خوش تھی اور یہ خوشی اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ پیرن کا موبائل بجا تھا دوسری طرف زیب اس سے اس کا ایڈریس پوچھ رہی تھی۔ پیرن مسکرا کر اسے ایڈریس سمجھانے لگی۔

''لگتا ہے آج کوئی اور گیسٹ بھی آ رہا ہے؟'' کیتھی نے مسکراتے ہوئے پیرن سے پوچھا۔

''ہاں...... میری ایک اولڈ فرینڈ آ رہی ہے۔'' پیرن نے کہہ کر ایک دم جوائے کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر بیزاری کے تاثرات پھیل گئے۔

''آئی تھنک مجھے جم انکل کی طرف چلے جانا چاہیے۔'' وہ منہ بنا کر بولا تو کیتھی اور پیرن نے ایک دم چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیوں......؟'' پیرن نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ...... وجہ جانتی ہیں۔'' جوائے نے کہا...... اور جم کو فون کرنے لگا کہ وہ اس کی طرف آ رہا ہے۔ پیرن کو اس کا attitude دیکھ کر شاک سا لگا۔

''جوائے بیٹا...... یہ ٹھیک بات نہیں...... جو بھی ہے، وہ ہماری گیسٹ ہیں اور ہمیں انہیں بھرپور پروٹوکول دینا چاہیے۔'' پیرن نے نرمی سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''آئی ایم ناٹ اے ہپوکریٹ......'' جوائے نے الفاظ چباتے ہوئے کہا اور منہ بنا کر ایک بیگ میں کچھ چیزیں ڈال کر وہاں سے چلا گیا۔ پیرن حیرت اور پریشانی سے اسے دیکھنے لگی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیسے روکے...... اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ جب بھی جوائے کو کسی بات سے زبردستی روکنے کی کوشش کرتی تو وہ بہت زیادہ

ہوں......'' زیب نے قدرے نرمی سے کہا۔

''میں لاتی ہوں۔'' پیرن اٹھ کر وہاں سے چلی گئی تو زیب بھی واش روم میں جا کر وضو کرنے لگی۔ کیتھی انتہائی متجسس ہو کر اس کے پیچھے گئی اور واش روم کے دروازے کے پاس کھڑی ہو کر حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ زیب بہت اہتمام سے وضو کر کے باہر نکلی تو پیرن نے اسے ایک چھوٹی سی چٹائی پکڑائی۔ وہ تھینک یو کہہ کر چٹائی بچھانا چاہ رہی تھی لیکن اسے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس رخ سے بچھائے۔

''آئی ایم سوری...... مجھے ٹھیک طرح سے پتا نہیں کہ یہاں لوگ کس طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔'' پیرن نے قدرے سنجیدگی سے کہا تو زیب نے جلدی سے اپنا موبائل پکڑ کر اس پر ڈائریکشن معلوم کی اور لاؤنج کے ایک کونے میں چٹائی بچھائی مگر اس کونے میں دیوار پر جوائے اور پیرن کی کچھ تصویریں لگی تھیں۔ زیب نے انہیں اتار کر سائڈ ٹیبل پر رکھا جب دیوار بالکل خالی ہو گئی تو وہ اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے لگی۔ کیتھی اس کے پیچھے بیٹھ کر انتہائی حیرت سے اس کی حرکات و سکنات کو دیکھنے لگی۔ پیرن کچن میں چلی گئی تھی مگر کیتھی وہیں بیٹھی رہی اور جب نماز ختم کر کے زیب دونوں ہاتھ بلند کر کے دعا پڑھنے میں مصروف تھی تو اس کے چہرے سے بہت اطمینان اور سکون جھلک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں...... مگر ہونٹ تیزی سے ہل رہے تھے۔ اس کے چہرے سے ایسی روشنی پھوٹ رہی تھی کہ کیتھی کتنی ہی دیر حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔ جب زیب نماز پڑھ کر اور چٹائی کو لپیٹ کر اٹھی تو اچانک اس کی نظر کیتھی پر پڑی...... اسے اپنی طرف یوں محو دیکھ کر وہ ایک دم چونکی اور مسکرا کر پوچھنے لگی۔

''اتنی حیرت سے کیا دیکھ رہی ہو؟'' زیب نے مسکرا کر پوچھا۔

''یہ آپ کیا کر رہی تھیں؟'' کیتھی نے حیرت سے پوچھا۔

''prayer دن میں پانچ بار ہم مسلم نماز پڑھتے ہیں۔ ساری دنیا کے سب مسلمان ایسے ہی نماز پڑھتے ہیں۔'' زیب نے مسکرا کر جواب دیا۔

''یوں دیوار کی طرف منہ کر کے......؟'' کیتھی نے دیوار کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''نہیں...... دیوار کی طرف نہیں، کعبہ کی طرف...... جو اللہ کا گھر ہے۔ ساری دنیا کے لوگ اللہ کے گھر کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔'' زیب نے مسکرا کر جواب دیا۔

''اللہ کے گھر کی طرف کیوں؟'' کیتھی نے پھر حیرت سے پوچھا۔

''کیونکہ وہ ہی سب کا (گاڈ) اللہ ہے۔ اور اس زمین پر صرف اس کا ایک ہی گھر ہے خانۂ کعبہ جس کی طرف اس نے سب مسلمانوں کو منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ یہ ہم اپنی مرضی سے نہیں کرتے اس کے حکم سے کرتے ہیں۔ اگر اپنی مرضی سے کریں تو کوئی کسی طرف منہ کرے تو کوئی کسی اور طرف......'' زیب نے گہری سانس لیتے ہوئے اسے بتایا۔

''کیوں...... اس میں کیا لاجک ہے؟'' کیتھی نے حیرت سے پوچھا۔

''اسلام میں unity (وحدت) پر بہت زور دیا گیا ہے۔ دنیا کے مسلمان کہیں بھی رہتے ہوں اسی طریقے سے نماز ادا کرتے ہیں۔ اور اللہ پر ایک جیسا (یقین) faith رکھتے ہیں کہ وہ ہر جگہ ہر ایک کے پاس موجود ہے اور انہیں دیکھ رہا ہے اور وہ ہر عبادت میں وہ نظم و ضبط چاہتا ہے۔ دنیا کے سب مسلمان ایک جیسی ہی نماز پڑھتے ہیں۔ ایک جیسے روزے رکھتے ہیں، ایک جیسا حج اور عمرہ کرتے ہیں اور خدا پر بھی ایک جیسا ہی ایمان رکھتے ہیں۔'' زیب نے قدرے سنجیدگی سے بتایا تو کیتھی حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔

''آپ نے اس دیوار سے جوائے اور میم کی پکچرز کیوں اتاریں؟'' کیتھی نے پھر متجسس ہو کر پوچھا۔

''وہ اس لیے کہ اسلام میں امیجز کی پوجا کرنا حرام ہے۔ اللہ یعنی کہ گاڈ دنیا کے تمام امیجز اور shapes سے







بہت بڑا ہے۔انسان کی عقل اس تک کبھی نہیں پہنچ سکتی کیونکہ اس کی ہستی بہت بڑی ہے۔ہم اسے اس کی نشانیوں سے پہچانتے ہیں جب ہم دنیا کی ہر، ہر چیز میں اسے آبزرو کرتے ہیں تو ہمارا یقین چھوٹی سے چھوٹی چیز کو دیکھ کر جب بڑی تک پہنچتا ہے تو اس کے بارے میں صرف ایک سوچ پیدا ہوتی ہے کہ اس کا خدا بہت بڑا ہے۔اتنا بڑا کہ وہ پوری کائنات اور اس میں بسنے والی ساری مخلوق کو لمحوں میں سمیٹ سکتا ہے۔'' زیب اسے انتہائی محبت سے گاڈ کے بارے میں بتانے لگی تو وہ اس کی ہر، ہر بات کو انتہائی حیرت سے سننے لگی۔اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زیب کی ایک، ایک بات اس کے دل پر انتہائی شدت سے اثر کر رہی ہو...... اسی لمحے پیرن کچن سے آئی اور زیب سے پھر باتیں کرنا شروع ہو گئی مگر کیتھی اپنی جگہ پر یونہی بیٹھی رہی۔اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کاش پیرن کچن سے نہ آتی تو وہ اس کی باتیں یونہی سنتی رہتی۔نہ جانے اس کی باتوں میں کیسا سحر تھا کہ کیتھی کا دل مضطرب ہونے لگا اور وہ خواہش کرنے لگی کہ کاش زیب پھر سے اکیلی ہو اور وہ اس کی باتیں سنے......وہ اسی انتظار میں بیٹھی رہی......مگر پیرن اور زیب آپس میں انتہائی محو ہو کر اپنی فیملی اور یونیورسٹی لائف کے بارے میں باتیں کرتی رہیں۔یہاں تک کہ مغرب کی نماز کا ٹائم ہو گیا...... زیب پھر اٹھی اور وضو کر کے پہلے کی طرح نماز پڑھنے لگی......کیتھی پھر حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔جبکہ پیرن موبائل پر کسی سے بات کرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔زیب کی یہ نماز پہلے سے کچھ لمبی تھی۔نماز سے فارغ ہو کر جب وہ صوفے پر بیٹھی تو کیتھی جلدی سے اٹھ کر اس کے پاس آ گئی۔

''آپ بار، بار ایک جیسی نماز کیوں پڑھتی ہیں......کیا ایک ہی کافی نہیں۔'' کیتھی نے قدرے متجسس ہو کر پوچھا۔

''ہم دن میں کھانا بھی تو بار، بار کھاتے ہیں ناں......کیا ایک بار کھانا کافی نہیں؟'' زیب نے مسکرا کر جواب دیا۔

''کھانے کا نماز سے کیا تعلق......؟'' کیتھی نے حیرت سے پوچھا۔

''کھانا جسم کی غذا ہے اور نماز روح کی......'' زیب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''وہ کیسے......؟'' کیتھی نے پھر چونک کر پوچھا۔

''انسان دو چیزوں سے بنا ہے جسم اور روح......اگر جسم کو بھوک لگتی ہے تو روح کو بھی اس سے زیادہ بھوک لگتی ہے۔'' زیب نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''وہ کیسے......؟'' میری روح کو تو کبھی بھوک نہیں لگی۔'' کیتھی نے مسکرا کر پوچھا۔

''کیا تمہارے دل نے خدا سے کبھی محبت نہیں کی؟'' زیب نے پوچھا تو کیتھی ایک دم چونکی۔

''کیا جیسز کرائسٹ سے؟'' کیتھی نے چونک کر پوچھا۔

''نہیں گاڈ سے......جیسز کرائسٹ......گاڈ نہیں وہ صرف ایک Messenger یا prophet ہیں۔جس طرح ہمارے prophet حضرت محمد ﷺ ہیں اسی طرح کرسچنز کے prophet جیسز کرائسٹ ہیں اور جیوز کے prophet حضرت موسیٰ Moses ہیں۔گاڈ کو prophets کے ساتھ مت ملاؤ......وہ صرف ایک ہے، جس نے ساری دنیا کے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے اور اس نے ہر انسان کے دل میں اپنی محبت اور تلاش رکھی ہے۔جب انسان کا تعلق اس کے ساتھ بندھ جاتا ہے تو پھر جسم کی بھوک کی طرح روح کی بھوک بھی بڑھنے لگتی ہے۔اور جب انسان اس کی عبادت کرتا ہے تو اس کی یہ بھوک satisfction (اطمینان) میں بدل جاتی ہے۔تم بھی گاڈ سے سچی محبت کر کے دیکھو......تو پھر خود بخود تمہیں سب سمجھ میں آ جائے گا۔'' زیب نے مسکرا کر محبت بھرے لہجے میں کہا تو کیتھی حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی اور نادانستہ اس کا ہاتھ پکڑ کر چومنے لگی۔زیب نے بھی محبت سے اس کی پیشانی کو چوما۔اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ محبت کا انتہائی دلفریب احساس اور لمس اس کی روح کو چھو گیا ہو۔

زیب کا موبائل بجنے لگا تھا جبھی پیرن اپنے کمرے سے باہر نکلی۔

''اوکے پیرن...... تھینک یو ویری مچ فار یور کمپنی...... میرے ہسبینڈ مجھے لینے آرہے ہیں۔اب مجھے جانا ہے۔'' زیب نے مسکراتے ہوئے موزے، جوتے پہنے پھر کوٹ پہن کر اسکارف کو اچھی طرح لیا...... کیتھی نہایت حیرت سے اس کی ایک، ایک حرکت کو دیکھ رہی تھی۔

''زیب یہ کیسے ہوسکتا ہے۔تم ابھی تھوڑی دیر پہلے تو آئی ہو اور اب واپس بھی جارہی ہو۔تمہیں میرے پاس stay کرنا چاہیے۔'' پیرن نے مصنوعی خفگی سے شکایت کرتے ہوئے کہا۔

''میں پھر آؤں گی۔ جوائے سے ملے بغیر میں کیسے جاسکتی ہوں۔ میرا اس سے ملنے کو بہت دل چاہ رہا ہے۔ اوہ، میں تو بھول ہی گئی۔ میں اس کے لیے گفٹس لائی تھی۔'' اور اس نے اپنا بیگ کھولا اس میں سے چاکلیٹس کے کئی پیکٹ نکالے اور انہیں ٹیبل پر رکھا اور مسکرا کر ایک پیکٹ کیتھی کو پکڑاتے ہوئے بولی۔

''یہ ہماری لٹل فرینڈ کے لیے......'' زیب نے نہایت محبت سے چاکلیٹ کا پیکٹ کیتھی کو پکڑایا تو وہ انتہائی خوش ہوکر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''تھینک یو ویری مچ، یو آر سو سویٹ......'' کیتھی نے مسکرا کر اس کے ہاتھ سے وہ لے لیا۔

''پیرن یہ سب چاکلیٹس جوائے کو دینا اور اسے میری طرف سے بہت پیار کرنا۔'' زیب نے محبت سے کہا تو پیرن ایک دم بوکھلا گئی۔

''وائے ناٹ شیور......'' پیرن جلدی سے بولی۔اتنے میں زیب کے موبائل پر مس کال آئی۔

''میرے ہسبینڈ آگئے ہیں...... میں اب چلتی ہوں۔'' زیب اٹھتے ہوئے بولی۔

''کیا وہ اندر نہیں آئیں گے؟'' پیرن نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں......'' زیب نے مسکرا کر کہا اور اسکارف سے اپنے چہرے کو اچھی طرح کور کیا اور دونوں سے مل کر باہر چلی گئی۔

"she is a wonderfull lady...very sweet more then my mom" کیتھی کے منہ سے بے ساختہ نکلا تو پیرن نے ایک دم چونک کر اس کی طرف دیکھا اور گہری سانس لے کر خاموش ہوگئی۔

''میم...... میں حیران ہوں کہ جوائے ان سے کیوں چڑ کر گھر سے چلا گیا ہے۔ وہ کیا ان سے پہلے کبھی ملا ہے؟'' کیتھی نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''نہیں......'' پیرن نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

''اسی لیے......'' کیتھی نے فوراً کہا۔

''کیا مطلب......؟'' پیرن نے حیرت سے پوچھا۔

''اگر وہ ان سے پہلے کبھی ملتا تو اس کی رائے بالکل مختلف ہوتی۔ میں آج ان سے پہلی بار ملی ہوں اور بہت امپریس ہوئی ہوں۔ میں نے ان سے زیادہ پیار کرنے والی سویٹ لیڈی کبھی نہیں دیکھی۔'' کیتھی نے انتہائی خوش ہو کر جذباتی انداز میں زیب کی تعریفیں کرتے ہوئے کہا۔ پیرن پھر خاموش ہوگئی۔

''میم مجھے یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ جوائے انہیں کیوں اتنا ناپسند کرتا ہے؟'' کیتھی نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

"because she is a Muslims and joy hates muslims" پیرن کے منہ سے اچانک بے ساختہ نکلا تو کیتھی نے ایک دم چونک کر اسے دیکھا۔

''کیوں......؟ آپ کی فرینڈ تو بہت اچھی ہیں تو پھر وہ مسلمز سے کیوں نفرت کرتا ہے؟'' کیتھی نے حیرت سے پوچھا۔

''سب مسلمز اچھے نہیں ہوتے۔'' پیرن نے منہ بنا کر جواب دیا۔

''تو کیا ایک کی وجہ سے پھر سب سے ہی نفرت کرنی چاہیے؟'' کیتھی نے حیرت سے پوچھا تو پیرن ایک دم بوکھلا گئی اور نظریں چرا کر اسے دیکھنے لگی۔

''آئی تھنک رات ہو رہی ہے۔ اب تمہیں بھی گھر جانا چاہیے۔'' پیرن نے جلدی سے کہا تو کیتھی گہری سانس لے کر خاموش ہو گئی۔

''یس...... آئی تھنک سو......'' اس نے اپنا لانگ کوٹ پہنتے ہوئے کہا اور جاتے ہوئے پیرن کے گلے ملتے ہوئے بولی۔

''تھینک یو ویری مچ، آج آپ کے ساتھ اچھا دن گزرا ہے اور اسپیشلی آپ کی فرینڈ کے ساتھ...... میں انہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔'' کیتھی مسکراتے ہوئے بولی اور لاؤنج سے باہر چلی گئی...... پیرن ایک سرد آہ بھر کر صوفے پر بیٹھی گہری سوچوں میں گم ہو گئی۔

☆☆☆

جب جوائے جم کے اپارٹمنٹ میں پہنچا تو جم کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ جوائے کو دیکھ کر وہ حیرت سے چونکا۔

''کیا بات ہے...... تمہارا موڈ کیوں آف ہو رہا ہے؟'' جم نے مسکرا کر پوچھا۔

''مام کی ایک مسلم فرینڈ ان سے ملنے آ رہی تھیں تو میں آپ کے پاس آ گیا۔'' جوائے نے منہ بنا کر کہا۔

''کیوں......؟ اس لیے کہ تم اس کا سامنا نہیں کر سکتے؟'' جم نے چونک کر پوچھا۔

''نہیں...... اس لیے کہ مسلمز سے مجھے شدید نفرت ہے...... ان کو دیکھ کر میرا خون کھولنے لگتا ہے اور بہت بدتمیزی کرنے کو دل چاہتا ہے۔ مما اپنی فرینڈ کی بہت تعریفیں کر رہی تھیں...... مجھے فیل ہونے لگا کہ میں ان سے بدتمیزی کروں گا...... اس لیے یہاں چلا آیا......'' جوائے نے منہ بنا کر جواب دیا۔

''اچھا کیا...... ویسے تم مسلمز کے بارے میں جو کچھ فیل کرتے ہو...... بالکل ٹھیک کرتے ہو...... muslims deserve hate'' جم دانت کچکچا کر بولا تو جوائے نے حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیا...... آپ کہیں جا رہے ہیں؟'' جوائے نے اسے شوز اور کوٹ پہنتے دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں...... کیا تم میرے ساتھ چلو گے......؟'' جم نے مسکرا کر پوچھا۔

''کہاں......؟'' جوائے نے حیرت سے پوچھا۔

''جہاں...... میں جا رہا ہوں......'' جم نے مسکرا کر جواب دیا۔

''او کے......'' جوائے نے مسکرا کر کہا اور اس کے ساتھ چلا گیا۔ رات گئے جوائے گھر لوٹا تو لاؤنج میں ٹیبل پر چاکلیٹس کے ڈبے اور کچھ تحائف پڑے تھے۔ جوائے نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا...... پیرن صوفے پر بیٹھی لیپ ٹاپ پر کچھ کام کرنے میں مصروف تھی۔

''مام...... یہ چاکلیٹس اور گفٹس کہاں سے آئے ہیں؟'' جوائے نے قدرے مشکوک انداز میں پوچھا۔

''زیب لائی ہے...... تمہارے لیے......'' پیرن نے ایک ٹک اس کی طرف دیکھ کر گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''میرے لیے......؟ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ آپ نے کیسے ایک مسلم سے یہ چیزیں لے لیں۔ کیا آپ نہیں جانتی کہ مسلمز کیسے ہوتے ہیں۔'' وہ غصے میں دانت کچکچا کر نفرت سے بولا۔

''زیب بہت اچھی ہے جوائے......'' پیرن نے نرم لہجے میں کہا۔

''جھوٹ...... دنیا کے سب مسلمز بہت برے ہوتے ہیں اور میں ان سے نفرت کرتا ہوں۔ کیا آپ ان سے

نفرت نہیں کرتیں؟'' جوائے نے غصے سے پوچھا۔

''کرتی ہوں......'' پیرن نے کہا۔

''کیا اتنی نفرت کے باوجود بھی آپ یہ چاکلیٹس کھائیں گی......؟'' جوائے نے غصے سے پوچھا تو پیرن نے چونک کر اسے دیکھا اور خاموش ہو گئی۔ جوائے نے غصے میں سارے چاکلیٹس ڈسٹ بن میں پھینکے اور چلانے لگا۔

''آئی ہیٹ مسلمز......'' وہ چلاتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا اور پیرن حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

کیتھی جب سے پیرن کے گھر سے لوٹی تھی زیب گل اس کے حواسوں پر چھائی ہوئی تھی...... اس کا محبت بھرا لہجہ...... میٹھی باتیں اس کی نماز اور پھر اپنے گاڈ کے بارے میں باتوں نے اس کے دل اور ذہن پر بہت گہرا اثر کیا تھا۔ وہ رات کو بیڈ پر لیٹی تو زیب کی باتیں اس کے ذہن میں گونج رہی تھیں۔

''جیسز کرائسٹ گاڈ نہیں...... وہ تو بس پرافٹ ہیں...... میسنجر...... پرافٹ کو گاڈ کے ساتھ مت ملاؤ...... پیرن میم نے بھی یہی کہا تھا۔ شاید اس میں میری ہی کوئی غلطی ہے کہ میں گاڈ کو جیسز کے ساتھ ملاتی رہی شاید اس لیے کہ مجھے گاڈ کے بارے میں ٹھیک طرح سے نالج بھی تو نہیں......'' اس نے آہ بھر کر سوچا۔

''تم گاڈ سے سچی محبت کر کے تو دیکھو پھر تمہیں خود بخود سب کچھ سمجھ میں آ جائے گا۔'' زیب کے الفاظ پھر اس کے ذہن میں گونجے......

''اس کا مطلب ہے مجھے گاڈ کے بارے میں جاننے کی کوشش کرنی چاہیے۔'' وہ آنکھیں بند کر کے کسی سوچ میں ڈوب گئی۔

☆☆☆

شام ہو رہی تھی۔ جب کیتھی، پیرن سے ملنے اس کے گھر آئی تو پیرن کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اور وہ دو روز سے آفس بھی نہیں جا رہی تھی۔ کیتھی نے ایک abstract پینٹنگ بنائی تھی اور وہ اسے جوائے کو دکھانا چاہتی تھی۔ پیرن اپنے بیڈ روم میں میڈیسنز کھا کر ریسٹ کر رہی تھی جبکہ جوائے لاؤنج میں بیٹھا ایک انگلش مووی دیکھ رہا تھا۔ کیتھی کو دیکھ کر وہ ایک دم خوش ہو گیا اور وہ دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ کیتھی نے بیٹھتے ہی اسے اپنی پینٹنگ دکھائی تو وہ دیکھ کر بہت متاثر ہوا اور اس کی بہت زیادہ تعریفیں کرنے لگا...... کیتھی بہت زیادہ خوش ہوئی اور خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھی وہ اس پینٹنگ کے مختلف meaning نکال کر اسے بتا رہا تھا اور وہ اس کی ذہانت سے متاثر ہو رہی تھی۔ جوائے نے اسے بتایا کہ وہ بھی بہت جلد اس کے آرٹ کالج میں ایڈمیشن لینے جا رہا ہے تو یہ خبر سن کر کیتھی کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ باتیں کرتے ہوئے کیتھی نے اپنے بیگ میں سے چاکلیٹس کا وہ ڈبا نکالا جو اسے زیب نے گفٹ کیا تھا۔ اس نے ان میں سے کچھ چاکلیٹس کھائی تھیں اور باقی ویسے ہی پڑی تھیں۔ اس نے مسکرا کر ڈبا اس کی طرف بھی بڑھایا اور اسے چاکلیٹ کھانے کی آفر دی۔

''تھینک یو......'' جوائے نے مسکرا کر کہا...... اور چاکلیٹ کا ریپر کھولنے لگا۔

''یہ چاکلیٹس بہت ٹیسٹی ہیں۔ اس روز زیب آنٹی نے مجھے گفٹ کی تھیں۔'' کیتھی نے مسکرا کر بتایا تو جوائے ایک دم ریپر کھولتے ہوئے رک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''mom کی فرینڈ...... جو پاکستان سے آئی تھیں...... اس نے تمہیں بھی دی تھیں۔'' جوائے نے قدرے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہاں...... اور انہوں نے تمہیں بھی تو گفٹ کی تھیں...... کیا تم نے نہیں کھائیں؟'' کیتھی نے مسکرا کر چاکلیٹ

کھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... میں نے وہ ڈسٹ بن میں پھینک دیں۔'' جوائے نے قدرے خفگی سے منہ بنا کر اپنے ہاتھ میں پکڑی چاکلیٹ ٹیبل پر رکھی تو کیتھی نے ایک دم چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''ڈسٹ بن میں کیوں......؟'' کیتھی نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

''آئی ہیٹ مسلمز...... اور مجھے مسلمز سے کوئی چیز لینا پسند نہیں۔'' جوائے نے قدرے غصے سے کہا۔

''لیکن میں نے تو ان سے اچھی لیڈی آج تک نہیں دیکھی۔ وہ تو میری ماں سے بھی زیادہ لونگ اور سویٹ ہیں۔ میں تو ان سے مل کر بہت امپریس ہوئی ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ تم ان سے کیوں نفرت کرتے ہو؟'' کیتھی نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"muslims are always hypocrites" وہ تمہارے سامنے اچھا بن کر تمہیں متاثر کرنے کی کوشش کر رہی ہوں گی...... لیکن حقیقت میں وہ اتنی اچھی نہیں ہوں گی۔ یہ سب مسلمز جھوٹے ہوتے ہیں۔'' جوائے نے غصے سے دانت کچکچا کر کہا۔

''نہیں، نہیں جوائے...... مجھے وہ بالکل ایسی دکھائی نہیں دیں۔ تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ کاش تم ان سے ایک بار ملتے تو تمہیں اندازہ ہوتا کہ وہ کتنی اچھی خاتون ہیں......'' کیتھی نے پھر تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''پلیز اسٹاپ...... میرے سامنے اتنی تعریفیں کرنے کی ضرورت نہیں...... تمہاری یہ باتیں میرے دل سے مسلمز کے لیے نفرت کو کبھی ختم نہیں کر سکتیں۔'' جوائے نے انتہائی خفگی سے منہ بنا کر...... کہا تو کیتھی حیرت سے اسے دیکھنے لگی اور اس کا موڈ آف دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ ''جوائے......'' پیرن نے اپنے کمرے سے اسے آواز دی تو جوائے نے چونک کر کمرے کی طرف دیکھا۔

"mam is calling me" جوائے اٹھ کر اس کے کمرے کی طرف جانے لگا تو کیتھی بھی اس کے ہمراہ کمرے میں چلی گئی۔ پیرن دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اس کی طبیعت اب بہتر تھی۔

''جوائے مجھے ایک کپ کافی لا کر دو......'' پیرن نے جوائے سے کہا تو کیتھی جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

''میں آپ کے لیے لے کر آتی ہوں۔'' وہ کہہ کر باہر چلی گئی...... تو پیرن نے جوائے کی طرف دیکھا...... اس کے چہرے پر اب بھی خفگی کے تاثرات تھے۔

''کیا ہوا؟ تم کچھ اپ سیٹ لگ رہے ہو۔'' پیرن نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں......'' وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا...... پیرن اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھنے لگی مگر خاموش رہی سائڈ ٹیبل پر پڑا اس کا موبائل بجا تو اس نے اٹھ کر موبائل کان سے لگایا اور آہستہ آواز میں ہیلو کہا۔

''اوہ...... ہائے زیب...... تم کیسی ہو......؟'' پیرن نے جیسے ہی زیب کہا تو جوائے نے خفگی سے ماں کی طرف دیکھا اور اٹھ کر وہاں سے چلا گیا...... پیرن کے چہرے پر خفگی اور حیرت کے ملے جلے تاثرات نمایاں ہونے لگے...... مگر وہ زیب سے نارمل موڈ میں باتیں کرتی رہی۔

''آئی ایم سوری...... پیرن میں تم سے دوبارہ ملنے نہیں آ سکوں گی کیونکہ آج رات کو میں پاکستان واپس جا رہی ہوں۔'' زیب نے بتایا تو پیرن ایک دم چونکی......

''کیوں...... اتنی جلدی......؟'' پیرن نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں...... میرے بیٹے کی طبیعت اچانک بہت خراب ہو گئی ہے اور مجھے بابا جان نے واپس آنے کو کہا ہے...... مجھے بہت افسوس ہے کہ میں جوائے سے ملنے نہیں آ سکوں گی...... مجھے اس سے ملنے کا بہت شوق تھا لیکن...... خیر پھر بھی

سکی...... تم اسے میری طرف سے بہت پیار کرنا......'' زیب بہت محبت سے اس کے ساتھ باتیں کر رہی تھی کہ کیتھی کافی کے ساتھ کوکیز لے کر آ گئی اور اس کے قریب رکھی سائڈ ٹیبل پر ٹرے کو رکھا اور پیرن کو باتیں کرتے ہوئے سننے لگی۔ موبائل آف کر کے پیرن نے کیتھی کی طرف دیکھا۔

''کیا زیب آنٹی کا فون تھا؟'' کیتھی نے مسکرا کر پوچھا۔

''ہاں، وہ آج رات واپس جا رہی ہیں۔'' پیرن نے بتایا۔

''اوہ تو کیا وہ آپ سے ملنے اب کبھی نہیں آئیں گی؟'' کیتھی نے افسردگی سے پوچھا۔

''نہیں......'' پیرن نے کہہ کر کافی کا مگ ہاتھ میں پکڑا اور خاموشی سے پینے لگی۔

''ویری سیڈ...... میری بہت خواہش تھی کہ میں دوبارہ ان سے ملتی...... شی از ویری نائس پرسن...... لیکن معلوم نہیں جوائے انہیں کیوں اتنا ناپسند کرتا ہے۔'' کیتھی کے منہ سے بے ساختہ نکلا تو پیرن نے ایک دم چونک کر اس کی طرف دیکھا اور گہری سانس لے کر خاموش ہو گئی۔

''میم...... وہ مسلمز سے اتنی نفرت کیوں کرتا ہے؟'' کیتھی نے پیرن کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ ایک دم بوکھلا گئی مگر اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

''میم...... کیا آپ بھی جوائے کی طرح مسلمز سے اتنی ہی نفرت کرتی ہیں؟'' کیتھی نے معنی خیز انداز میں پوچھا تو پیرن ایک دم ہڑبڑا گئی اور اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا...... کیتھی حیرت سے اسے دیکھتی رہی اور پھر اٹھ کر باہر چلی گئی...... جوائے کا موڈ بھی کافی آف تھا۔ کیتھی نے اسے ایک ٹک دیکھا اور پھر خاموشی سے اپنا بیگ اٹھایا اور باہر نکل گئی۔

واپسی پر سارا راستہ وہ گہری سوچ میں گم رہی اسے جوائے اور پیرن کے رویوں کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اس نے زیب کے بارے میں بھی بہت سوچا تھا...... اسے زیب کے بارے میں کوئی منفی بات محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ جب بھی اس کے ذہن میں آتی تو ایک خوشگوار تاثر اس کے ذہن میں ابھرنے لگتا۔

''اتنی اچھی انسان سے جوائے صرف اس لیے نفرت کر رہا ہے کہ وہ مسلم ہے اور کیا واقعی مسلمز اتنے برے ہوتے ہیں کہ ان سے نفرت کی جائے۔'' اس کا ذہن بری طرح الجھنے لگا...... اسے زندگی میں پہلے کبھی ایسا کوئی موقع نہیں ملا تھا جب وہ مسلمز کے ساتھ انٹچ ہوتی...... اسے ان کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ کبھی کبھار، اچانک کسی مسلم کا ذکر سننے کو ملتا تو وہ کوئی خاص توجہ نہیں دیتی...... لیکن اب اس کے اندر عجیب سے خیالات جنم لے رہے تھے۔ وہ اپنی زندگی میں پہلی بار زیب کی صورت میں کسی مسلم سے ملی تھی اور وہ اس سے بہت زیادہ متاثر ہوئی تھی مگر پیرن اور جوائے کے رویے نے اسے ان کے بارے میں بہت مشکوک کر دیا تھا۔ پیرن کے خیال میں۔ ''سب مسلمز اچھے نہیں ہوتے۔'' اور جوائے کے خیال میں ''مسلمز دنیا کے سب سے برے لوگ ہیں۔'' اور اس کے اپنے خیال میں ''زیب سے بڑھ کر اچھی عورت اسے زندگی میں نہیں ملی تھی۔'' وہ بہت پریشان ہونے لگی اور اسی الجھن میں گھر پہنچی تو مسز ولسن (اس کی پے انگ گیسٹ) جو ایک اسکول ٹیچر تھیں اور لاؤنج میں بیٹھی ایک کتاب پڑھ رہی تھیں۔ کیتھی نے انہیں ہائے کہا اور قدرے تھکے ہوئے انداز میں اپنا بیگ چیئر پر رکھ کر وہیں بیٹھ گئی۔ مسز ولسن نے اپنی نظر کی عینک اتار کر اسے حیرت سے دیکھا۔

''کیا بات ہے...... کیا تم بہت تھک گئی ہو...... یا پھر کسی وجہ سے اپ سیٹ ہو؟'' مسز ولسن نے قدرے نرمی سے پوچھا۔

''ہاں'' کیتھی نے آہ بھر کر جواب دیا اور اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیوں......؟'' مسز ولسن نے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مسز ولسن میں ایک بات سے بہت الجھن کا شکار ہوں کہ دنیا میں کتنے religions ہیں...... اور کون سا

religion سب سے زیادہ ٹھیک ہے؟ اور کس کے (پیروکار) followers سب سے زیادہ اچھے لوگ ہیں۔'' کیتھی نے گہری سانس لیتے ہوئے پوچھا تو مسز ولسن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''یہ تم آج کیسی باتیں کر رہی ہو...... آر یو او کے......؟'' مسز ولسن نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں...... میرا ذہن بہت زیادہ الجھنے لگا ہے اور میں بہت زیادہ کنفیوز ہونے لگی ہوں، آپ تو ایک ٹیچر ہیں اور آپ نے اپنی زندگی میں مختلف تجربے حاصل کیے ہیں...... پلیز آپ مجھے گائڈ کریں کہ کون سا دین سب سے زیادہ ٹھیک ہے؟'' کیتھی نے قدرے بے صبری سے پوچھا...... اور اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں تو مسز ولسن کو اس کے اندر کے اضطراب کا کچھ اندازہ ہونے لگا۔

''تمہیں معلوم ہے دنیا میں تقریباً 45 یا اس سے بھی زیادہ religions ہیں اور ہر مذہب کے لوگ اپنے ہی دین کو ٹھیک کہتے ہیں مگر میرے خیال میں وہی religion ٹھیک ہے جس میں خدا کا concept (تصور) بالکل واضح اور کلیئر ہے...... ایسا تصور جس کو جان کر انسان کا دل فوری طور پر اسے قبول کرلے اور پھر اس میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہ رہے۔'' مسز ولسن نے گہری سانس لے کر کہا تو کیتھی ایک دم چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''مسز ولسن کیا آپ نے اس پر کوئی ریسرچ کی ہے اور کیا آپ کو اس حقیقت کا پتا چل گیا ہے؟'' کیتھی نے گہری سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...... لیکن میں ابھی تمہیں کچھ بتا کر تمہارے ذہن پر اپنے خیالات مسلط نہیں کرنا نہیں چاہتی...... اگر یہ سوال تمہارے ذہن میں پیدا ہوا ہے تو میں چاہتی ہوں کہ اس سوال کا جواب بھی تم خود ہی تلاش کرو اور جب اپنی سوچ اور جدوجہد سے تم اس سوال کا جواب پالو گی تو پھر دنیا کی کوئی اور طاقت تمہارے نظریات کو چیلنج نہیں کر سکے گی۔'' مسز ولسن نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا تو کیتھی انتہائی متجسس ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیا آپ کو یقین ہے کہ مجھے اس سوال کا جواب مل جائے گا؟'' کیتھی نے گہری سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...... اس لیے کہ گاڈ کا اصل تصور انسان کے اندر بھی موجود ہے۔ جس طرح مقناطیس، لوہے کی ہر چیز کو اپنی طرف کھینچتا ہے اسی طرح انسان کے اندر موجود خدا کا تصور پوری طرح کائنات میں پھیلی ان تمام چیزوں ...... سوچ اور حقائق کو اپنی طرف کھینچتا ہے جو اس تصور سے ٹیلی کرتے ہیں...... اس لیے تم اپنے مائنڈ کو بالکل (غیر جانب دار) نیوٹرل ہو کر یہ فیصلہ کرنے دینا اور پھر جب حقیقت تمہیں مل جائے تو اسے قبول کرلینا پھر تم خود ہی مطمئن ہو جاؤ گی۔'' مسز ولسن نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ گہری سانس لے کر خاموش ہوگئی۔ بات ابھی واضح نہیں تھی۔

''مسز ولسن کیا آپ اس سلسلے میں مجھے تھوڑا گائڈ کرسکتی ہیں کہ میں یہ ریسرچ کیسے شروع کروں؟'' کیتھی نے قدرے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...... تم لائبریری میں جاؤ، انٹرنیٹ پر ریسرچ کرو اور جو تم ریسرچ کرو...... اس کے مطابق اپنے اردگرد ان لوگوں کو دیکھنے کی کوشش کرو جو اس religion کے ماننے والے ہیں۔'' مسز ولسن نے کہا...... اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور اس کا دل ان کی بات سن کر کچھ قائل ہوگیا۔

''او کے...... میں ضرور ایسا ہی کروں گی۔'' کیتھی نے مسکراتے ہوئے کہا اور قدرے مطمئن ہو کر اپنے کمرے میں چلی گئی مسز ولسن بھی مسکرا کر اسے دیکھنے لگیں۔

مسز ولسن...... بہت اچھی...... نرم مزاج...... پچاس، پچپن سالہ پڑھی لکھی عورت تھیں۔ ان کی اپنی ایک ہی بیٹی تھی جو امریکا ہائر اسٹڈیز کے لیے گئی ہوئی تھی۔ مسٹر ولسن (ان کے شوہر) ایک بیمار آدمی تھے جو زیادہ تر اپنے کمرے میں بیڈ پر سوئے رہتے اور مسز ولسن جاب کے ساتھ ساتھ ان کی بہت دیکھ بھال کرتیں وہ ایک مطمئن اور پُرسکون

خاتون تھیں جو بہت کم کسی سے شکوے شکایت کرتیں...... زیادہ تر وقت ان کا کتابیں پڑھنے میں گزرتا...... کیتھی نے ایلن کی ڈیتھ کے بعد انہیں پے انگ گیسٹ رکھ لیا تھا اور ان کی کیتھی سے بہت دوستی بھی ہوگئی تھی...... وہ کیتھی کو اپنی بیٹی الزبتھ کی طرح چاہنے لگی تھیں۔

☆☆☆

اگلے روز کیتھی کالج گئی تو جوائے سے بھی اس کی ملاقات ہوئی جوائے اس کا کالج فیلو تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کافی دیر بیٹھ کر باتیں کرنے کے ساتھ، ساتھ آرٹ کو بھی ڈسکس کرتے رہے۔ کیتھی کو یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے جوائے اس میں بہت انٹرسٹ لے رہا ہو۔ اسے ہر بات میں گائڈ کرنے کی کوشش کرتا اور دونوں کالج میں ہر وقت ایک دوسرے کے ساتھ ہی ہوتے...... دونوں میں رفتہ، رفتہ دوستی بہت زیادہ گہری ہونے لگی تھی۔ اگر کیتھی اسے کہیں دکھائی نہ دیتی تو وہ اس کی تلاش میں اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا...... اور جیسے ہی وہ نظر آجاتی تو وہ ایک دم خوش ہو جاتا چند ہی دنوں میں ان کی دوستی بہت زیادہ گہری ہوگئی تھی یا پھر شاید دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہونے لگی تھی۔ دونوں اکھٹے بیٹھ کر پینٹنگز بناتے پھر ایک دوسرے کے ساتھ ان کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرتے...... لیکن کیتھی نے ایک بات آبزرو کی تھی کہ جوائے نے اس کے ساتھ اپنے دل کی باتیں کبھی شیئر نہیں کی تھیں۔ اکثر باتوں، باتوں میں کیتھی نے اس سے مسلمز سے نفرت کی وجہ جاننے کی کوشش کی تھی مگر وہ ہر بار ان کے خلاف زہر اگل کر خاموش ہو جاتا اور کیتھی اس کی باتیں سن کر خاموش ہو جاتی اور پھر کچھ نہ پوچھتی......

کیتھی کالج سے جب بھی فارغ ہوتی تو لائبریری چلی جاتی اور وہاں جا کر ریسرچ کرتی...... اس نے دنیا میں انسان کے آغاز سے ہی جنم لینے والے religions کا مطالعہ شروع کیا تو وہ یہ جان کر انتہائی حیران رہ گئی کہ

انسان نے جس چیز کو بھی تھوڑا سا طاقتور دیکھا تو اسے خدا بنا کر پوجنے لگا اگر سورج کی روشنی اور اس کی حرارت سے متاثر ہوا تو اسے اپنا خدا بنالیا..... اگر زمین کی وسعت اور اس میں پیدا ہونے والے اناج اور زمین میں چھپے خزانوں کو پایا تو زمین کو اپنی دیوی ماں مان کر اس کی عبادت کرنے لگا۔ اگر آگ کے روشن الاؤ کو دیکھا تو اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا..... اور جب دل چاہا تو لکڑی، پتھر، مٹی، لوہے اور مختلف دھاتوں کی انسانی یا جانوروں کی شکلیں بنا کر ان بتوں کو پوجنا شروع کر دیا..... اور کبھی انہیں خدا تک پہنچنے کا وسیلہ سمجھنے لگا..... کسی نے بادل، ہوا، آندھی، بارش، چاند، سورج، ستارے اور پہاڑوں غرضیکہ ہر وہ شے جس تک ان کی پہنچ ممکن نہیں تھی..... ان سب کو اپنا خدا بنالیا..... صرف ہندومت میں اسے 14,321 دیوی، دیوتاؤں کی موجودگی نے حیران کر دیا..... لیکن اس کا دل ان سب کے بارے میں تفصیل پڑھ کر بہت بے قرار اور مضطرب ہونے لگا اور اس کے اندر موجود حق کی آواز نے انہیں فوراً مسترد کر دیا کہ دنیا میں ہر طاقتور چیز خدا نہیں ہو سکتی..... اگر انسان، سانپ، بچھو اور شیر کو طاقتور سمجھ کر اس سے خوف کھانے لگے تو کیا اسے خدا بنالے.....؟ اور اگر کوئی جانور فائدہ دے تو کیا اسے بھی خدا بنا کر پوجنا شروع کر دیا جائے..... کس قدر احمقانہ سوچ تھی جس نے اس کے دل میں اضطراب کے ساتھ، ساتھ کراہیت بھی پیدا کر دی تھی۔

''خدا تو صرف وہی ہو سکتا ہے جو دنیا کی ساری طاقتوں کا مالک ہو..... زمین، آسمان، تمام مخلوقات اور کائنات کی ہر شے پر اسے مکمل اختیار اور قدرت ہو.....'' اس کا دل کہتا اور وہ مزید مضطرب ہو کر پہلے سے زیادہ ریسرچ میں مصروف ہونے لگی..... اس نے تمام پرانے مذاہب کا مطالعہ شروع کیا۔

کیتھی نے جب ان کے بارے میں پڑھا تو انتہائی کنفیوز ہونے لگی۔ اور اس نے اپنے دل سے سوال کیا کہ کیا وہ خدا کے اس تصور کو مانتی ہے.....؟ اس نے کتاب بند کی اور آنکھیں بند کر کے گہری سوچ میں ڈوب گئی تو اس کے دل نے فوراً جواب دیا۔ ''نہیں جو خدا دنیا بنا کر (برہما) خود سو جائے وہ کیسے خدا ہو سکتا ہے؟ کیا وہ اپنی ساری مخلوق سے بے خبر ہو کر خود نیند کے مزے لے اور کسی کے دکھوں اور تکلیفوں کا احساس نہ کرے وہ کبھی خدا نہیں ہو سکتا..... اور جو خدا (وشنو) مختلف انسانوں اور جانوروں کی صورت میں ظاہر ہو تو کیا وہ اس تقدس کے قابل ہے کہ ساری کائنات میں صرف اس کی پوجا کی جائے؟ اور جو خدا (شیو) مختلف... ارواح اور شیطانوں کی صورت میں ظاہر ہو تو کیا اس کا مرتبہ اور مقام اس خدا جیسا ہو سکتا ہے۔ جو پوری دنیا کا حاکمِ اعلیٰ ہو..... نہیں کبھی نہیں..... میرے اندر موجود حق کی آواز ان خداؤں کو قبول نہیں کر رہی۔'' اس نے بڑی سی کتاب واپس لائبریری میں رکھی اور بیگ اٹھا کر باہر نکل آئی۔

اس کے دل میں عجیب سی مایوسی چھائی تھی وہ گھر پہنچی تو مسز ولسن اپنی بیٹی الزبتھ سے موبائل پر باتیں کرنے میں مصروف تھیں۔ کیتھی نے ایک ٹک ان کی طرف دیکھا اس کا چہرہ قدرے تھکا ہوا اور اداس تھا۔ مسز ولسن کو مصروف دیکھ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور جا کر اپنے کمرے میں تھکے ہوئے انداز میں بیڈ پر لیٹ گئی..... اور چھت کو گھورنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد مسز ولسن ٹرے میں اس کے لیے کھانا لے کر آئیں اور اس کے پاس ٹیبل پر رکھا۔

''تھینک یو..... مسز ولسن آپ نے کیوں تکلیف کی.....؟'' کیتھی نے جلدی سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''نو پرابلم..... تم میری بیٹی ہی ہو..... میں الزبتھ کو تمہارے بارے میں بتا رہی تھی تو وہ بہت خوش ہو رہی تھی کہ تم مجھے اس کی کمی محسوس نہیں ہونے دیتیں۔'' مسز ولسن نے محبت سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''تھینک یو..... سو نائس آف یو.....'' کیتھی نے مسکرا کر محبت بھرے لہجے میں کہا تو وہ بھی مسکرا دی۔

''او کے..... مجھے یہ بتاؤ کہ آج تم اتنی اداس کیوں لگ رہی ہو؟'' مسز ولسن نے اس کے قریب بیٹھ کر نرمی سے پوچھا تو اس نے گہری سانس لے کر ان کی طرف دیکھا۔

''آج میں دنیا کے سب سے پرانے مذہب کے بارے میں پڑھ کر بہت کنفیوز ہوئی۔''

''کیوں.....؟'' مسز ولسن نے حیرت سے پوچھا۔

''ان میں گاڈ کا تصور اتنا پیچیدہ اور کنفیوزنگ ہے کہ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس کے ماننے والے کس طرح ان باتوں پر یقین کیے بیٹھے ہیں کہ جنہیں سنتے یا پڑھتے ہی عقل بالکل قبول نہیں کرتی۔'' کیتھی نے قدرے جھنجلا کر کہا..... تو مسز ولسن نے مسکرا کر اسے دیکھنے لگیں۔

''انسان کا عقیدہ ایک نسل سے دوسری نسل میں ایک امانت کی صورت میں منتقل ہوتا ہے جس کو آنے والی نسلیں اپنی عزت اور جان سے بھی زیادہ سنبھال کر رکھتی ہیں اور اکثر لوگ بہت سی باتوں کو غلط مانتے ہوئے بھی ان پر صرف اس لیے قائم رہتے ہیں کیونکہ ان کے باپ دادا ان پر عمل کرتے آئے ہیں۔'' مسز ولسن نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''لیکن ہر انسان کی اپنی زندگی ہے..... اپنی سوچ ہے اور اپنی ہی عقل ہے۔ وہ دوسروں کی آنکھوں کو استعمال کر کے خود اپنے لیے راستہ کیسے تلاش کر سکتا ہے؟'' کیتھی نے قدرے حیرت سے کہا۔

''یہ تم کہہ رہی ہو ناں کیونکہ تم سچے خدا کی تلاش میں نکلی ہو..... مگر جو لوگ مذہب کے بارے میں زیادہ تحقیق میں یا بحث میں نہیں ہوتے تو وہ اپنے خاندانی عقیدے کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں۔ کیا غلط ہے، کیا صحیح ہے..... وہ اس بحث میں نہیں پڑتے۔ وہ اپنے بڑوں کے راستے سے ہٹ کر اپنے لیے کوئی نیا راستہ اس لیے منتخب نہیں کرتے کیونکہ یہ بہت مشکل اور کٹھن کام ہے۔ جب کوئی ایک religion سے دوسرے میں convert ہوتا ہے تو اسے پورے خاندان کی مخالفت مول لینی پڑتی ہے۔ یورپ میں پچویشن مختلف ہے مگر ساؤتھ ایشین کنٹریز میں جہاں سوشل اور کاسٹ سسٹم (ذات پات) مضبوط اور غالب ہے وہاں ایسی مخالفتیں مول لینا بہت مشکل ہوتا ہے..... ہمارے اسکول میں ایک سکھ ٹیچر مسلم ہوئی تھی تو اس کے وطن میں اس کی ساری فیملی نے اس کا بائیکاٹ کر دیا اور پھر وہ دوبارہ کبھی وہاں نہیں گئی۔'' مسز ولسن نے بتایا۔

''مسلم.....؟'' کیتھی حیرت سے بڑبڑائی۔

''ہاں..... یورپ میں اسلام بہت تیزی سے پھیل رہا ہے اور عیسائیت کے بعد دنیا کا دوسرا بڑا مذہب بن گیا ہے۔ ایک عام تحقیق کے مطابق پوری دنیا میں کرسچنز 31.59 فیصد ہیں جبکہ مسلمز 23.2 فیصد ہیں اور اسلام اتنا پرانا مذہب بھی نہیں۔'' (یہ ایک کرسچن خاتون کے اپنے نظریات تھے) مسز ولسن نے کہا تو کیتھی متجسس ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''رئیلی..... اسلام کیوں اتنی تیزی سے پھیل رہا ہے.....؟'' کیتھی نے حیرت سے پوچھا۔

''اس کے بارے میں تم خود ریسرچ کرو اور اس کی وجہ جاننے کی کوشش کرنا۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا تو کیتھی نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

''تو پھر کیوں نہ میں اسلام سے ہی ریسرچ شروع کروں.....؟'' کیتھی نے کہا۔

''اٹس اپ ٹو یو لیکن ہر ریسرچ میں ہسٹری کا رول بہت اہم ہے۔ کسی چیز کی ہسٹری کو جانے بغیر ہم اس کے ٹھیک یا غلط ہونے کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔'' مسز ولسن نے اسے گائڈ کیا تو وہ گہری سانس لے کر خاموش ہو گئی اور کسی سوچ میں ڈوب گئی۔

☆☆☆

ہفتے کی صبح تھی۔ جم کی چھٹی تھی اور وہ prayer لیے جانے کی تیاری میں مصروف تھا۔ اس نے بلیک پینٹ کوٹ پہنا..... اور پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے جوائے کا نمبر ملایا۔ جوائے ناشتا بنانے میں مصروف تھا۔ پیرن آفس گئی ہوئی تھی..... جم نے اسے تیار ہونے کو کہا کہ وہ اسے کہیں لے کر جانا چاہتا ہے۔ جوائے نے پہلے تو جانے سے انکار

کیا پھر اس کے اصرار پر تیار ہونے لگا...... جم اسے لے کر ایک synagogue چلا گیا۔ جوائے نے بھی لانگ کوٹ پہن رکھا تھا۔ synagogue کے فرنٹ ڈور سے دونوں نے ڈریس ہیٹس لے کر پہنے اور اندر چلے گئے۔ synagogue ایک بڑا سا ہال تھا۔ جس کے ساتھ چھوٹے کمرے اسٹڈی کے لیے یا آفسز کے لیے تھے۔ ایک چھوٹا سا کمرا تورات کی اسٹڈی کے لیے مخصوص تھا۔

''یہ کیا ہے......؟'' جوائے نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سرگوشی میں پوچھا۔

''prayer hall...synagogue'' جم گہری سانس لے کر اسے ہال کے بارے میں بتانے لگا۔ وہاں چند یہودی پینٹ کوٹ اور ہیٹس میں ملبوس ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے تھے ان کے ساتھ ادھیڑ عمر ربی کھڑا تھا۔

''یہ کون ہے......؟'' جوائے نے ربی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ربی...... میرا مطلب...... مائی ماسٹر...... teacher of torah'' جم نے اسے بتایا۔

''او کے......'' جوائے نے مسکرا کر کہا اور دونوں باتیں کرتے ہوئے چلے گئے۔ جم یہودی تھا اور بہت پلاننگ سے جوائے کو یہودی بنانے کے چکر میں تھا۔

☆☆☆

کیتھی اور جوائے کی کلاس میں ایک نئے لڑکے عبدالرحمٰن نے ایڈمیشن لیا تھا۔ جو پاکستان، حیدر آباد سے آیا تھا۔ اور اسے کیلی گرافک آرٹ کے ساتھ ساتھ abstract پینٹنگ میں بھی بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ وہ دبلا پتلا سنجیدہ مزاج نو جوان تھا۔ جو ہر وقت سر پر کیپ پہنے رکھتا۔ پہلے تو جوائے نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی مگر جب اسے دوسرے کلاس فیلوز سے پتا چلا کہ وہ مسلم ہے تو اس کے اندر کی نفرت نے اسے مختلف انداز میں عبدالرحمٰن کو تنگ کرنے پر ابھارا۔ وہ کبھی باتوں، باتوں میں اس پر طنز کرتا اور کبھی اس کی بنائی ہوئی پینٹنگز کا مذاق اڑاتا...... جبکہ عبدالرحمٰن بہت زیادہ ٹیلنٹڈ اسٹوڈنٹ تھا اور اس کے ٹیچرز بھی اس کی بہت تعریف کرتے تھے مگر جوائے اس کی ہتک اور توہین کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ کیتھی کو جوائے کی یہ حرکتیں دیکھ کر انتہائی غصہ آتا تھا۔ اور وہ اسے منع کرنے کی کئی بار کوشش کرتی...... مگر جوائے اس کی کسی بات کو سننے کو تیار نہیں تھا۔ عبدالرحمٰن جب بھی جوائے کو اپنی طرف آتے دیکھتا تو راستہ بدل لیتا...... اور جوائے اس بات پر دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا کہ وہ اس سے ڈرتا ہے۔ کیتھی اس کی ذہانت اور ٹیلنٹ سے بہت متاثر ہوئی تھی اور وہ جب بھی کبھی عبدالرحمٰن کے پاس کھڑی ہو کر کچھ ڈسکس کر رہی ہوتی تو جوائے اسے خفگی سے دیکھتا اور بعد میں اس سے ناراض ہوتا، کیتھی اس سے وجہ جاننے کی کوشش کرتی مگر جوائے اسے جھڑک دیتا۔

عبدالرحمٰن نے ایک تجریدی آرٹ کا شاہکار بنایا تھا۔ جس میں ہر طرف آگ لگی تھی۔ اور اس آگ کے شعلوں میں اس نے بہت خوب صورت انداز میں انسانی آنسو بنائے تھے جو نفرت کی اس آگ کو بجھانے کے لیے بہت کم تھے۔ کیتھی نے پینٹنگ دیکھی تو اس کی بہت تعریف کرنے لگی۔ دونوں بینچ پر بیٹھے تبصرہ کرنے میں مصروف تھے تو جوائے آہستہ، آہستہ چلتا ہوا ان کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا...... اور پینٹنگ کو بغور دیکھنے لگا۔ اس نے پیچھے سے ہاتھ بڑھایا اور کیتھی کے ہاتھ سے چھین کر اسے بغور دیکھنے لگا...... دونوں ایک دم ہکا بکا رہ گئے۔

''تم terrorist اینڈ پُرتشدد لوگ ایسی ہی پینٹنگز بنا سکتے ہو...... کیونکہ تم ساری دنیا کو اپنی نفرت کی آگ میں جلا کر ختم کرنا چاہتے ہو۔'' جوائے نے اس کی پینٹنگ زمین پر پھینکتے ہوئے انتہائی غصے سے عبدالرحمٰن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے بھی غصے سے اس کی طرف دیکھا اور خاموشی سے اپنی پینٹنگ اٹھائی۔

''مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم صرف مجھ سے دشمنی لے رہے ہو یا پھر مسلمز سے؟'' عبدالرحمٰن نے ایک گہری

سانس لیتے ہوئے نرم لہجے میں پوچھا۔

''تم سے اس لیے کہ تم...... مسلم ہو......'' جوائے نے قدرے خفگی سے کہا۔

کیتھی پریشان ہو کر دونوں کو دیکھنے لگی۔

''کیا میں اس مسلم دشمنی کی وجہ جان سکتا ہوں؟'' عبدالرحمٰن نے پوچھا۔

''کیا تم لوگوں کو معلوم نہیں کہ اس وقت دنیا کے سب سے بڑے کلرز تم ہی لوگ ہو...... تم دنیا کو سکون سے نہیں رہنے دیتے۔'' جوائے نے خفگی سے کہا تو عبدالرحمٰن اپنی پینٹنگ پکڑ کر خاموشی سے وہاں سے چلا گیا اور جوائے اس کے لیے برے، برے الفاظ منہ سے نکالنے لگا۔

''جوائے تم اکثر عبدالرحمٰن کے ساتھ بہت زیادتی کرتے ہو...... کسی کی اتنی تذلیل کرنا اچھی بات نہیں۔'' کیتھی نے پُرتاسف انداز میں کہا۔

''یہ لوگ اسی کے حقدار ہیں۔'' جوائے نے کہا اور خفگی سے منہ بنا کر وہاں سے چلا گیا۔ کیتھی کو بہت افسوس ہونے لگا اسے عبدالرحمٰن سے بہت ہمدردی تھی۔ وہ بہت محنت سے پیسے اکٹھے کر کے یہاں آرٹ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے آیا تھا اور اپنے ملک میں جا کر وہ ایک آرٹ اسکول کھولنا چاہتا تھا۔ اس کے بہت اعلیٰ مقاصد تھے۔ کیتھی کو ڈر تھا کہ وہ جوائے کی وجہ سے اتنا زیادہ ہرٹ نہ ہو کہ سب کچھ چھوڑ کر واپس چلا جائے۔ اسے عبدالرحمٰن بہت اچھا، سلجھا ہوا اور دھیمے مزاج کا نو جوان لگا تھا۔ کیتھی نے آہ سرد بھری اور اپنا بیگ اٹھا وہاں سے چلی گئی۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن آرٹ کی کسی کلاس میں نہ آیا تو کیتھی دل ہی دل میں پریشان ہونے لگی۔ آف ٹائم کے بعد اس نے عبدالرحمٰن کو کئی بار فون کیا...... مگر اس نے اس کی کال نہ لی...... لائبریری میں بھی اور گھر آ کر بھی وہ بہت اپ سیٹ رہی...... اسے جوائے سے محبت تھی...... مگر عبدالرحمٰن سے کچھ زیادہ ہی ہمدردی محسوس ہونے لگی تھی کیونکہ وہ بہت حساس اور نرم دل رکھتی تھی۔

اگلے روز اسے عبدالرحمٰن کالج میں ملا تو بہت بجھا، بجھا سا تھا۔ کیتھی نے اس سے وجہ پوچھی تو وہ خاموش رہا۔

''پلیز تم جوائے کی وجہ سے ڈسٹرب نہ ہو...... وہ یونہی ہائپر ہو جاتا ہے لیکن دل کا بہت اچھا ہے...... میں اسے سمجھاؤں گی۔'' کیتھی نے عبدالرحمٰن کا ہاتھ پکڑ کر اسے نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا تو اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

''میں یہ کالج چھوڑنے کا سوچ رہا ہوں۔'' عبدالرحمٰن نے آہ بھر کر کہا۔

''کیتھی جب وہ مجھے برا کہتا ہے تو میں اتنا مائنڈ نہیں کرتا لیکن جب وہ سب مسلمز کو برا کہتا ہے اور ان کے بارے میں بری، بری باتیں کرتا ہے تو مجھے بہت برا لگتا ہے تب میرا خون کھولنے لگتا ہے لیکن میں صرف اسی لیے خاموش رہتا ہوں کہ اگر میں نے اس کے ساتھ جھگڑا کیا تو پھر سب مجھے ہی الزام دیں گے کہ میں نے جھگڑا کیا اور بلاوجہ لڑ پڑا تو پھر مسلمز کا امیج اور زیادہ خراب ہو گا...... اس لیے بہتر یہی ہے کہ میں یہاں سے چلا جاؤں......'' عبدالرحمٰن نے افسوس سے کہا۔

''اور تمہارے وہ اعلیٰ مقاصد...... اور خواب......؟'' کیتھی نے پوچھا۔

''میرے لیے میرا religion اور میری مسلم کمیونٹی کی عزت زیادہ اہم ہے...... اگر اللہ نے میری قسمت میں تعلیم حاصل کرنا لکھا ہو گا تو میں ضرور حاصل کر کے رہوں گا۔ یہ میرا ایمان ہے۔'' عبدالرحمٰن نے گہری سانس لے کر کہا تو کیتھی نے چونک کر اسے دیکھا۔

''انسان جس چیز کے لیے کوشش کرتا ہے اسے وہی ملتی ہے۔ قسمت کا اس میں کیا رول ہے؟'' کیتھی نے حیرت سے پوچھا۔

''ٹھیک ہے...... لیکن، ہم مسلمانوں کا واضح یقین ہے کہ انسان کو دنیا میں جو کچھ ملتا ہے وہ اس کی قسمت میں اس کی پیدائش سے پہلے ہی لکھا جا چکا ہے۔ اللہ نے اس کی قسمت میں سب کچھ لکھ دیا ہے لیکن اس راز کو انسان پر ظاہر نہیں کیا اس راز کو پانے کے لیے خود جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ جو لوگ خدا پر پختہ یقین رکھتے ہیں وہ اسے اپنی ذاتی محنت کا

نام دیتے ہیں...... اس لیے میرا بھی خدا پر پختہ یقین، ایمان ہے کہ وہ میرے لیے کہیں اور سے راستہ بنائے گا۔'' عبدالرحمٰن نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''اٹس وری اسٹرینج...... تم مسلمز لوگ کتنے عجیب ہو...... کیسی عجیب و غریب باتیں کرتے ہو......'' کیتھی کو اس کی باتوں پر شدید حیرت ہوئی۔

''نہیں، اس میں کچھ بھی عجیب نہیں...... ایکچوئلی تمہارا مائنڈ ابھی اتنا میچور نہیں ہوا کہ وہ حقائق کو فوراً قبول کرلے...... تم اپنے ذہن سے سوچ رہی ہو...... اور میں اپنے ذہن سے...... تم ایک مختلف ماحول میں پلی بڑھی ہو، تمہارا ذہن مختلف ہے...... ہمارے عقائد بھی مختلف ہیں اور فلاسفی آف لائف بھی...... تمہیں زندگی میں جو تجربات ہوتے ہیں وہ مجھے نہیں ہوتے۔ اس لیے ہم دونوں کیسے ایک جیسا سوچ سکتے ہیں۔ ہاں، جب ہمارا تعلق ایک عقیدے سے ہوگا تو ہماری سوچ بھی ملنا شروع ہوجائے گی۔'' عبدالرحمٰن نے بڑی وضاحت سے مگر نہایت آسان الفاظ میں اسے سمجھایا تو وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی مگر بولی کچھ نہیں۔

''میں اب کالج نہیں آؤں گا...... تم بہت اچھی ہو...... وری نائس پرسن...... اپنا بہت خیال رکھنا...... میں تم سے رابطے میں رہوں گا۔ بائے......'' عبدالرحمٰن نے ٹوٹے دل سے ایک زخمی مسکراہٹ سے اسے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ کیتھی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اچانک اس کی آنکھوں سے دو آنسو گرے تو وہ چونکی۔ اسے سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اچانک وہ آنسو کیوں گرے تھے۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور چہرہ صاف کیا اور وہاں سے چلی گئی۔

اگلے روز عبدالرحمٰن کلاس میں نہیں آیا تھا۔ جوائے نے جان بوجھ کر مذاق میں اس کا ذکر چھیڑا تو کیتھی نے افسوس سے اس کی طرف دیکھا۔

''اس نے کالج چھوڑ دیا ہے...... تمہاری وجہ سے......'' کیتھی نے آہ بھر کر کہا۔

''میری وجہ سے......؟ دہاٹ نان سینس...... کیا وہ اتنا بے وقوف ہوسکتا ہے کہ میری وجہ سے اپنی اسٹڈیز چھوڑ کر چلا گیا...... اب مجھے پکا یقین ہوگیا ہے کہ مسلمز واقعی بہت نان سینس ہوتے ہیں۔'' وہ منہ بنا کر طنزیہ انداز میں بولا تھا۔

''ہاں...... وہ تمہاری وجہ سے بہت ہرٹ ہورہا تھا...... جب تم بار، بار اسے اور اس کی کمیونٹی کو برا کہتے تھے۔'' کیتھی نے خفگی سے کہا۔

''دیکھو تم مجھے الزام مت دو...... اور تم اسے کیوں اتنی فیور کررہی ہو؟ تم میری فرینڈ ہو...... اور تمہیں مجھے فیور کرنا چاہیے۔'' جوائے نے خفگی سے کہا۔

''میں غلط بات میں تمہیں فیور نہیں کرسکتی...... اور تم نے عبدالرحمٰن کے ساتھ غلط کیا...... وہ بیچارہ کتنی مشکل سے پیسے جمع کرکے یہاں پڑھنے کے لیے آیا تھا اور پتا نہیں اب کہاں ہوگا...... شاید اپنے ملک واپس چلا جائے گا۔'' کیتھی نے نہایت افسردگی سے کہا تو جوائے کو غصہ آنے لگا۔

''تم ایک مسلم کو فیور کررہی ہو...... تم نہیں جانتیں کہ یہ لوگ کتنے برے ہوتے ہیں......'' وہ پھر شروع ہوچکا تھا۔

''عبدالرحمٰن برا نہیں تھا...... اور تم اتنے اچھے لوگوں کو صرف ان کے religion کے اینگل سے کیوں دیکھتے ہو...... ہر مسلم تمہیں برا لگتا ہے۔'' کیتھی نے غصے سے جواب دیا اور اپنا بیگ اٹھا کر جانے لگی۔

''ہاں، ہاں دنیا کا ہر مسلم برا ہے، وہ بھی اُن کا مذہب بھی تمہیں خود پتا چل جائے گا...... تو پھر تم بھی میری طرح انہیں برا کہوگی۔'' جوائے نے غصے سے کہا تو کیتھی نے ایک ٹک خفگی سے اسے دیکھا اور خاموشی سے چلی گئی...... جوائے غصے میں بڑبڑاتا رہا۔

(جاری ہے)



الٹی گنگا

نگہت اعظمی

رمضان کا آخری عشرہ تھا۔ دن کے تین بجے آگ برساتے سورج کے تیروں کا مقابلہ کرتی میں گھر پہنچی...... گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے میں نے ڈرائنگ روم کا رخ کیا...... ایک ہفتے پہلے ہی میں نے گھر والوں کی جھنجلاہٹوں، مخالفتوں اور تنقیدوں سے جنگ کرتے ہوئے اپنے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا تھا۔ یعنی ڈرائنگ روم کو از سرِ نو سیٹ کیا تھا...... اور اپنے اس کارنامے سے... میں اتنا

خوش تھی کہ ہر روز اسپتال سے گھر آ کر ڈرائنگ روم کی زیارت کرتی...... ایک، ایک چیز کو دیکھ کر خوش ہوتی اور دل ہی دل میں اپنے آپ کو سراہتی۔

جونہی ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر میں نے لائٹ آن کی تو ایک لمحے کے لیے میری جان کھنچ کر حلق میں آ گئی۔ میرے خون کا درجۂ حرارت نقطۂ ابال کو چھونے لگا...... میرا دل چاہا میں دیوار پر سر دے ماروں...... میرے بڑی محنت اور مشقت سے خریدے ہوئے کاسنی کلر کے لیدر کے صوفوں پر کالے پوائنٹر سے بڑی بڑی لکیریں اور دائرے بنے ہوئے تھے اور یہ اتنے پکے تھے جن کو مٹانے کے لیے ابھی تک کوئی کیمکل یا بیج ایجاد نہیں ہوا تھا۔

میں دل کو تھام کر وہیں بیٹھ گئی۔ دونوں بیٹے اور شوہر آفس گئے ہوئے تھے، بیٹی یونیورسٹی میں تھی، گھر میں ساس تھیں، جو اس گھر کے ہر مسئلے سے بے نیاز اپنے کمرے میں خوابِ خرگوش کے مزے لے رہی تھیں۔ ملازمہ کام کر کے جا چکی تھی۔ اب میں کہتی تو کس سے کہتی کہ اس وقت میرے دل پر کیا گزر رہی ہے۔

ان صوفوں سے میری جذباتی وابستگی بہت شدید تھی کہ یہ صوفے میرے دو سال کے خوابوں کی تعبیر تھے۔ ان کو خریدنے کے لیے میں نے پورے سال پیسے جمع کیے تھے۔ اپنی بے شمار خواہشات کو مارا تھا۔ کئی ضرورتوں کو پسِ پشت ڈالا تھا۔ ان کو خریدنے کے لیے کئی دوپہریں بازاروں میں گزاری تھیں۔ اس قسم کے صوفے میں نے سب سے پہلے اپنے ایک سینئر آفیسر کے گھر میں دیکھے تھے۔ خوب صورت اور سجے ہوئے گھر ہمیشہ سے میری کمزوری رہے ہیں لیکن محدود آمدنی اور بڑھتی ہوئی مہنگائی کی وجہ سے میں کبھی بھی گھر کو اپنی مرضی کے مطابق ڈیکوریٹ نہ کر سکی پھر احسن کو بھی گھر کی سجاوٹ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ ان کی دلچسپی یہ تھی کہ نیا LCD آ جائے تا کہ وہ آفس سے گھر آ کر مزے سے چینل گھماتے رہیں یا پرانی گاڑی بیچ کر نئی گاڑی خرید لی جائے...... یا مہینے میں ایک بار ہوٹل جا کر ڈنر کر لیا جائے۔ انہیں اس بات سے کوئی مطلب نہیں کہ گھر کا فرنیچر کتنا پرانا ہو گیا ہے۔ صوفے کس زمانے کے ہیں، قالین اتنا پرانا ہو گیا ہے کہ اس کا اصل رنگ ہی مٹ گیا ہے۔ میری احسن کی ہمیشہ لڑائی اس بات پر ہوتی تھی میں جب بھی گھر کے فرنیچر یا پردے بدلنے کا ذکر کرتی وہ ٹی وی کے پروگرام اتنے غور سے دیکھنے لگتے جیسے میں ان سے نہیں دیواروں سے باتیں کر رہی ہوں اور جب غصے سے میری آواز تیز ہو جاتی تو انتہائی سکون سے کہتے......

''کیوں غصہ کر رہی ہو، اس عمر میں غصہ کرنا صحت کے لیے اچھا نہیں ہوتا......''

یہ سن کر میرا پارہ اور ہائی ہو جاتا اور میں بکتی جھکتی وہاں سے اٹھ جاتی...... لیکن جب سے میں کرنل ایاز کے گھر سے آئی تھی میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب چاہے آندھی آئے پانی جائے میں نے ڈرائنگ روم کو سیٹ کرنا ہی ہے۔

میں فوج میں میجر تھی۔ دو سال پہلے میری پوسٹنگ پنڈی سے کراچی ہو گئی تھی۔ میں نے ڈاؤ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا تھا۔ پھر فوج جوائن کر لی...... فوج میں عہدہ تو بڑا ہوتا ہے لیکن اس عہدے کے مقابلے میں پیسہ بہت کم ہوتا ہے، فوجیوں کی زندگیاں بظاہر جتنی پُرشکوہ نظر آتی ہیں اندر سے اتنی ہی محنت و مشقت سے بھرپور ہوتی ہیں۔ ویسے تو میرے میاں بھی میجر تھے مگر اس کے باوجود ہمارے پاس کوئی بینک بیلنس نہیں تھا۔ دو سال پہلے میرے میاں کورس پر کراچی آئے تو میں نے اپنی پوسٹنگ کے لیے درخواست دے دی اور شومئی قسمت کہ دو ماہ کے اندر مجھے بھی کراچی پوسٹ کر دیا...... میں نے سی ایم ایچ میں جا کر رپورٹ کی تو میرا پہلا انٹرویو کرنل ایاز سے ہوا جو اس اسپتال میں سیکنڈ ان کمانڈ (21C)

تھے۔ میں...... ان کی شخصیت کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوئی۔ فوجی ہونے کے باوجود ان میں بے حد عاجزی اور انکساری تھی۔ فوجیوں کے رواج کے مطابق انہوں نے فوراً ہی مجھے بہن کہہ کر مخاطب کیا پھر مجھ سے میرے شوہر اور بچوں کے بارے میں پوچھا۔ میرے مسائل دریافت کیے اور میرے اٹھنے سے پہلے مجھے اور میری فیملی کو اپنی بیٹی کی سالگرہ میں انوائٹ کیا جو دو دن بعد اُن کے گھر پر ہونی تھی۔

میں سالگرہ کے دن اپنے شوہر کے ساتھ ان کے گھر پہنچی تو ان کا گھر دیکھ کر حقیقتاً میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ بظاہر وہ ایک درویش صفت انسان نظر آتے تھے لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ان کا لائف اسٹائل اتنا اعلیٰ اور نفیس ہوگا...... میں نے فوجیوں کے بہت سجے سنورے گھر دیکھے تھے لیکن ان کا گھر جس انداز سے سجا ہوا تھا وہ واقعی قابلِ تعریف تھا۔

کرنل صاحب اور ان کی مسز نے بڑے پُرتپاک انداز میں ہمارا استقبال کیا اور ہم دونوں کو ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھایا۔ ڈرائنگ روم میں نہ بے تحاشا ڈیکوریشن کے پیسز کی بھرمار تھی کہ ڈرائنگ روم ڈیکوریشن کی دکان لگے نہ کمرا فرنیچر کی دکان کی طرح فرنیچر سے بھرا ہوا تھا۔ ڈرائنگ روم کے فرش پر بہت اعلیٰ قسم کے ٹائلز لگے ہوئے تھے۔ درمیان میں بے حد قیمتی اور اسٹائلش ڈیزائن کا کارپٹ بچھا تھا۔ درمیان میں شیشے کی میز تھی اور چاروں طرف سیون سیٹر ز صوفے رکھے تھے جن پر کاسنی لیدر چڑھا ہوا تھا۔ صوفوں پر کاسنی کشن تھے جن پر ڈارک پرپل کلر کی کڑھائی ہوئی تھی۔ سامنے دیوار پر شیشے کی الماری تھی۔ جس کے اندر کاسنی رنگ کے بلب لگے تھے۔ اس میں سے چھن، چھن کر کاسنی کلر کی روشنی باہر آ رہی تھی۔ ایک کونے پر ایک خوب صورت لیمپ تھا جس کا شیڈ کاسنی رنگ کا تھا اور دوسرے کارنر پر مصنوعی درخت رکھا تھا جس میں جا بجا کاسنی پھول لگے ہوئے تھے۔ ایک بے حد خوب صورت اسٹائلش سیٹی رکھی تھی۔ چھت سفید تھی فانوس اور پنکھے صوفوں کے کلر کے تھے۔ پردے بھی صوفوں کے کلر کے تھے جن پر سلور کام بنا ہوا تھا۔ ہر چیز اس طرح جگر، جگر کر رہی تھی جیسے ابھی اور اسی وقت دکان سے خرید کر لائی گئی ہو۔ یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ ان میں کوئی چیز بھی نئی نہیں تھی۔ پردے سے لے کر صوفے تک ہر چیز کم از کم پانچ سال پرانی تھی۔

ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہی مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ وہ ان کا صوفہ سیٹ تھا۔ میں نے لیدر کے بہت سے صوفے دیکھے تھے لیکن اتنا دلکش اور نظروں کو تازگی دینے والے رنگ کا لیدر ابھی تک میری نظروں سے نہیں گزرا تھا۔

''یہ کون سا لیدر ہے؟ میں نے لیدر میں یہ کلر کبھی نہیں دیکھا......'' کھانا کھانے کے بعد جب ہم خواتین باتوں میں مصروف تھے تو میں نے کرنل ایاز کی مسز سے صوفوں کی تعریف کرتے ہوئے پوچھا۔

''ایاز کے دوست کا لیدر کا کارخانہ ہے۔ ایاز کی فرمائش پر انہوں نے اس کلر کا لیدر بنایا تھا۔''

''پھر تو یہ بہت مہنگا ہوگا......'' بے اختیار میری زبان سے یہ جملہ نکلا۔

''ہاں مہنگا تو خاصا ہے...... لیکن اصل لیدر کے صوفے تو مہنگے ہی ہوتے ہیں۔'' انہوں نے ٹالنے والے انداز میں جواب دیا۔ میرا دل تو چاہ رہا تھا کہ ان سے قیمت پوچھوں لیکن مجھے اچھا نہیں لگا اور وہ بھی شاید بتانا نہیں چاہ رہی تھیں۔ ہم پھر دوسری باتوں میں مصروف ہو گئے۔

پارٹی بہت اچھی رہی ہم سب نے خوب انجوائے کیا...... کرنل ایاز نے سارے آفیسرز سے میرا تعارف کرایا۔ جب میں گھر آئی تو میرے دماغ پر ان کا گھر سوار تھا۔ شاید رات بھر میں یہی خواب دیکھتی رہی کہ میرا بھی ایسا ہی گھر ہے اور میں اسے

اسی طرح سجا رہی ہوں۔ اسپتال جوائن کرنے کے تین ماہ بعد مجھے بھی ایک فلیٹ مل گیا۔ جو تین بیڈ روم، لاؤنج اور ڈرائنگ روم پر مشتمل تھا۔ فلیٹ پرانا ضرور تھا لیکن روشن اور ہوادار تھا۔

فلیٹ کے الاٹ ہوتے ہی کرنل ایاز جیسے گھر کا خواب میرے اندر ہلچل مچانے لگا اور اس خواب کے آکٹوپس نے میرے پورے ذہن کو جکڑ لیا۔ میری ہر بات کی تان گھر کی سجاوٹ پر ٹوٹنے لگی۔ بچوں کو اس ذکر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور احسن کو تو اس ذکر سے خواہ مخواہ کا بیر تھا۔

''میں جانتا ہوں تمہیں گھر سجانے کا بہت شوق ہے لیکن اس شوق کو جنون نہ بنالو۔''

''میں تو جب بھی گھر کے لیے کوئی چیز لانے کو کہتی ہوں آپ اسی طرح باتیں کرتے ہیں۔'' میرا لہجہ تلخ ہو جاتا۔ میری عادت تھی کہ جب میں کسی کام کے بارے میں سوچ لیتی تو تن من دھن سے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرتی اور اس سلسلے میں مجھے لوگوں کے رائے مشورے بالکل اچھے نہیں لگتے۔

''مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ آخر ان صوفوں میں کیا برائی ہے جو تم انہیں بیچ کر نئے صوفے خریدنے کے لیے باؤلی ہوئی جا رہی ہو جبکہ تم جانتی ہو ابھی ہمارے بجٹ میں اتنے مہنگے صوفوں کی گنجائش نہیں ہے.....'' وہ مجھے سمجھانے کی ناکام کوشش کرتے۔

''میں آپ سے پیسے نہیں مانگ رہی ہوں۔ میں نے کمیٹی ڈالی ہے، رمضان میں وہ مجھے ملے گی ان پیسوں سے میں یہ صوفے خریدوں گی۔'' میرے اس طرح کے منہ توڑ جواب سے ان کا منہ بن جاتا اور میرا غصے کا سورج سوا نیزے پر پہنچ جاتا۔

''آپ کا بس چلے تو آپ پرانا ٹوٹا ہوا فرنیچر بھی نہ پھینکنے دیں..... اگر میں گھر کی چیزوں کے لیے اتنا لڑتی جھگڑتی نہیں تو آج ہمارا گھر بھی آپ کی اماں کی گھر کی طرح آثارِ قدیمہ کا شاہکار ہوتا جسے چند سال بعد حکومت میوزیم کا درجہ دے دیتی۔'' ان کے منہ بنانے پر مجھے اور زیادہ غصہ آتا، اور میں ان کو جلانے کے لیے ان کی اماں کو بھی درمیان میں لے آتی۔ میری کراچی میں پوسٹنگ کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا تھا کہ اب میری ساس اپنے بڑے بیٹے کو چھوڑ کر میرے پاس آکر رہنے لگی تھیں اور اتنے سال خود مختاری کی زندگی گزارنے کے بعد مجھے ساس کا اپنے ساتھ رہنا برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

''تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے، تمہارا جو جی چاہے کرو..... جاؤ اور ابھی جا کر ساری تنخواہ سے صوفہ خرید لاؤ۔ پھر سارا مہینہ اسی صوفے کو دیکھ کر گزارا کر لینا۔ اسی کو دیکھ کر پیٹ بھرنا، اسی کو دیکھ کر بچوں کی فیسیں دینا۔ پتا نہیں جب عقل بٹ رہی تھی تو تم کس کونے میں کھڑی تھیں۔ نام کو عقل نہیں ہے۔'' ہمیشہ کی طرح جھگڑے کا اختتام اسی جملے پر ہوا اور میں غصے سے بڑبڑاتی ہوئی ٹی وی لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی اور ٹی وی آن کر کے چینل سرچ کرنے لگی۔

☆☆☆

ان روز، روز کے جھگڑوں سے تنگ آکر میں نے گھر میں صوفے کا ذکر کرنا بالکل ختم کر دیا۔ لیکن خاموشی سے اپنے مشن کی تکمیل میں لگی رہی۔ میں نے آفس میں ایک لاکھ کی کمیٹی ڈالی تھی اور رمضان سے ایک ہفتے پہلے مجھے کمیٹی مل گئی۔ جس دن کمیٹی ملی میں اپنے بڑے بیٹے کو لے کر پورے شہر کا چکر لگاتی رہی لیکن نہ مجھے اس ڈیزائن کا صوفہ ملا اور نہ وہ کلر..... بیٹا الگ میری اس مشقت سے بیزار ہو رہا تھا۔ اس کی بیزاری پر مجھے اور بھی غصہ آرہا تھا۔ میں سارے راستے اسے باتیں سناتی رہی۔

''میں نہ ہوں تو گھر کچرا خانہ بن جائے، کسی کو گھر کی فکر ہی نہیں ہے۔ لوگوں کو دیکھو اپنے گھروں کو

کیسے سجا سنوار کر رکھتے ہیں۔ یہاں کسی کو اتنی توفیق نہیں کہ بازار میرے ساتھ چلا جائے۔ میں ہی سارا دن کھپتی رہوں۔''

''اب صبح سے تو آپ کے ساتھ پھر رہا ہوں۔ اتنے اچھے اچھے صوفے ہیں آپ کو کوئی پسند ہی نہیں آتا۔'' وہ بھی سخت جھنجلایا ہوا تھا۔ اب اسے کیا بتاتی بات صوفے کی نہیں تھی..... اپنے خواب کی تعبیر کی تھی۔ وہ پورا دن سارے بازار کی خاک چھان کر میں ناکام ہو کر گھر آگئی۔ طبیعت سخت جھنجلائی ہوئی تھی۔ پھر میری رات کو ڈیوٹی بھی تھی۔ مجھے اس کا بھی غصہ تھا۔ ایک ہفتے بعد رمضان کی آمد، آمد تھی۔ مجھے اس کی بھی تیاری کرنی تھی..... اب ساس بھی ساتھ رہتی تھیں۔ ذرا سی کسی چیز میں کمی بیشی ہو جاتی تو انہیں فوراً بیٹیوں کی تعریف کرنے کا نادر موقع مل جاتا۔

''سائرہ تو رمضان سے ہفتہ بھر پہلے ہی ساری چٹنیاں، چاٹ مسالے بنا کر رکھ لیتی ہے۔ اس کے گھر میں پورا رمضان افطاری کے لیے کوئی چیز بازار سے نہیں آتی۔ پھر ماشاء اللہ بھری سسرال میں رہتی ہے۔ آئے دن کسی نہ کسی کی افطار پارٹی ہوتی ہے۔'' ساس کے ان جملوں پر میرا خون کھول کر رہ جاتا ہے..... اب ان سے کون کہتا کہ سائرہ نوکری نہیں کرتی، سارا دن گھر میں رہتی ہے۔ میں بھی گھر میں رہوں تو اس سے دگنا کام کر سکتی ہوں..... میں یہ سب سوچ سکتی تھی لیکن کہہ نہیں سکتی تھی کہ احسن سب کچھ برداشت کر سکتے تھے لیکن اپنی ماں کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتے تھے۔

پھر یہ ہوا کہ میرا ہر ویک اینڈ اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے صرف ہونے لگا۔ انسان واقعی خسارے میں ہے، کیسی کیسی لاحاصل چیزوں کے حصول کے لیے اپنی زندگی کے قیمتی اور انمول لمحات کو ضائع کرتا۔ کبھی، کبھی مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہوتا..... لیکن پھر اس لایعنی خواہش کا غلبہ اتنا شدید ہوتا کہ سب کچھ بھول جاتی۔

دو حالتوں کا واضح فرق

''مومن چار حالتوں کے درمیان رہتا ہے۔''

☆ حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا، مومن چار حالتوں کے درمیان رہتا ہے اگر کسی تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو صبر کرتا ہے اور اگر کوئی نعمت ملتی ہے تو شکر کرتا ہے اور اگر بات کرتا ہے تو سچ بولتا ہے اور اگر کوئی فیصلہ کرتا ہے تو انصاف والا فیصلہ کرتا ہے۔

☆ مومن پانچ قسم کے انوار میں چلتا پھرتا ہے اس کا کلام نور ہے اور اس کا علم نور ہے۔ مومن کے اندر نور ہے اور باہر نور ہے اور قیامت کے دن یہ نور کی طرف لوٹ کر جائے گا جبکہ کافر پانچ قسم کی ظلمتوں (اندھیروں) میں چلتا پھرتا ہے۔ اس کا کلام ظلمت ہے، اس کا عمل ظلمت ہے، کافر جاتا ہے تو ظلمت میں اور باہر آتا ہے تو ظلمت میں اور قیامت کے دن یہ بے شمار ظلمتوں کی طرف لوٹ جائے گا۔

مرسلہ: ریحانہ حسن، گلستان جوہر، کراچی

☆☆☆

رمضان کا بابرکت مہینہ شروع ہو چکا تھا اور اب یہ خواہش شدت اختیار کر چکی تھی کہ میں عید پر ڈرائنگ روم کو کرنل ایاز کے ڈرائنگ روم کی طرح سیٹ کر لوں..... ہمیں جو فلیٹ ملا تھا وہ نہ کرنل ایاز کے فلیٹ کی طرح نیا، نیا بنا ہوا تھا اور نہ ہی وہ علاقہ ان کے علاقے جیسا صاف ستھرا تھا۔ یہ فلیٹ خاصا پرانا تھا۔

اس کی زمینوں پر ٹائلز نہیں تھے بلکہ فرش موزائک کا تھا۔ اسی طرح ہر چیز خاصی پرانی تھی۔ اب سرکاری گھر میں ٹائل لگانا تو ممکن نہیں تھا۔ اس کا حل میں نے یہ ڈھونڈا کہ سارے گھر میں وال ٹو وال کارپٹ ڈال لیا۔ ڈرائنگ روم میں فان کلر کے کارپٹ کے اوپر ایرانی قالین سے ملتا جلتا قالین

لے کر آئی۔ شیشے کی میزیں بھی زیادہ مہنگی نہیں ملیں، پردے بھی ہلکے کوالٹی کے خرید لیے۔ ابھی عید میں پورے دو ہفتے باقی تھے اور میرا سارا وقت بازاروں میں گزر رہا تھا۔

☆☆☆

''کیا بات ہے تم بہت تھکی، تھکی لگ رہی ہو۔'' افطار کے بعد میں نڈھال سی لاؤنج میں بیٹھی چائے پی رہی تھی تو احسن نے بغور مجھے دیکھا...... شاید انہیں مجھ پر ترس آ گیا تھا یا یہ خیال ہوا کہ اگر اس عمر میں، میں ہی راہیِ عدم ہو گئی تو گھر کو سنبھالنے کے لیے دوسری کہاں سے آئے گی۔

''ظاہر ہے تھکیں گی ہی جب اسپتال سے آکر سارا دن بازاروں کے چکر لگاتی رہیں گی۔'' میری بیٹی جو اسی سال کالج میں داخل ہوئی تھی اور میری ان سرگرمیوں سے سخت نالاں رہتی تھی منہ بنا کر بولی۔ شاید میں اندر سے بہت کمزور ہو گئی تھی یا بیٹی کی بے حسی کا احساس میں کچھ کہے بنا آنسوؤں سے رونے لگی۔

''ارے بھئی کیا ہوا......؟ خیریت...... تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے......'' احسن میرے رونے سے بری طرح گھبرا گئے۔

''میں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا......'' زہرا الگ پریشان ہو گئی۔

''جاؤ اپنی ماں کے لیے شربت بنا کر لاؤ۔ مجھے لگتا ہے نہیں ڈی ہائیڈریشن ہو گئی ہے۔''

''مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں...... مجھے کچھ نہیں ہوا۔''

''تم آرام نہیں کرتی ہو...... ہر بات کو اپنے ذہن پر سوار کر لیتی ہو۔'' احسن نے بڑی نرمی سے مجھے سمجھایا۔

''آپ کو احساس ہی نہیں ہے، عید میں صرف پندرہ دن رہ گئے ہیں، میں پرانا صوفہ بھی بیچ چکی ہوں...... اگر صوفہ نہ آیا تو عید پر جو مہمان آئیں گے تو کیا فرش پر بیٹھیں گے......'' احسن کا موڈ اچھا دیکھ کر میں نے اپنی پریشانی کی وجہ بیان کر دی۔

''اوہو تو اس فکر نے آپ کی راتوں کی نیندیں اڑا دی تھیں...... یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں...... ابھی چلتے ہیں ابھی آپ کا مسئلہ حل کر دیتے ہیں۔'' احسن کا موڈ کچھ زیادہ ہی خوشگوار تھا۔ شاید باس سے تعلقات بہت اچھے چل رہے تھے۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور فوراً اٹھ گئی۔ ہم دونوں پہلے طارق روڈ پہنچے...... ٹریفک کا ایسا اژدھام جیسے کل عید ہو...... وہاں کی ساری فرنیچر کی دکانیں دیکھ ڈالیں کوئی صوفہ اچھا نہیں لگا پھر انچولی کی مارکیٹ پھر 13D اور سب سے آخر میں لالوکھیت کا رخ کیا۔

''یہاں بھی دیکھ لو...... یہاں بھی کبھی اچھی چیزیں مل جاتی ہیں...... یقین کرو یہ بڑی پرانی مارکیٹ ہے یہاں کا فرنیچر بہت اچھا ہوتا ہے۔'' احسن مارکیٹ میں داخل ہوتے ہوئے مجھے مسلسل سمجھا رہے تھے۔

میں مختلف دکانوں میں فرنیچر دیکھ رہی تھی اور دل ہی دل میں خود کو کوس رہی تھی کہ خواہ مخواہ احسن کے کہنے پر یہاں آ گئی۔

''ارے...... اس دکان میں چلیں...... بالکل ویسا ہی صوفہ...... جیسا میں چاہ رہی تھی۔'' میں دکانوں کے اندر رکھے ہوئے فرنیچر کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی کہ ایک دکان کے اندر رکھے ہوئے صوفہ سیٹ نے میری دلی مراد پوری کر دی۔ ہم دونوں دکان میں داخل ہو گئے۔

''بالکل ویسا...... وہی ڈیزائن، ویسا ہی لیدر......'' میں نے صوفے پر ہاتھ پھیرا۔

''یہ کتنے کا ہے......؟'' میں نے ڈرتے، ڈرتے پوچھا۔

''تیس ہزار...... دکان دار کے قیمت بتانے پر میں تقریباً اچھلنے کے قریب آ گئی۔ میں نے صوفے

کے لیے پچاس ہزار رکھے تھے۔

''حوصلہ رکھو...... زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں......'' احسن نے مجھے آنکھیں دکھائیں۔

''یہ اصل لیدر تو نہیں ہے۔'' احسن نے بھاؤ تاؤ شروع کر دیا۔

''ظاہر ہے...... اصل لیدر کا صوفہ تو اتنا سستا نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ اصل لیدر کا صوفہ لیں تو کم از کم ڈیڑھ لاکھ کا ہو گا۔'' دکاندار نے صفائی سے اصل حقیقت بیان کر دی...... میرا دل بجھ گیا اور دل کی کیفیت چہرے سے آشکار ہونے لگی۔

''اب کیا ہوا ہے؟'' احسن نے میری صورت دیکھی۔

''یہ اصل لیدر تو نہیں ہے ناں......'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''تم نے اصل لیدر کا اچار ڈالنا ہے کیا......؟ ہمارے گھر میں جو مہمان آتے ہیں ان میں کسی کو بھی اصل لیدر کی پہچان نہیں ہے...... جیسا ہمارا فلیٹ ہے اس کے لحاظ سے یہ صوفہ بہترین ہے۔'' احسن نے سرگوشی میں یہ جملے کہہ کر اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''ہاں ٹھیک ہے، دیکھنے میں تو ویسا ہی لگ رہا ہے۔'' میں نے بھی اوکے کر دیا کہ اب میرے پاس اسے قبول کرنے کے سوا کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔ کیونکہ گزشتہ تقریباً ایک ماہ سے بازاروں میں پھر، پھر کر میں ادھ موئی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

اور اب اتنی محنتوں اور مشقتوں سے حاصل کیے ہوئے صوفوں کا یہ حشر دیکھ کر میرا کلیجا منہ کو آنے لگا تھا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ یہ کس کی کارستانی ہے۔ کیونکہ چند دن پہلے ہی ملازمہ نے مجھ سے بڑے لجاجت بھرے لہجے میں درخواست کی تھی کہ'' باجی میری چھوٹی بچی بیمار ہے، میں کام پر آجاتی ہوں تو وہ گھر میں روتی رہتی ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں اسے لے آیا کروں...... وہ بہت نیک بچی ہے میرے ساتھ، ساتھ رہے گی۔'' اس کے منت بھرے انداز پر مجھے بھی رحم آ گیا۔ ویسے بھی رمضان کا مہینہ تھا نیکی کا جذبہ دودھ کے ابال کی طرح نفس کی آخری حدوں تک پہنچا ہوا تھا۔ میں نے بھی اسی جذبے سے سرشار ہو کر اجازت دے دی۔ یہ ملازمہ بہت محنتی اور ایماندار تھی۔ ویسے تو مجھے ملازمہ کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی میرے ساتھ میرا اردلی تھا۔ احسن کو بھی اردلی مل سکتا تھا لیکن ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہم صرف ایک اردلی رکھیں گے اور ایک اردلی کی تنخواہ لے لیا کریں گے۔ میرا اردلی رحمت میرے ساتھ کافی عرصے سے تھا اور میں نے اسے گھر کے سارے کاموں میں طاق کر دیا تھا۔ لیکن جب ہماری پوسٹنگ کراچی ہوئی اور میری ساس نے میرے ساتھ رہنا شروع کیا تو انہیں سب سے پہلے یہ اعتراض ہوا کہ ایک غیر مرد ہر وقت گھر میں کیوں دندناتا پھرتا ہے جبکہ گھر میں جوان لڑکی بھی ہے۔ احسن بھی اپنی ماں کے ہم نوا تھے۔ اسی لیے مجھے اس ملازمہ کو رکھنا پڑا اب باہر کے سارے کام رحمت کرتا تھا اور گھر کے اندر کے سارے کام...... تسنیم کرتی تھی۔ پہلے تسنیم اپنی بڑی بیٹی کو لایا کرتی تھی...... وہ ایک لمحے کے لیے بھی نچلی نہیں بیٹھتی سارے گھر میں گھومتی پھرتی رہتی۔ اور اسے چیزیں اٹھانے کی بھی عادت تھی۔ اس کے آنے کے بعد سے میرے میک اپ کی کئی قیمتی چیزیں گم ہو گئی تھیں۔ جب میں تسنیم سے کہتی تو وہ خدا رسول کی قسمیں کھانے لگتی۔

''نہیں باجی، میری بچی ایسی حرکت نہیں کر سکتی۔ اللہ معاف کرے نہ مجھ میں یہ عادت ہے اور نہ میرے بچوں میں۔ ہم بھوکے سو جائیں گے لیکن چوری نہیں کریں گے۔'' وہ اس طرح کی باتیں کرتی کہ میں سخت شرمندہ ہو جاتی کہ میں نے نیک اور پرہیزگار خاتون کی بیٹی پر چوری کا شبہ ظاہر کیا لیکن جب میری ڈریسنگ ٹیبل سے دو ہزار کا بیر

(base) اور کئی ہزار کے پرفیوم غائب ہوگئے تو میں نے تسنیم سے صاف، صاف کہہ دیا کہ وہ بچی کو ساتھ نہ لائے۔ تسنیم کو اس لیے جواب نہیں دیا کہ وہ جب سے ہمارے گھر کام کررہی تھی کوئی چیز غائب نہیں ہوئی تھی۔ دوسرے وہ اماں کی چہیتی بھی بہت تھی۔ اماں کے سارے کام وہی کرتی تھی۔ اس کو نوکری سے ہٹانا اپنے لیے ایک اور مصیبت مول لینا تھا۔ ایک تجربے کے بعد میں دوسرا تجربہ نہیں کرنا چاہ رہی تھی لیکن پھر وہی مجبوری اور نیکی کے جذبے کا ابال...... میں نے دوسری بچی کو دیکھا ہوا تھا...... وہ بہ مشکل تین سال کی ہوگی۔ میں نے سوچا تین سال کی بچی بھلا کیا چرائے گی...... ؟ اسی لیے میں نے اجازت دے دی۔ دو دن تک تو وہ بچی خاصی ڈری سہمی رہی، تیسرے دن میں اسپتال سے آئی تو دیکھا موصوفہ میری جائے نماز سے تسبیح نکالے اس کے دانے بکھیر رہی ہیں۔ میں نے خود کچھ کہنے کے بجائے ان کی اماں کو بلا کر ان کی لختِ جگر کا کارنامہ دیکھایا انہوں نے میرے سامنے ہی بچی کو ایک تھپڑ لگایا اور مجھے شرمندہ کردیا۔

''باجی کیا کروں، یہ میری بات ہی نہیں سنتی۔''
اس کے اس بیچارگی کے جملے پر میں خون کے گھونٹ پی کررہ گئی۔

دوسرے دن گھر میں داخل ہوئی تو دیکھا وہ ڈریسنگ ٹیبل سے ٹالکم پاؤڈر اٹھائے اپنے آپ کو بھی نہلا رہی ہیں اور ریڈ کارپٹ پر بھی تھوپ رہی ہیں۔ مجھے پھر بے رحم ظالم بیگم صاحبہ بننا پڑا۔ تسنیم کو آواز دی وہ بظاہر لرزتی، کانپتی تشریف لائی مارے صدمے کے میری زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا میں نے روہانسی ہوکر بچی اور کارپٹ کی طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے پھر پرانی پالیسی اختیار کی اور اس دفعہ بچی کے دو تھپڑ لگا دیے۔ بچی نے منہ پھاڑ، پھاڑ کر چلّانا شروع کردیا اور میری ساس کا جذبۂ ترحم اپنے عروج پر جا پہنچا۔ وہ بھی خوفِ خدا سے لرزتی کانپتی کمرے میں داخل ہوگئیں۔

''استغفراللہ ...... استغفراللہ...... تمہیں رحم نہیں آتا...... اتنی معصوم بچی پر ہاتھ اٹھاتی ہو...... خدا کے غضب سے ڈرو، یہ بہت بڑا ظلم ہے، بچوں کو مارنے والا بھی ظالم اور مارنے کی ترغیب دینے والا بھی ظالم......'' میں سمجھ گئی تھی، اس وقت سب سے بڑی ظالم میں تھی۔ اور آج جب اس صوفے کو آئے ہوئے صرف ایک ہفتہ ہوا تھا تو اس پر اس قدر بے دردی سے لکیریں اور دائرے بنائے گئے تھے کہ میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ مجھے یاد آیا جس دن یہ صوفہ ہمارے گھر آیا تھا۔ ہمارے گھر میں جشن کا سماں تھا۔ بڑے بیٹے کو اس کے آنے کی اتنی خوشی نہیں تھی جتنی میرے ساتھ بازاروں میں پھرنے کی اذیت سے بچنے کی خوشی تھی۔ بیٹی بھی اس لیے خوش تھی کہ اب اماں گھر میں رہیں گی اور اسے افطاری کے لیے جو ایک آدھ چیز بنانی پڑتی تھی اس سے بھی وہ بچ جائے گی۔ اور احسن اس لیے خوش تھے کہ انہیں ہر وقت اس ذکر کے سننے سے نجات مل گئی تھی۔ رہ گئیں ساس تو وہ اب اپنی تمام خواہشیں پوری کرکے اللہ والی بننے کی کوششوں میں مصروف تھیں۔ ہم جیسے گناہ گاروں کا ہر فعل ان کے نزدیک صرف اس دنیا کا خسارہ تھا۔

''میں کہاں جاؤں......؟ کس سے کہوں اور...... کیا کہوں......؟'' آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوچکی تھیں ایسی رقت تو آج تک کبھی نماز میں طاری نہیں ہوئی جیسی اس وقت طاری ہوئی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ ابھی اور اسی وقت تسنیم کو بلاؤں اور اس کے سامنے اس کی بچی کو دل بھر کر ماروں اور اس کو فوراً نوکری سے نکال دوں...... پر رات ہی تو لیلۃ القدر تھی اور ساری رات میں نے توبہ اور استغفار کرتے ہوئے گزاری تھی اور عہد کیا تھا کہ اب

میں بہت نیک اور پرہیزگار بننے کی کوشش کروں گی۔ درگزر کو اپنی عادت بنالوں گی، لوگوں کو ان کی غلطیوں پر معاف کردیا کروں گی۔ لوگوں کے دل دکھانے والی باتوں اور رویوں پر صبر کروں گی اور یہ عہد کرکے صبح اسپتال گئی تھی۔ سب سے پہلے نرم اور شفیق لہجے میں گفتگو کرتی رہی۔ جمعداروں، ٹیکنشنوں، آیاؤں، نرسوں کی غلطیوں کو درگزر کرتی رہی۔ کسی کو لیٹ آنے پر بے عزت نہیں کیا...... بلکہ مسکرا کر خوش آمدید کہا کسی کی چھٹی نہیں روکی۔ کسی نے ایک ہفتے کی چھٹی اپلائی کی اسے دو ہفتوں کی چھٹی دے دی۔ کسی نے پچاس روپے مانگے اسے سو دے دیے...... نیکی اور درگزر کے جذبے سے پور، پور ڈوبی ہوئی گھر میں داخل ہوئی تو ایسا سخت امتحان میرا منتظر تھا کہ جس میں درگزر اور صبر کرنا گویا کسی پہاڑ کی چوٹی کو پیر کی ٹوٹی ہوئی ہڈی کے ساتھ سر کرنا تھا اور میں اس پہاڑ کو سر کرنے کے لیے سارا دن قرآن پاک پڑھتی رہی۔ فیس بک پر بڑے بزرگوں کے اقوال پڑھ کر دُہراتی رہی۔ اگلے دن اسپتال سے جلدی آگئی تھی کیونکہ شام کو پڑوسیوں کے گھر افطاری بھی بھجوانی تھی۔

''تسنیم......'' میرے اندر جتنی صبر کی طاقت بھی میں نے اسے جمع کرکیا سے آواز دی۔

''کیا ہوا باجی......؟'' وہ حسبِ معمول لرزتی ہوئی میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔ میں اسے لے کر ڈرائنگ روم میں آگئی اور صوفوں کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ کیا ہے......؟''

''باجی کیا کروں...... میں باورچی خانے میں اماں کے لیے روٹیاں پکا رہی تھی...... اس نے نہ جانے کہاں سے یہ قلم ڈھونڈ لیا اور لکیریں بنادیں۔'' اس کے چہرے پر کسی قسم کے شرمندگی کے آثار نہیں تھے۔

''پھر......'' غصے کی شدت سے الفاظ میرے حلق میں پھنس گئے۔

''باجی آپ ناراض نہیں ہو...... میں نے بڑی کوشش کی لیکن یہ صاف نہیں ہوئے...... وہ بہت شریر ہوگئی ہے اسی لیے میں اسے آج لے کر نہیں آئی۔'' انہوں نے مجھ پر دوسرا احسان کیا۔

''پھر...... اب...... کیا ہوگا......'' غصہ میری انتہا کو پہنچنے لگا۔

''باجی اس دفعہ معاف کردیں۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا......'' اس نے سو دفعہ کا دُہرایا ہوا جملہ پھر سے دُہرایا۔

''ظاہر ہے اور کر بھی کیا سکتی ہوں...... نہ تمہیں مار سکتی ہوں اور نہ تمہاری بچی کو...... تمہیں احساس ہے......؟ تم نے میرا کتنا بڑا نقصان کیا ہے، یہ میرے نئے صوفے ہیں جن کا تمہاری بچی نے یہ حشر کردیا۔ تمہاری بچی کو میں نے اس لیے گھر میں آنے کی اجازت دی تھی کہ وہ میرے گھر کی چیزوں کو برباد کردے......'' میں نے بہت ضبط کرکے بھی اسے اتنی باتیں سنادیں...... وہ خاموشی سے سر جھکائے میری باتیں سنتی رہی۔

''اب یہاں کیا کھڑی ہو...... میرے سامنے سے فوراً چلی جاؤ......'' مجھے ڈر لگا کہ کہیں میری زبان سے کچھ اور کڑوے اور کسیلے جملے نہ نکل جائیں۔ میں اسے باتیں سنا کر اپنے کمرے میں آگئی۔ میرا غصہ کسی طرح کم نہیں ہو رہا تھا۔ ابھی تو احسن نے یہ سب کچھ نہیں دیکھا تھا وہ دیکھ لیتے تو ایک لمحے میں اسے نوکری سے فارغ کردیتے جبکہ میں تو اسے ڈانٹ کر بھی شرمندہ تھی۔ میں نے اسے اس حد تک معاف کردیا کہ اسے نوکری سے فارغ نہیں کیا...... بلکہ عید کے لیے جو اس کو جوڑا دیتی تھی وہ بھی دیا۔ اس کے بچوں کو عیدی بھی دی...... لیکن عید سے دو دن پہلے وہ غائب ہوگئی۔ دو دن بعد عید تھی۔ ان دنوں کسی ملازمہ کا ملنا پہاڑ سے جوئے شیر نکالنے سے زیادہ مشکل تھا۔ پھر عید کے دن دوپہر میں میری ساس، نندیں، نندوئی اور ان کے بچے، جیٹھ، جیٹھانی

دیور، دیورانی ان کے بچے کھانے پر مدعو تھے۔ اردلی بھی چھٹی پر چلا گیا تھا۔ اب گھر میں، میں تھی اور میری بیٹی۔ چاند رات میں پوری رات جاگتی رہی روسٹ چکن، دم کے کباب، بریانی کا مسالا، شاہی ٹکڑے میں نے رات کو بنائے، صبح تو ویسے ہی کاموں کا اتنا انبار ہوتا تھا کہ چیزوں کو فائنل ٹچ دیتے دیتے ہی دوپہر ہو جاتی۔ بہر حال سب کے آنے سے پہلے میں نے سارا کھانا تیار کر لیا تھا...... سب آئے اور سب نے دل بھر کر کھایا۔ خوب تعریفیں کیں اور کھانا کھاتے ہی سب روانہ ہو گئے۔ اور میں کچن میں برتنوں کے ڈھیر کے ساتھ تنہا رہ گئی۔ پوری شام برتن دھوتے گزر گئی۔ درمیان میں مہمانوں کی آمدو رفت بھی جاری رہی۔ رات جب بستر پر لیٹی تو جسم پکتے ہوئے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔

☆☆☆

عید کے تیسرے دن تسنیم اپنی بچی کو لیے ہوئے آئی۔ اسے دیکھ کر میرا بلڈ پریشر ہائی ہونے لگا۔

''عید پر کیوں نہیں آئیں......'' میں نے حتی الامکان لہجے کو نرم کرتے ہوئے کہا۔

''باجی مجھے ایک اور جگہ کام مل گیا ہے۔ آپ تو مجھے پانچ ہزار دیتی تھیں۔ وہ مجھے دس ہزار دے رہی ہیں اور کام بھی کوئی خاص نہیں ہے بس صبح سے چار بجے تک ان کے بچے کو سنبھالنا ہے۔'' وہ مجھے جلا رہی تھی یا مجھے ایسا لگ رہا تھا۔

''باجی میں تو آپ کو خدا حافظ کہنے آئی تھی۔'' وہ پھر گویا ہوئی۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں جانتی تھی وہ کیوں آئی ہے۔ اسے اس مہینے کی تنخواہ لینی تھی۔

''تمہیں جانا تھا تو کم از کم ایک ہفتے پہلے تو مجھے بتا دیتیں...... تمہیں معلوم نہیں کہ عید پر گھر میں کتنا کام ہوتا ہے......'' میرا لہجہ تلخ ہونے لگا۔

''باجی جس دن آپ نے میری بچی کی ایک چھوٹی سی غلطی پر مجھے ڈانٹا تھا میں نے اسی دن سوچ لیا تھا کہ میں اس گھر میں کام نہیں کروں گی۔ باجی ہم عزت دار لوگ ہیں، ہم نے محنت بیچی ہے عزت نہیں بیچی...... آپ نے معصوم بچی کی غلطی پر مجھے کتنا بے عزت کیا تھا۔ آخر بچے تو شرارت کرتے ہی ہیں......'' اس کی باتیں سن کر میرا سر گھوم رہا تھا۔ میں شکر کر رہی تھی کہ میرے پاس کلاشنکوف جیسا کوئی ہتھیار نہیں تھا ورنہ اس وقت میں ساری گولیاں اس کے بھیجے میں اتار دیتی۔

''باجی اس عید پر خرچہ بہت ہو گیا...... آپ نے ابھی تک تنخواہ بھی نہیں دی عیدی بھی اتنی کم دی کہ مجھے کسی کو بتاتے بھی شرم آ رہی تھی۔ نئی بیگم صاحبہ نے تو مجھے بھی جوڑا بنا کر دیا اور میرے سارے بچوں کو بھی اور عیدی بھی آپ سے زیادہ دی ہے۔'' اس نے شاید میرا صبر آزمانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ میرا دل چاہا کہ میں اس کے ٹوٹے، ٹوٹے کر کے چیل، کوؤں کو کھلا دوں...... میرے اندر غم و غصے کا طوفان اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ میں نے ایک نظر اس کے مسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھا اور خاموشی سے اٹھی، الماری کی طرف گئی اس کی تنخواہ کے پیسے نکالے اور پوری تنخواہ اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ اس نے پیسے گنے اور منہ بنا کر بولی۔

''باجی آپ نے میرے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے، میں نے اتنی خدمت کی اور آپ نے جاتے وقت مجھے انعام بھی نہیں دیا۔ باجی آپ کو میرے جیسی ایماندار اور اتنے کم پیسوں میں اتنا کام کرنے والی عورت نہیں مل سکتی۔''

وہ اور بھی نہ جانے کیا، کیا کہہ رہی تھی اور میں لبوں پر خاموشی کا قفل لگائے سوچ رہی تھی۔

''کیا اب بھی میرا شمار صبر کرنے والوں میں نہیں ہوگا۔''

وہ دلہن بنی بیٹھی تھی اور اس پر رج کر روپ آیا تھا...... خاندان بھر کی عورتیں صدقے واری جاتی رہیں۔ لڑکیاں، بالیاں اس کی قسمت پر رشک کر رہی تھیں۔

''ہائے رخشی کیسی قسمت والی ہے...... اتنا سوہنا دولہا ہے کہ بس......'' اور اس بس پر اس کی بس ہونے لگی۔

''بڑے نصیبوں والی ہے بھئی......'' اور اس کا دل دہاڑیں مار مار کر رونے لگا کیسے نصیب......؟ اور

یہ تیری آہ ہے

میمونہ صدف



پھر اماں کو زخمی نظروں سے دیکھنے لگی...... کیا خبر عین وقت پر انہیں اس کی بھولی صورت پر رحم آجائے اور وہ منع کردیں...... مگر اماں اس کی نظروں، آنسوؤں کو شروع دن سے اب تک نظر انداز ہی کرتی آئی تھیں۔

''ہائے اماں، کیوں کیا میرے ساتھ ایسا؟ اب بھی وقت ہے روک لیں مجھے۔'' دل دہائیاں دینے لگا۔

اور اماں تھیں کہ بنی ٹھنی خوش باش سی مہمانوں کے درمیان اندر باہر ہوتی رہیں۔

وقتِ نکاح جب ایجاب وقبول کا مرحلہ آیا تو بھی وہ کن انکھیوں سے اماں کو دیکھتی رہی۔ کیا خبر اماں آخری مرحلے پر منع کردیں...... مگر وہ تھیں کہ مطمئن سی کھڑی اس کے جواب کی منتظر تھیں۔

نکاح نامے پر دستخط کے ساتھ ہی مبارک باد کا شور اٹھا...... مامیاں، چاچیاں، خالائیں، پھوپیاں...... سبھی بڑی بوڑھیاں اور لڑکیاں بالیاں لپک، لپک کر اسے گلے لگاتیں اور چوم کر آگے بڑھ جاتیں۔

''آہ اماں کس جنم کا بدلہ لیا ہے مجھ سے...... ڈائن بھی یہ نہ کرتی ہوگی جو آپ نے اپنی اولاد کے ساتھ کیا۔'' وہ چپکے، چپکے آنسو بہاتی رہی۔ رخصت ہو کر جب سسرال کی دہلیز پار کی تو گھونگٹ تلے ہی چور نگاہوں سے اِدھر اُدھر کا جائزہ لینے لگی...... گھر یا ماحول دیکھنا مقصود نہ تھا وہ تو اسے دیکھنے کی خواہشمند تھی۔

''کہاں ہے وہ؟'' نظروں ہی نظروں میں پورا گھر چھان ڈالا مگر بے سود...... اسے نہ ملنا تھا سو نہ ملی۔

☆☆☆

رخشندہ جبیں اپنے چار بھائیوں میں سب سے چھوٹی اور اکلوتی تھی۔ بھائیوں نے ہمیشہ سے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا...... البتہ اماں ہمیشہ کھینچ کر رکھتی تھیں۔ تربیت کے معاملے میں اماں کسی قسم کے سمجھوتے کی قائل نہیں تھیں...... اور وہ بھی تو لڑکی ذات...... مگر بھائیوں کی شہ پر وہ اکثر فائدہ اٹھا لیتی۔

''مت بگاڑ دے...... اگلے گھر جا کر یہی حرکات رہیں تو آٹھ، آٹھ آنسو روئے گی۔'' اماں لتاڑتیں۔

''آٹھ، آٹھ آنسو کیسے اماں...... کوئی اسے ایک آنسو بھی رُلا نہیں سکتا۔'' رخشی سے بڑا رضوان بڑے مان سے کہتا تو اماں سر پکڑ کر رہ جاتیں۔

''سدھر جا رخشی...... بچی نہیں رہی تو......''

''ارے اماں بچی ہی ہے ناں......'' بھائی کی شہ پر رخشی اٹھلاتی ہوئی یہ جا وہ جا...... اماں بھائیوں کو آنکھیں دکھاتی رہ جاتیں مگر وہاں کسی کو پروا نہیں تھی۔ اماں صرف سر ہی پیٹ سکتی تھیں، وہ بھی اپنا...... رخشی کا نہیں...... بہتیرے رشتے آئے مگر کوئی بھی انہیں اپنی بہن کے شایانِ شان نہ لگتا...... وہ ہر دوسرے رشتے میں، مین میخ نکالتے۔

''شہزادہ نہیں آئے گا اسے بیاہنے۔'' اماں کھول کر رہ جاتیں۔

''شہزادی ہے ہماری بہن...... سو شہزادہ ہی ڈھونڈیں گے۔'' بڑے مان سے جواب آتا اور رخشی بیگم ہواؤں میں اڑنے لگتیں۔ دماغ تھا کہ ساتویں آسمان سے اترنے کا نام ہی نہ لیتا تھا اور پھر انہی ڈھیر سارے رشتوں میں عزیز کمال کا رشتہ آیا۔ اچھا خوبرو نوجوان، پڑھا لکھا، پکی نوکری، اچھی تنخواہ اور سب سے بڑھ کر اکلوتا بیٹا...... ساری جائداد کا تنہا مالک، ہاں ایک بہن تھی چھوٹی جس کی کبھی نہ کبھی تو شادی ہو ہی جانا تھی...... اسے ہر لحاظ سے موزوں لگا۔ اماں الگ خوش تھیں اور بھائی سب کے سب مطمئن سو وہ بھی سمجھ بیٹھی کہ بھائیوں نے سچ مچ شہزادہ ہی چنا ہے۔

''بڑے شریف لوگ ہیں۔'' بڑا بھائی عدنان تو یہی کہتا پھرتا تھا اور سب تائیداً سر ہلاتے۔

''لڑکا ہر لحاظ سے بہترین ہے۔'' چھوٹا عثمان بھی خوش تھا۔ سو باقی سب بھی خوش......

اور جب سب خوش تھے تو وہ کیوں نہ ہوتی...... اتنا اچھا رشتہ تو نصیبوں والیوں کو ملتا ہے۔ سو وہ خود کو نصیب والی گرداننے لگی۔

''اماں اس کی بہن ابھی تک کیوں نہیں آئی......؟ ایک بھائی ہے اس کا...... اسے کوئی ارمان نہیں ہے بھابی کا۔'' ایک روز یونہی برسبیل تذکرہ اس کے منہ سے نکل گیا...... اماں تھوڑا چونکیں پھر سرسری سا جواب دے ڈالا۔

''ہاں، نہیں آئی تو نہیں آئی...... اس میں بھلا کیا حرج ہے؟ اور اپنے، اپنے خاندان کے طور طریقے ہوتے ہیں...... کنواری لڑکیوں کا یوں شادی بیاہ کے معاملات میں بولنا یا دخل دینا پسند نہیں کیا جاتا۔''

''پھر بھی اماں......''

اماں آگے سے خاموش رہتیں تو وہ بھی منہ پھلا کر خاموش ہو جاتی پھر عزیز کمال کی اماں کتنی بار ہی آئی گئیں...... اماں اور بھائیوں کا بھی آنا جانا ہوا...... شادی کی تیاریاں بھی شروع ہو گئیں مگر وہ (بہن) نہ تو کبھی آئی اور نہ ہی اس کا تذکرہ ہوا۔

''کیسی ہے وہ اماں؟ پیاری سی ہے یا یوں ہی...... کس جماعت میں پڑھتی ہے...... دیکھنے میں کیسی ہے؟'' وہ ان گنت سوالات کرتی اور اماں کسی ایک کا بھی جواب نہ دیتیں۔ الٹا ڈپٹ دیتیں۔

''تجھے اس سے کیا لینا دینا...... اپنے کام سے کام رکھ۔''

''ارے، مجھے کیوں لینا دینا نہیں...... وہ میری ہونے والی اکلوتی نند ہے آخر۔'' وہ کچھ، کچھ منہ بناتی اور کچھ، کچھ اٹھلاتی۔

اور اماں منہ کھولے اسے تکنے لگتیں۔

''حیا کر کچھ...... یوں منہ پھاڑ کر کیا ہونے والی سسرال کا ذکر کرتے ہیں؟''

''تو کیا منہ بند کر کے مالا جپتی رہوں سسرال کی۔'' اور وہ برے، برے منہ بناتی بھائی کے سر ہوئی۔

اس نے کہا تھا

کسی دن تم سے ملنے پر
کہا تھا نظم لکھوں گا
تمہارے نرم بالوں پر
تمہارے شوخ گالوں پر
تمہاری مست آنکھوں پر
تمہاری مسکراہٹ پر
ترے قدموں کی آہٹ پر
تیرے ہونٹوں کی نرمی پر
تیری سانسوں کی گرمی پر
تیرے ہاتھوں کے کنگن پر
تیری پائل کی چھن، چھن پر
تیرے رکنے پہ، چلنے پر
کسی دن تجھ سے ملنے پر
کہا تھا نظم لکھوں گا
تو اب وہ جب بھی ملتی ہے
یہی کہتی ہے مجھ سے
وہ میری نظم لائے ہو
یا پھر سے بھول آئے ہو
مجھے تب یاد آتا ہے
مجھے اِک نظم لکھنی ہے
اسی کی خوش بیانی پر
اسی کی مست جوانی پر
مجھے اِک نظم لکھنی تھی
مجھے اِک نظم لکھنی تھی
مگر اے ہم نشیں میرے
لکھوں کیا میں بتا دے یہ
کہ تیرے ہاتھ میں تو اب
یہ کس وعدے کی مہندی ہے
تیرے ماتھے پہ اے ہم دم
یہ کس کے نام کی بندیا
چمکتی ہے دمکتی ہے

کاوش: مہوش جواد، چوک اعظم، لیہ

''کیسی ہے میری نند......؟ دیکھنے میں کیسی ہے؟ دبلی پتلی خوب صورت سی ہے یا سوٹی، بھدی، بدصورت سی؟''

''انسان ہے اور کیسی ہوتا ہے؟'' بھائی بھی اماں کی طرح گول مول جواب دے کر چلتا بنا۔

''آخر کوئی مجھے میری نند کے متعلق بتاتا کیوں نہیں؟ میں ملنا چاہتی ہوں اس سے۔'' وہ دوسرے بھائی کے سر ہوئی۔ وہ اب اونچا، اونچا بول رہی تھی۔ سنانا اماں کو مقصود تھا۔

بھائی سب کے سب گونگے بنے اماں کو تکنے لگے اور اماں جیسے بہری بن کر مستقل اپنے کام میں مصروف رہتیں۔

''اماں اسے بتادیں۔'' چھوٹا رضوان دبے، دبے لفظوں میں بولا۔

''کیا بتانا ہے مجھے......؟ اماں کیا چھپا رہی ہیں مجھ سے؟ سچ، سچ بتادیں مجھے...... کہیں وہ کوڑھ کی مریض تو نہیں...... ٹی بی تو نہیں، کھانس، کھانس کر جراثیم پھیلانے والی...... خون تو نہیں تھوکتی؟'' اور اماں نے اشتعال میں آکر ہاتھ میں پکڑا تکیہ اسے دے مارا۔

''کوئی شرم حیا ہے یا نہیں...... زبان کیسی قینچی کی طرح چلتی ہے۔''

''قینچی کی طرح چلے یا چھری کی طرح مجھے سب سچ بتائیں۔'' وہ ٹلنے والوں میں سے نہ تھی اور اماں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیا بتائیں اور کیا چھپائیں۔ سو گلا کھنکھارتے ہوئے تمہید باندھی۔

''دیکھو رخشی اللہ کا خوف کھانا اس بچی کے معاملے میں...... بڑی بے ضرر سی ہے وہ۔ بس ذہن صحیح کام نہیں کرتا ہے۔''

''ہائے میں مرجاؤں...... پاگل ہے۔'' وہ اچھل پڑی اور منہ پیٹ لیا۔

''پاگل نہیں ہے وہ...... بس ذہنی کمزوری ہے۔'' اماں کا دل ہی دہل کر رہ گیا سو فوراً تصحیح کی۔

''پاگل ہی ہوئی اماں...... آپ نے مجھے پاگلوں کے گھرانے میں دے دیا۔ اُف میرے خدا...... اماں آپ میری سگی ماں ہی ہیں ناں......؟'' اور اماں دل تھامے اس کی موشگافیاں سنتی رہ گئیں۔ بھائی بھی سب خاموش تھے...... کبھی بات دل کو لگتی، کبھی دل سے اترتی۔

پھر روز، روز ہنگامہ ہونے لگا...... رخشی چاہتی تھی کہ رشتے سے انکار کردیا جائے مگر اماں ماننے کو تیار نہ تھیں اور بھائی بھی اماں کے ہم خیال بن چکے تھے اس بار......

''ہیرا لڑکا ہے...... راج کرے گی میری دھی رانی۔'' اماں پیار سے پچکارتیں اور وہ ہتھے سے اکھڑ جاتی۔

''ہیرے کے ساتھ جو پتھر ملیں گے ان سے سر ٹکرا، ٹکرا کر جب مرجاؤں گی تو ہی سکون ملے گا۔'' وہ بھاں، بھاں کر کے رونے لگ جاتی۔

مگر وہ اماں کو نہ منا سکی اور اب بیاہ کر عزیز کمال کے ہمراہ اس کے گھر چلی آئی تھی۔

☆☆☆

اگلے روز جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کے بیڈ کی پائنتی سے سر ٹکائے لال آنکھیں اور ملگجے حلیے میں وہ اسے دیکھ رہی تھی...... سوتی جاگتی سی رخشی کا خوف کے مارے برا حال تھا سو چیختی ہوئی باہر کی جانب بھاگی۔ اور چیخ، چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھالیا تھا۔

اماں اور دیگر عزیز بھی شور سن کر باہر نکل آئے۔

''وہ...... وہ پاگل میرے کمرے میں ہے، مجھے مارنے آئی ہے۔'' وہ ساس کے پیچھے چھپی ہراساں سی عزیز کو بتانے لگی۔ ثریا بیگم کے دل کو اس کی بات چھید گئی۔ مگر وہ سہہ گئیں۔

''رخشی وہ پاگل نہیں ہے۔'' عزیز کو برا لگا تھا سو صاف کہہ گیا۔

''میں کچھ نہیں جانتی، اسے میرے کمرے سے

باہر کریں اور مجھے ابھی کے ابھی اماں کے گھر چھوڑ کر آئیں...... میں اس گھر میں ایک پل کے لیے بھی نہیں ٹھہر سکتی۔'' وہی بچپنا، وہی ضد......

عزیز کے ماتھے کے بلوں میں اضافہ ہوا مگر اماں نے بات سنبھال لی۔

''ہاں بیٹا اسے آج اماں کے گھر چھوڑ آؤ...... دو دن وہیں رہ لے، ولیمے والے روز واپس لے آنا۔'' معاملہ فہم خاتون تھیں ثریا بیگم سو بیٹے کو طریقے سے سمجھایا اور ان کے کمرے میں جاکر بیٹی کو باہر نکال لائیں۔

''اماں...... بھابی ہے میری بھابی ہے......'' وہ رخشی کی جانب دیکھ کر اشارہ کرتی اماں کو سمجھانے لگی۔ رخشی اسے باہر نکلتا دیکھ کر عزیز کی اوٹ میں ہوگئی اور کندھے سے جھانک، جھانک کر اسے تکنے لگی۔

''بھابی ہے مگر منع کیا تھا ناں کہ بھابی کے کمرے میں نہیں جانا پھر کیوں گئی؟'' اماں بجھ، بجھ روٹھی سی ناصحانہ انداز میں مخاطب تھیں۔

''میری بھابی ہے۔'' وہ ایک ہی گردان لگائے ہوئے تھی۔ جیسے اماں کو سمجھانے کی کوشش کررہی ہو اور اماں اتنی سمجھدار ہو کر بھی ناسمجھ بن رہی تھیں۔ اماں اسے گھسیٹ کر اپنے کمرے میں لے گئیں۔ رخشی اس روز عزیز کے ہمراہ اپنی اماں کے گھر چلی آئی تھی اور گھر پہنچتے ہی ایک ہنگامہ برپا کردیا تھا۔ اس کی اماں سمجھا، سمجھا کر تھک گئیں مگر اس کے پلے کچھ نہ پڑا۔

ولیمے سے ایک روز قبل ہی ثریا بیگم اس سے ملنے آئی تھیں کمرا بند کیا اور اسے سمجھانے لگیں۔

''ہم نے بخت سے متعلق کچھ بھی تمہارے گھر والوں سے نہیں چھپایا بیٹا...... شادی بیاہ کے معاملات میں کچھ چھپانا بددیانتی ہے اور ہم بددیانت نہیں۔ اس کی حالت کی ذمے دار نہ وہ خود ہے اور نہ ہم...... اللہ کی طرف سے آزمائش ہے سو کاٹ رہے ہیں۔ وہ قطعاً بے ضرر ہے۔ کبھی کسی کو ذرہ برابر بھی نقصان نہیں دیا۔ اللہ کی خاطر اسے برداشت کرلو...... اللہ پاک اس کے بدلے تمہاری مشکلات دور فرمادے گا......'' وہ ملتجیانہ لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ ''اور جہاں تک گھر چھوڑ کر میکے بیٹھ جانے کا سوال ہے تو بیٹا اچھی بچیاں اپنا گھر اتنی معمولی سی باتوں پر تو کیا بڑی، بڑی باتوں پر نہیں چھوڑا کرتیں...... اس گھر کی اصل مالکن تم ہو...... عزیز کی نہیں تمہاری ماں بن کر سمجھا رہی ہوں...... ابھی تم نئی نویلی دلہن ہو سو میاں ناز برداریاں اٹھائے گا مگر وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ مرد کا دل ایسی حرکات سے اوبنے لگتا ہے سو بچی تمہیں خود سے ہی محتاط ہونا پڑے گا۔''

نہ جانے ان کی باتوں میں کیا جادو تھا کہ حرف بہ حرف دل پر ثبت ہوتا گیا اور وہ اس روز ثریا بیگم کے ہمراہ اپنے گھر جانے پر آمادہ ہوگئی۔

''پہلے تو مان کر نہ دے رہی تھیں تم؟'' اماں حیران تھیں۔

''بس تو اب مان گئی ناں...... آپ خوش ہوجائیں۔'' وہ اپنا سامان سمیٹ رہی تھی۔

''ایسا کیا کہا ہے ساس اماں نے؟'' وہ دل ہی دل میں خوش بھی تھیں کہ بیٹی اپنی رضامندی سے واپس گھر جارہی ہے۔

''بس کچھ کہہ دیا ایسا......'' وہ مطمئن سی تھی اور اسی لیے اماں بھی مطمئن تھیں۔

☆☆☆

ثریا بیگم کے ہاں عزیز کمال کی پیدائش کے آٹھ سال بعد بیٹی کی پیدائش ہوئی تھی جس کا نام خوش بخت رکھا گیا۔ اس کی پیدائش کے دو ماہ بعد ہی ثریا بیگم کے میاں کا انتقال ہوگیا اور تبھی سے خاندان بھر نے اسے بدبخت قرار دیا جو پیدا ہوتے ہی باپ کو

نگل گئی۔

''ہے ہی منحوس...... میرے بھائی کو کھا گئی۔''

پھپھو منہ بھر، بھر کر اسے کوسنے دے رہی تھیں...... اس بچی کو جو ابھی ٹھیک سے ماں کو نہ پہچانتی تھی جو دودھ کے علاوہ کچھ کھاتی پیتی نہیں تھی۔ وہ سالم باپ کو کھا گئی۔

''ایسے تو مت کہیں آپا......'' ثریا نے تڑپ کر بیٹی کو سینے سے لگالیا۔

''ارے پوت کے پاؤں پالنے میں دکھ جاتے ہیں...... منحوس ماری ہے یہ...... ساری زندگی نگلتی رہے گی اوروں کی خوشیاں......''

ثریا بیگم بیوگی کا دکھ بھول کر اپنی بچی کے دکھ میں گھلنے لگیں جو خاندان بھر میں منحوس اور نابکار ٹھہرائی جاچکی تھی۔

پھر اس خوش بخت کو سوا تین سال کی عمر میں جا کر ایسا بخار چڑھا کہ دماغی کمزوری کا سبب بن گیا...... بہتیرا علاج کرایا مگر افاقہ نہیں ہوا...... جسمانی نشوونما ہوتی رہی مگر ذہنی نشوونما رک گئی۔ سولہ سال کی لڑکی ہو کر بھی وہ چھ سال کی بچی ہی رہی۔

جہاں ثریا بیگم بٹھا جاتیں وہیں بیٹھی رہتی...... منہ سے بچوں کی طرح آوازیں نکالتی، تالیاں مار، مار کر ہنستی اور قہقہوں پہ قہقہے لگاتی جاتی۔ اور ثریا بیگم اسے دیکھ، دیکھ کر روتی جاتیں جو اپنے حال سے بے حال تھی۔

سب آتے جاتے یہی کہتے رہتے کہ کیا فائدہ ہے اس کی زندگی کا...... بے فائدہ نہ ہوتو اور وہ خوش بخت سے تو بد بخت بنی اور پھر بے فیدی...... وقت کے ساتھ، ساتھ لوگ بھول ہی گئے کہ اس کا نام خوش بخت رکھا گیا تھا یا وہ تھا تو صرف بے فیدی......

ثریا بیگم سوچ، سوچ کر تھک جاتیں کہ کیا... بے فائدہ اولاد عطا کر دی ہے اور پھر اللہ سے شکوہ کرنے لگتیں کہ کیسی آزمائش میں مبتلا کر دیا مجھ بیوہ کو۔

ایک روز اسے اٹھا کر سامنے کھیتوں کی جانب لے گئیں جہاں ایک زہریلی بوٹی جمی ہوئی تھی...... اسے کھلا کر آزمائش سے نجات چاہتی تھیں مگر وہاں پہنچ کر دیکھا تو بوٹی سرے سے غائب تھی۔ حالانکہ کل ہی وہ جب بکری باندھنے آئی تھیں تو اس طرف سے گزرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اسے دیکھتے ہی انہیں یہ خیال آیا تھا۔

''کم بخت کو موت بھی قبول کرنے سے انکاری ہے۔'' گود میں اٹھائی، رال ٹپکاتی بچی کو لے کر گھر واپس لوٹ آئیں۔ شام کو بکری کو کھولنے کھیتوں کی طرف گئیں تو بوٹی وہیں موجود تھی۔ دل کانپ گیا......

''مولا یہ کیا ماجرا تھا؟'' نظر اٹھا کر آسمان کو تکا۔

''مولا تیرے رنگ...... تو اس کی زندگی چاہتا ہے، اس بے فیدی کی...... پھر میں کون ہوتی ہوں اس کی موت کی خواہش کرنے والی۔'' اس دن سے وہ خوش بخت کا بہت خیال رکھنے لگیں۔

جب وہ پورے گیارہ برس کی ہوئی تو کسی طاق رات میں صحن میں جا کر کھڑی ہوگئی...... اماں اور بھائی عبادت میں مشغول اور وہ اکیلی نہ جانے کون سے اسرار جاننے صحن کے بیچوں بیچ جا کھڑی ہوئی...... صحن چیخوں سے گونج اٹھا اور وہ غش کھا کر وہیں گر پڑی۔ اس روز کے بعد سے اسے ایسی چپ لگی کہ اماں بلا، بلا کر تھک جاتیں مگر وہ نہ اب قہقہے لگاتی، نہ تالیاں بجاتی...... بس یک ٹک آسمان کو تکا کرتی...... یا آنکھیں موندے بیٹھی رہتی اور نہ جانے زیرِلب کیا، کیا پڑھتی رہتی۔

کہنے والے کہتے کہ اس نے شبِ قدر پائی ہے، اللہ کے بہت سے رازوں کو پایا ہے تبھی ایسی حالت ہوگئی۔

پھر عورتیں اس کے پاس آکر بیٹھتیں اور مدعا بیان کرتی جاتیں...... دعائیں کروانے آتیں...... کسی کے گھر والے کی نوکری نہیں تھی تو کسی کی اولاد

نہیں تھی...... کسی کے بچوں کے رشتے کا مسئلہ تو کسی کو محبت کا......

وہ سنتی رہتی اور خاموش رہتی، عورتیں ہاتھ جوڑ، جوڑ کر تھک جاتیں کہ کوئی دعا دے ڈال اور لوٹ جاتیں، کبھی جو موج میں ہوتی دھڑا دھڑ دعائیں دیے جاتی اور قبول کرنے والے نے بھی جیسے عہد کر رکھا تھا... اس سے کہ جو مانگے گی ملے گا...... اور مانگنے والی نے مجال ہے جو خود کے لیے کبھی نمک کا ذرہ بھی مانگا ہو...... اس کی خود کی کوئی چاہت نہ تھی...... وہ تو بس دوسروں کی چاہتیں پوری کرنے کو ہاتھ اٹھاتی تھی...... مستجاب الدعوات میں چنا گیا تھا اسے۔

پھر عورتیں...... عقیدت سے ہاتھ چومنے کی کوشش کرتیں...... وہ انہیں پیچھے ہٹا دیتی...... اسے یہ حرکت پسند نہیں آتی تھی۔

''میرے میاں کی نوکری لگ گئی تیری دعا سے خوش بخت......''

''بخت والی دھی ہے تیری ثریا...... اس کے ہاتھ اٹھانے کی دیر تھی جیسے میری بچی کے نصیب کھل گئے۔ بڑی اچھی جگہ بات پکی ہوئی ہے۔''

اور وہ بے فیدی سے خوش بخت بن گئی تھی۔ ثریا بیگم اسے دیکھتی رہ جاتیں کہ وہ جو بے فیدی تھی اللہ اس کی دعاؤں سے کیسے لوگوں کو فیضیاب کر رہا تھا...... بندہ، بندہ گواہ تھا کہ کبھی اس نے کسی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی نہ تنگ کیا۔

☆☆☆

رخشی سارا دن گھر کے کام کاج میں جتی رہتی اور کن انکھیوں سے اسے آتے جاتے دیکھتی جو صحن کی دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندے کچھ بڑبڑاتی رہتی یا پھر زمین پر آڑھی ترچھی نادیدہ لکیریں کھینچتی رہتی۔ اور نظر اٹھا کر بھی اِدھر اُدھر نہ دیکھتی۔ آہستہ، آہستہ رخشی کا خوف جاتا رہا۔

اس دن کے بعد سے نہ وہ اس کے کمرے کی طرف گئی تھی اور نہ اسے مخاطب کیا... بس کبھی کبھار اسے گھورتی اور پھر سر جھٹک دیتی...... یقیناً ثریا بیگم نے بہت طریقے سے سمجھایا تھا اور وہ طریقے سے سمجھ بھی گئی تھی...... نہ اس نے کبھی رخشی کو کسی قسم کی شکایت کا موقع دیا اور نہ ہی رخشی کو کبھی اس سے شکایت ہوئی۔

''بے فیدی اب کبھی اس طرف نہیں آئی اور نہ اس نے مجھے کبھی بلایا ہے۔'' اس روز رات میں وہ یونہی باتوں، باتوں میں عزیز سے کہہ بیٹھی۔ کافی دنوں سے دل میں دبا کر بیٹھی تھی اب اظہار کر ہی ڈالا۔

''جانور بھی محبت کی زبان سمجھتا ہے، وہ تو پھر انسان ہے۔'' اس کا لہجہ نرم تھا سو وہ ہضم کر گئی۔ البتہ مطلب خوب سمجھ گئی تھی۔

''اور سنو، اسے بے فیدی مت بلایا کرو...... اس کا نام خوش بخت ہے۔'' عزیز، بہن کے معاملے میں اماں سے زیادہ حساس ثابت ہوا تھا۔

''ساری دنیا اسے بے فیدی ہی کہتی ہے، ایک میں نے کہہ دیا تو کیا ہوا؟'' اب کی بار اسے اچھا نہیں لگا تھا سو لہجہ ترش ہوگیا۔

''سب کے منہ میں بند نہیں کر سکتا مگر میرے گھر میں سے کوئی اسے بخت کے علاوہ کچھ نہیں بلائے گا۔'' لہجہ دوٹوک تھا۔ اس نے جواباً بحث سے پرہیز کیا۔

پھر وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ رخشی خود سے اسے مخاطب کر لیتی...... کبھی کھانے کے لیے بلاتی تو کبھی کسی چھوٹے موٹے کام کے لیے...... جواباً وہ بھی دوڑی، دوڑی چلی آتی اور ''میری بھابی ہے۔'' کہتی ہر کام کر دیتی۔

رخشی کی شادی کو سال سے اوپر ہوگیا تو ایک روز یونہی وہ خوش بخت کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

''سن بخت تو سب کے لیے دعا کرتی ہے ناں میرے لیے بھی دعا کر دے کہ اللہ میری گود بھر دے۔'' اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھے وہ لجاجت

بھرے انداز سے کہہ رہی تھی اور وہ آنکھیں موندے بیٹھی رہی...... نہ ہوں، نہ ہاں نہ کوئی دعا ....

''سن رے بے فیدی، مجھے کیوں دعا نہیں دیتی؟'' وہ اس کا گھٹنا زور، زور سے ہلانے لگی۔ جواب جو نہ دیتی تھی۔ وہ کوفت کا شکار ہو گئی۔ تبھی اس نے آنکھیں کھولیں اور اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ پہلی بار اس کی بھابی اس طرح اس کے قریب فرصت سے آکر بیٹھی تھی۔ ذہنی کمزور سہی مگر سب محسوس ہوتا تھا اسے۔ احساسات سے عاری نہیں تھی وہ۔ حقارت، محبت، دکھ، خوشی، پشیمانی، گریز سب سمجھتی تھی۔

شادی کے ڈیڑھ سال بعد وہ امید سے تھی اور شروع دن سے اس کی طبیعت بگڑی ہی رہتی...... دل اتنا گھبراتا تھا کہ کبھی رات میں اٹھ، اٹھ کر کھڑکیاں کھول کر بیٹھ جاتی کہ کہیں سے تازہ ہوا آئے...... عزیز شور کرتا......

''ٹھنڈ آرہی ہے رخشی...... کھڑکی بند کردو......''

اور رخشی کا دم اور گھٹنے لگتا پھر وہ دروازہ کھول دیتی اور گہری سانس بھرتی...... کہیں سے تازہ ہوا آئے اور اس کے دل سے بوجھ اڑا کر لے جائے۔

''رخشی مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے، تم باہر چلی جاؤ۔'' اور وہ اٹھ کر باہر آجاتی۔ ساری رات گھر میں چکراتی پھرتی اور ایسے میں وہ بھی اس کی ہم نشیں بن جاتی...... اس کے ساتھ ہی جاگتی رہتی۔ اس لمحے جب اس کا جیون ساتھی بھی ساتھ نہیں نبھا رہا تھا وہ بے فیدی اس کے ساتھ تھی۔

''میری تو حالت ٹھیک نہیں ہے جھلی...... تو کیوں جاگتی ہے پوری رات؟''

اور وہ خاموشی سے بھابی کے سامنے آلتی پالتی مارے بیٹھی رہتی، یک ٹک نظریں انہی پر جمائے رکھتی۔ کبھی رات کو اس کا جی متلانے لگتا تو وہ جھٹ پٹ پانی لے آتی۔ اس کی کمر سہلانے لگتی...... اور ایسا کرتے وہ سمجھداری سولہ سال خوش بخت لگتی...... کون کہہ سکتا تھا کہ اس کی ذہنی بالیدگی رک گئی ہے۔ وہ بعض اوقات خود حیران رہ جاتی۔

اور اگلے روز وہ اسے پھر سے وہی بے فیدی لگتی جسے نہ اپنا ہوش ہوتا نہ اردگرد کا...... عالم فانی اور لافانی کے مدھ میں معلق کسی ثقات کے مانند......

☆☆☆

جس روز اسے اسپتال لے کر جایا جارہا تھا...... اس نے خوش بخت کو نہ جانے کیا پڑھ، پڑھ کر خود پر پھونکتے دیکھا۔

''دعا کرنا میرے لیے......'' اس نے جاتے، جاتے دروازے کے ساتھ لگی نند سے استدعا کی جس نے سر ہلا دیا گویا سب سمجھ رہی ہو۔ جب وہ واپس آئی تو اس کی گود میں ننھی منی سی پری تھی......

''دیکھ بخت تیری منی......'' ثریا بیگم نے ننھی گڑیا کو اس کی جانب بڑھایا مگر وہ دروازے میں کھڑی اسے دیکھنے کے بجائے بھابی کو دیکھتی رہی۔ وہ پہلے روز کے بعد سے کبھی اس کے کمرے میں نہ آئی تھی۔

''آجا بخت...... منی کو اٹھائے گی نہیں؟ تو پھپو ہے اس کی۔'' رخشی ذرا سا مسکرائی تو وہ دوڑ کر لپکی اور ثریا کے ہاتھ سے اسے جھپٹ کر دیوانہ وار چومنے لگی۔

''میری منی ہے۔'' وہ پیار کرتی جاتی اور اماں روتی جاتیں۔

''میں پھپو...... میں پھپو اماں۔'' ثریا بیگم نم آنکھوں سے سر اثبات میں ہلاتیں اس کی تصدیق کرتی رہیں۔

''رخشی اللہ تجھے اجر دے۔'' اس کے سر پر ہاتھ دھرتے، وہ کمرے سے باہر نکل گئیں۔ اس دن سے جیسے انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اب بھابی، نند کو سنبھال لے گی سو دو ہفتے بعد ہی وہ خاموشی سے مٹی کی چادر اوڑھ کر سونے چل دیں۔

ثریا بیگم کی وفات پر رخشی نے پہلی بار خوش بخت کو دیواروں، درختوں سے لپٹ، لپٹ کر روتے دیکھا تھا...... شادی کے قریباً ڈھائی سال بعد اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ رونا بھی جانتی ہے جو، جو خواتین تعزیت کے لیے آتی گئیں، وہ ان میں سے کسی کے گلے نہ لگی نہ ہی روئی...... اس کے ہم نوا اور ہمدرد درخت اور دیوار تھے جن سے سارا سال وہ لپٹی رہتی۔

''ماسی کیا واقعی بخت نے شبِ قدر پائی ہے؟''

وہ ماسی عظمت سے سرگوشی میں بات کرتے، کرتے اچانک پوچھ بیٹھی۔ ماسی بڑی اللہ لوک بندی تھیں...... گہری سانس بھری اور بخت پر نظریں جما دیں۔

''یہ تو مولا کے رنگ ہیں...... اس کی رمزیں ہیں جو وہ کسی، کسی پر کھولتا ہے، کون اس کا رمز آشنا ہے وہی جانے...... پر ایک بات ہے کہ اللہ نے ایک طرف سے کمی رکھی تو دوسری طرف سے بڑا عطا بھی کیا ہے...... اب ہم جیسے بندے کہاں سمجھ سکتے ہیں ایسی باتیں۔'' ماسی اتنا کچھ سمجھ کر بھی کیسی نا سمجھ عاجز بن گئی۔

رخشی سر ہلاتی رہ گئی۔ وہ واقعتاً نہ سمجھی تھی۔

ثریا بیگم کی وفات کے بعد سے خوش بخت پھر سے بے فیدی بن گئی...... عورتوں کا تانتا بندھا رہتا مگر اب وہ ہاتھ نہ اٹھاتی۔ وہ ہاتھ جوڑ، جوڑ کر تھک جاتیں مگر نہ اس کے ہاتھ اٹھتے نہ لب ہلتے......

''بخت اب کیوں دعائیں نہیں دیتی؟'' وہ اکثر پوچھتی تھی مگر جواب ندارد، وہ بلا، بلا کر تھک جاتی مگر وہ جگہ سے انچ بھر نہ ہلتی۔

اس نے گڑیا کو اٹھانا بھی چھوڑ دیا تھا...... حتیٰ کہ وہ کمرے میں پڑی روتی رہتی مگر وہ اس کے قریب بھی نہ پھٹکتی۔ رخشی اکیلی سارا گھر سنبھال، سنبھال کر ادھ موئی ہو جاتی...... اس سے پہلے ساس نے سارا گھر سنبھال رکھا تھا تو کبھی احساس ہی نہیں ہوا کہ گھر کی اتنی ذمے داریاں بھی ہوتی ہیں۔ پھر گڑیا کی ذمے داری الگ تھی اور بخت ہلنے کو تیار نہیں تھی کہ وہ گڑیا کی ذمے داری ہی اسے سونپ دے۔

اس روز کام کر کر کے اس کا پارہ چڑھا ہوا تھا اور گڑیا نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا...... لہٰذا سارا غصہ بخت پر نکال دیا۔

''بے فیدی ہی ہے ناں آخر...... نکمی، ناکارہ...... کسی کام کی نہیں ہے۔ اپنا آپ سنبھال نہیں سکتی مجھے کیا مدد دے گی...... لوگ ٹھیک تجھے بے فیدی کہتے ہیں۔''

اس وقت تو بخت خاموشی سے لب بھینچے تکتی رہی حتیٰ کہ اس کے وجود میں ہلکی سی جنبش تک نہیں ہوئی مگر شام میں اس نے بخت کو گڑیا کو گود میں لے کر جھلاتے دیکھا اور منہ سے نہ جانے کون سا آسمانی راگ نکل رہا تھا جو اس کی سمجھ سے بالاتر تھا مگر گڑیا اسے سن کر خاموش تھی...... وہ ہولے سے مسکرا دی اور صد شکر ادا کیا۔

اس روز کے بعد سے گڑیا کبھی روتی نہ پائی گئی تھی...... بخت نے گویا ماں بن کر اسے سنبھال لیا تھا۔

''نہ جانے کون سا طلسم پھونکتی ہے۔'' وہ دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے پھپو، بھتیجی کو آپس میں باتیں کرتے دیکھتی...... باتیں کرنے والی تین سالہ دماغ کی حامل خوش بخت اور باتیں سننے والی تین ماہ کی نیناں...... بہرحال وہ بیٹی کی طرف سے مطمئن ہو کر اپنا کام کرتی رہتی۔

☆☆☆

''کبھی کبھی مجھے بخت کی سمجھ نہیں آتی۔'' وہ نیناں کو لٹا کر مالش کر رہی تھی اور جواباً وہ قلقاریاں مار رہی تھی۔

''اب کیا، کیا اس نے؟'' عزیز بیڈ پر لیٹا اخبار پڑھ رہا تھا۔

''کبھی کبھار تو ایسی بن جاتی ہے جیسے بہری ہے اور گونگی بھی...... نہ سن رہی ہے اور نہ جواب دے گی......'' عزیز مسکرا دیا۔ ''اور کبھی ایسی سیانی بن جاتی ہے کہ مجھے لگتا ہے کہ کسی سو سولہ بڑھیا کی روح حلول کر گئی ہے اس میں...... سب سمجھتی ہے جو سمجھاؤ

وہ بھی اور جو نہ سمجھاؤ وہ بھی...... اب دیکھیں گڑیا کو اتنا اچھے سے سنبھال لیتی ہے کہ میں بے فکر ہو جاتی ہوں اس کی طرف سے...... جس لڑکی کو اماں کبھی کبھار کھانا اپنے ہاتھوں سے کھلاتی تھیں آج وہ سیانی بن کر گڑیا کو کھلا رہی ہوتی ہے۔'' عزیز مسکراتا رہا۔

''بس رخشی اس کا کبھی دل نہ دکھانا...... اس نے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا...... وہ بے ضرر ہے یاد رکھنا۔ اماں اسے ہمارے ذمے ڈال کر گئی ہیں سو اس کا بہت خیال رکھنا۔'' وہ نیناں کی مالش کرتے ہوئے سر ہلاتی جا رہی تھی۔ عزیز کی باتوں کو اس وقت پلو سے باندھ لیا تھا...... یہ سوچے بغیر کہ ان باتوں کو تو ہمیشہ ہی پلو سے بندھا رہنا چاہیے۔

☆☆☆

نیناں فطری طور پر بخت سے بے حد مانوس تھی...... بخت اسے کھلاتی پلاتی بھی خود تھی اور سارا دن اس کے ساتھ کھیلتی بھی رہتی۔

''دیکھا کیسے اللہ نے تیری مشکلات اس کے ذریعے حل کیں جس سے تو چڑتی تھی۔'' اماں جب بھی اس سے ملنے آتیں بخت کو دیکھ، دیکھ کر رخشی کو ضرور احساس دلاتیں اور وہ خاموش رہتی مگر دل میں اقرار ضرور کرتی تھی۔

اس روز محلے سے ہی ایک خاتون نیاز کے چاول دینے آئی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ اندر آ کر بیٹھ گئیں۔

''رخشی ہوش کے ناخن لو، تم نے بچی کو اس کے حوالے کر رکھا ہے۔'' رخشی ان کی بات پر ذرا کی ذرا مسکرا دی۔

''نہیں باجی...... جیسا سب سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے، بخت کسی کو نقصان نہیں دیتی اور گڑیا کا تو اتنا خیال کرتی ہے کہ شاید میں بھی نہیں کر سکوں۔'' اس نے محبت پاش نظروں سے نند کی گود میں چڑھی بیٹی کو دیکھا۔

''لاکھ بے ضرر سہی مگر ہے تو یہ پاگل ناں...... حرکات دیکھو اس کی...... تمہاری بچی اب بڑی ہو رہی ہے جو یہ کرے گی، گڑیا بھی اس کی پیروی کرے گی...... جنگلی، گنوار بنانا ہے کیا بچی کو جو اس پاگل کے سپرد کر رکھا ہے۔ خدمت اچھی شے ہے، تم ضرور اس کی کرو...... اجر ملے گا مگر بچی کو اس کے سائے سے بھی دور رکھو...... ایک تو پاگل کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا، کب بگڑ ہی جائیں اور دوسرے بچی کی عادات بگڑ جائیں گی...... خود تو بے فیدی ہے، بچی پر تو اثر نہ ڈالے۔''

رخشی کے پلو سے بندھی باتیں ایک، ایک کر کے کھلنے لگیں اور نئی گانٹھیں بندھنے لگیں۔ اس نے عزیز کو بتائے بغیر ہی نیناں کو بخت سے دور رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

اب جب بھی بخت کھیلنے کے لیے اس کے کمرے کی جانب جانے لگتی رخشی ٹوک دیتی...... کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑ لیتی۔

''وہ سو رہی ہے۔'' بخت تھم جاتی۔

''وہ کارٹون دیکھ رہی ہے، تم بعد میں آنا۔'' وہ لوٹ آتی۔

''ابھی اس کے نہانے کا وقت ہے۔'' وہ خاموشی سے وہیں ٹک جاتی۔

اور چھوٹی سی نیناں نہ جانے کتنے کاموں میں مصروف ہو گئی کہ بخت اس سے مل نہ سکتی۔

ثریا بیگم کہتی تھیں وہ بڑی سیانی ہے، سب سمجھتی ہے...... اور وہ واقعی سمجھ گئی تھی کہ اب اسے گڑیا کے پاس نہیں جانا، اس سے دور رہنا ہے، بھلے وہ خود سے ہی کیوں نہ اس کی جانب بڑھے، بھلے وہ روتی رہے، اب اسے گڑیا کے قریب نہیں جانا۔ اس نے بھابی کی اجازت پر پہلی بار گڑیا کو گود میں بھر کر اپنایا تھا...... اب وہ بھابی کے کہنے پر ہی اسے گود سے اتار کر پرایا کر رہی تھی۔ گڑیا اب اس کی جانب ہمکتی تو رخشی روک لیتی، رخشی اِدھر اُدھر ہوتی تو وہ خود بخود گڑیا کی نظروں سے اوجھل ہو کر کھسک لیتی۔

وہ جسے سب بے فیدی کہتے تھے۔ موقع برمحل اس سے فائدہ بھی حاصل کرنا جانتے تھے۔ بھابی نے بھی شاید یہی کیا تھا ہمیشہ سے۔

☆☆☆

ایک روز گھر پر عزیز کے چند دوست مدعو تھے اور رخشی صبح سے باورچی خانے میں مصروف تھی...... گھر کی صفائی کے لیے کام والی ماسی آنے لگی تھی سو ایک طرف سے فکر کم ہوئی...... جاتے، جاتے ماسی بڑا گیٹ چوپٹ کر گئی اور رخشی بے خبر سی باورچی خانے میں ہی لگی رہی۔

نیناں کھیلتے، کھیلتے گیٹ کی طرف جا نکلی اور بلی کے پیچھے بھاگتے، بھاگتے گیٹ سے باہر...... خوش بخت جو بظاہر اس سے بے خبر رہتی مگر چھپ، چھپ کر اس پر ایک چور نظر ڈال لیتی، سیڑھیوں پر بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے سر گھما، گھما کر بھابی کو تلاشا اور پھر پھرتی سے باہر کو لپکی۔

رخشی کو جب کاموں سے فرصت ملی تو بیٹی کا ہوش آیا اور پھر پورا گھر چھان مارا مگر نہ تو نیناں گھر پر تھی اور نہ بخت......

''ہائے میرے ربا...... کدھر لے گئی وہ میری بچی کو......'' دل تھام کر گیٹ کی جانب بھاگی جو کھلا پڑا تھا۔

''بے فیدی...... کدھر مر گئی، ربا میری بچی۔''

اڑوس پڑوس میں سب سے پوچھ لیا مگر کہیں کسی کو کوئی خیر خبر نہ تھی۔ وہ بھاگتی، بھاگتی بڑے میدان کی طرف جا نکلی تو سامنے سے ایک شخص گود میں بچی لیے آ رہا تھا۔ نیناں کو دیکھتے ہی بھل، بھل آنسو گرنے لگے۔

''سامنے جو بڑا گٹر ہے ناں اس کا ڈھکن ٹوٹا ہوا ہے...... یہ بلی کے پیچھے بھاگتی، بھاگتی وہاں تک جا پہنچی تھی اور گرتے، گرتے بچی ہے۔ وہ دور جو پاگل بیٹھی ہے اس نے اسے بچایا۔ وہ اس کے پیچھے دوڑی آئی خود وہ بھی آدھی ڈھے ہی گئی تھی...... بس اللہ نے کرم کیا اس پر کہ وہاں سے ہم گزر رہے تھے تو اسے باہر کھینچ لیا۔'' اس نے دور بیٹھی بخت کی جانب اشارہ کیا جو اپنی کہنی اور گھٹنے سہلا رہی تھی اور منہ سے آوازیں نکال رہی تھی جیسے شدید درد میں مبتلا ہو مگر کوئی اس کے زخم سہلانے والا تھا نہ ہی مرہم لگانے والا۔

''صحیح کہا بھائی صاحب...... اس پر اللہ ہمیشہ ہی کرم کرتا آیا ہے۔'' رخشی، گڑیا کو اٹھائے، اٹھائے اس کی طرف دوڑی...... اس کے قریب پہنچ کر گھٹنوں کے بل ڈھے گئی۔

بخت اسے اپنے زخم دکھا رہی تھی مگر زخموں کی وجہ چھپا گئی۔ رخشی روتی جاتی تھی اور اس کے زخمی ہاتھوں کو چومتی جاتی تھی۔

''معاف کر دے مجھے بخت...... اللہ کے لیے مجھے معاف کر دے۔'' بخت حیران پریشان سی روتی بلکتی بھابی کو تکتی رہی اور اپنا درد بھول گئی۔

''اماں آپ ٹھیک کہتی تھیں اللہ اس کے ذریعے سے میری مشکلات ٹالتا ہے...... اور میں اقرار کرتی ہوں کہ یہ بے فیدی نہیں، ہرگز نہیں...... کوئی انسان کیسے بے فائدہ ہو سکتا ہے۔ اللہ کا بنایا کوئی ذرہ بھی اس کائنات میں بے مصرف نہیں...... اس کی بنائی ہر چیز میں تکمیل ہے۔ بصارت اندھی ہو سکتی ہے، بصیرت نہیں۔''

اس نے روتے، روتے نیناں کو اس کی گود میں دے دیا۔

''یہ لے بخت...... یہ تیری ہے، اس کی جان پر اب مجھ سے کہیں زیادہ تیرا حق ہے۔''

اور بخت اسے گود میں اٹھا کر چٹا چٹ پیار کرنے لگی۔

''میری منی...... میں پھپھو......'' اور رخشی نم آنکھوں سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''ہاں، ہاں یہ منی تیری ہی ہے۔''



ناولٹ

آ کہر میں

نایاب جیلانی

سپر لگژری ''کیمری'' فل اسپیڈ کے ساتھ نیویارک کی کارپٹڈ ہائی وے پر دوڑ رہی تھی۔ سورج کی کرنیں چھتوں پر پڑ رہی تھیں جہاں برف پڑی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا سنہری کرنوں کی چمک سے کئی ہیرے دمک رہے ہوں۔

مگر یہ چمک اس کی آنکھوں میں ریت بھر رہی تھی۔ اگر خالہ اسے اتنا مجبور نہ کرتیں، اس کے سامنے گریہ نہ کرتیں اور مرنے سے پہلے عہد نہ لیتیں تو شاید

فاطمہ کبھی ان اجنبی راہوں کی طرف نہ پلٹتی...... ان کٹھور لوگوں کی بستی میں نہ آتی۔ خالہ کی ہر بات پر سر جھکانا اس کا فریضہ تھا۔ خالہ کی محبت اور فرمانبرداری اس کے لیے عبادت کا درجہ رکھتی تھی۔

خالہ کی یاد میں آج بھی فاطمہ کی آنکھیں نمی سی بھر جاتی تھیں۔ اس کا ویزا لگا اور ٹکٹ کنفرم ہوا اِدھر خالہ اپنے آخری ''فرض'' سے فراغت پا کر خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ فاطمہ کے ویزے کا انتظار کررہی تھیں۔ اس کی زندگی میں در آنے والی طغیانی کے بعد سکون اور شانتی کا انتظار کررہی تھیں۔ جیسے ہی ماموں نے ایک مرتبہ پھر اس کا ویزا وغیرہ بھیجا...... ٹکٹ کے پیسے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کیے...... اُدھر خالہ نے مکان بیچ کر سارے اماؤنٹ کے ڈالرز بنوائے اور فاطمہ کو اپنے آنسوؤں سے زیر کر کے جہاز میں بٹھا دیا...... ابھی وہ سفر میں تھی جب اطلاع مل گئی کہ خالہ اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔ شاید وہ فاطمہ کو اپنی زندگی میں محفوظ ٹھکانے پر بھیجنے کا اطمینان کر کے اس دنیا سے رخصت ہوئی تھیں...... یا پھر اپنی بیٹی کا لدا بوجھ اتار کر اللہ کے حضور حاضر ہوئی تھیں۔

انہیں گمان ہوگا...... یہ عمل ان کی بیٹی کے رستوں میں بکھرے کانٹے سمیٹ دے گا۔ شاید خالہ کا گمان غلط نہ ہو...... مگر ہر کوئی اپنے عمل کا کیا پاتا ضرور ہے۔ چاہے کسی بھی صورت میں ہو...... دل دکھانے والے یہ کیوں نہیں سوچتے اگر کوئی ان کا دل دکھا جائے تو کیا ہو؟ زندگی چھین لینے کی کوشش کرنے والے یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ کوئی ان کی زندگی کے ساتھ اس طرح کرے تو کیا ہو...... ؟ بے بس کردینے والے جب خود بے بس ہو جاتے ہیں تو اپنی بے بسی کا حال تک سنا نہیں سکتے۔

نیویارک ہائی وے پر بکھری ایسی دردناک یادیں آج بھی فاطمہ کی روح کو جھنجوڑتی تھیں۔ جیسے ایک فلم سی تھی جو آنکھوں کے پار چل رہی تھی۔ منظر کے بعد منظر بدل رہا تھا۔ چہرے کے بعد چہرہ بدل رہا تھا۔

آنکھوں کے رنگ بدل رہے تھے۔ لوگ بدل رہے تھے، عکس بدل رہے تھے۔ حتیٰ کہ شہر بدل رہے تھے۔

اچانک چلتی ''کیمری'' کی خاموش فضا میں مردانہ آواز ابھری تھی۔ گاڑی ڈرائیو کرنے والا بظاہر سنجیدہ نظر آتا بندہ ایک دم بولنا شروع ہوا تو فاطمہ کو خیال آیا۔ وہ گاڑی میں اکیلی نہیں تھی اور سوچوں کے سفر میں بہت دور تک نکلی ہوئی تھی۔ اس کی یادیں نیویارک...... کی طرح بہت گنجان تھیں۔ پھر بھی وہ لمحہ بھر میں یادوں کے طویل سلسلے کو جھٹک کر سیدھی ہوگئی۔ اس کا دھیان اردگرد نہیں، امر کی گفتگو اور باتوں کی طرف تھا۔ وہ شاید خود کلامی کررہا تھا۔ یقیناً یہ امر ہی تھا...... ماہر کا دوست بلکہ جگری دوست، بیچ میں چودہ سال آچکے تھے پھر بھی فاطمہ نے ائرپورٹ پر امر کو دیکھ کر پہلی مرتبہ میں پہچان لیا تھا۔ تب کے اور اب کے امر میں کافی فرق تھا۔ تب وہ ایک لاابالی، بے فکرا، ہنس مکھ، شوخ مزاج اسٹوڈنٹ تھا۔ میڈیکل کا اسٹوڈنٹ لیکن اس وقت وہ پہلے والے امر سے کافی مختلف لگ رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ بیچ میں چودہ سال آگئے تھے۔ گوکہ وہ اب بھی ہینڈسم اور پرفیکٹ تھا مگر اس کی پرسنالٹی سے سنجیدگی میچ نہیں کررہی تھی۔ اس کی باتیں سن کر اس نے یہی اندازہ لگایا تھا۔ وہ مغرب کا پروردہ ضرور تھا لیکن آج بھی مغرب کے لیے اس کے جذبات منفی ہی تھے۔ فاطمہ کو وہ پہلے والا ہی امر لگا...... جب وہ ماموں کے گھر کی مین روڈ پر اونچی آواز میں گوروں کے خلاف باتیں کیا کرتا تھا۔

فاطمہ کو اس وقت بھی وہ پہلے والا امر ہی لگا...... ویسا ہی جوشیلا اور بھڑکیلا...... اور اس کا دوست بھلا کیسا ہوگا؟ پہلے کی طرح ہی سرد، برفیلا، اجنبی......

اس کا خیال بھٹک کر ماہر کی طرف لپکنے لگا تھا۔ اس نے خود کو ملامت کر کے ذہن امر کی باتوں اور غصے کی طرف لگایا تھا پھر ایک گہری افسردہ سانس اس کے حلق سے برآمد ہوئی۔

''بڑی طاقتیں ہمیشہ اپنے مفاد کے لیے ویٹو پاور

کا استعمال کرتی ہیں۔ وہ پاور بڑی ریاست کی سربراہی سے حاصل ہو...... دولت سے حاصل ہو یا حسن سے...... اپنے مفاد کے لیے بڑی طاقتیں کچھ نہیں دیکھتیں۔ چھوٹے ملکوں اور چھوٹے لوگوں کو کچل کر رکھ دیتی ہیں۔'' فاطمہ کے جواب نے لمحے بھر کے لیے امر کو سن کر کے رکھ دیا۔ اسٹیئرنگ وہیل پر اس کا ہاتھ ہولے سے کپکپا گیا۔ جیسے وہ سمجھ گیا تھا۔ فاطمہ کا اشارہ کس طرف تھا اور وہ کن بڑی طاقتوں کا ذکر کررہی تھی۔

''وقت بڑی طاقتوں کو سرنگوں کردیتا ہے۔'' کافی دیر بعد امر نے جیسے تبصرہ کیا تھا۔ فاطمہ کے لبوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

''وقت نہیں...... بڑی طاقتوں کی شاطرانہ چالیں جو کبھی کبھار الٹ بھی جاتی ہیں...... اور کبھی کبھار مات کرنے والوں کو شہ مات کا مزہ بھی چکھنا پڑتا ہے...... اور یہ تقدیر کی شہ مات ہوتی ہے۔'' اس کا لہجہ کسی قدر نم اور افسردہ تھا۔ امر لمحے بھر کے لیے چپ سا ہوگیا۔

''تم بہت سمجھداری کی باتیں کرنے لگی ہو۔'' اس کا انداز ذرا بے تکلف قسم کا تھا۔ تاہم وہ اس کی سنجیدگی پر چونک ضرور گیا تھا۔

''بیچ میں چودہ سال آچکے ہیں امر بھائی......'' وہ جتانا نہیں چاہتی تھی پھر جانے کیسے زبان سے پھسل گیا۔ امر بھی چپ سا کر گیا۔ اب بھلا کیا بولتا۔ جیسے سارے لفظ بے جان اور بودے ہوچکے ہوں۔

کافی دیر تک کار میں معنی خیز سی خاموشی چھائی رہی۔ جسے امر نے خود ہی سمیٹ ڈالا۔

''سفر تو اچھا گزر گیا......؟'' اسے کچھ تو کہنا ہی تھا یا شاید وہ فاطمہ کے لفظوں کی گھٹن کو زائل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اچانک ہی گفتگو کو اک الگ موڑ دے دیا تھا۔ شاید اسے بات بدلنے کے لیے بہترین موضوع مل گیا تھا۔

''پتا نہیں...... ترکی میں جہاز کا اسٹے (وقتی قیام) تھا۔ وہیں پہ خالہ کی وفات کا پتا چلا...... پاکستان سے کال آئی تھی۔'' فاطمہ کی آواز پھر سے بھرا گئی۔ امر کی آنکھوں میں بھی تاسف ابھرنے لگا...... پھر اس نے قدرے جھجک کر پوچھا تھا۔

''وہ حورعین کی والدہ تھیں نا؟''

''ہاں......'' فاطمہ کے حلق تک میں ریت بھر گئی تھی۔ دریائے ہڈسن کے کناروں پر بکھری سوکھی ریت اڑتی ہوئی اسے غبار آلود کر گئی تھی۔ فاطمہ کا منہ، ناک اور آنکھیں ریت کے نوکیلے ذروں سے بھر گئے تھے۔ اسے لگا حورعین کے نام کے ساتھ ذلتوں کے کئی باب اور کئی اوراق کھلتے چلے گئے تھے۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے چکراتا سر تھام لیا تھا۔ امر نے اس کی بگڑتی طبیعت دیکھی اور پریشان ہوگیا۔ پھر اس نے جلدی سے پانی کی بوتل کھول کر اسے پکڑائی۔ وہ خاصا گھبرا گیا تھا۔ گوکہ وہ ایک ڈاکٹر تھا پھر بھی......

''تم ٹھیک ہو فاطمہ......؟'' اس نے کافی دیر بعد جب وہ کچھ سنبھل گئی تب پوچھا تھا۔

''بہتر ہوں۔'' اسے بہ مشکل ہی بولنا پڑا تھا۔ پانی کی بوندیں حلق میں اتریں تو سوکھا گلا کچھ تر ہوا تھا۔ پھر وہ ذرا سنبھل گئی تھی۔ آخر امر پر کچھ کیوں ظاہر ہونے دیتی؟ گوکہ امر اس کی زندگی کے ہر پہلو سے واقف تھا...... ہر اس ذلت سے جو اس نے نیویارک سے سمیٹی تھی...... ہر وہ ٹھوکر اور دھوکا جو اس نے اپنوں سے کھایا تھا۔ امر سب کچھ تو جانتا تھا...... ہر بات، ہر واقعہ، فاطمہ کی زندگی کے ایک، ایک پل سے واقف تھا۔

پھر اس نے امر کا دھیان خود سے ہٹانے کی غرض سے پوچھا۔

''ماموں اور مامی کیسے ہیں؟'' اس کی نارمل آواز گاڑی میں گونجی تو امر نے سکون کی سانس لی۔ ورنہ وہ خاصا پریشان ہوگیا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ پہلے اسے کسی میڈیکل اسٹیشن پر لے جائے مگر فاطمہ اب کافی بہتر دکھائی دے رہی تھی۔

''انکل اور آنٹی ٹھیک ہیں...... تمہارا انتظار کررہے ہیں۔'' امر نے نرمی سے بتایا اور پھر بیک ویو مرر

سے فاطمہ کے تاثرات دیکھنے چاہے...... وہ اس کے چہرے سے کچھ کھوجنا چاہتا تھا۔ اس نے کسی اور کے بارے میں کیوں نہیں پوچھا؟ چلو ماہر کا نہ پوچھتی پھر بھی کم از کم اسے بچوں کے بارے میں تو ضرور استفسار کرنا چاہیے تھا۔ وہ بچے جو اس کے آنے کی خبر پہ سخت دیوانے ہو رہے تھے۔ خوشی سے اچھل پڑے تھے۔ اتنے پُرجوش تھے اور بہت دن سے اسے ویلکم بولنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

''بچے تمہارا بہت شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔'' امر نے خود ہی ڈھیٹوں کی طرح بتا دیا تھا کیونکہ اسے محسوس ہو رہا تھا فاطمہ بالکل بھی بچوں کے بارے میں کچھ پوچھنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ اسے فاطمہ کے سپاٹ تاثرات پہ عجیب سا دکھ ہوا تھا...... کیونکہ بچوں کا خیال، ان کی خوشی، دیوانگی اور فاطمہ کی آمد کے لیے پُرجوش ہونا وہ خود ملاحظہ کر چکا تھا۔

''اگر فاطمہ کے ایسے ہی کٹھور تاثرات رہے تو بچوں کا دل کس قدر ٹوٹ جائے گا۔'' امر کو آنے والے وقت سے خوف سا آیا۔

گو کہ فاطمہ پہلے سے بہت بدل چکی تھی۔ اس کا وہ بچپنا، لاابالیت اور بے وقوفانہ سا تاثر اب کہیں نہیں تھا۔

وہ بہت سنجیدہ ہو چکی تھی۔ اس کی شخصیت میں ایک وقار اور ٹھہراؤ آ چکا تھا۔

اور سب سے بڑی بات فاطمہ کو اپنے تاثرات بھی چھپانے آ گئے تھے۔ گویا وقت واقعی بہت آگے تک جا چکا تھا۔ اتنا آگے کہ امر کو بھی فاطمہ سے بات کرنے کے لیے بہت دیر تک سوچنا پڑ رہا تھا۔ وہ کیسے اور کس طرح سے بچوں کا ذکر چھیڑے؟ وہ اسی شش و پنج میں مبتلا تھا جب فاطمہ نے خود ہی خاموشی کو سمیٹ ڈالا۔ شاید وہ اس معنی خیز چپ پر خود ہی اکتا گئی تھی۔

''کیا ماموں نے گھر بدل لیا......؟'' فاطمہ نے شیشے سے پار دریائے ہڈسن کے پل کو دیکھا تھا۔ یہ رستہ ماموں کے گھر کو نہیں جاتا تھا تو پھر یہ لوگ کہاں جا رہے تھے؟ اس نے بہت نیچے تک جھانک کر دیکھا تھا۔ بہت دور تک ہڈسن کا پانی بکھر رہا تھا۔ بہت خوب صورت اپارٹمنٹ نمایاں لہروں پر تیرتی سفید بطخوں کے مانند لگ رہی تھیں۔ ہڈسن کے نیلے پانی پر تیرتے بنگلے اتنے سفید تھے کہ موتیوں سا گمان ہوتا۔ بہت دور سے سفید نگینے معلوم ہوتے تھے۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''دریا کے اس پار......'' امر نے اپنے تئیں خاصا ہلکا پھلکا جواب دیا تھا جو فاطمہ کو قطعاً ناکافی لگا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر تفکر کے گہرے احساس کو دبا کر پوچھا۔

''یہاں کیوں آئے ہیں؟'' وہ بے چین ہو گئی تھی...... یہ امر تو وہی تھا۔ چودہ سال پہلے والا...... بے ڈھنگا، بھیجو کہیں، جاتا کہیں تھا...... لینے کسی کو آتا اور لے کسی اور کو جاتا تھا۔

''ہم کہاں آ گئے ہیں؟'' ایک جگہ گاڑی رکتے دیکھ کر اس نے پھر پوچھا......

''ہمیں یہاں لنچ کرنا ہے پھر گھر کی طرف نکلنا ہے۔'' امر نے بالآخر لمبا چوڑا پروگرام بتا دیا تھا۔ فاطمہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔

''تو کیا اب بھی مامی، فاطمہ کے لیے ایک وقت کھانا بنانے کا تردد نہیں کر سکتی تھیں؟'' وہ عجیب انداز میں سوچتی رہ گئی تھی...... گو کہ اسے مامی سے کسی بھی قسم کی ہمدردی یا نرماہٹ کی امید نہیں تھی۔ پھر بھی دل کو دھکا سا لگا۔ واقعی کچھ لوگ کبھی نہیں بدلتے۔ مامی بھی ویسی ہی تھیں مغرور، نخریلی اور فاطمہ کو کم تر سمجھنے والی۔ اسے کوئی ایسی خوش فہمی تو نہیں تھی اور نہ ہی یہ امید تھی کہ مامی اس کا پُرجوش قسم کا استقبال کریں گی پھر بھی دل عجیب انداز میں بکھرا گیا تھا۔ اسے ان سنسان، تلخ اور اجڑے دنوں کا خیال آیا تھا جو اس نے مامی کی ہمراہی میں گزارے تھے اور جو اس نے ماموں کے عقوبت خانے میں بتائے تھے۔ وہ دن شاید فاطمہ عمر بھر نہیں بھلا سکتی تھی۔ وہ مہینے، وہ سال کیسے پُراذیت تھے۔ وہ وقت کتنا درد ناک تھا...... گزرتا ہی نہیں تھا...... رینگ، رینگ کے چلتا تھا۔

اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا لی تھی۔ پلکیں پپوٹوں سے جڑیں تو دو آنسو خود بخود ٹوٹ کر گالوں پر پھسل گئے تھے۔ وہ گزرے ہوئے ماضی کو یاد نہ کرنے کا عہد کر کے آئی تھی۔ مگر یادیں تو...... ایسے ہی بد عہد ہوتی ہیں تب اچانک امر نے اسے مخاطب کر لیا تھا۔

''تم نے میرے بارے میں پوچھا نہیں...... میں کیا کرتا ہوں؟ شادی کی یا نہیں؟ یعنی تمہاری نگاہ میں میری کوئی اہمیت ہی نہیں۔'' امر کا انداز قدرے خفگی لیے ہوئے تھا۔ فاطمہ کو چونک کر سنبھلنا پڑا تھا۔ پھر وہ ذرا سی سیدھی ہوئی۔

''میں یہی سوچ رہی تھی۔'' اس نے گڑبڑا کر کہا۔ امر نے بیک ویو مرر سے گھور کر اسے دیکھا تھا۔

''جھوٹ تمہیں بولنا نہیں آتا۔'' امر کا انداز جتانے والا تھا۔ فاطمہ چپ سی رہ گئی تھی۔

''تو اب بتا دیں...... کیا کرتے ہیں آپ......؟'' فاطمہ نے ملائمت سے پوچھا۔ وہ واقعی امر سے یہی سوال کرنا چاہتی تھی...... لیکن ماضی کی تلخ یادوں میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہیں رہتا تھا۔

''کچھ زیادہ نہیں...... بچے پالتا ہوں...... تمہارے بچے۔'' امر کا انداز صاف جتانے والا تھا۔ فاطمہ کو لمحہ لگا اور وہ زلزلوں کی زد میں آ گئی تھی۔ اس کے دماغ کو چکر پھیریاں لگ گئی تھیں۔ ہر چیز جیسے گول، گول گھومتی جا رہی تھی۔ اس کے دل کو بھی پنکھ لگ گئے تھے۔ جیسے صفحۂ ہستی پر بھونچال آ گیا تھا۔ فاطمہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ ہر طرف ایک ہی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

''تمہارے بچے......''

''تمہارے بچے......''

فاطمہ کو لگا وہ کبھی اپنے پیروں پر کھڑی نہیں ہو سکے گی۔ اس کی ٹانگوں پر لرزہ طاری تھا۔ اس کے پورے وجود پر لرزہ طاری تھا۔ وہ رعشہ زدہ مریض کی طرح کپکپانے لگی تھی اور وہ کپکپاتی جا رہی تھی، تھرتھراتی جا رہی تھی۔ اس پر قیامت آ رہی تھی۔

''ڈیڑھ سال ہو چکا ہے حورعین کو گئے ہوئے۔ بچے اس سے بہت اٹیچ تھے۔ وہ ٹوٹ سے گئے۔ ان کو سنبھلنے میں اور کچھ نئی حقیقتوں کو قبول کرنے میں بہت وقت لگا تھا۔ پھر جب وہ سنبھل گئے تو تمہیں......'' امر مزید بھی بتا رہا تھا۔ شاید اس کا مائنڈ میک اپ کر رہا تھا۔ نئی حقیقتوں سے مراد شاید بچوں کو فاطمہ کے متعلق بتانا تھا۔ اور جب بچوں کو پتا چل گیا تو پھر کیا ہوا ہو گا؟ ان کا ردِعمل کیا تھا؟ اپنے باپ کی طرح ہی ظالمانہ، خود غرضانہ اور کٹھور......

فاطمہ کا رواں، رواں کان بن گیا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں متزلزل تھیں۔ جیسے کہیں تہلکہ مچا ہو...... جیسے کہیں قیامت بپا ہو۔ وہ دل جو چودہ سال سے تھپک، تھپک کر صبر کی لوریوں سے بہل رہا تھا اچانک ہی جنونی ہو گیا۔ بے قابو سا ہو گیا...... بے چین و بے قرار سا ہو گیا۔

وہ انہیں دیکھنے کے لیے مچل گئی، بلک اٹھی...... مضطرب ہو گئی۔ وہ جو لہو کی طرح جسم کے ریشے، ریشے میں رگ، رگ میں دوڑ رہے تھے۔ وہ کہاں تھے؟ وہ کس شہر میں تھے؟ کس نگر میں تھے؟ وہ انہیں کہاں، کہاں تلاشتی؟ وہ اس کی آنکھوں سے اوجھل تھے۔

فاطمہ کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ اونچی آواز میں روتی رہے۔ گریہ کرے...... بین کرے...... ماتم کرے...... اسے لگا وہ زمانوں سے نہیں آج ہی جدا ہوئے ہیں بلکہ ابھی جدا ہوئے ہیں۔

امر نے مڑ کر دیکھا اور دھک سے رہ گیا۔ فاطمہ کے رخسار نمکین پانیوں سے بھیگ رہے تھے۔ وہ بے آواز رو رہی تھی اور اس کے اندر ماتم کی صف بپا تھی۔ شاید صبر کی طنابیں ہاتھوں سے چھوٹ چکی تھیں۔ وہ اونچی آواز میں رونے لگی۔ وہ بلند آواز میں چیخنے لگی۔ وہ اپنے بالوں کو نوچنے لگی۔ رخساروں کو پیٹنے لگی۔ اس کے سارے اختیارات کی حدیں آج ٹوٹ گئی تھیں۔

امر بے بسی سے اسے دیکھتا جا رہا تھا۔

فاطمہ رو، رو کر نڈھال ہوگئی۔ چلا چلا کر اس کا حلق خشک ہوگیا۔ چیخ، چیخ کر وہ تھک چکی تھی۔ برسوں سے بہتے آنسوؤں کی ندیاں بھی سوکھنے لگی تھیں۔

اس کی آنکھیں سوج کر پھول گئیں۔ کچن کے پھل کی طرح لال ہوگئیں۔ وہ جس اذیت سے گزر رہی تھی اس کا اندازہ کوئی نہیں کرسکتا تھا۔ کسی میں اتنی سکت نہیں تھی۔ اتنی طاقت نہیں تھی کہ فاطمہ کا دکھا ہوا زخمی دل چیر کر دیکھ پاتا۔

وہاں لہو ہی لہو تھا، زخم ہی زخم تھے۔

''اور انہیں اتنے سالوں بعد پتا چلا کہ حورعین کون تھی؟ اور تم کون؟ گو کہ بچوں کے معصوم ذہنوں کو الجھانا غیر مناسب تھا پھر بھی ہمیں بتانا تو تھا ہی...... میں نے انہیں سب کچھ بتایا...... اس انداز میں کہ بچوں کی نفسیات کسی بھی موڑ پر نہ الجھے...... ان کے لیے حورعین بھی ڈریم لینڈ کی فیری تھی اور تم بھی...... ڈریم لینڈ کی ایک فیری چلی گئی اور دوسری فیری آگئی...... یعنی تم...... اگر تم واپس پلٹ کر آئی ہو تو یقیناً بہت کچھ درگزر کروگی...... اپنے لیے نہ سہی، ماہر اور انکل، آنٹی کے لیے سہی...... عون اور محمد کے لیے...... وہ تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ فلوریڈا کی پرنسز پاکستان سے واپس لوٹ آئی ہے ہم سب کے لیے...... جو تمہارے اپنے ہیں۔''

امر کی آواز کسی آکٹوپس کی طرح اسے جکڑ رہی تھی۔ اس میٹھے لہجے میں آس بول رہی تھی۔ امید چمک رہی تھی۔ وہ یقین تھا جو ٹوٹنے لگتا بھی تو جڑ جاتا۔

اور امر کو واقعی ایسا ہی یقینِ کامل تھا۔ وہ عون اور محمد کی ماں تھی...... اور مائیں کٹھور دل نہیں ہوتیں۔

مائیں کبھی بچوں سے انتقام نہیں لیتیں۔ اور نہ اپنے بچوں کو آزماتی ہیں۔

اور وہ فاطمہ احسن...... ماہر ارباب کی بیوی نہیں...... عون و محمد کی ماں بن کر واپس آرہی تھی کیونکہ فاطمہ احسن صرف عون اور محمد کی ماں تھی...... صرف عون اور محمد کی۔

☆☆☆

اور پھر نیویارک شہر میں اس روز کا چمکتا سورج ڈھل گیا تھا۔ رینگتی ہوئی رات آئی اور ہر چیز پر چھا گئی۔ یہ پچیس دسمبر کی تاریخ تھی، کرسمس کی رات چمکتی روشنیوں نے پورے نیویارک کو بقعۂ نور بنا رکھا تھا۔ پورا شہر جگمگا رہا تھا۔ پورا شہر گویا جگنوؤں سے بھرا تھا۔ پورا نیویارک دلہن کی طرح سج رہا تھا۔ شاید گوروں کے لیے کرسمس سے بڑھ کر کوئی خوشی نہ ہو۔ فاطمہ کے لیے تو عید سے بھی اوپر جہانوں کی خوشیاں بے دریغ آسمانوں سے برس رہی تھیں۔

وہ رات جو شبِ برات سے کم نہیں تھی...... وہ رات جو ملن کی رات تھی۔ اس رات فاطمہ کی بلکتی ممتا کو قرار آگیا تھا۔ اس رات فاطمہ کی بے سکون زندگی میں ٹھہراؤ آگیا تھا۔ اس نے ان دو لڑکوں کو دیکھا...... جو اس کے شانوں سے کچھ نیچے تھے۔ پھر بھی اپنی عمر سے بڑے قد...... اونچی اٹھان، صحت مند سراپا لیے ذہین آنکھیں۔ فاطمہ کے دل میں ممتا کی ایسی لہریں اٹھیں جو چودہ سال کے ہر دکھ، ہر اذیت ہر جدائی کو بہا کر لے گئیں۔ یاد رہا تو بس اتنا...... ان دو لڑکوں کے وجود میں فاطمہ کے لیے امان ہے سکون ہے، سرور ہے، خوشی ہے، عمر بھر کا قرار ہے۔

وہ عون اور محمد کو آنکھوں میں بسا، بسا کر نہیں تھک رہی تھی۔ وہ بھی ایسے بلک، بلک کر ملے کہ عمر بھر کی ساری وحشتوں کا ازالہ ہوگیا تھا۔ ان دونوں کے خوب صورت وجود میں گم ہو کر وہ ماموں، مامی کو یکسر نظر انداز کرچکی تھی۔ امر کے بتانے بلکہ جتلانے پر اسے احساس ہوا تھا سو قدرے سنجیدگی سے ماموں اور مامی کو سلام کیا...... گو کہ اس کا انداز کافی روکھا تھا پھر بھی مامی کا جوش کم نہیں ہوا...... وہ بڑی محبت جتلاتے جوش سے فاطمہ سے بھینچ، بھینچ کر ملی تھیں۔ جیسے مامی کے ساتھ فاطمہ کے بڑے اچھے تعلقات رہے ہوں۔ اپنے بیٹے کی ہر زیادتی کا اسے فون کر کر کے اور احوال پوچھ پوچھ کے ازالہ کیا تھا۔

فاطمہ کے دل میں انی سی اتر آئی تھی۔ چاہے کچھ

بھی ہو جاتا...... مامی اور ان کے بیٹے کی دی گئی ذلت کو اتنی آسانی کے ساتھ بھلا دینا ممکن نہیں تھا۔

وہ کیسے بھول جاتی، دن رات کی اس اذیت کو ماہر کے تلخ رویے کو، حقارت کو، مامی کی بیزاری کو اور اس آخری رسوائی کو...... کیا وہ سب کچھ بھلا دینا واقعی آسان تھا۔

ماموں اسے تڑپ، تڑپ کر روتے دیکھ کر پشیمان اور آزردہ ہو رہے تھے۔

''میری بیٹی! مجھے معاف کردو...... میں تمہارا کوئی حق ادا نہیں کرسکا......'' وہ اس کا سر تھپکتے بہت غم زدہ تھے۔ فاطمہ کو سنبھلنا ہی پڑا۔ آخر اس کی خرابیِ قسمت میں ماموں کا کیا دوش تھا...... وہ تو اپنا فرض حتی المقدور نبھاتے ہی رہے تھے جہاں تک ممکن ہوا، فاطمہ سے رابطہ رکھا...... تعلق نبھایا...... اسے تسلی دلاسا دیتے رہے...... ماموں بس اتنا ہی تو کرسکتے تھے۔

''مجھے یقین نہیں آرہا...... میں زندگی میں...... بقائمی ہوش و حواس کے ساتھ عون اور محمد کو دیکھ رہی ہوں۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا......'' وہ اپنے بیٹوں کو خود میں بھینچ کر روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ فاطمہ نے اتنے سال اسی نفرت میں گزارے کہ یہ دونوں اپنے باپ کی طرح ہوں گے۔ ویسے ہی سنگ دل، کٹھور، خود غرض پھر وہ کیوں خود سے اپنے بچوں کے ساتھ رابطہ کرتی...... ان سے ملتی...... وہ اس گمان میں رہی کہ خود غرض باپ کے بیٹے بھی خود غرض ہوں گے۔

لیکن فاطمہ کا یہ گمان غلط ثابت ہوگیا تھا...... وہ ناک نقشے میں اپنے باپ جیسے ضرور تھے مگر عادتوں، مزاج اور طبیعت میں فاطمہ کا دوسرا عکس......

پھر بہت دیر بعد امر نے ملن کے طویل ہوتے پروگرام کو دیکھ کر فاطمہ سے کہا۔

''فاطمہ! ان سے ملو یہ حمنہ ہیں...... عون اور محمد کی بہن......'' امر کے احساس دلانے پر فاطمہ نے گردن موڑ کر کراسنگ ایریا کے انٹرنس پر ابھی تک کھڑی اس

بابا جان ہم ادھورے ہیں بہت

زندگی اِک بے اعتبار شے ہے کسی کو خبر نہیں آنے والا وقت ہمارے لیے خوشیوں کی نوید لا رہا ہے یا غموں کا طوفانی ریلہ...... اپنوں کے بچھڑ جانے کا دکھ صرف چند لمحوں کا رونا نہیں یہ تو عمر بھر کا رونا ہے۔ خوشیوں کا موقع ہو یا غموں کے لمحات اپنے بچھڑے ہوئے بہت یاد آتے ہیں۔

12 اپریل اِک قیامت صغریٰ کا منظر، آسمان کیسا کیسا عجب رنگ دکھاتا ہے یا زمین کیسے دہلتی ہے اس دن سمجھ آگئی۔ اچانک بالکل اچانک میرے بابا ہم سے بچھڑ گئے۔ جانے والے کب لوٹ کر آتے ہیں مگر اچھے لوگ کبھی بھلائے نہیں جاتے۔ میرے بابا تھے بھی ایسے ناقابلِ فراموش...... ہر اپنے پرائے کے مددگار اور سہارا، با اخلاق، نڈر، بے باک اور بے خوف، تن تنہا اپنے حاسدوں اور دشمنوں کے سامنے سینہ سپر رہنے والے۔ ہمیشہ ہمیں حق بات کہنے کی نصیحت کرنے والے۔ آج ہم بہن بھائی جس مقام پر ہیں وہ والدین کی ہی دعائیں اور محنت ہیں۔ ہم بیٹیوں کو کبھی بابا نے بیٹوں سے کم نہیں سمجھا۔ بلکہ ہمیشہ فوقیت دی۔ امی سے اکثر باتیں چھپا جاتی تھیں ہم بہنیں مگر بابا کو اپنی ہر صورتِ حال سے آگاہ کردیتے تھے ہم بیٹیوں کو جو مان، اعتبار بابا نے دیا میری دعا ہے کہ وہ مان، اعتبار، محبت ہم سدا قائم رکھ سکیں۔ میگزین میں میرا لکھا ہوا جب بھی پبلش ہوتا خوشی و مسرت سے ان کا چہرہ دمک جاتا تھا میرا نام پڑھ کر...... ہر ماہ باقاعدگی سے میرے خطوط ارسال کرتے۔ مجھے خود میگزین لا کر دیتے۔ ہمارا معاشرہ وہ معاشرہ جہاں ڈائجسٹوں کو پڑھنا حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، جہاں بیٹیاں پڑھی لکھی ہونا فضول خیال کیا جاتا ہے ایسے معاشرے کا مقابلہ کرنے والے میرے بابا اپنی ذات میں منفرد ایسے ہی منفرد تھے اپنی تمام فیملی سے یکسر مختلف اور جیسا ہم اولاد کو چاہا ان کی تربیت خاص کی وجہ سے ہم بھی ویسے ہی سامنے آئے۔ میری کتاب اثاثۂ زیست کی اشاعت کے سلسلے میں بابا نے مجھے بہت سپورٹ کیا تھا اور ان کی خوشی دیدنی تھی۔

ہر اِک کو خوشی سے بطورِ تحفہ دیتے کہ یہ میری بیٹی نے لکھی ہے اور ہر اِک حیران کہ ایسے معاشرے میں اتنی کم عمری میں اتنی پختہ شاعری کیسے ممکن......

بابا جان ہمارے درمیان نہ ہو کر بھی ہمیشہ حیات رہیں گے۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ میرے بابا کے لیے دعائے مغفرت فرمائیں اور دعا کریں اللہ پاک ہم اولاد کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

طلبگارِ دعا، سامعہ ملک پرویز، بھیرہ خان پور ہزارہ

دس سالہ بچی کی طرف دیکھا تھا جو ہنوز پُرشوق نگاہوں سے فاطمہ کی طرف دیکھتی سرخ گلابوں کی ٹوکری اٹھائے کھڑی تھی۔

اس نے سرخ فراک پہن رکھی تھی۔ بالوں میں سرخ ربن لگا رکھے تھے۔ ہاتھوں میں سرخ گلاب پکڑ رکھے تھے۔ اور اس کی آنکھوں میں آس چمک رہی تھی۔ جیسے فاطمہ خود چل کر اس کے پاس آئے گی۔ جیسے فاطمہ عون اور محمد کی طرح اسے خود سے لپٹا لے گی...... اسے بہت پیار کرے گی۔

وہ آنکھوں میں ستاروں کی چمک لیے اسے ہی دیکھ رہی تھی...... وہ چھوٹی سی بچی نہیں...... ''حورعین'' کھڑی تھی۔ اتنی ہی حسین، مہکتی، خوب صورت کہ نگاہ ٹھہرتی اور جم جاتی...... پھر ہٹتی ہی نہیں...... فاطمہ کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ اس کے قدم ہڈسن پارک کے اس تین منزلہ ریسٹورنٹ کے فرش نے پکڑ لیے تھے۔ وہ اپنی جگہ پر جیسے جم گئی تھی۔ اس کی سانس تک رک گئی تھی۔ رگوں میں گردش کرتا لہو جیسے جم گیا تھا۔

پھر یوں لگا جیسے در و دیوار گھوم رہے ہیں۔ جیسے زمان و مکان بھول رہے ہیں۔ فاطمہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ چکرا کر گر پڑتی۔ معاً وہ بچی چلتی ہوئی فاطمہ کے قریب آئی۔ اس کی چال میں شہزادیوں کی سی نزاکت تھی، اس کی آنکھوں میں معصومیت تھی، دل کشی تھی، وہ حورعین کی حمنہ تھی...... حورعین جیسی نازک، حسین، دلفریب، ویسی ہی نزاکتوں والی...... فاطمہ کو دوسرا جھٹکا تب لگا تھا جب بچی نے پھولوں کی ٹوکری اس کے پیروں میں رکھی تھی۔ پھر دوسرے ہی لمحے وہ فاطمہ کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ ایسا والہانہ انداز تھا کہ فاطمہ کا دل بیٹھ گیا۔

حورعین کی بیٹی کا یہ والہانہ انداز اس کے دماغ کی چولیں ہلا گیا تھا۔ اس کے سر پر ریسٹورنٹ کی چھت آن گری...... وہ ننھی بچی نہیں کسی ماہر رقاصہ کی طرح گول، گول گھوم کر گیت سنا رہی تھی۔

پھر وہ گیت کے اختتام پر کورنش بجالائی...... اور بعد میں اس کا ہاتھ چوم کر کہا۔

''ویلکم ان ڈریم لینڈ ماما۔'' امر، عون اور محمد تالی بجا کر اس کی پزیرائی کرنے کی کوشش میں اسی کے انداز میں کورنش بجالائے تھے۔ پھر امر کی بیوی آمنہ نے اسے گلابوں کا بوکے دیا۔

اگر دیکھا جاتا تو ایسا استقبال بہنوں کا ہی ہوتا ہے اور فاطمہ کا تو دلہن بن کر بھی نہیں ہوا تھا۔ جب وہ فلوریڈا اسے دلہن بن کر ماموں کے گھر آئی تھی۔ اس وقت کو وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

وہ حورعین کی بیٹی حمنہ کو دیکھ کر اس قدر شاکڈ تھی کہ ہاتھ بڑھا کر اس کے بالوں کو سہلا بھی نہیں سکی۔ ویسے بھی حمنہ کی طرف اس کا ہاتھ بڑھ ہی نہیں سکا تھا۔ اس کا ظرف اور دل تنگ پڑ گیا...... وہ حمنہ کی پزیرائی نہیں کر سکی۔ کیونکہ وہ حمنہ کی پزیرائی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی پھر فاطمہ نے پورا رستہ دیکھا ہی نہیں اس ننھی بچی کا چہرہ بجھ گیا تھا۔ اور اس کی چمکتی آنکھوں میں اندھیرا اتر آیا تھا۔ سپر لگژری کیمری میں موجود کسی بھی فرد نے دھیان نہیں دیا تھا۔ حورعین کی بیٹی سب سے نظر بچا کر چپکے، چپکے آنسو بہا رہی تھی۔

☆☆☆

''اگر آپ سب کچھ کھو چکے ہیں تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں...... کیونکہ جو سب کچھ کھو دیتا ہے اس کے پاس پانے کے لیے پوری دنیا ہوتی ہے۔''

خالہ نے ایک مرتبہ فاطمہ کو بڑے جذب کے ساتھ سمجھایا تھا۔ اس وقت فاطمہ کو خالہ کی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ دراصل وہ وقت انتہائی مایوس کن تھا...... فاطمہ کو کوئی روزن دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کوئی رستہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ خود کو ایک بند گلی میں کھڑا پاتی تھی۔ جہاں پہ نہ کوئی کھڑکی تھی نہ کوئی دروازہ...... نہ روشنی تھی نہ ہوا...... وہ سب کچھ لٹا کر آئی تھی...... وہ اپنا قیمتی سرمایہ ہار کر آئی تھی۔ اس کا صدمہ، اس کا غم کوئی معمولی نہیں تھا۔ زندگی میں ہار جانا اتنا اذیت ناک نہیں ہوتا، جس قدر ٹھکرایا جانا درد ناک ہوتا ہے۔

انسان ہار جانے کی ذلت بھول جاتا ہے مگر ٹھکرائے جانے کی ذلت بھلا نہیں پاتا۔

پھر فاطمہ کے تو دُہرے نقصان ہوئے تھے...... وہ دُہری اذیتوں میں مبتلا تھی...... اس کا گھر تو ٹوٹا ہی تھا، بچے بھی چھوٹ گئے...... اپنا وطن، جگہ اور جائے پیدائش تک چھوڑنا پڑی۔

وہ گھر سے بے گھر ہوگئی تھی۔ وطن سے بے وطن ہوگئی تھی۔ اس کے سارے رشتے دار اور تعلق ختم ہوگئے تھے یہاں تک کہ بچے بھی بچھڑ گئے تھے۔

تب خالہ تڑپ کر راتوں کو روتی ہوئی فاطمہ کو ایک چیز سمجھاتی تھیں۔

''یہ زندگی ہماری خواہشات کے مطابق نہیں ہوتی...... جہاں ہماری پسند کی چیز ہمیں میسر نہ آئے یا کھو جائے...... صبر وہاں کام آتا ہے۔'' خالہ جب تک زندہ رہیں اسے صبر کے سبق ہی پڑھاتی رہی تھیں۔ اور صبر تھا کہ آتا ہی نہیں تھا...... بہت سال وہ صبر کرنے کی کوشش میں لگی رہی۔ صبر کی رمزیں سیکھتی، صبر کا قرینہ سیکھتی...... پھر بھی صبر سمجھ میں نہیں آتا تھا پھر جب بہت سا وقت گزر گیا...... ماہ و سال کا شمار کرنا ترک کیا۔ رستے زخموں پر پھاہے رکھے تو صبر کی پہیلی خود بخود سمجھ میں آگئی۔ اس نے صبر کو بچھونا بھی بنایا اور اوڑھ بھی لیا...... سو زندگی کے دن ویران ہی سہی مگر گزرتے چلے گئے۔ اسے پتا ہی نہیں چلا اور وقت اتنا آگے نکل گیا۔

زندگی کے اتنے سال چپکے سے نکل گئے...... وہ پوروں پر حساب رکھتی تو اس کی شادی کو قریب چودہ سال ہو چکے تھے اور علیٰحدگی کو دس سال......

وہ پورے دس سال بعد ایک مرتبہ پھر ماموں کے اسی کاٹیج میں گھوم رہی تھی۔ جس کے چپے، چپے پر اذیت یادیں بکھری تھیں۔ فاطمہ کے آنسو بکھرے تھے۔ اس کی آہیں بکھری تھیں۔

یہ ماموں کا وہی کاٹیج تھا جو اس کے لیے برزخ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ آج اسی کاٹیج میں فاطمہ پورے استحقاق سے گھومتی تھی اور کوئی اسے ٹوکنے والا نہیں ہوتا تھا۔

ماموں تو پہلے بھی مداخلت نہیں کرتے تھے...... ہاں مامی اور ماہر تو تھے ناں...... جو اس کے لیے سراپا جلاد تھے۔ وہی ماہر اسے دیکھ کر اتنا حیران ہوا کہ بولنا ہی بھول گیا۔ شاید اس کے گمان میں تھا۔ فاطمہ مڑ کر آئے گی ہی نہیں...... اور شاید فاطمہ کبھی نہ آتی۔ عمر بھر کے لیے اس پر لعنت بھیج دیتی۔

اگر وہ صرف ماہر کی بیوی ہوتی تو کبھی بھی اس گھر پر تھوکتی بھی نہیں۔ فاطمہ کو لوٹنا تو اس لیے پڑا تھا کہ وہ اپنے بیٹوں سے مزید جدائی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

اس کے رستوں میں عون اور محمد کھڑے تھے۔ وہ کس، کس موڑ پر انہیں نظر انداز کرتی؟ وہ کس، کس موڑ پر انہیں دیکھ کر منہ موڑ لیتی؟ یہ کام ایک سنگ دل باپ تو کر سکتا ہے مگر ایک مر مٹ جانے والی ماں نہیں کر سکتی۔

اور آج پورے دس سال بعد وہ پھر ماہر کی راج دھانی میں موجود تھی...... اور پورے اعتماد اور استحقاق کے ساتھ تھی کیونکہ پہلے اور اب کے وقت میں، سورج اور چاند جتنا فرق تھا...... دھوپ اور بادلوں جتنا فرق تھا۔ رات اور دن جتنا فرق تھا۔

حتیٰ کہ مامی بھی اس کے کسی کام میں مداخلت نہیں کرتی تھیں۔ وہ جو مرضی کرتی جیسی مرضی کوکنگ کرتی، ناپسندیدگی یا تنقید کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور ماہر بھی خاموش ہی رہتا۔

فاطمہ کو وہ وقت بھی یاد تھا جب ایک صبح اس نے ناشتے کی میز سجا کر مامی اور ماہر کو آواز دی تھی۔ وہ شادی کی پانچویں صبح تھی۔ کوکنگ میں اس کا پہلا تجربہ تھا۔ وہ بہت محنت و خلوص سے ناشتا بنا رہی تھی۔

گو کہ اسے یہ سمجھ بوجھ نہیں تھی کہ ماہر کے دل کا رستہ نہ معدے سے ہو کر آتا ہے اور نہ ہی کسی اور سمت سے...... وہ بس بڑی لگن سے ناشتا بنا رہی تھی۔ بالکل اپنی ماں کی طرح...... اس کی ماں بھی پاپا کے لیے اتنی ہی لگن سے ناشتا بناتی تھیں لیکن پاپا کا رویہ ممی سے بڑا ہتک آمیز ہوتا تھا۔ وہ کھانے کی پوری ٹرے کو جب دل چاہتا الٹ دیتے تھے۔ فلوریڈا میں اس کی ممی کے گھر

جیسا کوئی گھر نہیں ہوگا۔ اور اس کی ممی جیسی بھی کوئی ممی نہیں ہوں گی۔ فاطمہ کی ممی نے کبھی شوہر کی مار پیٹ اور بدتمیزی پر مشتعل ہو کر پولیس نہیں بلوائی تھی۔ کم از کم فاطمہ نے اپنے ہوش میں کبھی ایسا نہیں دیکھا تھا۔

اس طرح پاپا کے جیسا کوئی بدتمیز شوہر فاطمہ نے پورے فلوریڈا میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ سمجھتی تھی پوری دنیا میں صرف پاپا جیسا ایک ہی مرد ہے...... انتہائی ال مینرڈ...... اسے یہ خبر نہیں تھی کہ اس کے پاپا سے بڑھ کر بھی ایک مرد موجود ہے، جو اُن سے بدتہذیبی میں چار ہاتھ آگے تھا۔ پاپا غصے میں پوری ٹرے الٹ دیتے تھے اور ماہر غصے میں پوری میز الٹ دیا کرتا تھا۔ اس کا پہلا تجربہ فاطمہ کو شادی کے پانچویں روز ہوا تھا۔ جب ماہر کو ناشتا پسند نہیں آیا تھا۔ اس نے ایک، ایک چیز کو سونگھا اور میز الٹ دی۔ یہ حملہ اتنا اچانک تھا کہ فاطمہ سہم کر چیخ پڑی تھی۔ بے ساختہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔ پھر بھی ماہر کو رحم نہیں آیا تھا۔ وہ اگلے بیس منٹ تک چلّا رہا تھا۔ پھر اپنے میڈیکل اسکول چلا گیا۔ مامی آرام سے تماشا دیکھتی رہی تھیں۔ انہوں نے ماہر کو ٹوکا ہی نہیں تھا۔ الٹا ماہر کے جاتے ہی برس پڑیں۔

''کیا اتنا بدذائقہ کھانا پکاتی ہو؟ تبھی ماہر نے میز الٹ دی۔ تمہاری وجہ سے اتنا نقصان ہوا ہے۔ میز کا شیشہ بھی ٹوٹا اور برتن بھی...... تمہاری سزا ہے تم گھر کا سارا کام کروگی، ڈرائیو وے سے برف بھی ہٹاؤ گی۔'' یہ مامی نے محض ٹریلر دکھایا تھا۔ پھر پوری فلم تو ہنی مون سے پہلے ہی چل پڑی تھی۔ مامی کے نخریلے ماہر کو کچھ پسند نہیں آتا تھا۔ وہ پلیٹیں، گلاس، چمچے اٹھا، اٹھا کر نیچے پھینکتا تھا۔ غصے میں چلّاتا، گالیاں دیتا اور دہاڑتا رہتا تھا۔

پھر فاطمہ کو کچھ ہی عرصے بعد پتا چلا کہ ماہر کو اس کے ہاتھ کا کچھ بھی پسند نہیں تھا بلکہ سرے سے فاطمہ ہی پسند نہیں تھی۔ وہ اسے بھوتنی، کالی، بھدی اور نہ جانے کیا، کیا کہتا تھا۔

سوچوں کا طویل سلسلہ اسے پھر سے بھٹکا رہا تھا۔ معاً وہ عون کی آواز پر حال کی دنیا میں لوٹی تھی۔

اس وقت سب فاطمہ کے ہاتھ کا بنا کھانا کھا رہے تھے۔ اس کے ہاتھ کا ذائقہ پہلے جیسا ہی تھا۔ شاید ان سب کے ٹیسٹ بدل گئے تھے۔

اس کے بچے تو بہت رغبت سے کھانا کھا ہی رہے تھے مامی اور ماہر بھی خاموشی سے کھاتے رہے...... بغیر ناک چڑھائے...... ماتھے پر شکن لائے بغیر......

''شاید حورعین نے ماہر اور مامی کی عادتیں بدل دی تھیں۔'' اس نے تلخی کے ساتھ سوچا پھر خالی برتن اٹھا کر کچن میں چلی گئی۔

اسے دس سال بعد ایک مرتبہ پھر ماہر کی سلطنت میں آئے ہوئے آج آٹھواں دن تھا۔ وہ بہت جلدی اپنے بچوں کی پسند ناپسند کو جان گئی تھی۔ وہ کیا کھاتے تھے، کیا پہنتے تھے؟ فاطمہ کو چند دنوں میں ازبر ہو چکا تھا۔

وہ بڑی لگن، محنت اور چاہت سے کوکنگ کرتی رہی تھی۔ خالہ نے اسے پاکستانی کھانوں میں بھی طاق کر دیا تھا۔ گو کہ وہ اب بھی بہت لذیذ کھانا نہیں بناتی تھی پھر بھی اس کے بچے بے انتہا تعریف کرتے تھے۔

یہ بھی ایک ایسی ہی سہ پہر تھی۔

وہ کچن میں کھانا بنانے میں مصروف تھی...... اس نے کریلوں کے ساتھ سبزی کا رائتہ بنایا تھا۔ اور سویٹ میں ایپل پائی...... عون اور محمد پاکستانی فوڈ کے زیادہ شوقین تھے۔

جب اس نے رات تک کا کھانا بنالیا...... تب میز بھی سجادی تھی۔ چاہے کچھ بھی ہو جاتا تھا، بچے ماہر کے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ وہ اس کے انتظار میں بیٹھے رہتے۔ خاص طور پر حورعین کی حمنہ...... وہ تو پانی تک نہیں پیتی تھی۔ فاطمہ کو حیرانی ہوتی...... اپنی ماں والے سارے گُر اسے ازبر تھے۔ ساری اداؤں اور چالاکیوں سے واقف تھی۔ باپ کو کس، کس طرح خود تک محدود رکھنا ہے اپنی طرف متوجہ یا مصروف رکھنا ہے۔ وہ اتنی سی بالشت بھر کی لڑکی کو دیکھ، دیکھ کر حیران ہوتی تھی۔

جب اس نے ڈنر سرو کیا...... تب کریلوں کو دیکھ کر ایک مرتبہ تو ماہر کے چہرے پر استعجاب اترا تھا اسی

طرح حمنہ کے تاثرات میں بھی ناپسندیدگی نظر آئی۔ جبکہ عون اور محمد کے ساتھ مامی بھی بے نیازی سے کھانا کھا رہی تھیں۔ گویا انہیں بھی کھانے پر اعتراض نہیں تھا۔ پھر ماہر اور حمنہ کے تاثرات ایسے کیوں تھے؟ فاطمہ کو اندر ہی اندر کھد بد سی ہوئی...... لیکن وہ ماہر کے سامنے اسے مخاطب کرنا نہیں چاہتی تھی۔

بیٹی کو بے دلی سے کھانا کھاتے دیکھ کر ماہر سے رہا نہیں گیا...... اور شاید اس کی آمد کے پچیسویں دن ماہر نے خود فاطمہ کو مخاطب کیا تھا وہ بھی اپنی نخریلی بیٹی کے لیے...... فاطمہ کے اعصاب کھنچ سے گئے تھے۔

''اس کو چیز آملیٹ بنادو......'' ماہر نے حمنہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا...... وہ مخاطب فاطمہ سے تھا مگر دیکھ حمنہ کی طرف رہا تھا۔ حمنہ بھوکی رہے...... یہ اسے گوارا کہاں تھا...... کیونکہ وہ جانتا تھا حمنہ نان ویجیٹرین ہے۔ اسے سبزیاں پسند نہیں تھیں جبکہ ماہر دیکھتا تھا لنچ یا ڈنر میں سبزی ضرور ہوتی تھی...... اور اس کے ساتھ ہی کوئی اضافی آئٹم نہیں ہوتا تھا۔ حمنہ بنا ناپسندیدگی دکھائے چپ چاپ کھانا کھا لیتی تھی...... یہ اس کی بہت اچھی عادت تھی۔ وہ کوئی نخرہ یا اعتراض نہیں کرتی تھی لیکن حمنہ خود پر جبر کرے؟ یہ ماہر کی برداشت سے باہر تھا۔

اتنے دن ہو چکے تھے...... وہ خود سب دیکھ رہا تھا فاطمہ، عون اور محمد سے مینیو پوچھتی تھی۔ ان کی پسند کا کھانا بناتی تھی مگر حمنہ سے کچھ بھی پوچھنے کا تردد اس نے کبھی نہیں کیا تھا۔ اور نہ ہی حمنہ نے خفگی دکھائی تھی۔ نہ باپ سے شکایت کی...... وہ ایسی ہی فرمانبردار بچی تھی۔ وہ بہت امن پسند بچی تھی۔ لڑائی جھگڑے سے دور رہتی...... اسے پتا تھا وہ باپ سے شکایت کرے گی تو گھر میں لڑائی ہوگی۔

جب مامی، عون اور محمد اٹھ کر چلے گئے تب ایک مرتبہ ماہر نے فاطمہ سے کہا۔

''حمنہ کو کچھ بنادو...... وہ بھوکی رہے گی...... کھانا نہیں کھا رہی...... اسے سبزی پسند نہیں آئی۔'' ماہر کی آواز سن کر ایک مرتبہ پھر اس نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ حمنہ سر جھکائے بیٹھی تھی اور وہ فاطمہ کو پوری ایکٹر لگ رہی تھی۔

وہ غائب دماغی سے ماہر کو دیکھتی رہی۔ جیسے اس کی بات سمجھنا چاہ رہی ہو...... ماہر اندر ہی اندر زچ سا ہونے لگا۔ تاہم اس نے کہا کچھ نہیں تھا۔

''حورعین نان ویجیٹرین ہے، مجھے پتا نہیں تھا...... نہ اس نے کبھی بتایا۔'' فاطمہ نے خاصی سنجیدگی دکھائی۔ ماہر پانی پیتے، پیتے چونک گیا۔

''حورعین؟'' اس کی آنکھوں میں استعجاب اتر آیا تھا۔ پھر اس نے حمنہ کی طرف دیکھ کر جتلایا۔

''حورعین نہیں، حمنہ...... اس کا نام حمنہ ہے۔''

''اچھا...... میرے ذہن سے نکل گیا......'' فاطمہ نے غائب دماغی سے سر جھٹک دیا تھا۔ ماہر کے ہونٹوں پر طنز پھسل پڑا۔

''تمہارے حواسوں پر حورعین ہی سوار ہے۔ اور ہمیشہ سے سوار ہے۔''

''اور آپ کے؟'' اس کا سوال بڑا کرارا قسم کا تھا کچن کی طرف بڑھتا ماہر لمحے بھر کے لیے رک گیا۔

''ظاہر ہے میرے بھی۔'' وہ کچھ اور جواب دینا چاہتا تھا مگر بات بدل گیا۔ اچھا تھا کلستی رہتی۔ اتنا نخرہ دکھا رہی تھی حد نہیں...... ایک آملیٹ بنانا تھا یا پڈسن میں تیرنا تھا...... حد تھی اور واقعی حد تھی...... وہ غصے میں فرائنگ پین میں آئل ڈالنے لگا۔

اور فاطمہ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی تھی۔

تو وہ آج تک اور ابھی تک حورعین کا ہی اسیر تھا۔ اسی کا عاشق، اسی کے عشق میں گرفتار...... فاطمہ کے اندر لاوا بھڑکنے لگا تھا، شعلے پھیلنے لگے تھے اور حورعین آج بھی ان کے درمیان تن کے کھڑی تھی۔ کسی پہاڑ کے مانند جسے عبور کرنا کم از کم فاطمہ کے بس کا کمال نہیں تھا۔ اس کے پورے وجود پہ تھکن اتر آئی۔ افسردگی اتر آئی۔ رنجیدگی اتر آئی۔ دل چاہ رہا تھا۔ واپس کسی اندھے رستے کی طرف مڑے اور کھائی میں

جا گرے یا کسی دریا میں کود جائے۔ جہاں نہ ماہر ہو اور نہ ماہر کی حورعین......

یہ دونوں فاطمہ کی زندگی کے ناسور تھے۔ عذاب تھے، زخم تھے، نا آسودگی کا برزخ تھے۔ وہ جانے کب تک برف کے مانند جمی رہتی۔ معاً حمنہ کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔

''ماما! ڈیڈی کو چیز آملیٹ نہیں بنانا آتا...... وہ کنفیوزڈ ہیں۔'' حمنہ نے بھیگی نمناک آواز میں کہا تھا۔ جیسے باپ کی مشکل پر وہ سخت بے چین تھی۔ فاطمہ اچھی بھلی ششدر رہ گئی تھی۔ کیونکہ حمنہ کا انداز انتہائی شائستہ تھا۔ وہ اتنی سی بچی کی حسیات پر سخت متعجب تھی۔

فاطمہ نے چونک کر اوپن کچن میں دیکھا...... فرائنگ پین جل، جل کر خاک ہو رہا تھا۔ اور ماہر جانے کون سا مسئلہ حل کرنے کے لیے سوچوں میں مستغرق تھا۔

فاطمہ نے لحہ بھر کے لیے سوچا اور پھر حمنہ کو بری طرح سے جھڑک دیا۔

''اتنا باپ کا خیال ہے تو خود کر لو...... میری جان چھوڑو...... میں تمہارے باپ کی نوکر نہیں......'' اس کی آواز نہ چاہتے ہوئے بھی بلند ہو گئی تھی۔ یوں کہ ماہر تک ٹھنک کر مڑا تھا اور حمنہ بھی ڈر کر سہم گئی تھی۔ اس کا انداز خاصا جارحانہ تھا۔

ماہر کی چبھتی نگاہوں کی تپش پا کر وہ الٹے قدموں اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ جاتے، جاتے اس نے حمنہ کے چکنے گلابی گالوں پر آنسو بکھرتے دیکھے تھے۔ لمحے بھر کے لیے فاطمہ کو اپنے روڈ رویے پر افسوس ہوا پھر وہ سر جھٹک کر اندر چلی گئی کیونکہ ماہر کی نظروں میں کچھ ایسا تاثر ضرور تھا کہ جس نے فاطمہ کے دل کو اٹکا دیا۔ جیسے اسے امید نہیں تھی کہ فاطمہ، حمنہ کے ساتھ اتنا روڈ بی ہیو یئر رکھے گی۔

پھر اس ساری رات فاطمہ کو نیند نہیں آئی۔ وہ پوری رات جاگتی رہی، سوچتی رہی...... جیسے ضمیر کی چبھن کا شکار ہو جیسے ساری رات حمنہ کے آنسو اسے بے چین کرتے رہے ہوں۔ پھر بھی وہ حورعین کی طرح خود کو کٹھور ہونے کا درس دے کر مضبوط کرتی رہی تھی۔ آخر حورعین نے گیارہ سال اس کے شوہر پر قبضہ جما کر اسے جلاوطن کیے رکھا تھا۔ اگر حورعین بے حس تھی تو فاطمہ بھی اس کی بیٹی کے لیے اتنی ہی بے حس ہو سکتی تھی۔

☆☆☆

چودہ سال پہلے وہ فلوریڈا سے نیویارک آئی تھی۔ پھر چار سال سے بھی کم مدت کے بعد ذلت اور رسوائیوں کے داغ لے کر پاکستان چلی گئی۔

اس نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیوں کیا تھا؟ وہ فلوریڈا واپس کیوں نہیں گئی؟ فاطمہ آج بھی اسی سوال کے گرد گھومتی تھی۔

ماہر کی بے وفائی کا صدمہ لے کر اسے فلوریڈا جانے سے امر نے روکا تھا۔ وہی تو تھا جس نے بھاگ دوڑ کر کے فاطمہ کا پاسپورٹ بنوایا تھا۔ پاکستان کا ویزا لگوایا تھا۔

یہ امر کی خواہش تھی کہ فاطمہ پاکستان چلی جائے...... وہاں جا کر حورعین کی ماں یعنی اپنی خالہ کو اس کے کرتوت بتائے...... کیا خبر اس کی ویران اور اجڑی زندگی کی کہانی سن کر خالہ کو جلال آ جائے...... وہ امریکا پہنچ کر ماہر اور حورعین کی طلاق کروا دیں۔

تب فاطمہ کو بھی یہی مناسب لگا تھا...... پھر فلوریڈا میں اس کا کوئی ٹھکانا بھی نہیں تھا۔ اپنے بے حس باپ کے پاس وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ ویسے بھی تعلیم اس کے پاس نہیں تھی۔ ہنر کوئی آتا نہیں تھا۔ نہ کوئی جاب تھی، نہ فنانشلی اسٹرانگ پوزیشن تھی...... اسے پتا تھا کہ پاکستان میں اس کی خالہ بہت امیر ہیں...... کم از کم فاطمہ کو رہنے کے لیے چھت اور عزت کی روٹی تو ضرور ملے گی۔ اس سے زیادہ کی اسے چاہ نہیں تھی۔

وہ پاکستان تو چلی آئی...... خالہ کو اپنی دردناک کہانی بھی سنائی۔ خالہ نے اس غم کو سر پر سوار بھی بہت کیا...... اسپتال جا پڑیں۔ حورعین سے قطع تعلقی کر لی...... اور قسم کھائی کہ زندگی بھر اس سے کلام نہیں کریں گی...... حالانکہ فاطمہ نے بہت زور دیا تھا۔ بہت کوشش کی...... خالہ امریکا جائیں...... بیٹی سے پوچھیں...... اسے غیرت دلوائیں...... ماہر کو مجبور کریں، وہ اسے طلاق دے...... مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ خالہ نے حورعین سے بات ضرور کی تھی مگر اس کے بعد وہ چپ سی ہو گئی تھیں۔

انہوں نے پھر حورعین کو برا بھلا نہیں کہا تھا۔ بلکہ ایک چپ کی بکل میں گم ہو گئیں۔ فاطمہ نے لاکھ سر پیٹا مگر جواب ندارد تھا۔ وہ اسے صبر کرنے کا بس مشورہ دیا کرتی تھیں۔

حالانکہ امر بھائی کے کہنے پر فاطمہ نے رو، رو کر سارا واقعہ بار، بار خالہ کو سنایا تھا۔

''صرف اپنے عشق کی آگ بجھانے کی خاطر ماہر نے مجھے بدکردار کہا...... عیاش کہا...... کال گرل کہا...... اور بچے چھین کر مجھے گھر سے نکال دیا...... مجھے ہر رشتے سے بے دخل کر دیا...... صرف اس حورعین کی وجہ سے...... آپ کی بیٹی نے میرا گھر اجاڑ دیا......'' وہ ساری، ساری رات روتی اور تڑپتی تھی...... اسے غم کے لمبے، لمبے دورے پڑتے...... بہت سال وہ دنیا سے کٹی رہی...... یہ خالہ کی کوششیں اور بددعائیں تھیں جو رنگ لائی تھیں اور فاطمہ بہت سال کے بعد کچھ سنبھل گئی تھی۔

اس وقت وہ کالج کی سیڑھیوں پر کھڑی تھی۔ یہاں سے امریکی ہائی وے کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ دنیا کا بہترین ٹریفک نظام امریکا میں دکھائی دیتا۔ جگہ، جگہ سائن بورڈوں پر شہروں، قصبوں اور ریاستوں کے میں بارے میں لکھا ہے۔ کوئی بھی اجنبی محض نقشے کی مدد سے پورے امریکا کی سیر کر سکتا ہے۔ کسی سے رستہ پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں۔

لیکن فاطمہ ایک ایسی امریکی لڑکی تھی جو نقشے کو پکڑ کر بھی اجنبیوں سے اپنے ہی گھر کا رستہ پوچھتی پھرتی...... چاہے کوئی ٹھیک بتاتا یا غلط...... فاطمہ کو اندھا دھند دوسروں کی انگلی پکڑ کر چلنے کی عادت تھی...... ایک بات تو سچ تھی...... اس نے کبھی اپنی عقل کا استعمال

رونے کا فائدہ

امریکا کے ایک ممتاز ماہرِ نفسیات ڈاکٹر ولیم فیری نے اپنی طویل تحقیق کے بعد انکشاف کیا ہے کہ آنسوؤں کا انسان کی صحت کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ ان کی تحقیق کے نتیجے میں یہ بات ظاہر ہوئی ہے کہ جذباتی دباؤ کے وقت انسانی جسم میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور جسم کے اندر مختلف غددوں سے خاص مواد نکل کر خون میں شامل ہو جاتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ رونے کے بعد انسان خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے۔ ڈاکٹر فیری کا خیال ہے کہ جذباتی دباؤ کے نتیجے میں جسم میں کیمیاوی عمل ہوتا ہے۔ وہ آنسوؤں کے ذریعے زائل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ روتے نہیں ہیں وہ مختلف قسم کے امراض میں بالخصوص السر کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر فیری نے تحقیق کی ہے کہ عورتوں کی نسبت مرد زیادہ السر کے مریض ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ جذباتی آنسو، پیاز کے ذریعے بہنے والے آنسوؤں سے کیمیاوی طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر فیری نے سو افراد کو پیسے دے کر ان کے آنسو حاصل کیے اور ان پر مختلف تجربے کیے ہیں۔

مرسلہ: ماریہ عقیل، لاہور

نہیں کیا تھا۔ اسی لیے ماہر اپنی ماں پر چلاتا رہتا تھا۔

''کس احمق اور بدھو کو میرے ساتھ باندھ دیا...... اس میں عقل نام کی نہیں...... اتنی احمق اور گاؤدی ہے...... کسی بات کا پتا نہیں چلتا...... فلوریڈین گائے ہے۔'' ماہر کی بازگشت آج بھی فاطمہ کو سالوں پیچھے لے جاتی تھی۔ تب بھی وہ احساسِ توہین پر رو پڑتی...... چیخ اٹھتی اور پاگل ہو جاتی تھی۔

اور جب وہ صدمے کی انتہا پر بھاں، بھاں کر کے روتی تب بھی ماہر کا پارہ آسمان پر چڑھ جاتا......

''اس کو رونے کا بھی سلیقہ نہیں...... کوئی ایسے

روتا ہے؟ آخر حورعین بھی تو ہے ناں...... وہ تو ایسی نہیں...... وہ تو بالکل ایسی نہیں...... آپ کو یہ الو کی دم ملی تھی میرے لیے...... کیا حورعین دکھائی نہیں دی......؟'' ماہر جب بولنے پر آتا تو ذرا بھی لحاظ نہیں رکھتا تھا۔ ایسے، ایسے فضول الفاظ کا استعمال کرتا تھا کہ بندہ مٹی تلے گھس جانے کی خواہش کرنے لگتا۔

پھر ماہر کو اس کی عمر پر بھی اعتراض تھا۔ اسے میچور لڑکیاں پسند تھیں۔ حورعین جیسی...... فاطمہ کم عمر تھی...... اسے ڈریسنگ کرنے کا، کوکنگ کا، گھر سنوارنے اور شوہر کا دل جیت لینے کا طریقہ نہیں آتا تھا۔ جانے وہ کون عورتیں ہوتی ہیں جنہوں نے اتنے، اتنے دیوہیکل شوہروں کو بھی دام میں کر رکھا ہوتا ہے۔ ایک فاطمہ تھی اسے شوہر کے چہرے پر مسکراہٹ لانے کا بھی طریقہ نہیں آتا تھا۔

اوپر سے مامی اس کی انسلٹ پہ بہت خوش ہوتی تھیں۔ اصل میں حورعین انہیں بھی پسند تھی اور فاطمہ کی پوری فیملی کو وہ سخت ناپسند کرتی تھیں۔ شاید اس کے پاپا کی وجہ سے ورنہ اس کی ممی تو آئیڈیل ماں بلکہ آئیڈیل عورت تھیں۔ صوم وصلوٰۃ کی پابند، شرمیلی، نیک اور دبو...... انہوں نے فاطمہ کی تربیت بھی ایسی ہی کی تھی۔ یہ خبر نہیں تھی کہ ان کے بھتیجے کو ایسی لڑکیوں سے انتہائی چڑ اور نفرت تھی۔

وہ بااعتماد اور باوقار لڑکیوں کو پسند کرتا تھا۔ جو سوبر ہوں، دھیما بولیں، کسی بھی پرابلم کو سولو کرنے کے پہلو سوچیں ناں کہ چیخ، چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھالیں۔ اسے جذباتی اور اعصابی طور پر مضبوط، پاورفل اور اسٹرانگ خواتین اچھی لگتی تھیں جبکہ فاطمہ میں ایسی کوئی بھی خوبی نہیں تھی۔

وہ خود سے کوئی بھی فیصلہ نہیں کر پاتی تھی۔ اگر کوئی اسے مشورہ دیتا، اچھا یا برا تو وہ اس پر آنکھ بند کر کے اعتبار کرلیتی...... دل و جان سے عمل کرنے کی کوشش کرتی...... خود سے اس کے اچھے، برے پہلو پر غور نہیں کرتی تھی۔

اس کی ممی نے بہت حد تک اسے محتاج بنا ڈالا تھا۔ وہ کبھی اکیلی گھر سے اسکول تک نہیں گئی تھی۔ ممی نے اسے سہیلیاں بھی بنانے نہیں دیں۔ اسے اسٹور تک جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اپنے تئیں ممی اسے ارد گرد کے بے باک ماحول کی پرچھائیوں سے دور رکھتی تھیں۔ یہ خبر نہیں تھی کہ بیٹی میں اعتماد ختم ہوتا جارہا ہے۔ وہ ماہر جیسے بندے کے ساتھ کس طرح سے رہے گی؟ کیسے گزارہ کرے گی؟ نیویارک کی کھلی سڑکوں کو دیکھتی وہ فلوریڈا میں ممی کے پہلو سے جا چپکی......

''اُف یادیں اور رُلا دینے والی یادیں......'' ممی کی یاد نے اسے نمناک کردیا تھا۔ جیسے ہی اس نے گردن گھمائی پیچھے ماہر کو کھڑا دیکھ کر حواس باختہ ہونے کے بجائے اکڑ گئی۔

وہ سمجھ گئی تھی کہ ماہر اس کی تلخ کلامی پر باز پرس کرنے آیا ہے۔ مگر وہ ہوتا ہے کون تھا باز پرس کرنے والا؟ دس سال پہلے اس کی ناک تلے عشق کا کھیل رچا کر، اپنی محبوبہ سے ایک بچی پیدا کر کے آج بھی اتنا تن کے کھڑا تھا۔ جیسے اسے اپنے کسی بھی عمل پر پشیمانی نہیں تھی۔

جیسے اسے اپنی پہلی بیوی کو گھر سے دھتکارنے اور بچے چھین لینے پر کوئی ندامت نہیں تھی۔ اگر وہ اپنے بچوں کی خاطر اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آ ہی گئی تھی تو کم از کم ماہر کا فرض تو بنتا تھا۔ فقط ایک لفظ معذرت اور شرمندگی کا اس کی سماعتوں میں اتار دیتا لیکن فاطمہ کو لگتا وہ اس کے لوٹ آنے پر کچھ اور اکڑو خان بن گیا تھا...... اندر ہی اندر جانے کتنا مسرور ہے...... ایک بیوی کو دھتکار کر، دوسری شادی بھی رچالی...... بیٹی بھی ہوگئی...... اور محبوبہ کے مرجانے کے بعد پہلی بیوی نے گھر بھی آ کے سنبھال لیا...... کتنے مزے تھے ان مردوں کے جو یورپی ہوتے ہیں یا پاکستانی...... ویسے بھی پاکستانی مغرب کے ماحول میں پیدا ہوکر بھی ذہنی طور پر رہتے پاکستانی ہی ہیں، وہی بیویوں کو نیچا دکھانے والی پرانی اور گھٹیا برصغیرانہ غلام قسم

کی سوچ......

اس وقت فاطمہ اندر ہی اندر پیچ وتاب کھاتے ہوئے ماہر کے بولنے کا انتظار کر رہی تھی۔ پھر کافی دیر بعد ماہر کو خود ہی بولنا پڑا...... شاید وہ فاطمہ کی پہل کا انتظار کر رہا تھا۔

''حمنہ کے ساتھ اتنا روڈلی بی ہیو کرنے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟'' وہ جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر بہت کڑے تیوروں کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔ فاطمہ کے اعصاب بھی تن گئے تھے۔ حمنہ کے لیے اس کی چاہت پہ وہ شدید جلن محسوس کر رہی تھی۔ حالانکہ ایک بچی سے کیا حسد کرنا؟ لیکن وہ اپنی کیفیات سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

''میں ایسی ہی ہوں۔'' اس نے اپنے تئیں بڑا تنک کر کہا تھا...... ماہر کو شاید ایسے جواب کی توقع نہیں تھی۔ وہ لمحے بھر کے لیے چپ کر گیا تھا۔

''میں تو سمجھا تھا کہ تم میں کچھ تبدیلی آچکی ہے لیکن تم تو وہی ہو...... میں نے ہی تمہیں دوبارہ بلوا کر غلطی کی......'' اس کے انداز میں تاسف بھر گیا تھا۔ اور فاطمہ کے تو سر پہ جا لگی تھی...... اس کی آنکھیں احساسِ توہین سے لال ہوگئیں۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' فاطمہ نے غصے سے کہا۔

''بہت خوب، مطلب بھی میں ہی سمجھاؤں تمہیں...... اپنا کیا دھرا بھول چکی ہو...... جو کچھ تم نے کیا...... وہ ایسا شرمناک تھا کہ تمہیں تو میرے سامنے اتنا اکڑ کر کھڑے ہوتے ہوئے بھی سو مرتبہ سوچنا چاہیے تھا۔ مگر تم اپنے انگریز بے مذہب اور بے دین باپ کی طرح ڈھیٹ اور بے غیرت ہو۔'' ماہر کے الفاظ نے فاطمہ کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ اس کا چہرہ دہکنے لگا۔ آنکھیں آگ برسانے لگیں۔

''جسٹ شٹ اپ......'' وہ چلا اٹھی تھی۔

''چلاؤ مت فاطمہ...... میں خود بھی ماضی کو دُہرانا نہیں چاہتا...... اور ایسا قابلِ فخر ماضی ہے بھی نہیں...... جسے اچھے دنوں کی طرح یاد کیا جائے...... اگر میں سب کچھ بھلا چکا ہوں تو تم بھی پچھلی باتیں بھول جاؤ۔

بہتری اسی میں ہے...... اور باقی یہ ہے کہ حمنہ کے ساتھ برتاؤ میں تبدیلی لاؤ...... وہ اتنی سمجھدار نہیں جو تمہاری تلخی کو برداشت کرسکے۔'' ماہر کا لہجہ اب بھی روکھا اور کھردرا تھا۔

''میں نے حمنہ کو کیا کہہ دیا؟'' وہ اب کی دفعہ کچھ پست آواز میں بولی۔

''جو کہا ہے اب ایسا مت کہنا...... میری بیٹی بہت ہی حساس ہے۔'' ماہر نے جیسے وارننگ دینے والے انداز میں کہا تھا۔ پھر نپے تلے قدم اٹھاتا پلٹ گیا۔ جبکہ فاطمہ ہونٹ کاٹتی غصے میں بڑبڑاتی رہ گئی۔

☆☆☆

ماہر سے اس دن کی تلخ کلامی کے بعد دوبارہ بات نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ حمنہ کے حوالے سے ماہر کی شکایات دور ہوچکی تھیں۔ فاطمہ خاص طور پر ماہر کی موجودگی میں جتا، جتا کر حمنہ سے پوچھتی تھی۔

''آج لنچ میں کیا ہو؟ یا ڈنر میں کیا بناؤں؟'' وہ واضح طور پر ماہر کو سنا کر حمنہ کو مخاطب کرتی تھی جواباً حمنہ اپنا فرمائشی پروگرام بے تکلفی سے نشر کردیتی۔ فاطمہ نے ایک بات شدت سے نوٹ کی تھی۔ حمنہ بہت زیادہ فاطمہ کے قریب ہونا چاہتی تھی۔ وہ بہانے، بہانے سے فاطمہ کو متوجہ کرتی...... اس سے پیار لینے کی کوشش کرتی اور پھر بہت لاڈ سے گلے میں باہیں ڈال کر جتاتی۔

''ماما......! آپ میری پرنسس ہیں۔'' اکثر لاڈ کے یہ مظاہرے ماہر کے سامنے ہونے لگے تھے۔ اور وہ ٹی وی دیکھتا اچانک چونک جاتا تھا۔

''ایسا قاتلانہ جھوٹ......'' اس کی بڑبڑاہٹ بہ آسانی فاطمہ کے کانوں تک بھی پہنچ جاتی تھی گوکہ وہ جواب نہیں دیتی تھی اور نہ ہی ظاہر کرتی تھی کہ اس نے ماہر کی بڑبڑاہٹ سن لی ہے تاہم وہ جانتا ضرور تھا کہ اندر ہی اندر وہ سلگتی ہے۔ حمنہ اکثر اپنے ایکسٹرا لاڈوں کی وجہ سے اسے شرمندہ کرواتی تھی۔

ایک دن بڑے جوش میں کہنے لگی۔

''میری ماما سے اچھی کوکنگ کوئی نہیں کرتا...... آپ میرے لیے نوڈلز بنائیے گا۔ چکن نوڈلز......'' حمنہ

اس کے رویے میں روکھا پن پا کر بھی بڑے دعوے سے فرمائشیں کرتی تھیں۔ تب ماہر بھی اخبار دیکھتا متوجہ ہوا۔ پھر چھت کی طرف دیکھ کر بڑبڑاتا ہوا اٹھا تھا۔

’’اللہ میرے بچوں کے معدوں پر رحم کرے۔‘‘ کچن کی طرف جاتی فاطمہ لمحے بھر کے لیے رک گئی تھی پھر اس نے تیکھے ابرو اٹھا کر کہا۔

’’مجھے سمجھ نہیں آتی...... میرے ہاتھ کا پکا کھانا کھا کر لوگ اب میزیں کیوں نہیں الٹتے...... ایک بات پہ سارا کریڈٹ حمنہ کی ماں کو ضرور جاتا ہے...... اس نے ناک میں نکیل ڈال کر پالنے کے بگڑوں کو سدھار دیا...... یہ کمال حورعین کے ہی پاس تھا۔‘‘ اس کا انداز بھرپور سراہتا ہوا تھا...... ماہر باہر جاتا، جاتا رک گیا۔

’’چلو، تم نے کسی بات پر حورعین کو کریڈٹ تو دیا۔‘‘

’’حورعین تو آسکر کی حقدار تھی...... دوسروں کے گھروں پہ شب خون مارنا عام بندے کا کام نہیں ہوتا۔‘‘ اس کے طنز کی کاٹ کو جانے کیسے وہ ضبط سے پی گیا تھا۔ شاید حمنہ کا احساس کر کے...... ورنہ فاطمہ تو جانتی تھی منہ توڑ جواب دیے بغیر وہ رہ نہیں سکتا تھا۔

’’ذرا اپنے الفاظ میں ترمیم کرلو...... شب خون حورعین نے نہیں مارا بلکہ تم نے ہماری زندگیوں میں کسی ناگہانی بلا کی طرح انٹری دی تھی، مجھے کچھ دہرانے کی ضرورت نہیں...... تم ایک، ایک حقیقت سے آشنا ہو۔‘‘ اس نے جس بات کی طرف اشارہ دیا تھا وہ فاطمہ اچھی طرح جانتی تھی...... یہ ایک ویک پوائنٹ تھا...... سو وہ چپ کر گئی۔

’’میں نے کسی کے ساتھ لو میرج نہیں کی تھی...... نہ میں کورٹ میرج کے ذریعے آئی...... مجھے مامی اور ماموں شادی کر کے لائے تھے۔‘‘ فاطمہ نے بڑے دوٹوک انداز میں جتایا تھا۔

’’اور ابھی تک میں اسی گناہ کی سزا بھگت رہا ہوں۔ اللہ کرے کسی کا بھی کسی بے عقل عورت سے واسطہ بھی نہ پڑے۔‘‘ ماہر کا انداز ہلکا پھلکا ہی تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بات بڑھ کر اور رخ اختیار کرلے۔

تعلقات ویسے بھی خاصے کشیدہ تھے۔ مزید کشیدگی کی گنجائش نہیں تھی۔

’’آہ...... عقل مند عورت تو ملی تھی...... بس نصیب ہی خراب تھے۔ حورعین ہوتی تو میں یہاں نہ ہوتی۔‘‘ اس نے بڑی تلخ اور کاٹ دار بات کی تھی۔ ماہر لمحے بھر کے لیے چپ ہوا جیسے کچھ ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

’’حورعین ہوتی بھی تو تم یہیں ہوتیں، حورعین کا مرجانا کوئی بہانہ نہیں بنا تھا۔ اس کی زندگی میں ہی اگر مجھے کچھ حقیقتوں کا پتا چل جاتا تو تب بھی تم یہیں ہوتیں۔‘‘ اس نے بڑے مستحکم لہجے میں جواب دیا تھا۔ اب چپ ہونے کی باری فاطمہ کی تھی۔

’’تو گویا دس سال کا کشٹ کاٹنے کے بعد آپ کو احساس ہوا کہ تب کچھ غلط ضرور ہوا تھا؟‘‘ وہ جیسے شدت غم و غصے سے پھٹ پڑی تھی۔

’’غلط ہوا نہیں تھا فاطمہ......! تم نے غلط کیا تھا؟ مان جاؤ کہ تم انتہائی احمق ہو...... جو بھی ہوا تمہاری بے خبری میں ہوا...... جس کا بھگتان ہم سب نے بھگتا...... سزا تم نے بھی کاٹی اور میں نے بھی......‘‘ ماہر لب بھینچ کر خاموش ہوگیا۔

’’سزا کس نے کاٹی؟ ماہر ارباب نے...... ہرگز نہیں تم نے تو حورعین کے ساتھ اچھا وقت گزارا...... امتحان تو سارے میرے لیے تھے۔ میں نے اپنے بچوں کی جدائی سہی...... ملک بدر ہوئی...... ایک گھٹن زدہ زندگی تک محدود رہ گئی تھی اگر خالہ نہ ہوتیں تو میں مرجاتی۔‘‘ فاطمہ کے جانے کون، کون سے ٹانکے اُدھڑ گئے تھے۔

’’اور مجھے میرے باپ کا آخری منہ دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوا۔‘‘

’’اس کا تو نام ہی مت لو......‘‘ ماہر کا انداز ہر خند تھا...... مامی اور ان کا لخت جگر فاطمہ کے پاپا کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ شاید وہ انگریز تھے یا پھر کوئی اور وجہ......؟

’’تو پھر کس کا نام لوں......؟ اس آزمائش کا جو

میرے ہی نصیب میں تھی...... اس امتحان کا جو دس سال پر محیط ہوگیا تھا...... کون میرے دس سالوں کے عذابوں کا حساب دے گا؟ کون میرے ماہ و سال کا حساب دے گا؟ میرے بچوں نے جو میرے بغیر وقت گزارا...... میں نے اپنے بچوں کی جدائی کس طرح برداشت کی کوئی میری تکلیف کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔‘‘ فاطمہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔ شاید ماہر کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا...... وہ خاموش ہوگیا تھا۔

’’لوگ خوش نصیب ہیں جو چاہتے ہیں پالیتے ہیں۔‘‘ اس کا اشارہ حورعین کی طرف تھا۔ وہ بڑے درد بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ جیسے اسے مری ہوئی حورعین پہ بھی رشک آرہا تھا۔

ماہر اسے دیکھتا رہا...... وہ آج بھی ایسی تھی جلد باز، جذباتی، بات بے بات آنسو بہانے والی... جلدی بدگمان ہونے والی...... ہر تاثر کو ظاہر کر دینے والی۔

’’تم حورعین کی بات کر رہی ہو؟‘‘ ماہر نے عجیب انداز میں پوچھا تھا۔

’’ظاہر ہے...... حورعین کے بجائے کوئی اور اتنا قابل رشک ہوسکتا تھا؟‘‘ وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی تھی۔

’’اچھا...... بھلا وہ کیسے خوش نصیب تھی؟‘‘ ماہر نے اگلا سوال داغا...... فاطمہ بغیر رکے شروع ہوچکی تھی۔

’’اس کے پاس اتنی قابلیت تھی، وہ اتنی کامیاب تھی پھر اسے من چاہی محبت ملی......‘‘ اس کا لہجہ حسرت آمیز ہوچکا تھا۔ ماہر اسے تاسف سے دیکھتا رہا۔

’’مجھے آج پتا چلا ہے حورعین کو تمہارے حسد کی نظر لگ گئی تھی۔‘‘ اس کے لہجے میں ایسا کچھ ضرور تھا...... جس پر وہ چلا اٹھی تھی۔

’’میں کیوں اسے نظر لگاتی؟ وہ میری خالہ زاد بہن تھی۔‘‘

’’لیکن تم نے ہمیشہ اس سے نفرت کی۔‘‘ ماہر کو جتلانا پڑا تھا۔ فاطمہ چپکی سی رہ گئی۔

’’اس نے میرا گھر اجاڑا تھا۔‘‘

’’اس نے تمہارا گھر نہیں اجاڑا تھا...... یہ کام تم نے خود کیا......؟‘‘ ماہر اپنی بات پر زور دے کر بولا تھا...... فاطمہ ہکا بکا رہ گئی۔

’’میں نے خود؟‘‘ اس کی آواز لڑکھڑا گئی...... ’’مگر کیسے......؟‘‘ اس کا دل کسی انہونی کے خوف سے تیز تیز دھڑکنے لگا۔ ماہر لمحے بھر کے لیے خاموش ہوگیا جیسے کسی سوچ میں گم ہو... اس کے چہرے پر تفکر کا جال تھا اور ان سارے ماہ و سال کی کہانی درج تھی جس کا وقت اور ایک، ایک لمحہ بھاری تھا۔ اتنا ہی بھاری جس قدر فاطمہ پر بھاری تھا۔

وہ جانے کیا، کیا سوچتا رہا کس، کس انداز میں سوچتا رہا۔

پھر جب بولا تو اس کی آواز پہلے کی طرح روکھی اور کھردری تھی۔

’’اپنے باپ پر بھروسا کر کے......‘‘ ماہر کے جواب نے فاطمہ کو سرتاپا فریز کر دیا تھا۔

☆☆☆

’’ضد اور ہٹ دھرمی صحیح رائے کو بھی دور کر دیتی ہے۔‘‘

یہ بات بہت پہلے فاطمہ کی ممی نے اس کے لیے کہی تھی اور وہ حیران ہوتی تھی کہ اس میں ضد اور ہٹ دھرمی کہاں ہے؟ اپنے تئیں وہ بڑی فرمانبردار تھی، ممی کی ہر بات مانتی تھی۔ ان کی ہر بات کو سمجھتی تھی...... لیکن ممی نے کہا تھا۔

’’فاطمہ خاموش ضدی اور خاموش ہٹ دھرم ہے۔‘‘ اس بات کا بھلا کیا مفہوم تھا؟ فاطمہ کبھی نہ سمجھ پائی لیکن اتنا ضرور تھا کہ اس میں کچھ عادتیں اپنے باپ والی ضرور موجود تھیں...... اس کا باپ بھی ہٹ دھرم تھا...... اپنی بات پر ڈٹا رہتا اور منواتا چاہے دنیا اِدھر سے اُدھر ہوجاتی فاطمہ بھی ضدی اور ہٹ دھرم تھی۔ گو کہ وہ اپنے باپ کی طرح شور نہیں مچاتی تھی مگر اندر ہی اندر وہ اپنی سوچی ہوئی رائے پر قائم رہتی...... چاہے وہ رائے

غلط ہوتی یا ٹھیک ہوتی...... وہ اپنے ذہن میں آئی سوچ پر عمل کر گزرتی تھی...... لیکن اس کے لیے بھی کوئی نہ کوئی اس کی پشت پناہی ضرور کرتا تھا۔ ماموں کے گھر دس سال بعد آ کر بھی وہ ان نکتوں کو آج تک سوچ نہیں پائی تھی جو ماہر اور اس کے درمیان علیٰحدگی کا باعث بنے تھے۔

اس کی اپنی سوچ اور خیال حورعین تک ہی محدود تھے...... وہ حورعین جو اس کی زندگی میں بھونچال لائی تھی۔ وہ حورعین جو اس کی زندگی میں تہلکہ مچا گئی تھی۔

لیکن اس کے پیچھے کوئی ایک وجہ بھی ضرور تھی...... یہی ناں کہ ماہر ارباب کو حورعین سے محبت تھی...... اس سے بڑی وجہ علیٰحدگی کے لیے اور کیا ہو سکتی تھی۔

چھٹی کے روز مامی نے ایسے ہی حورعین کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔

''بعض لوگ بڑے ہی بدقسمت ہوتے ہیں۔ نہ قابلیت ان کے کام آتی ہے نہ حسن اور نہ ہی محبت......'' مامی کے لہجے میں آج بھی حورعین کے لیے ہمدردی محسوس ... کی جا سکتی تھی...... آہ، حورعین جا کر بھی ان لوگوں کی زندگیوں میں موجود تھی۔ پھر بھی یہ لوگ سمجھتے تھے حورعین بدقسمت ہے۔

''آپ کے بیٹے نے اس سے عشق فرمایا تھا۔ پھر بھی وہ بدقسمت تھی؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی فاطمہ کے لہجے میں جلن در آئی تھی۔

''حورعین کو تو نظر ہی کھا گئی۔ عشق، محبت کسی کے کام کیا آتے ہیں؟ جب قسمت ہی ساتھ نہ دے۔'' مامی کا لہجہ ہنوز وہی تھا۔

''اسے ماہر مل گیا تھا تب بھی وہ بدنصیب تھی؟'' اس نے کڑھتے ہوئے کہا۔

''ماہر تو تمہیں بھی مل گیا تھا...... ماہر کا مل جانا کیا خوش قسمتی کی علامت ہوتا ہے؟'' مامی کے اگلے الفاظ اسے ہکا بکا کر گئے...... کچھ پل کے لیے فاطمہ کچھ بول نہیں پائی...... ایک دم گم صم ہو گئی تھی۔

''ماہر کو مجھ سے محبت تو نہیں تھی ناں......'' اسے بات کرنے کے لیے ایک پوائنٹ مل ہی گیا تھا۔

''اچھا......'' مامی کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا......''اگر محبت نہیں تھی تو دس سال بعد تم یہاں نہ ہوتیں۔'' ان کا انداز بھرپور جتلانے والا تھا۔

''میرا یہاں دوبارہ آنا ماہر کی مجبوری نہیں ......اسے بچوں کی خاطر مجھے بلوانا پڑا......'' وہ سبزی کاٹتی بہت آزردہ ہو گئی تھی۔ جانے کیا، کیا باتیں یاد آنے لگی تھیں۔ عموماً وہ گزری باتیں بھلاتی ہی نہیں تھی۔

''تم جو بھی سمجھ لو......'' مامی نے گہری سانس کھینچی۔

''محبت اسے بس حورعین سے تھی۔'' اس نے جلے دل کا پھپھولا پھوڑ ہی دیا۔

''اس کا جواب ماہر سے لینا۔'' انہوں نے صاف دامن بچا لیا۔

''ماہر بھلا کیا جواب دے گا۔ اس کی نشانی کو سینے سے لگا تو رکھا ہے......'' فاطمہ نے کلس کر کہا۔ اشارہ حمنہ کی طرف تھا کیونکہ حمنہ میں ماہر کی جان بند تھی۔ وہ حمنہ کے معاملے میں ذرا سی کوتاہی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

''کمال ہے۔'' مامی کو پھر سے طنز سوجھا تھا۔

''تمہاری بھی دو نشانیوں کو اس نے سینے سے ہی لگا رکھا تھا۔'' ان کا اشارہ اس کے بیٹوں عون اور محمد کی طرف تھا۔

''لیکن میرے ساتھ زیادتی تو کی تھی ناں......'' اسے اپنے خسارے رہ، رہ کر یاد آنے لگے۔''مجھے گھر سے نکالا تھا......''

''یہ تمہاری اپنی غلطیوں کا خمیازہ تھا...... ٹھیک ہے تب ماہر غصے میں تھا...... لیکن اس نے تمہیں بعد میں بلوایا بھی تھا۔'' مامی نے جتلاتے ہوئے کہا تھا...... فاطمہ کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

''کب بلوایا تھا... کب؟'' اسے تو پچھلے دس سالوں میں ایک بھی ماہر کی فون کال موصول نہیں ہوئی تھی۔

اور مامی کیسا سفاک جھوٹ بول رہی تھیں۔

''کیا تمہارے ماموں نے ایک ہزار ایک فون نہیں کیے تھے؟ کیا وہ تمہیں لینے پاکستان نہیں گئے......؟ کیا میں نے فون نہیں کیے......؟ کیا حورعین نے تمہاری منتیں نہیں کی تھیں؟ گو کہ شروع کے چند سالوں میں ماہر کا غصہ نہیں اتر رہا تھا۔ وہ تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا تھا لیکن بعد میں ماہر نے تم سے رابطہ کرنے کے لیے ہمیں مجبور کیا...... شاید اس کا غصہ اتر گیا تھا یا پھر بچوں کی وجہ سے...... اور اب بھی تمہیں ماہر ہی نے بلوایا ہے......'' مامی ایک ہی سانس میں اس کی آنکھیں کھولتی چلی گئی تھیں۔

''اور تم تب بھی نہیں آئیں...... تم خود نہیں آئیں...... کیونکہ تم ہٹ دھرم ہو......''

''ماہر لینے آتا تو آ جاتی...... میں خود سے کیوں آتی؟ ماہر نے حورعین کی وجہ سے مجھے گھر سے نکالا تھا۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں نکلتی تو اس کی خواہش پوری ہوتی......'' فاطمہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئی تھیں۔ مامی اسے تاسف سے دیکھتی رہ گئیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں۔ ''تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''تم اپنی غلطی بلکہ گناہ کبھی تسلیم نہیں کرو گی۔'' مامی زیرِ لب بڑبڑا کر رہ گئیں...... ان کی بڑبڑاہٹ اتنی اونچی ضرور تھی کہ فاطمہ بہ آسانی سن سکتی۔ اسے بے انتہا دکھ ہوا تھا۔ آخر اب بھی مامی کی نظر میں فاطمہ ہی بری تھی۔

''میں نے کیا گناہ کیا تھا......؟ بتائیں مجھے...... جو بھی ہوا، میرا اس میں کیا قصور تھا؟'' وہ تڑپ اٹھی تھی۔

''پتا نہیں...... لیکن ہم سب نے بہت ٹف ٹائم گزارا تھا تب...... ماہر تو کچھ سمجھتا ہی نہیں تھا۔ تمہیں طلاق دینا چاہتا تھا۔ یہ تو ہم سب نے بڑی مشکل سے اسے سمجھایا تھا۔'' مامی شاید اب کریڈٹ لینے کے چکروں میں تھیں...... فاطمہ نے کم از کم یہی سمجھا تھا۔

''پھر تم اپنی غلطی ماننے کے بجائے اکڑ بھی گئیں۔ فلوریڈا جانے کے بجائے پاکستان چلی گئیں۔

امر کو تم نے فورس کیا...... تمہیں پاکستان بھجوائے...... پھر حورعین کی ماں کو ہمارے خلاف کر دیا۔'' مامی بھی تاک، تاک کے حملے کر رہی تھیں۔ اگرچہ ساری باتیں ہی ٹھیک تھیں پھر بھی اسے بہت دکھ ہو رہا تھا۔

''مجھے بھی امر نے ہی کہا تھا...... تم پاکستان ریلیکس ہونے چلی جاؤ......'' فاطمہ کی آواز دبی ہوئی تھی۔

''اس نے تمہیں ریلیکس ہونے کو کہا تھا کیونکہ ان دنوں تم بھی ڈپریسڈ تھیں، تنہا تھیں، ماہر کچھ سن نہیں رہا تھا۔ پھر تمہارے لیے اسے یہی بہتر لگا۔'' مامی نے برہمی سے جتلایا۔

''امر نے ہی مجھے بتایا...... حورعین کی شادی کا...... حورعین کو بھی مجبور کیا...... وہ طلاق لے...... لیکن وہ طلاق کیوں لیتی، اس کے تو ارمان پورے ہو رہے تھے۔ اچھا ہوا مر کھپ گئی۔'' آخری الفاظ انتہائی صدمے کی کیفیت میں اس نے منہ ہی منہ کہے تھے۔ گو کہ حورعین اس کی رقیب تھی پھر اس کی وفات کا سن کر فاطمہ کو دکھ ضرور ہوا تھا لیکن اس وقت وہ جذباتی کیفیت میں تھی۔

''حورعین کو گئے ہوئے ڈیڑھ سال ہو گیا۔ اور مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔'' فاطمہ کو اچانک ایک اور شکوہ یاد آیا تھا۔ مامی کو چونکنا ہی پڑا۔ ان کی آنکھوں میں تحیر پھیل گیا تھا۔

''ڈیڑھ سال؟ تمہیں کس نے کہا؟'' مامی کی حیرانی پہ فاطمہ بھی چوکنا ہو گئی۔

''مجھے امر بھائی نے بتایا تھا۔''

''اوہو...... امر نے، اچھا، اچھا......'' مامی جیسے سمجھ گئی تھیں...... ''اور دیکھو...... یہ لڑکا دوبارہ آیا ہی نہیں...... بچی کی خبر گیری نہیں لی۔ بزنس بھی تو اس کا ملکوں، ملکوں پھیلا ہوا ہے...... بیچارے کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا...... یہ تو تمہاری وجہ سے نیو انگلینڈ کی مصروفیات ترک کر کے ائرپورٹ پہنچا تھا۔ پھر اسے ٹکٹ بھی کنفرم کروانا پڑا...... پاکستان کے لیے......

''اسے'' بھجوانا جو تھا......'' مامی بھی غیر رواں لہجے میں بولتی اسے کچھ عجیب سی لگیں۔ ان کی کوئی بات بھی اس کے پلے نہیں پڑی تھی۔ جانے کیسے ارجنٹ پاکستان بھجوانے کے لیے امر کو تردد کرنا پڑا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔ پھر امر تو میڈیکل اسکول میں پڑھتا تھا۔ بزنس میں کیسے لگ گیا۔ خیر، بزنس تو اس کے باپ کا تھا۔ اور وہ ان کا اکلوتا بیٹا...... باپ کے بعد بزنس کو اسی نے سنبھالنا تھا...... کیونکہ امر امریکا کے کروڑ پتیوں میں شمار ہوتا تھا۔

''حورعین کو امر نے بھی بہت فورس کیا تھا...... وہ ماہر سے طلاق لے...... مگر وہ ایسی کٹھور تھی کہ میرا گھر اجاڑ ڈالا...... میں دس سال اپنے بچوں سے دور...... رہی۔'' اسے پھر سے وہی رونا یاد آ گیا۔

مامی اسے تاسف سے دیکھتی رہی تھیں جیسا کہ فاطمہ کا راگ انہیں کچھ بھا نہیں رہا تھا۔ خاص کر گھر اجاڑنے والی بات......

''اپنا کیا دھرا تمہیں بھول چکا ہے...... خیر یاد بھی نہیں کروانا چاہتی......'' مامی کو بلا کا غصہ آ گیا۔

''آپ بھی ہمیشہ مجھے الزام دیتی ہیں...... میں نے کیا گناہ کر دیا تھا؟'' وہ روہانسی ہو کر چیخ پڑی تھی۔

''تم نے حورعین اور ماہر کے نکاح کی خبر پولیس کو نہیں دی تھی؟'' انہوں نے انتہائی کرختگی سے فاطمہ کو حواس باختہ کر دیا...... یہ خاصا کریہہ سچ تھا۔ فاطمہ کا سر جھک گیا...... وہ قدرے شرمندہ ہوگئی لیکن وہ اپنے عمل میں خود کو حق بجانب سمجھتی تھی کہ اسے تب یہی کرنا چاہیے تھا اور اس نے ٹھیک کیا تھا۔

''تو میں اور کیا کرتی؟ مجھے اپنا گھر بچانا تھا۔'' اس نے پست آواز میں کہا۔

''گھر بچ گیا تھا کیا......؟ بلکہ تمہارا یہ عمل ماہر کو اور بھی تم سے متنفر کر گیا......'' مامی کو بھی بھگو بھگو کر مارنی آتی تھیں...... وہ پہلے بھی فاطمہ کو ہر وقت احساس دلاتی رہتی تھیں کہ وہ ماہر کی من چاہی بیوی نہیں ہے۔

''ماہر شروع سے ہی مجھے پسند نہیں کرتا تھا...... کیونکہ بیچ میں حورعین کھڑی تھی...... خالہ جتنی عظیم تھیں حورعین اتنی ہی پست......'' وہ گھٹی، گھٹی آواز میں بول رہی تھی۔

''اور اس نے بہت دفعہ مجھ سے کہا...... میں اس کی زندگی سے چلی جاؤں۔''

''وہ تمہارے ماموں کی وجہ سے مجبور ہوگیا تھا...... انہوں نے زبردستی تم سے ماہر کی شادی کروائی تھی۔'' مامی کو بھی نہ جانے کیا کچھ نہیں یاد آیا تھا۔

''جانتی ہوں سب......'' فاطمہ کا حلق تک کڑوا ہوگیا......''اسی لیے تو میں آتی نہیں تھی۔ ماہر خوش رہتا اپنی حورعین کے ساتھ...... اب بھی حورعین جاتی نہیں تو ماہر مجھے کبھی نہیں بلواتا...... بچے سنبھالنے مشکل جو ہو رہے تھے۔'' وہ زہر خندسی بولتی چلی گئی۔

''تم عقل سے خالی ہو......'' مامی نے ہمیشہ کی طرح بے رحمانہ تبصرہ کیا۔

''آپ جو بھی کہہ لیں اتنا تو تسلیم کریں گی ناں کہ حورعین نے آپ کے بگڑے ہوئے لختِ جگر کو سدھار دیا ہے۔ کہاں وہ چلّانے والا...... میزیں الٹنے والا ماہر ارباب...... اور کہاں ایسی تہذیب کے گھر میں موجودگی کا بھی گمان نہیں ہو......'' وہ سبزی کاٹ چکی تو زیرِ لب بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کر جانے لگی...... معاً اس کی نگاہ سٹنگ روم کے ڈور فریم پر پڑی...... وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔ سبزیوں کا پورا باؤل اس کے ہاتھ سے گر پڑا تھا...... وہ آنکھیں پھاڑے سامنے دیکھتی رہی تھی۔ اور فرش پر کٹی ہوئی گاجروں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔

اسے یقین نہیں آ رہا تھا...... سدا کا چیختا چلّاتا ماہر بے آواز قدموں سے چلتا ہوا نہ جانے کب سٹنگ روم کے ڈور فریم میں کھڑا ہوا تھا...... اور جانے کب سے وہ ان کی باتیں سن رہا تھا؟ اور اس نے کیا کچھ نہیں سن لیا ہوگا؟ فاطمہ کا دماغ جیسے گول، گول گھومنے لگا...... مارے شرمندگی کے اس سے سر اٹھانا مشکل ہوگیا۔

☆☆☆

امر کا اس گھر میں قیام اور آمد و رفت لازم و ملزوم تھی۔

فاطمہ پچھلے سالوں پر نگاہ ڈالتی تو اسے ہر موڑ پر امر کی یادیں اس گھر میں بکھری نظر آتیں۔ وہ اپنے گھر میں کم، کم قیام کرتا تھا...... اس کا ہر وقت کا پڑاؤ اسی گھر میں تھا......

لیکن اب امر کو آئے ہوئے مہینہ بھر سے اوپر ہوگیا تھا۔ مامی ہر وقت امر پر غصہ کرتیں۔ ان کی ہر بات کا اختتام اس فقرے پر ہوتا۔

''بچی کی ذرا بھی پروا نہیں...... دونوں مصروف؛ دونوں آؤٹ آف اسٹیشن۔'' ان کا غصہ ناک کی نوک پر رہتا تھا اور حمنہ بھی پورے دن میں کئی مرتبہ پوچھتی......

''ڈیڈی! وہ لوگ کب آئیں گے؟'' کبھی کبھی جب وہ زیادہ اپ سیٹ ہوتی تو ماہر حمنہ کو لیے کمرے میں چلا جاتا...... جانے کون لوگ تھے جنہیں حمنہ مس کر رہی تھی اور کبھی، کبھی شدت سے کرنے لگتی...... تب ماہر آؤٹنگ کا لازمی پروگرام بنا لیتا تھا۔

ڈزنی لینڈ میں گزرا وہ دن بھی ایسا ہی بیکار سا تھا۔ فاطمہ کو بالکل ہی بیکار لگا...... ایسا دن جس میں ماہر بس حورعین کی بیٹی کے نخرے اٹھاتا رہا تھا۔ گو کہ عون اور محمد بھی بہت خوش تھے اور پورا دن ڈزنی لینڈ میں انجوائے کرتے رہے۔

''ڈیڈی کے ساتھ کبھی، کبھی اتنا انجوائے کرنے کا موقع ملتا ہے۔'' عون بہت خوش تھا...... ڈزنی لینڈ میں آ کر سبھی خوش ہوتے ہیں ڈزنی لینڈ ایک جادو نگری ہے۔

فاطمہ نے اپنی پوری زندگی میں ڈزنی لینڈ کو نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ اس کا باپ بہت غریب تھا اور ممی بس اتنا کماتی تھیں جس سے پیٹ کا سلسلہ چل سکتا۔ باقی عیاشیاں تو بس خواب اور خیال تھیں۔

ان کے مقابلے میں ممی کے رشتے دار بہت امیر تھے۔ ماموں کا اپنا بزنس اور گھر تھا۔ اور پاکستان والی خالہ بھی بہت امیر تھیں۔ بس انہی کے حالات بہت خراب تھے۔

آئندہ افطاری کے چند رہنما اصول یاد رکھیں

1۔ دسترخوان پر اس جگہ بیٹھیں جہاں آپ کا ہاتھ ہر چیز تک جا سکے۔

2۔ شربت کا جگ اپنے سامنے مگر تھوڑا سا دور رکھیں ورنہ سب آپ سے شربت مانگتے رہیں گے۔

3۔ دوسروں پر نظر رکھیں اور چیزوں پر بھی دیکھیں کون سی چیز جلد ختم ہو رہی ہے۔

4۔ ہر پانچ منٹ بعد تھوڑا سا شربت پی لیں تاکہ ٹھونسی ہوئی چیزیں نیچے ہو جائیں اور نعمتوں کی جگہ بن جائے۔

5۔ کھجور کی گٹھلیاں اپنے ساتھ والے کی پلیٹ میں ڈالتے جائیں تاکہ آپ کا دامن صاف رہے۔

نوٹ:

دسترخوان سے اٹھنے سے پہلے مکمل اطمینان کر لیں کہ کوئی چیز بچ تو نہیں گئی۔

خصوصی نوٹ...... اس سال ہم سے بہت سی غلطیاں ہوئی ہیں اور ہم نہیں چاہتے کہ آئندہ بھی ہوں۔

از: مہ وش، سمرن راجپوت، سیالکوٹ

اظہارِ ہمدردی

ایک خاتون اپنی پڑوسن سے کہہ رہی تھیں۔

''اتنی دیر ہوگئی، منے کے ابا واپس نہیں آئے، ہوسکتا ہے کہ آج وہ پھر شراب خانے چلے گئے ہوں۔''

''اے ہے......! تم ہر بات کا برا پہلو ہی کیوں سوچتی ہو؟'' پڑوسن نے کہا۔ ''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ کسی بس کے نیچے آ گئے ہوں۔''

شاعرہ: حمیرا نوشین، منڈی بہاؤالدین

اور اس وقت فاطمہ اپنی سابقہ زندگی کو سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ زندگی جو کیڑوں مکوڑوں سے بھی بدتر تھی، وہ بڑے عرصے بعد فلوریڈا آئی تھی۔ قریب چودہ سال بعد...... یہ فلوریڈا تھا...... اس کا آبائی شہر...... جائے پیدائش...... لیکن فلوریڈا میں ابتدائی سولہ سال گزار کر بھی اس نے کبھی ڈزنی لینڈ کی سیر نہیں کی تھی۔ اسے ڈزنی لینڈ کو دیکھنے کی بہت حسرت تھی۔ بہت شوق تھا ایسا ہی شوق جیسے پاکستان میں کسی بچے کو سفاری پارک دیکھنے کا شوق ہوتا ہے۔ مگر فاطمہ کو تو جنونی شوق تھا۔ کیونکہ ڈزنی لینڈ ایک جادونگری کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایسی جادونگری جس میں انسان کھو جائے، گم ہو جائے اور کبھی خود سے بھی نہ مل سکے۔ ڈزنی ورلڈ کو چھ حصوں میں اچھی طرح منظم بنایا گیا تھا۔ اس کا ماسٹر مائنڈ والٹ ڈزنی تھا...... جس کی ذہانت نے یہ منفرد اور اچھوتا جادو گھر بنایا تھا۔

کوئی بھی انسان اس کو دیکھ کر خوابوں کی دنیا میں پہنچ جاتا...... جہاں جا کر تمام غم دنیا سے نجات مل جاتی...... وہ مین اسٹریٹ امریکا پر چلتی ہوئی بہت دور جا رہی تھی۔

بچے پرانے فیشن کی اسٹیم انجن والی ریل گاڑی میں بیٹھ چکے تھے جو پوری جادونگری کے اردگرد چکراتی تھی۔ اس کے قریب سے ہاؤس بگھی گزر رہی تھی۔ بگھی کے آگے دو گھوڑے بندھے تھے۔ گھوڑے بہت خوب صورت تھے۔ جن کے بڑے، بڑے پاؤں ہوتے ہیں۔

مین اسٹریٹ کے آخری کارنر پر خوب صورت سنڈریلا کاسل جنہیں پریوں کا محل کہتے تھے۔ اس کی اٹھارہ منزلیں تھیں۔

اور بہت بچپن میں وہ سنڈریلا کاسل دیکھنے کی خواہش میں ممی کا سر کھاتی تھی۔ اس پر ضد اور ہٹ دھرمی سوار ہو جاتی۔ وہ روتی، چیختی اور پھر کونے میں گھس کر 'لاتعلق' ہو جاتی...... منظر سے غائب ہو جاتی۔ اس کی۔ بچپن سے ہی عادت تھی۔ وہ مقابل کی مجبوری کا سبب نہیں کھوجتی تھی۔ بس بدگمان ہو کر غائب ہو جاتی۔ منظر سے دور ہو جاتی اور تب تک اسی طرح رہتی جب تک اپنا دل واپسی کو نہ چاہتا۔

فاطمہ کو اچھی طرح یاد تھا۔ جب اس کی ماہر سے شادی ہوئی...... تب اس نے پہلی فرمائش میں ماہر سے کہا۔

''مجھے ڈزنی لینڈ دیکھنا ہے، مجھے سنڈریلا کاسل جانا ہے۔'' یہ فاطمہ کی بچپن سے دل میں دبی معصوم خواہش تھی اور اسے لگا یہ خواہش پوری کرنا ماہر کے لیے ناممکن نہیں تھا۔ اس کے پاس وسائل بھی تھے۔ پیسہ بھی تھا اور وقت بھی...... لیکن ماہر اس کی فرمائش پر حیرت سے چیخ اٹھا تھا۔

''تم نے فلوریڈا میں رہ کر ڈزنی لینڈ نہیں دیکھا؟''

اس کی چیخ ایسی بھیانک نہیں تھی جس قدر اس کا رویہ ہتک آمیز تھا۔ ایک تو ماہر نے اس شادی کو قبول ہی نہیں کیا تھا...... وہ تو فاطمہ کو دیکھتا تک نہیں تھا۔ اوپر سے ایسی بے تکلفانہ فرمائش...... جیسے وہ دونوں بڑی محبت کرنے والے میاں بیوی ہوں۔ وہ تو اس کی دیدہ دلیری پر حیران تھا۔ پھر اپنی مغرور ماں کے ساتھ مل کر اس کا مذاق اڑاتا رہا...... مامی بھی موقع کی تلاش میں تھیں۔ انہیں بھی فاطمہ پر طنز کے تیر برسانے کا موقع مل گیا تھا۔

''اس کا باپ اسے ٹانی تک لا کر نہیں دیتا تھا کجا کہ سیریں کراتا...... ملائکہ کو اپنے کیے کی سزا ملی ہے۔'' مامی کو اس کی ممی پر بھی کیچڑ اچھالنے کا موقع مل گیا تھا۔ تب اس کا دل مامی سے کھٹا ہوا ہی تھا۔ ماہر سے بھی کھٹا ہو گیا تھا کیونکہ وہ بھی اس کی ممی پر الزام لگانے لگا۔

''یہ سب ملائکہ پھپھو کے اعمال کی سزا ہے۔ انسان کو اتنا بھی اپنے مقام سے گر نہیں جانا چاہیے کہ اسے اچھے، برے کی پہچان ہی نہیں رہے۔'' ماہر کی اس بات پر فاطمہ خاموش نہیں رہ سکی تھی۔ وہ غصے میں پھٹ پڑی تھی۔ اور اس نے ماہر کو بے نقط سنا ڈالی تھیں۔ اس بات کو قطعاً نظر انداز کر کے کہ وہ چار دن کی نو بیاہتا دلہن ہے۔ اس کی بکواس سن کر ماہر چیخ اٹھا تھا۔

''یہ ترس کے قابل نہیں تھی...... دیکھا آپ نے...... اس کی لمبی زبان کو...... میں تو کبھی اس سے شادی نہیں کرتا آپ نے میرے ساتھ بہت برا کیا ممی...... کتنی اجڈ اور جاہل ہے۔ اس میں بالکل تمیز نہیں......'' ماہر کا یہ غصہ پھر کم نہیں ہوا...... بلکہ وقت کے ساتھ، ساتھ بڑھتا رہا۔ اس دن کے بعد سے ماہر کو فاطمہ میں بس کیڑے ہی کیڑے دکھائی دینے لگے۔

وہ اس کی نظر میں جاہل تھی، ان پڑھ تھی، اجڈ تھی، کم عقل تھی۔

اس نے فلوریڈا میں پیدا ہو کر بھی گنوا دیا تھا...... اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ بات میں سلیقہ، نہ وقار، نہ ٹھہراؤ...... اسے تو بس ممی نے چوزوں کے ڈربے میں قید کر رکھا تھا تاکہ اسے امریکی معاشرے کی ہوا نہ لگے۔ اسی خوف کے زیر اثر وہ فاطمہ کے بنیادی حقوق، تعلیم اور اعتماد کو نظر انداز کرتی رہی تھیں۔

مین اسٹریٹ سے گزرتے ہوئے فلوریڈا کی یادوں نے اچانک اس پر حملہ کر دیا تھا پھر اسے وہ زندگی یاد آنے لگی جو اس نے ماہر کے ساتھ گزاری تھی۔

عون اور محمد کے بعد بھی وہ فیریر لینڈ میں پرانی اسٹیم ٹرین جیسی زندگی گزارتی رہی تھی۔ جس میں بیٹھ کر انتہائی خوفناک سین دکھائی دیتے تھے۔

بظاہر اس کی زندگی ڈزنی لینڈ سے کم نہیں تھی۔ لیکن اس کے اندر آ کر پتا چلتا کہ وہ کتنا خوفناک وقت گزار رہی تھی۔

بچے ابھی تک قلعہ جات، ریچھ، جمبوری ڈائمنڈ، ہارس شو اور شوٹنگ کرنے کا شوق پورا کر رہے تھے۔ ماہر اسے مین اسٹریٹ پر اندھا دھند چلتے دیکھ کر لیبرٹی اسکوائر کی طرف لے آیا تھا۔ وہ جو...... اپنے دھیان میں مگن اور گم تھی۔ ماہر کے بازو کھینچنے پر بھی چونکی نہیں تھی

ماں کے نام

اپنی پلکوں پہ میرے اشک پرونے والی
مجھ سے بھی پہلے میرے درد پہ رونے والی
میری ہر سانس ہے مقروضِ محبت تیری
بوڑھے ہاتھوں سے میرے کپڑوں کو دھونے والی
مجھ کو احساسِ یتیمی سے بچائے رکھا
پھول ہی پھول میری راہوں میں بونے والی
مجھ کو جرموں کی تلافی کا بھی موقع نہ دیا
بے خیالی میں میرے ہاتھ سے کھونے والی
صبر اور شکر تیری عمر کا حاصل ٹھہرے
قلزمِ فقر میں تن من کو ڈبونے والی
روز روتی ہے میری تلخ مزاجی تجھ کو
میٹھی باتوں سے میرے دل کو بھگونے والی
کون راتوں کو میرے واسطے اب جاگے گا
تختِ فردوس پہ آرام سے سونے والی
ماں کو کھویا ہے تو یہ راز کھلا ہے دائم
ماں تو ماں ہوتی ہے چاہے ہو کھلونے والی

شاعر: دائم بٹ

مرسلہ: یاسمین کنول، پسرور

نظم

کبھی مہندی سے سجا لو تم اپنے ہاتھوں کو
اس سجاوٹ کے کسی کونے میں
ہمارا بھی نام لکھ دو
یہ نام صرف ہم دونوں کو ہی نظر آئے
کچھ اس طرح سے ہم دونوں کا نام لکھ دو
تیری مہندی سے سجے ہاتھوں کو
میں اپنے ہاتھوں میں لوں گا
تیری مہندی کی خوشبو کو
اپنے دل میں قید کر لوں گا
ڈھونڈ لوں گا میں تیرے ہاتھوں میں
چھپے ہم دونوں کے نام

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

بلکہ اس کے ساتھ ہی کھسٹتی چلی آئی۔
پھر ایک راؤنڈ ٹیبل کے راؤنڈ اسٹول کو کھینچ کر ماہر نے اسے بیٹھنے کا کہا۔ اور پھر خود کو لمبا بار بر ہاؤس سے سمندری خوراک یعنی مچھلیوں کی ڈشز اٹھالایا۔

پھر اس نے بچوں کی طرف نگاہ ڈالی۔ وہ بھوک سے ابھی کوسوں دور تھے۔ سو وہ گم صم سی فاطمہ کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔

''تمہاری برسوں کی خواہش پوری ہوگئی......؟'' اس کا انداز طنزیہ نہیں تھا۔ پھر بھی فاطمہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔ شاید ماہر کی بات کو سمجھنا چاہتی تھی۔

''برسوں کی خواہش؟'' اس نے تیکھے انداز میں پوچھا۔

''ہاں......ناں......ڈزنی لینڈ کو دیکھنے کی خواہش......'' ماہر کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ چمکی تھی۔ فاطمہ جان نہیں پائی تھی کیا یہ مسکراہٹ طنزیہ تھی؟

اور اس نے کتنی پرانی بات کا حوالہ دیا تھا۔ قریب چودہ سال پہلے فاطمہ کی وہ خواہش جو ماہر کے مذاق میں دب کر دم توڑ گئی تھی۔

''تم سنڈریلا کاسل نہیں دیکھوگی؟'' اس نے شرارتاً ہونٹ کا کونا دبا کر کہا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو فاطمہ پھٹ پڑتی مگر اس وقت وہ فضول بحث میں اپنا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''نہیں......'' اس نے منہ پھاڑ کر جواب دیا۔
ماہر ہنوز مسکراتا رہا...... جیسے اس کے نہیں کو انجوائے کررہا ہو۔

''اگر کسی نے پوچھا تو بتا دینا...... سنڈریلا کاسل میں بہترین ریستوران، اسنیک بار، کیفے، بیکریز، خوب صورت اسٹال، ہاؤس آف میجک جیولرز، بینک، فرسٹ ایڈ سینٹر موجود ہیں۔'' وہ کسی ٹورسٹ گائڈ کی طرح اسے بتارہا تھا۔ فاطمہ کو بلا کا غصہ آیا مگر وہ پی گئی۔ اس وقت وہ کوئی تماشا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''ویسے تم ڈزنی لینڈ میں ہنی مون منانا چاہتی تھیں ناں......؟ لیکن یہ جگہ تو بچوں کی انجوائے منٹ کے لیے ہے...... تم ہنی مون کے لیے بش گارڈن کا انتخاب کرتیں۔ ویسے وقت اب بھی نہیں گزرا...... اگر تم چاہو تو ہنی مون کا ایک سویٹ تیار ہوسکتا ہے۔'' ماہر جان بوجھ کر اسے تپانے کی کوشش کررہا تھا۔ تاکہ وہ غصے میں کچھ تو بول اٹھے۔ لیکن فاطمہ فی الوقت ضبط سے کام لے رہی تھی۔

''تم کیا سوچ رہی ہو فاطمہ؟'' ماہر کو ذرا سنجیدہ ہونا ہی پڑا تھا۔ فاطمہ نے بھی ناپ تول کر اس کی ساری طراری نکالنے کا سوچا...... اس نے بڑے سنجیدہ انداز میں کہا۔

''میں حورعین کو سوچ رہی ہوں۔''

''تم کبھی اپنے بارے میں بھی سوچ لیا کرو...... کبھی اپنی غلطیوں پر بھی نظرِ ثانی کرلیا کرو......'' اس کی توقع کے عین مطابق ماہر چڑ گیا تھا۔ شاید وہ اس وقت حورعین کی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیسا بے وفا تھا، ماہر...... اتنی جلدی حورعین کو بھول بھی گیا۔ مرد ایسے ہی ہرجائی ہوتے ہیں۔ اس کے پاپا بھی ممی کو جلدی بھول گئے تھے۔ وہ ممی جنہوں نے پاپا کی خاطر ہر قسم کی صعوبتیں اٹھائی تھیں، مشکلات جھیلی تھیں۔

''ہر کوئی مجھے میری غلطیوں کا احساس دلاتا ہے۔ میں نے کون سا گناہ کردیا تھا؟'' فاطمہ چیخ پڑی تھی۔ ماہر لمحے بھر کے لیے چپ کرگیا۔ اس کی آنکھیں لال ہوگئی تھیں اس کا چہرہ بھی سرخ ہوگیا تھا۔ وہ غیظ وغضب سے بھر گیا تھا۔ پھر وہ بڑے ہی ضبط کے ساتھ بولا۔

''تم اپنی یادداشت کھوچکی ہو...... یہ بہت اچھی بات ہے۔ میں خود بھی اس شرمناک قصے کو دُہرانا نہیں چاہتا...... بہتر ہے ہم کوئی اور بات کرلیں۔'' ماہر کا دوٹوک انداز اس کی آنکھوں میں مرچیں بھر گیا تھا۔ فاطمہ کا سر جھک گیا...... اس کی یادداشت سلامت تھی...... اور اسے وہ شرمناک قصہ بھی یاد تھا...... مگر اس سب میں اس کا قصور کہاں نکلتا تھا۔

(جاری ہے)



بخیل

اُمِ طیفور

''میری سمجھ سے باہر ہے کہ آخر مسئلہ کیا ہے پروفیسر صاحب کا؟'' زیاد نے غصے سے دودھ سے بھرا مگ پرے کھسکایا۔ جس میں سے کچھ دودھ چھلک گیا اور باقی بچے دودھ کو امی نے اس کے آگے سے اٹھالیا۔ مبادا بیٹا اس کو بھی گرا کر ضائع کرتا۔ رزق ضائع کرنا اس گھر میں سب سے بڑا جرم تھا۔

''زیاد بس کرو اب...... عقل، تمیز سب بھول بیٹھے ہو ایک چھوٹی سی بات کے پیچھے۔ اب جلدی

سے دودھ ختم کرواور اپنی دادی کی دوائیں لے کر آؤ میڈیکل اسٹور سے...... رات سے ختم ہیں۔'' امی نے آدھا باقی رہ جانے والا دودھ کا مگ دوبارہ پورا بھر کے زیاد کے سامنے دھرا اور خود بھی ایک کرسی گھسیٹ کر ٹیبل پر اس کے سامنے بیٹھ گئیں۔ گھر کے تمام افراد اسی چھوٹے سے کچن ٹیبل پر بیٹھ کر ناشتا کرتے تھے۔

''مجھے نہیں پینا دودھ، امی! خدا کا واسطہ ہے، اب آپ کی اولاد بڑی ہوگئی ہے۔ ناشتے میں تھوڑی سی ترمیم کر دیں۔ چائے بنا کر دیں مجھے......''

''زیاد بیٹا ہر بات کو انا کا مسئلہ مت بنالیا کرو۔ گھر میں اس طرح فساد پیدا ہوتا ہے، چلو شاباش ختم کرو اب اسے۔'' امی نے رسان سے ایک بار پھر سمجھایا تھا۔ وہ اس کے غصے کو قابو کرنا جانتی تھیں۔

''امی! پروفیسر صاحب سے کہیں اپنے حکم میں تھوڑی تبدیلی لائیں۔ دودھ ناشتے کے بجائے رات سونے سے پہلے دے دیا کریں۔ کسی کو پتا چلتا ہے تو ہنستا ہے ہم پر کہ کالج، یونیورسٹی میں آکر بھی ہم ناشتے میں بچوں کی طرح دودھ لازمی پیتے ہیں۔'' زیاد سخت اپ سیٹ تھا اور امی اس کا سبب بھی جانتی تھیں۔ دودھ تو محض غصہ نکالنے کا بہانہ تھا۔ امی نے صبر کا گھونٹ بھرا اور تحمل سے گویا ہوئیں۔

''سب سے پہلی بات کہ میں نہیں سمجھتی کہ دودھ صرف بچوں کے پینے کی چیز ہے۔ تمہارے ابو کیا بچے ہیں؟ میں نے ساری عمر پروفیسر صاحب کو ناشتے میں دودھ پیتے دیکھا ہے۔'' امی نے لفظ پروفیسر صاحب پر زور دے کر کہا۔ ''اور دوسری بات...... پروفیسر صاحب تمہارے باپ ہیں اور باپ کو اس کے پیشے کے حساب سے نہیں، رشتے کے حساب سے بلایا جاتا ہے۔ سمجھے......'' امی نے شہادت کی انگلی اٹھا کر اسے تنبیہ کی تھی۔ جبکہ زیاد کے چہرے کے تاثرات میں بیزاری مزید نمایاں ہوگئی۔

''زیاد......'' امی کو اس کے تاثرات سے دکھ پہنچا تھا۔

''ہوں......'' وہ مگ کے کنارے پر انگلی پھیرتا کسی سوچ میں گم تھا۔

''بیٹا! ماں، باپ اولاد کا کبھی دانستہ برا نہیں کرتے...... نہ سوچتے ہیں...... ہاں یہ بات انہیں سمجھا نہیں سکتے۔ شعور کی طنابیں، وقت کے ہاتھوں میں تھما دیتے ہیں، جو خود بخود عمر کے کسی حصے میں ان کے دماغ میں اتر جاتا ہے۔ تم سے صرف یہی کہوں گی کہ باپ کے لیے بدگمان ہونے کے بجائے انہیں سمجھو...... جس طرح بائیس سال انہوں نے تمہیں سمجھا ہے۔'' زیاد نے ایک نظر اٹھا کر ماں کو دیکھا اور کرسی پیچھے کر کے کھڑا ہوگیا۔ کچن سے باہر نکلنے سے پہلے اس نے ایک نظر وہاں سے نظر آنے والے ''پروفیسر صاحب'' کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا اور صحن کے رخ کھلنے والے کچن کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ امی نے دکھ اور تاسف سے دودھ سے بھرے مگ کو دیکھا جو جوں کا توں پڑا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

''ٹھک، ٹھک، ٹھک......'' آدھا گھنٹا ہوگیا تھا زیاد کو اپنی بائیک کے ساتھ ''ٹھک، ٹھک'' اور خود سے ''بک بک'' کرتے ہوئے۔ قریب ہی کرسی پر براجمان دادی تسبیح کے دانے گراتی بغور پوتے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ان کی پنڈلیوں کا تیل سے مساج کرتی گھریلو ملازمہ زیاد کی چڑ چڑاہٹ کا لطف اٹھاتی وقفے، وقفے سے کھی کھی کرنے میں مصروف تھی۔ زیادہ کی برداشت جواب دے گئی۔

''اپنی کھی، کھی کنٹرول میں رکھ ثوبیہ......! نہیں تو تمہارے سر میں بھی دو پیچ ٹھونک دوں گا سمجھی......؟'' زیادہ نے اوزار کے ساتھ ملازمہ کو گھرکا۔

''اونہوں! زیاد لحاظ رکھو...... اور ثوبیہ تم بھی

اٹھو اب...... دیکھو جا کر تمہاری آپا کو کسی کام میں تمہاری ضرورت نہ ہو۔'' دادی اماں نے ملازمہ کو بہو کے پاس اندر روانہ کیا انہیں گھر کے مردوں کا ملازماؤں کے منہ لگنا قطعاً پسند نہیں تھا۔

''اور زیاد! تمہیں کاہے کا اتنا غصہ ہے جو اپنی بائیک کو آدھے گھنٹے سے مارے جا رہے ہو۔ بس مارے جا رہے ہو۔'' دادی اماں کا اشارہ زیادہ کی بائیک کی طرف تھا جس پر اپنا نہ جانے کون سا غصہ وہ نکال رہا تھا۔

''یہ اسی قابل ہے کہ اسے روز مارا جائے، سائیکل سے بدتر ہو چکی ہے، روز کوئی نہ کوئی مسئلہ ہوا رہتا ہے اس کے ساتھ۔'' وہ سخت اکتایا ہوا تھا۔

''مسئلہ تمہارے دماغ کے ساتھ ہے، جو تمہیں یہ اچھی بھلی بائیک، سائیکل سے بدتر دکھ رہی ہے۔ ابھی ہفتہ پہلے تمہارا باپ تفصیلاً مکینک کو دکھا کر لایا ہے اور مکینک کے بقول تمہاری بائیک بالکل فٹ ہے۔ ہاں...... اگر تم یونہی اوزار لے کر اس کو ٹھوکتے رہے تو یقیناً ان فٹ ہو جائے گی۔ جیسا کہ تم چاہتے ہو۔'' دادی اماں نے چشمے کے اوپر سے دیکھتے ہوئے اسے بہت کچھ جتایا تھا۔ ان کی گفتگو ہمیشہ بڑی مدلل ہوتی تھی۔ اپنے وقت کی آٹھ جماعتیں پڑھ رکھی تھیں، پروفیسر کی ماں تھیں اور بزرگوں کی باتوں میں علم کے سمندر سے زیادہ تجربہ ٹھاٹھیں مارتا ہے۔ زیاد ہمیشہ کی طرح جز بز ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر اوزار فرش پر رکھتا دادی اماں کے پاس چلا آیا۔ ان کے گھٹنوں پر ہاتھ دھر کر خود بھی وہیں ٹک گیا۔

''دادی اماں! پلیز آپ میری سفارش کر دیں ناں...... دیکھیں آپ کے سامنے ہی تو ہے میری بائیک کی حالت......'' دادی اماں نے خشمگیں نظروں سے گھورا تھا۔

''اچھا، اچھا...... اچھی بھلی ہے میری بائیک......'' زیاد نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر ہتھیار ڈالے تھے۔

''بس میرا شوق ہے ہیوی بائیک...... میرے دو دوستوں کے والد نے انہیں لے کر دی ہے حالانکہ میں جانتا ہوں کہ حسن کے والد تو آسانی سے افورڈ بھی نہیں کر سکتے پھر بھی محض بیٹے کے شوق کی خاطر انہوں نے کچھ بھی نہیں دیکھا اور ایک پروفیسر......'' زیاد نے زبان فوراً دانتوں تلے دبائی تھی۔ دادی اماں کے سامنے وہ باپ کو پروفیسر صاحب کہتا تو انہوں نے ایک زور کا دھر دینا تھا۔ ایسی زبان وہ صرف ماں کے سامنے ہی استعمال کرتا تھا۔

''میرا مطلب ہے آپ ابو سے کہیں ناں کہ مجھے بھی ہیوی بائیک لے دیں۔ وہ تو افورڈ بھی کر سکتے ہیں...... پلیز......! آپ کہیں ناں ان سے...... پتا نہیں ابو اپنے بچوں کی خواہشات کو ترجیح کیوں نہیں دیتے......؟ اوروں کے باپ بھی تو ہیں، اولاد کے منہ سے نکالنے سے پہلے چیز سامنے لا دھرتے ہیں لیکن ہمیں محض میانہ روی کا چورن چٹا دیتے ہیں۔ آخر ہماری بھی آرزوئیں ہیں، امنگیں ہیں۔'' اپنے تئیں زیاد نے دادی اماں کو جذباتی حوالے سے گھیرنے کی کوشش کی تھی مگر دادی اماں کے انداز و اطوار میں تبدیلی نظر نہیں آ رہی تھی۔ چند لمحے پوتے کا چہرہ بغور جانچنے کے بعد وہ گویا ہوئیں۔

''زیاد میرے بچے......! تمہارے پیدا ہونے سے لے کر تمہارے جوان ہونے تک کوئی ایسا لمحہ مجھے یاد نہیں جب تمہارے باپ نے تمہاری بنیادی ضروریات سے نظر چرائی ہو۔ تمہاری بھوک میں تمہیں خوراک مہیا کی، تمہاری بیماری میں تمہارا علاج کرایا، تمہیں بہترین اوڑھایا، پہنایا...... نرم گرم بستر پر سلایا، سردی گرمی سے بچایا، جس کالج اور یونیورسٹی کا نام تم نے لیا، وہیں تمہیں پڑھایا، تمہاری ہی خواہش پر صرف ڈیڑھ سال پہلے تمہیں نئی بائیک لے کر دی تھی حالانکہ گھر میں گاڑی کی سہولت پہلے سے ہی موجود تھی۔'' زیاد کے چہرے پر جھنجلاہٹ نمایاں تھی مگر دادی اماں نے بات

جاری رکھی تھی۔ ''اور میرا خیال ہے کہ صرف چھ ماہ ہی ہوئے ہیں ناں تمہیں لیپ ٹاپ لے کر دیے ہوئے۔ تمہاری تین بہنوں کی تعلیم و تربیت اور پھر مناسب جہیز کے ساتھ بیاہ، میرا خیال ہے تمہارے باپ نے ہی کیے ہیں۔ پروفیسر درویش منش ضرور ہے مگر دنیا داری نبھانا جانتا ہے۔ اب اگر تمہاری ہیوی بائک کو فضول خرچ مان کر وہ دلانے سے انکار کر رہا ہے تو اس میں ایسا غلط بھی کچھ نہیں...... نہیں ہوں گے اس کے پاس اس قدر پیسے...... اپنے باپ کو سمجھو زیاد...... اسے آزماؤ مت......'' آخر میں دادی کا لہجہ بلاشبہ التجائیہ ہو گیا تھا۔

''یہی تو...... یہی تو دادی اماں...... آخر کہاں جاتے ہیں پیسے......؟ میں نہیں مانتا کہ ابو کے پاس پیسے نہیں...... وہ میتھس، اسٹیٹس کے جانے مانے استاد ہیں، اکیڈمی بھی رن کر رہے ہیں پھر بھی آپ کہتی ہیں، پیسے نہیں...... چھوڑیں بھئی......'' زیاد نے تنفر سے سر جھٹکا اور دادی اماں کے دل کو جھٹکا لگا تھا۔ ان کے پاس جواب میں کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ بت بنی زیاد کو پلٹ کر واپس جاتے اور بائیک کے پاس پڑے اوزار سمیٹتے دیکھتی رہی۔

اولاد ماں، باپ سے حساب کیوں مانگتی ہے؟ اور ماں باپ اسے صفائیاں کیوں دیتے ہیں؟ ساری عمر معاشی تگ و دو کی چکی کے پاٹوں میں پسنے کے بعد بھی اولاد کی تشنہ اور ان کہی خواہشات سالم پہاڑ کے مانند کھڑی دکھائی دیتی ہیں۔ ساری عمر جس اولاد کے لیے والدین اپنی ہستی مٹاتے رہتے ہیں' اولاد کی بن کہے جان جانے والے ماں، باپ جب بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑے ان سے یہ گمان کرتے ہیں کہ آج بچے بن کہے والدین کے دل میں اتر جائیں، بن کہے جان جائیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں تو اولاد ''بوڑھا، بچہ ایک برابر......'' کا ٹیگ لگا کر ماں باپ کو احتیاط سے ایک ٹھکانے لگا دیتی ہے۔ یہ سوچے بغیر کہ جن ماں، باپ نے ہمیں بچے سے بڑا کیا وہ آج انہی کے لیے بچہ کیسے بن سکتے ہیں؟

☆☆☆

زیاد، پروفیسر محمود کا اکلوتا بیٹا اور تین بہنوں کا اکلوتا چھوٹا بھائی...... زیاد کے خیال میں وہ لاڈلا، اکلوتا، کبھی نہیں رہا۔ اور اس کی وجہ زیاد کے خیال میں خود اس کے والدِ محترم تھے۔ پروفیسر محمود اصول پرست اور سادہ طرزِ زندگی کے عادی ایک ایسی شخصیت، جن کے مداحوں میں ان کے اسٹوڈنٹس کی ایک بڑی تعداد کے علاوہ اہلِ محلہ بھی شامل تھے۔ معلم کے طور پر قابلِ تحسین زندگی گزاری تھی۔ حلال کھایا تھا اور حلال کمایا تھا۔ بقول بیٹے کے بہت زیادہ کمایا تھا مگر کہاں ٹھکانے لگایا تھا یہ اس کی نظر میں باپ کی زندگی کا سربستہ راز تھا۔ اس کی اپنی نظر میں وہ خاصی مظلوم زندگی گزار رہا تھا جس میں اس کی ڈھیروں آرزوؤں کا خون ہو رہا تھا۔ بہت سی خواہشات مارنا پڑ رہی تھیں۔ زندگی کی ہر سانس پروفیسر صاحب کے حکم کے تابع تھی۔

''دودھ زندگی کا لازمی جزو، نہار منہ بادام ضرور کھانے ہیں، سونے سے پہلے چائے، کافی نہیں پینی؟ سردیوں میں ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ دودھ جلیبی لازمی کھانی ہے، رات نو بجے کے بعد گھر سے باہر رہنا ممنوع ہے، گھر میں چاہے ستر دوست بلوا لو مگر ہوٹلوں، کلبوں میں دوستوں کے ساتھ غل غپاڑا کرنا حرام، کمرے کا دروازہ بلاوجہ لاک نہیں کرنا اور باتھ روم میں نہانے میں پندرہ منٹ سے زیادہ صرف نہیں ہونے چاہئیں۔'' ان تمام احکامات کو مانتے زیاد، بچے سے جوان ہوا تھا پر اب وہ آزادی چاہتا تھا۔ وہ ناشتے میں دودھ کے بجائے ڈھیر ساری کافی حلق سے اتارنے کا خواہش مند تھا۔ باداموں سے آسے چڑ ہو گئی تھی۔ وہ کھلی پاکٹ منی کا خواہش مند تھا۔ زندگی ایک ڈھب پر گزارتے، عاجز آ چکا تھا۔ وہ پروفیسر صاحب کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ

اب بچہ نہیں رہا بلکہ ایم بی اے کے فائنل سمسٹر میں آ چکا ہے۔ اس کا حلقۂ احباب ہے...... وہ شہر کی ایک بہترین یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہے (جو بقول اس کے پروفیسر صاحب نے محض دھاک بٹھانے کے لیے اس کا شہر کی بہترین یونیورسٹی میں ایڈمیشن کروا کر، اتنا خرچا کیا ہے) اب اگر وہ ایسی اونچی جگہ پر پڑھے گا تو رکھ رکھاؤ تو رکھنا پڑے گا ناں......

اور اس نے کوئی ایسی ہیوی ڈیمانڈ تو نہیں کی محض ''ہیوی بائیک'' ہی تو مانگی ہے مگر پروفیسر صاحب کا میانہ روی کا اصول ان کے آڑے آ رہا تھا جبکہ زیاد کے خیال میں اصل رکاوٹ ''بخل'' ہے، پروفیسر صاحب اپنی اولاد کے معاملے میں کنجوس ہیں، ٹھیک ہے اگر کچھ عرصہ پہلے ہی انہوں نے نئی بائیک دلائی تھی تو کیا ہوا......؟ کیا باپ ایک کے بعد دوسری چیز نہیں دلاتے......؟ اس کا اصل رونا ہی یہی تھا کہ پروفیسر صاحب پیسے کا کیا کرتے ہیں؟ ان کے ''سوشل اسٹیٹس'' سے وہ بخوبی واقف تھا۔ پھوں پھاں کی عادت نہ ان میں تھی نہ امی میں...... گھر بھی سادگی اور سلیقہ مندی کا منہ بولتا ثبوت تھا تو پھر اس کا ''حق......'' پروفیسر صاحب کسے دیتے رہے ہیں جو اس کے لیے ان کے پاس محض ایک ہیوی بائیک کے لیے رقم نہیں...... کہاں جاتا ہے میرا حق......؟ اور زیاد... کو زیادہ دن تک یہ کھوج نہیں لگانی پڑی تھی۔

☆☆☆

موسم سرما عروج پر تھا۔ رات بھی شدید بارش ہوئی تھی جس کی وجہ سے ٹھنڈ میں مزید اضافہ ہوا تھا۔ مگر صبح سورج نکلنے کی وجہ سے گھروں کے صحن پُر رونق ہو گئے تھے۔ اتوار کا دن تھا، اس لیے ہر گھر سے بچوں کی چہکار کی آواز آتی بہت بھلی محسوس ہو رہی تھی۔ پروفیسر صاحب بھی طبیعت میں گرانی کے کارن آج گھر میں موجود تھے۔ حالانکہ چھٹی کے دن وہ کبھی گھر میں نہیں ٹکتے تھے۔ ضرور کسی نہ کسی کے بلاوے پر گھر سے باہر ہوتے تھے۔ اس وقت وہ دھوپ کا لطف اٹھاتے تازہ اخبار کی سطر، سطر پڑھنے میں معروف تھے۔ امی کچن میں ابو کی پسند کے پکوان بنانے میں لگی تھیں کہ کوئی تو دن ہوتا تھا جب شوہر سارا دن گھر میں موجود ہوتے تھے جبکہ دادی اماں حسبِ معمول ملازمہ سے پنڈلیوں کی مالش کروانے کے بعد وہیں صحن میں کرسی ڈالے معمول کی تسبیحات پڑھنے میں مصروف تھیں۔ زیاد تک سک سے تیار کمرے سے باہر آیا تھا۔ آج اس کا پروگرام اپنے دوستوں کے ساتھ ان کی ہیوی بائیکس کو لانگ روٹ پر انجوائے کرنے کا تھا۔ مگر پروفیسر صاحب کو صحن میں موجود پا کر ٹھٹک گیا تھا کیونکہ وہ یقیناً اس کی تیاری دیکھ کر ٹھٹک جاتے۔ دل میں ہزار بہانے تیار کرتا وہ دبے قدموں باہر آیا تھا۔ پروفیسر صاحب کا چہرہ پوری طرح سے اخبار کے پیچھے چھپا ہوا تھا لہٰذا بنا چاپ کیے وہ صحن سے ملحق چھوٹی سی گلی میں کھڑی بائیک کو احتیاط سے گھسیٹ کر گلی کے آخری سرے پر بنے چھوٹے گیٹ سے باہر نکال لینا چاہتا تھا۔ پروفیسر صاحب کی پوچھ پڑتال سے بچ کر نکلنے کا یہ طریقہ خاصا احمقانہ تھا۔ روزانہ سیکڑوں طالب علموں کی چال سے ان کی شخصیت جانچ لینے والا معلم اپنی اولاد کے قدموں کی چاپ کیسے نہیں پرکھ سکتا......؟ زیاد نے بنا آواز کیے بائیک کو اسٹینڈ سے اتارا تھا اور چند قدموں کے فاصلے تک بائیک کو ابھی گھسیٹ پایا تھا کہ اس کے کانوں میں پروفیسر صاحب کی آواز آئی۔

''برخوردار......! سیانے کہتے ہیں کہ بائیک کو کک لگائی جائے تو وہ چلتی ہے، تم بھی ایسی کوشش کیوں نہیں کرتے؟'' زیاد کا دل چاہا بائیک کو ایک زوردار دھکا دے اور صحن کی دیوار پر دے مارے مگر وہ ہمیشہ کی طرح بے بس تھا۔ اس نے پلٹ کر پروفیسر

صاحب کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کی مگر آواز اخبار کے پیچھے سے آئی تھی۔ زیاد نے غور سے اخبار میں وہ سوراخ ڈھونڈنے کی کوشش کی جس میں سے انہوں نے زیاد کو تاڑا تھا۔ دادی اماں جو بیٹھے، بیٹھے اونگھنے لگی تھیں، الرٹ ہو کر پوتے کی طرف متوجہ تھیں۔ اب جواب دینے کے بغیر چارہ نہیں تھا تبھی بولا۔

''وہ اصل میں ابو...... یونیورسٹی میں فائنل سمسٹر چل رہا ہے اس لیے اسائنمنٹس بنانے کے لیے سب دوست اکٹھے ہو رہے ہیں اور بائیک تو ویسے بھی دس منٹ لے ہی لیتی ہے، اسٹارٹ ہونے میں۔ بہت تنگ کرنے لگی ہے۔'' زیاد بوکھلا ضرور گیا تھا مگر بائیک کا خود ساختہ نقص بتانا نہیں بھولا تھا۔

''اچھا! لاؤ میں بھی تو دیکھوں ذرا......'' پروفیسر صاحب نے مصنوعی فکرمندی سے اخبار لپیٹا۔

''نہیں، نہیں ابو...... اتنی بڑی پرابلم نہیں ہے۔ آپ بیٹھیں......'' زیاد نے فٹافٹ بائیک پر بیٹھ کر اسے کک لگائی تھی۔ پروفیسر صاحب کے بقول...... بیوقوفانہ طرزِ عمل اس پر ختم تھا۔ اب بھی اپنے عمل سے اپنے بیان کی نفی کر بیٹھا تھا۔

''ہوں...... اچھا ہوا اسٹارٹ ہوگئی۔'' پروفیسر صاحب نے دوبارہ کرسی سے ٹیک لگائی اور بولے۔ ''نہیں تو مکینک کی خیر نہیں تھی برخوردار......! آخر پوری تسلی دی تھی اس نے بائیک کی حالت کے بارے میں۔''

دادی اماں نے باپ، بیٹے کی نوک جھوک پر... بہ مشکل ہنسی دبائی تھی۔ زیاد جان چھڑاتا اسٹارٹ بائیک کو لے کر گیٹ تک پہنچا ہی تھا کہ گیٹ کی گھنٹی بج اٹھی...... اس نے بائیک پر بیٹھے، بیٹھے دروازہ کھولا، قدوسی صاحب تھے، پروفیسر صاحب کے قریبی دوست...... اس نے سلام کر کے انہیں اندر آنے کو کہا اور خود ان کے ذرا پہلو سے بائیک باہر لے جانے لگا تھا کہ قدوسی صاحب نے اسے روک لیا۔

''بیٹا! یہ رسید پروفیسر صاحب کو دے دو۔ ان سے کہنا کہ جن کو انہوں نے ایک لاکھ پندرہ ہزار روپے بھجوائے تھے، یہ ان کی طرف سے ہے۔ ابھی میں جلدی میں ہوں پھر کسی وقت آ کر تفصیلاً بات کروں گا...... ابھی چلتا ہوں......'' قدوسی صاحب ہوا کے جھونکے کی طرح آ کر چلے گئے۔ یہ جانے بغیر کہ زیاد کے دل میں لگی چنگاری کو ہوا دکھا گئے ہیں۔ ایک بیٹے کو باپ کے مقابل کھڑا کرنے کا سامان فراہم کر گئے ہیں۔ لمحوں میں زیاد کا دماغ سلگنے لگا تھا۔ اندرونی خلفشار اس کی آنکھوں میں نمایاں تھا۔ اس لیے کہ ابھی کل بھی ایک ایسا ہی واقعہ ہوا تھا جب ایک دور پرے کی رشتے دار آ کر پروفیسر صاحب کی دریا دلی کے گن گا رہی تھیں اور اپنے کمرے میں موجود زیاد سب سن رہا تھا۔ لاشعوری طور پر اس کا ہاتھ بائیک کو مسلسل ریس دینے لگا تھا۔ اس کے بالکل پیچھے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑے پروفیسر صاحب کا دل سکڑ کر پھیلا تھا، زبان جیسے خشک ہو کر تالو کو جا لگی تھی جو بھی تھا زیاد میں ان کی جان تھی مگر بلاشبہ وہ مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ ساری عمر نہ ڈرے تھے، نہ جھکے تھے۔

دادی اماں ساری صورتِ حال کی سنگینی جانچ کر زیاد کو آواز دے بیٹھیں۔ وہ نہیں چاہ رہی تھیں کہ اس وقت زیاد بائیک پر کہیں جائے...... جذباتی اور غصہ ور تو وہ شروع سے تھا۔ دادی اماں کی آواز سن کر زیاد نے لال بوٹی ہوتی آنکھوں سے پلٹ کر دیکھا تو نظر قریب کھڑے باپ کے مطمئن چہرے پر جا ٹکی۔ اور اگلے ہی لمحے رسید کی پرچی باپ کے پیروں میں پھینکتا وہ طوفان کی طرح بائیک نکال کر لے گیا۔ یہ دیکھے بغیر کہ پروفیسر صاحب نے وہ رسید یوں جھپٹ کر اٹھائی تھی جیسے وہ رسید نہیں کوئی قیمتی خزانہ ہو......

☆☆☆

شام ڈھل چکی تھی۔ مغرب کی اذانیں بلند ہونا شروع ہوگئی تھیں۔ مگر اس گھر کا ایک بوڑھا، کمزور اور بیمار وجود جبکہ دو بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑے نیم توانا نفوس صبح سے خالی پیٹ، صحن میں بیٹھے صرف جوان بیٹے کی راہ تک رہے تھے۔ امی نے ڈبڈبائی آنکھوں سے آسمان کو تکا جہاں پرندے گھروں کو اڑان بھر رہے تھے۔

''زیاد تو بھی گھر لوٹ آ...... میرے بچے......''

ماں کے دل سے ہوک اٹھی تھی۔ دادی اماں کا سردی کی شدت سے چٹختا بوڑھا چہرہ، جوان پوتے کے لیے فکرمند تھا تو نڈھال پروفیسر صاحب کا مضبوط دل بھی ہو چکا تھا۔ انہوں نے ماں کو بہت دفعہ اندر کمرے میں بھیجنے کی اور کچھ کھلانے کی کوشش کی مگر بے سود...... لاکھ باشعور سہی...... مدلل طرزِ گفتگو رکھنے والی عورت سہی...... اندر سے وہ روایتی دادی اماں ہی تھیں...... ''اصل'' سے زیادہ انہیں بھی ''سود'' پیارا تھا۔

اسی ادھیڑبن میں نہ جانے کتنے لمحے سرکے تھے کہ زیاد کی مخصوص ڈپلیکیٹ چابی کی کھنک نے ان ...تینوں کو زندہ کر دیا تھا۔ گیٹ کھلا اور زیاد خاموشی سے بائیک گھسیٹتا اندر چلا آیا۔ ان تینوں نے بائیک کی بدتر حالت کو دیکھا مگر کچھ بھی پوچھنے سے گریز کیا...... جو چیخ، چیخ کر کسی شدید ایکسیڈنٹ کا پتا دے رہی تھی۔ یقینی بات تھی کہ جس جذباتی کشمکش کا شکار ہو کر زیاد گھر سے نکلا تھا اس میں، اس کا بخیریت گھر واپس آ جانا غنیمت تھا۔ پروفیسر صاحب کے لبوں کو ایک ہلکی سی مسکراہٹ نے چھوا تھا، بائیک کی حالت دیکھ کر خودکلامی کی۔

''خبیث! سچ میں بائیک ٹھوک آیا ہے، ناقابلِ استعمال بنانے کی ہر ممکن کوشش......'' بیٹے کو خیریت سے سامنے دیکھ کر دل ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ دو چار تھپڑ بھی جڑ دیں۔ امی اور دادی اماں دونوں زیاد سے لپٹ، لپٹ جا رہی تھیں۔ دونوں ٹٹول، ٹٹول کر اس کے جسم کا جائزہ لے رہی تھیں۔ مبادا کہیں خود کو بھی چوٹ لگوا لایا ہو۔

سنو لڑکی

سنو لڑکی......!
زمانے کی طرح تم نے کسی کے خواب دیکھے ہیں
اگر خوابوں کی تعبیر یں تمہیں زندہ بھی رکھتی ہیں
تو اپنے پیار کی خاطر
زمانے کو کبھی بھی درمیاں اپنے نہیں لانا
زمانہ تو کسی کی کیدو سے ہرگز کم نہیں جاناں
سنو لڑکی......

شاعرہ: فریدہ فری...... لاہور

اصل جواب

ٹیچر: ''دو میں سے دو نکلے تو کیا بچا......؟''
اسٹوڈنٹ ''ہم کو سوال سمجھ نہیں آیا؟''
ٹیچر: ''تمہارے پاس دو روٹیاں تھیں تم نے ان کو کھا لیا اب تمہارے پاس کیا بچا؟''
اسٹوڈنٹ: ''سالن!''

از: یاسمین اقبال، سنگھ پورہ لاہور

ہنستے رہو

☆ چیونٹی رکشے میں بیٹھی اور پاؤں باہر رکھا۔
ڈرائیور: ''میم! پاؤں اندر کر لیجیے۔''
چیونٹی: ''نہیں راستے میں ہاتھی ملا تو لات مارنی ہے، کل منہ چڑا کر گیا تھا......''

☆☆☆

☆ لڑکی: ''آپ میری منگنی پر کیا تحفہ دیں گے؟''
سکھ: ''جو آپ کہو گی۔''
لڑکی: ''رنگ دے دینا۔''
سکھ: ''ٹھیک ہے پر اٹینڈ مت کرنا بیلنس کٹ جاتا ہے۔''

پروین افضل شاہین، بہاول نگر

''اب بس بھی کریں آپ دونوں...... آپ کا بیٹا دنگل جیت کرنہیں آرہا بلکہ پورے شہر میں پھرتے آوارہ کتوں کی گنتی کر کے آرہے ہیں برخوردار...... دیکھ نہیں رہیں خود کی حالت کیسی ہو رہی ہے؟ اور رہ گئی بائیک تو اس کا تیا پانچا آج نہیں تو کل لازمی تھا۔'' پروفیسر صاحب سارے دن کی کھولن اتارنا لازمی سمجھ رہے تھے جبکہ دادی اماں اور امی مسلسل انہیں آنکھ کے اشارے سے منع کر رہی تھیں۔ مگر پروفیسر صاحب مکمل فارم میں تھے۔

''کہاں تھے تم سارا دن......؟ گھر والوں کی فکر یا پروا بیچ کھائی ہے...... اور بائیک پر کیا ظلم ڈھایا ہے، ذرا یہ بھی بتادو......'' پروفیسر صاحب کو خاموش کھڑے زیاد کی خاموشی سے جھنجلاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

وہ شعوری طور پر اسے بلوانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ رسید والے واقعے کے حوالے سے زیاد کا ردِعمل جان لینا چاہتے تھے مگر وہ پروفیسر صاحب کے سوالات کے باوجود خاموش کھڑا کسی غیر مرئی نقطے کو گھورنے میں مصروف تھا۔ تبھی پروفیسر صاحب دھیرے، دھیرے چلتے بائیک کے پاس آئے اور جانچتی ہوئی نظروں سے اس کا جائزہ لینے کے بعد بولے۔

''چلو تمہاری مرضی تو پوری ہوئی اب...... نئی بائیک کا سبب بنا ہی لیا آخر......'' پروفیسر صاحب کی زبان سے الفاظ کیا ادا ہوئے، زیاد کے تھکے ہوئے اعصاب پہ گویا ہنٹر برس گیا، وہ یک دم پھٹ پڑا تھا۔

''مجھے نہیں چاہیے کچھ بھی...... پاس رکھیے آپ...... اپنے پیسے...... آپ کے خزانے میں کمی آجائے گی ورنہ...... آپ غیروں کو لاکھ دیجیے یا دو لاکھ...... مجھے پروا نہیں مگر اب مجھے آپ کے خزانے میں سے کچھ نہیں چاہیے۔ جوڑ کر رکھیے، سنبھالیے اپنے خزانے کو سدا......''

''بکواس بند کرو زیاد......'' دادی اماں سے برداشت نہیں ہو سکا۔ تبھی تڑپ کر بولیں۔ ''کیا خزانہ، خزانہ لگا رکھی ہے؟ کون سی ایسی چیز ہے جو تم بچوں سے چھپا کر رکھی گئی ہے؟ کہاں گڑا دیکھ لیا تم نے ان دیکھا خزانہ......؟'' زیاد اس قدر متنفر ہوگا، کسی کو گمان تک نہیں تھا۔

''یہ تو پروفیسر صاحب کو پتا ہوگا ناں...... میں کیا جانوں......؟ مجھے تو بس اتنا پتا ہے کہ اوروں کے لیے ان کے پاس دینے کو لاکھ، لاکھ، ڈیڑھ، ڈیڑھ لاکھ کی رقم ہے، جو یہ خدا ترسی کرتے ہوئے دیے جا رہے ہیں مگر اپنے سگے بیٹے کے لیے...... اپنے خزانے میں سے محض ایک ہیوی بائیک کے لیے بھی پیسے نہیں دے سکتے تو پھر مجھے بھی کوئی پروا نہیں...... ان کا خزانہ، انہی کو مبارک......! مگر مجھے ساری عمر یہ دکھ ضرور رہے گا کہ تمام عالم کو علم کی روشنی بانٹنے والا میرا باپ ''بخیل'' ہے۔''

''زیاد......'' امی اس درجہ گستاخی پہ ششدر رہ گئی تھیں اور ان کا ہاتھ تھپڑ مارنے کے لیے اوپر اٹھا تھا جسے نرمی سے پروفیسر صاحب نے تھام کر نیچے کر دیا تھا۔

''مارلیں...... مارلیں کیا فرق پڑ جائے گا......؟ کم از کم مارنے کے معاملے میں تو بخل سے کام نہ لیں۔'' زیاد استہزائیہ انداز میں کہتا ہوا کمرے کا رخ کرنے لگا، جب اسے اپنے پیچھے پروفیسر صاحب کی آواز سنائی دی۔

''زیاد! ذرا میرے کمرے میں چلو...... آج میں تمہیں اپنا پوشیدہ خزانہ دکھا دینا چاہتا ہوں...... چلو...'' پروفیسر صاحب نے قدم بڑھائے تھے۔ زیاد نے حیرت اور بے یقینی سے پروفیسر صاحب کو دیکھا اور پھر بولا۔

''سچ میں......؟ دیکھیں ابو مجھے آپ کی دولت جائداد کی ہوس نہیں...... مگر میں یہ ضرور جاننا چاہتا ہوں کہ آخر وہ کون سا ''خفیہ خزانہ'' ہے جو میں آپ کا بیٹا ہوتے ہوئے بھی نہیں جانتا، جہاں سے دنیا بھر کی

امداد کے لیے بڑی، بڑی رقمیں نکل آتی ہیں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی زیاد کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا اور کہیں دل میں شرمندگی کا احساس بھی جگہ بنا رہا تھا۔

''ہے...... واقعی ہے، ایسا خفیہ خزانہ ہے جو تمام کائنات کے خزانوں پر بھاری ہے مگر میں زندگی میں اس سے نفع نہیں اٹھا سکتا یہاں تک کہ مجھے موت آجائے۔'' پروفیسر صاحب کے ٹھنڈے لہجے میں پتا نہیں کیا تھا جس نے زیاد کے احساسات کو پل بھر کے لیے منجمد کر دیا تھا۔

''اور میں......؟'' زیاد نے سینے پر انگلی رکھ کر باپ سے سوال کیا۔

''کیا میرے نفع کے لیے ہے وہ خزانہ......؟''

''نہیں، تم بھی اس سے زندگی میں نفع نہیں اٹھا سکتے۔ یہاں تک کہ تمہیں بھی موت آجائے......''

امی اور دادی اماں نے کلیجے تھامے تھے جبکہ زیاد کی آنکھیں شدت حیرت سے پھٹنے کے قریب تھیں۔

''اور یاد رکھو تم نے وہ خزانہ اگر اپنی اولاد کو منتقل کیا تو وہ بھی اس سے قبل از مرگ نفع نہیں اٹھا سکتی...... اب چلو میرے ساتھ کمرے میں، باقی باتیں وہیں ہوں گی۔ آپ دونوں خواتین یہیں رکیے......'' پروفیسر صاحب نے ماں اور بیوی کو مخاطب کیا۔ ''اور ایک باپ کے اپنی اولاد کے سامنے سرخرو ہونے کی دعا کیجیے گا۔'' آخری فقرہ کہتے، پروفیسر صاحب کا لہجہ بھرا گیا۔ زیاد، باپ کے قدم پہ قدم رکھتا ان کے پیچھے کمرے میں چلا آیا۔

پروفیسر صاحب نے اسے دروازہ بند کرنے کو کہا اور خود دھیرے سے پلنگ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئے۔

''میری الماری کا دایاں پٹ کھولو......'' پروفیسر صاحب نے دروازے پر جمے کھڑے زیاد کو کہا۔ ''اب نچلی دراز کو کھولو اور اس کے پچھلے خانے میں چھوٹا سا ڈبا رکھا ہے۔ اسے نکال لاؤ۔'' زیاد کسی معمول کی طرح پروفیسر صاحب کے کہے کے مطابق عمل کرتا ہوا دراز کھولنے لگا۔ دراز کے پچھلے خانے میں واقعی ایک چھوٹا سا خستہ حال لکڑی کا ڈبا پڑا تھا۔ زیاد نے اسے نکال کر ہاتھوں میں لیا اور پہلی سوچ اس کے دماغ میں جو آئی وہ یہ تھی۔

''اتنے چھوٹے ڈبے میں...... بڑا خزانہ......؟ شاید سونے کے بسکٹ......؟'' ایک میٹھی، میٹھی سی لہر زیاد کے پورے جسم میں دوڑ گئی تھی۔ پروفیسر صاحب نے زیاد کی شخصیت پر جو ٹیگ ہمیشہ نصب کیے رکھا تھا۔

''احمقانہ خیالات، احمقانہ حرکات، زیاد......'' وہ واقعتاً اس پر فٹ بیٹھتا تھا۔

''اسے میرے پاس لے آؤ۔'' نامعلوم ابھی کتنی دیر زیاد کا وجود میٹھی، میٹھی لہروں کے سپرد رہتا جبھی اسے پروفیسر صاحب نے پکار لیا۔ اس نے خاموشی سے پلٹ کر باکس باپ کے حوالے کیا اور خود قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

پروفیسر صاحب چند لمحے گہری سوچتی نگاہوں سے اس باکس کو تکتے رہے۔ زیاد کو اس لمحے باپ کی آنکھوں میں واضح نمی دکھائی دی تھی پھر انہوں نے باکس کا چھوٹا سا خستہ ہک ہٹا کر اس کا ڈھکن کھول دیا۔ زیاد نے خوشی اور تجسس کے تحت کچھ اچک کر اس باکس میں جھانکا اور پھر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس میں ڈھیروں کاغذ اور بوسیدہ رسیدوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایک طرف تو پرانی رسیدوں کا چھوٹا سا بنڈل پڑا تھا جو سارا کا سارا پیلا پڑ چکا تھا۔ پتا نہیں کس صدی کے کاغذ تھے۔ ان ان گنت چھوٹے کاغذوں اور رسیدوں میں زیاد کو کام کی کوئی چیز بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ سخت مایوس ہوا تھا۔ اسے پروفیسر صاحب پر شدید غصہ آرہا تھا جو اسے بے وقوف بنا رہے تھے مگر ضبط کیے بیٹھا رہا اور پھر پروفیسر صاحب کی آواز سنائی دی۔

''تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ ان رسیدوں اور کاغذ کے ٹکڑوں کے لیے تمہارا کوفت بھرا تجسس ختم

کرنے کے لیے تھوڑی سی تفصیل میں جاؤں گا۔'' زیاد نے فوراً چہرے کے تاثرات نارمل کیے پروفیسر صاحب باپ تھے، جان گئے تھے بیٹے کے جذبات......

''تمہارے دادا رحمت اللہ ٹھیٹ کاروباری آدمی تھے۔ صرف اپنے گھر والوں کی نظر میں اور انتہائی خدا ترس اور ہمدرد تھے دنیا کی نظر میں...... تمہاری طرح ہمیں بھی ان سے شکایتیں تھیں۔ پیسے کی کمی کی...... مانگیں پوری نہ کرنے کی...... عیش و عشرت کا سامان مہیا نہ کرنے کی...... ان کا کام محض گھر میں راشن ڈالنا اور بھول جانا تھا۔ اماں کو لگا بندھا پکڑاتے تھے اور پھر اماں ہوتیں اور ان کے رونے...... وہ کیسے ہم بہن بھائیوں کی ضرورتیں پوری کرتیں، کیسے فیسیں دیتیں۔ ابا جی کو کبھی سروکار نہیں تھا ان باتوں سے۔ بہت سے گلے شکوے دل میں لیے ہم بہن بھائی اپنے، اپنے ٹھکانے لگے اور ابا جی اپنے آخری ٹھکانے...... اور پھر جس دن وہ مرے اس دن ہم پر کھلا کہ ابا جی محض ہمیں یتیم نہیں کر گئے بلکہ ایک دنیا کو بے آسرا چھوڑ گئے۔ ان کی میت پر ان کی اولاد سے زیادہ رونے والے انجان لوگ تھے۔ جو روتے جاتے اور ہمیں بتاتے جاتے تھے کہ کس کے گھر کا چولھا ابا جی کے دم سے جلتا تھا۔ کس کی بیٹی ابا جی کی وجہ سے بیاہی گئی...... کس کو روزگار ابا جی نے دلایا۔ کسی کا کچھ اور کسی کا کچھ اور بہت سے لوگوں کا بہت کچھ ابا جی اپنے سنگ سمیٹ کر لے گئے۔

بہت دن بعد جب میں نے ابا جی کی دکان کھولی تو وہاں کسی کونے کھدرے سے مجھے یہ ڈبا ملا...... بالکل ایسا ہی تجسس میرے دل میں بھی جاگا تھا جیسا تمہارے دل میں ابھرا تھا۔ میں نے بھی یہی گمان کیا کہ میرے ہاتھ نہ جانے کیسا خزانہ لگنے والا ہے...... شکر تھا ابا جی کو ہمارا خیال تو آیا...... ساری عمر دوسروں کو بھرتے رہے اب مرنے کے بعد ہمیں بھی کچھ نواز ہی گئے۔

مگر جیسے ہی میں نے ڈبے کا ڈھک ہٹایا...... ڈھیر سارے چھوٹے، چھوٹے کاغذ کے پرزے میرا منہ چڑا رہے تھے...... بالکل ویسا ہی تاثر اور غصہ میرے دل میں بھی جاگا تھا جیسا ابھی میں نے تمہارے چہرے پر دیکھا تھا...... میں نے بہ مشکل خود پر قابو پایا اور ان کاغذ کے پرزوں کو دیکھنے لگا۔ عجیب سی بات تھی...... ہر دوسرے پرزے پر تقریباً ایک جیسی عبارت لکھی تھی۔

''لالہ رحمت اللہ...... دس روپے کی روٹی''

''لالہ رحمت اللہ...... پانچ روپے کی روٹی''

''لالہ رحمت اللہ...... سات روپے کی روٹی''

میں نے باقی کاغذوں کو بھی پھرول کے دیکھا جن میں سے کافی ساری تو رسیدیں تھیں اور کسی میں چھوٹی، چھوٹی سی لکھائی میں پیسوں کا حساب کتاب لکھا تھا۔ ابھی میں اسی ادھیڑ بن میں لگا تھا کہ میرے دائیں ہاتھ میں پڑی چوکی پہ محمد دین چاچا آ کر بیٹھ گئے۔ چاچا محمد دین ابا جی کے بہت قریبی یار دوستوں میں سے تھے۔ بالکل سامنے ہی ان کی کپڑے کی دکان تھی۔ ابا جی کی دکان کھلی دیکھی اور مجھے اس میں موجود پا کر اٹھ کر میرے پاس چلے آئے...... میں ان سے ملنے کے لیے اٹھنے لگا تو مجھے کندھے سے تھپک کر بٹھا دیا۔ ان کی آنکھیں بھر آئی تھیں...... شاید ابا جی کی یاد نے چٹکی لی تھی۔ دونوں کی بیٹھک بھی بڑی تھی ایک دوسرے کے ساتھ...... میرے ہاتھوں میں موجود ڈبے اور اس میں موجود کاغذ کے ٹکڑوں کو دیکھ میں مجھ سے پوچھنے لگے۔''

''کیا دیکھ رہا ہے محمود پتر......؟ کیا ڈھونڈنا چاہ رہا ہے؟'' ان کی نظروں میں ناقابلِ فہم سا تاثر تھا۔ مجھے عجیب طرح کی شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔

''کچھ نہیں چاچا جی...... وہ میں بس...... یونہی...... آج ویسے ہی دکان کھولنے کو جی کیا تو چلا آیا...... سوچا کہ......'' میں نے جواب دیا۔

''کیا سوچا......؟'' چاچا نے میری بات اچک لی۔

''یہی کہ تیرا باپ اس دکان میں تم لوگوں کے لیے کون سا خزانہ چھپا کر گیا ہے؟'' چاچا سر جھٹک کر دھیما سا ہنسے جبکہ میں شرم سے پسینے، پسینے ہو گیا۔

''شرم نہ کھا پتر...... آخر جو ہے تم سب کا ہی ہے۔ وارثت کے لیے شرم کیوں کھائی...... پر پتر ترکہ تو، تو ہاتھ میں تھام کر بیٹھا ہے۔'' چاچا نے میرا دھیان ڈبے کی طرف کرایا۔

''کیا...... یہ ڈبا......؟ ہمارا ترکہ......؟''

مجھے لگا چاچا دین محمد پگلا گیا ہے...... کیسی عجیب بات کر رہا تھا ناں......؟ بھلا کبھی کسی باپ نے اولاد کے لیے وراثت میں پرچیاں بھی چھوڑی ہوں گی......؟ مگر میں اپنے مرے باپ کے لیے کچھ بھی نہیں کہنا چاہتا تھا۔ مجھ میں برداشت اور تحمل بہت زیادہ تھا کہ ایک یہ واحد چیز تھی جو ہمارے باپ کی طرف سے ہم بچوں کو وافر ملنے والی سہولت تھی کیونکہ کسی بھی دکھ، درد، تنگی، ترشی میں اس خصوصیت کا موجود ہونا ہی کسی سہولت سے کم نہیں ہوتا......

''کیوں تاؤ کھا رہا ہے پتر......؟'' چاچا محمد دین کی آواز نے میرے خیالات کی ڈور کھینچی...... مجھے چاچا کے درست قیاس پہ حیرت بھی ہوئی۔ یہ پرانے وقتوں کے بابے، بابیاں (بوڑھے، بوڑھیاں) آپ کے کچھ نہ بھی لگتے ہوں تو پھر بھی آپ کی سوچیں سگے ماں، باپ کی طرح پڑھ لیتے ہیں۔''باپ پہ غصہ نہ کر...... تیرا باپ بڑا درویش آدمی تھا۔ تم لوگ جو بھی سمجھو...... پر دنیا جانتی ہے کہ وہ ننگے کو کپڑا اور بھوکے کو نوالہ دینے والوں میں سے تھا۔ یہ جو ڈبا تیرے ہاتھوں میں ہے ناں...... اگر تیری عقل سے پا جائے تو یہ سچ میں خزانہ ہے۔ اس ڈبے میں تیرے باپ کا کردار بند ہے۔ اس کی خدا ترسی، ہمدردی اور غریبوں کی دعائیں جمع ہوئی رکھی ہیں۔ سچ پوچھ تو اس میں لوگوں کی وہ گواہیاں بند ہیں جنہیں تیرے میرے جیسے فقیر روزِ قیامت اپنے نیک اعمال کا وزن زیادہ کرنے کو، حلق سے باہر زبانیں لٹکائے ڈھونڈتے پھریں گے۔ یہ جو تو پرچی دیکھ رہا ہے ناں......'' چاچا نے ہاتھ بڑھا کر وہی پرچی تھامی جس پر لکھا تھا۔

''لالہ رحمت اللہ، دس روپے کی روٹی......''

''یہ تیرے باپ کا روز کا کام تھا...... سامنے جو یونس ہوٹل ہے ناں...... اُدھر تیرے باپ نے کہہ رکھا تھا کہ دن بھر میں جو فقیر، غریب خواہ ضرورت مند یا ڈھونگی، لالہ رحمت اللہ کا نام لے کر روٹی مانگے تو اسے کبھی نہ مت کہنا۔ جتنا مرضی کھا لے، کھانے دینا اور رات میں ایک ہی دفعہ حساب کی پرچی میری دکان پر پہنچا دینا...... یہ پرچیاں اسی کھاتے کی ہیں۔ روزانہ نہ جانے کتنے جھوٹے تو کتنے سچے آ کر کھانا کھاتے اور تیرا باپ بل چکاتا۔ اصل میں جو بھی رحمت اللہ کی ہٹی پہ مانگنے آتا وہ اسے سامنے ہوٹل روانہ کر دیتا۔ دیکھا، دیکھی وہ لوگ بھی جانے لگے جنہیں تیرے باپ نے نہیں بھیجا ہوتا تھا۔ مگر پھر رحمت اللہ کو ساری دیہاڑی (دن) کی چاہے دس روپے کی روٹی پڑتی یا پندرہ کی...... اس کے متھے کبھی وٹ نہیں پڑا (اس زمانے میں دس روپے کی بھی اہمیت بہت زیادہ تھی) حاجی کرم دین کے پتر کو دکان تیرے پیو (باپ) نے ہی ڈال کر دی تھی۔ جس سے اس غریب کے بچے پلنے شروع ہوئے، کمہاروں کا منڈا دبئی کیسے پہنچ گیا......؟ تیرے باپ کے دیے ادھار سے، جو کبھی واپس نہیں ہوا۔ رحمت اللہ روز رات کو اپنا دیا ہوا معاف کر کے سوانے ولوں میں سے تھا۔

یہ جو ادریس ہے، پچھلی گلی میں جھگی ڈال رکھی ہے جس نے...... وہ جب عیسائی سے مسلمان ہوا تو اسے کھانے کے لالے پڑ گئے تھے۔ مسلمان اب بھی اس سے کچیج (کراہیت) کھاتے اور عیسائی پوچھتا نہ تھا۔ تو تیرا باپ ہی تھا جس کی دکان سے

یہ مرد بھی ناں......

تنگیِ نفس کی وجہ سے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا کہ پولن الرجی نے شدید حملہ کر دیا تھا...... اور رات کے اس پہر میں بے بسی میں یوں سانس کیا لے رہی تھی لگتا تھا ابھی دم گھٹ جائے گا۔

شوہرِ نامدار اپنی اسٹڈی روم میں کانوں پر ہیڈ فون لگائے موسیقی سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ مطالعہ اور موسیقی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ گرتی پڑتی ان کے کمرے میں اشاروں سے اپنی حالتِ زار بتائی۔ میری طرف متوجہ ہوئے، ہیڈ فون اتار کر احوال پوچھا کہ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں! (یہ جملہ ان کا دل جلایا کرتا تھا) اگر ایمرجنسی میں جلدی نہ لے جایا گیا تو حالت بگڑ بھی سکتی تھی۔ بڑبڑاتے ہوئے اٹھے، گاڑی نکالی اور مجھے ایمرجنسی سیکشن میں اسپتال لے گئے۔ راستہ بھر...... بولتے رہے، یہ بے وقت کیوں بیمار ہوئیں' یہ کون سا وقت ہے بے آرام کرنے کا...... میں ان کی عادت سے واقف تھی سنتی رہی...... خیر اسپتال میں آلۂ بحالیِ تنفس میرا مطلب ہے آکسیجن سے میری بے ربط سانس بحال ہوئی اور قریباً ایک گھنٹے بعد میں پُرسکون سی ہو کر گھر آ کر سوگئی۔

شب و روز گزرتے رہے۔ ایک رات ٹھیک ایک بجے مجھے نیند سے جگایا اور کہا کہ میری طبیعت خراب ہے اسپتال جانا ہے۔ ہمارا ڈرائیور شام کو واپس اپنے گھر چلا جاتا تھا...... سو میں نے اپنے بیگ میں کچھ رقم ڈالی اور انتہائی تیزی سے انہیں اسپتال لے آئی۔ ایمرجنسی میں بیٹھے ڈاکٹر اور عملے نے انہیں فوری امداد دی۔ لائف سیونگ انجکشن لگایا اور ایڈمٹ کر لیا کہ اب مریض آرام سے ہوگا۔ اگلے چند روز وہ انتہائی نگہداشت کے کمرے میں تھے۔ اور ڈاکٹر مسلسل ان کی نگرانی کرتے رہے تھے۔ اور میں کمرے کے باہر بیٹھی ان کی صحت یابی کے لیے دعاؤں میں مصروف تھی۔ بارہا یہی خیال آتا کہ انسان پہ یہ افتاد کسی بھی وقت آسکتی ہے اب ان سے کیا کہتی کہ دن کی روشنی میں آپ کیوں بیمار نہ پڑے...... یہ کون سا وقت تھا مجھے بے آرام کرنے کا؟

بعد میں، میں سوچتی رہی کہ اس روز وہ سارا دن کیوں بے چین سے لان میں چہل قدمی کرتے رہے تھے کہ شاید انہی باتوں کی بازگشت پر غور کر رہے تھے......؟ ویسے عام حالات میں بے حد خیال اور محبت کرنے والے انسان تھے اور میں ان کو یہ بات یاد دلا کر خوب چھیڑ خانی کرتی صرف مسکراہٹیں ہوتیں چہرے پر......

تحریر: فریدہ افتخار، اسلام آباد

اسے راشن پانی جاتا تھا۔ کون، کون سے بندے گنواؤں تجھے......؟ میں مانتا ہوں پتر کہ تم بچوں کے لیے تمہارا باپ کوئی لمبی چوڑی جائداد چھوڑ کر نہیں مرا...... مگر پتر اس غریب پرور کی مدد رب نے اس طرح کی کہ آج اس کی ساری اولاد کسی نہ کسی لائق ہو چکی ہے تو بھی بہت سا پڑھ گیا...... بہنیں تیری بیاہی گئیں۔ بھائی تیرا کمائی سے لگ گیا......

پتر محمود......! تیرے باپ نے یہ ڈبا دنیا دکھاوے کو نہیں بھرا...... وہ تو تاریکیوں میں گھروں کو راشن ڈھوتا تھا۔ یہ ڈبا وہ تم لوگوں کے لیے اس لیے چھوڑ گیا کہ شاید اس کی کسی اولاد کے ہاتھوں اس کے خزانے میں وادا (زیادتی) ہوتا رہے۔ اس نے ان اعمال کے اجر کے لیے دنیا میں آس نہیں لگائی تھی۔

وہ تو کہتا ہی اس کو "وڈے دن کا خزانہ......" (روزِ حشر کا خزانہ) تھا جو پتر ہر کوئی اکٹھا نہیں کر پاتا...... تیرے میرے جیسے منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ بڑی، بڑی باتیں کرنے والوں کے کام بھی بڑے ہوں، یہ ضروری نہیں ہوتا کبھی کبھار بازی وہ لوگ مار لیتے ہیں جو کم فہم سمجھے جاتے ہیں۔ اب یہ تجھ پہ ہے کہ پتر کہ اپنے باپ کے لیے صدقۂ جاریہ بن جا اور ڈال تارہ اس خزانے میں اعمال کے موتی اگر نہیں تو اٹھ اور سامنے والے تالے میں روڑ (بہا) آ...... تیرے باپ کی روح یقیناً سمجھ جائے گی کہ اس کی اولاد اس کا ترکہ سنبھال نہ سکی۔ اس کی چھوڑی جائداد تالے کے نذر ہوگئی......" چاچا محمد دین نے ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور کندھے پر پڑا صافہ اتار کر اپنی آنکھیں صاف کیں پھر کھڑے ہو کر میرا کندھا تھپک کر دکان پار کر گئے جبکہ میں وہیں پہ بیٹھا سود و زیاں کا حساب کرتا رہ گیا۔ کیا پایا تھا میں نے......؟

چوبیس سالہ زندگی میں...؟ کون سا دن ایسا تھا جو میں نے ابا جی کے ڈھب پر گزارا ہو؟ کس کی طرف سے مجھے کبھی کوئی رسید یا پرچی موصول ہوئی تھی؟

بس! وہ وقت مجھ پر ٹھہر گیا پھر میں نے ماضی دیکھا نہ مستقبل...... میں نے حال میں رہتے ہوئے آخرت کی فکر شروع کی...... رسیدیں اور پرچیاں اکٹھی کرنی شروع کیں۔ ابا جی کی طرح لوگوں کے گھروں میں راشن ڈالنے شروع کیے۔ بیروزگاروں کو کسی کام دھندے سے لگوایا...... کسی کی بیٹی کی شادی کا فرنیچر تو کسی کی بیٹی کی بارات کا کھانا، کسی غریب کی ٹپکتی چھت کو مرمت کروایا تو کسی کو علاج کی غرض سے رقم فراہم کی...... اور ان تمام کاموں کی رسیدیں وصول کیں...... اس لیے نہیں کہ کل کو میں مروں تو دنیا میرے لیے واہ، واہ کرے بلکہ اس لیے کہ جیسے میں نے ابا جی کے شروع کیے اس سلسلے کو آگے بڑھایا، ویسے ہی میری اولاد اس خزانے میں اپنا حصہ ڈال سکے لیکن......" پروفیسر صاحب نے جو بڑی دیر سے اپنی ذہن میں ماضی کی کھرچن، کھرچ رہے تھے لمحے بھر کو رکے اور بے جان بت کے مانند بیٹھے اپنے واحد اور جان سے عزیز بیٹے کو دیکھا۔

"لیکن ہم ایسے (خزانے) پائیں...... مرنے کے بعد...... یہاں تک کہ ہم حشر میں اٹھائیں جائیں گے۔ تب ہم اس خزانے کو پائیں گے اجر کی صورت، جزا کی صورت...... جنت کی صورت...... میں بخیل نہیں ہوں زیاد...... میں قطعاً بخیل نہیں ہوں، اللہ جانتا ہے میں نے اپنی اولاد کی خوراک، رہائش، پڑھائی، تربیت و پرورش میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تمہیں مجھ سے اس قدر گلے ہیں...... میں تمہیں اب بھی چھوٹے سے بچے کے مانند دیکھتا ہوں، اولاد کبھی ماں، باپ کے لیے بڑی نہیں ہوتی، میں تمہیں دودھ پلواتا ہوں کیونکہ میں اپنے بچے کے لیے اسے بہتر سمجھتا ہوں...... بادام کھلاتا ہوں کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ میرے پڑھائی میں جتے بیٹے کے دماغ کو بادام تقویت دیں گے......

میں تمہیں دس بجے کے بعد گھر سے باہر نہیں جانے دیتا ہوں کہ دل سوکھے پتے کے مانند تھرتھراتا ہے جب میرا بچہ رات گئے تک باہر رہتا ہے۔

مجھے لگتا ہے کہ میرا لائق بچہ شہر کے بہترین کالج اور یونیورسٹی کے قابل ہے سو میں نے اس کا ایڈمیشن وہیں کرایا اور...... اور مجھے لگتا ہے کہ میرا بیٹا ہیوی بائی کے قابل نہیں ہے وہ اس پر بیٹھ کر ہوا سے باتیں کرے گا، وہ اس پر سوار ہو کر بے پروا ہو سکتا ہے، وہ بھول سکتا ہے کہ اس کی ریش ڈرائیونگ خدانخواستہ اسے کسی نقصان سے دوچار کر سکتی ہے بس...... اتنا سا قصہ ہے میرے بیٹے......''

پروفیسر صاحب بات مکمل کر کے آنکھیں موندے گہری، گہری سانس لینے لگے...... تھکن جیسے رگ، رگ میں سرایت کر گئی تھی۔

''میں کنجوس نہیں ہوں، میں اپنی آخرت کے لیے ڈر چکا ہوں، تمہارے تو آگے لمبی زندگی پڑی ہے انشاء اللہ...... مگر میرے بچے...... میرا توشہ خالی ہے...... مجھے اپنی خالی جھولی کو اس خزانے سے بھرنے دو...... خدا کا واسطہ ہے تمہیں...... میں اور کتنا جیوں گا...... سب تمہارا ہی ہے مگر زیاد...... میرے بچے...... مجھے خالی ہاتھ مت جانے دو، مجھے اکٹھا کر لینے دو......''

اتنا کہہ کر پروفیسر صاحب بچوں کے مانند رو دیے۔ انہوں نے بیٹے کے سامنے اپنی پینگی کی تھی۔ وہ دکھ کی اتنا گہرائیوں میں ڈوب گئے تھے۔ انہیں خبر تک نہیں تھی کہ زیاد پہ کیا بیت گئی۔ وہ شدید سردی میں پسینے میں ڈوبا گہری، گہری سانس کھینچ رہا تھا۔

☆☆☆

''اُف...... پشیمانی سی پشیمانی تھی...... کیا سمجھتا رہا وہ اپنے باپ کو اور وہ کیا نکلے...... کیا وہ ایسے دادا کا پوتا یا ایسے باپ کا بیٹا کہلانے کا مستحق تھا؟ میں اپنے دھندوں میں الجھا رہا اور میرا باپ اپنے اور میرے لیے آخرت کا سامان کرنے میں لگا رہا اور اگر اب بھی میں اللہ کی رسی کو تھام نہ پاتا تو......؟'' زیاد کا پسینے پسینے ہوا جسم زوردار جھٹکا کھا گیا اور اس جھٹکے کے نتیجے میں وہ پروفیسر صاحب کے قدموں میں پڑا تھا۔

''مجھے معاف کر دیں ابو......! میں بدبخت ہوں، کم ظرف ہوں، میں باپ کو آزمانے چلا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ میری خود کی زندگی آزمائش بن جاتی تو......؟ میں آپ سے بدتمیزی کرتا رہا۔ آپ کو بخیل اور کنجوس سمجھتا رہا...... میں نہیں جانتا تھا کہ آپ کے اعمال روزِ حشر مجھے بھی خاک سے لاکھ کا کر دیں گے...... جو میں آپ کے قدم پہ قدم رکھ لوں...... مجھے معاف کر دیں ابو...... پلیز......'' زیاد رو رہا تھا اور زیاد کے رونے سے پروفیسر صاحب کا دل رو رہا تھا۔ انہوں نے جھک کر پیروں پہ گرے بیٹے کو اٹھایا، اس کی پیشانی چومی...... پھر بولے۔

''میں نے تمہیں معاف کیا...... ہمارا رب بھی ہمیں معاف کرے...... آج میں بہت آسودہ حال ہو گیا ہوں۔ میرا بیٹا میرے ساتھ آن کھڑا ہوا ہے۔ تم نے مجھے خوشیوں سے بھر دیا ہے اور باپ کو خوش کر کے اپنے خزانے کو نیکیوں سے......'' آخری جملہ کہتے ہوئے پروفیسر صاحب کا لہجہ ہلکا سا شرارتی ہوا تھا۔

''اب میں باہر جا تا ہوں ابو......! دادی اماں اور امی سخت پریشان ہوں گی......'' زیاد تیزی سے اٹھا اور باہر نکلنے کے لیے قدم دروازے کی سمت بڑھا دیے۔

''زیاد......؟'' عین اسی وقت پروفیسر صاحب نے پیچھے سے پکارا۔

''جی ابو......'' وہ پلٹا۔

''مجھے اچھا لگتا ہے، جب تم مجھے وہ کہتے ہو۔''

''وہ کیا ابو......؟''

''پروفیسر صاحب......'' اور پروفیسر صاحب کھلکھلا کر ہنس دیے۔ ان کے خوب صورت قہقہے میں زیاد کی چہکار بھی شامل تھی۔

واہمے

فرح طاہر



وہ کالج سے لوٹی تو نظر کے سامنے کوئی بھی نہیں تھا اسے کافی زیادہ حیرت ہوئی' یہ وقت تو دوپہر کے کھانے کا تھا ہر طرف چہل پہل ملا کرتی ہمیشہ گھر میں داخل ہوتے ہی امی جی کی آواز سنائی دیا کرتی مگر آج ایسا کچھ بھی نہیں تھا...... نہ کوئی سامنے موجود تھا اور نہ ہی کسی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہر طرف سناٹا طاری تھا وہ حیران و پریشان سی آگے بڑھی۔ کچن میں بھی کوئی موجود نہیں تھا۔ اس نے اپنے

کمرے میں بیگ اور فائل رکھی اور افرادِ خانہ کی تلاش میں باہر نکل آئی۔ سب کمروں میں دیکھنے کے بعد جیسے ہی وہ دادا جان کے کمرے قریب سے گزرنے لگی تو اسے امی جی آواز سنائی دی۔

''یہ سب یہاں اس وقت کیا کر رہے ہیں......؟'' خود سے سوال کرتی ادھ کھلے دروازے کو مزید کھولتی اندر داخل ہوئی...... اس کی متلاشی نگاہوں نے وہاں سب کو موجود پایا۔ وہ کچھ آگے بڑھی تو سب کی یہاں موجودگی کا جو سوال اس کے ذہن میں اٹھا تھا اس کا جواب آپوں آپ ہی مل گیا۔

اس کے سامنے دادا جان بے ہوشی کے عالم میں پڑے تھے، وہ تیزی سے ان کے بیڈ کے قریب آئی تھی۔

''کیا ہوا دادا جان کو......؟'' اس نے بنا کسی کو دیکھے سوال کیا تھا جس کا جواب امی جی نے دیا۔

''ابھی ڈاکٹر چیک کر کے گئے ہیں، ان کا کہنا ہے بڑھتی عمر کے ساتھ کمزوری زیادہ ہوگئی ہے۔ اسی لیے ان کی حالت ایسی ہو رہی ہے۔''

''ان کو کھانے میں کیا دیا تھا؟'' دادا جان کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر اس نے بخار چیک کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

''ناشتا ہی تو دینے آئے تھے تب ہی ان کی اس حالت کا پتا لگا...... جب سے بس اسی طرح لیٹے ہیں نہ تو کچھ بول رہے ہیں نہ آنکھیں کھول رہے ہیں۔'' زرمین نے لب کشائی کی۔ دادا جان کو بخار نہیں تھا وہ برف کے مانند ٹھنڈے پڑے تھے اس نے تیزی سے ان کا ہاتھ پکڑ کر نبض چیک کرنی چاہی...... رک، رک کر چلتی نبض نے اس کی پریشانی میں مزید اضافہ کیا۔

''ابو جی! دادا جان ٹھیک نہیں ہیں۔'' اس نے پریشانی بھری نگاہوں سے دادا جان کو دیکھ کر ابو کی طرف دیکھا تھا۔ یہ بات وہ سب پہلے سے جانتے تھے ابو جی کی آنکھوں میں تیرتی نمی واضح دکھائی دے رہی تھی

اس نے لب بھینچ کر سر جھٹکا۔

''دادا جان کو کچھ نہیں ہو سکتا......'' وہ خود رو دینے کو تھی مگر دل و دماغ میں ابھرتی سوچوں کو پرے جھٹک دیا۔

''شرمین بیٹا ڈاکٹر ان کو انجکشن لگا گئے ہیں ان کا کہنا ہے یہ کچھ دیر بعد خود ہی ہوش میں آجائیں گے۔ تم پریشان مت ہو بیٹا......'' امی جی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو اس کا مچلتا دل کچھ حالت سکون میں آ گیا۔

''چلیں پھر ان کو آرام کرنے دیں، ہم سب باہر چلتے ہیں......'' دادا جان کو کمبل اوڑھاتے ہوئے وہ ان کے پاس سے اٹھ کھڑی ہوئی...... تو سب اس کے ساتھ دادا جان کے کمرے کا دروازہ ہلکے سے بند کر کے باہر چلے آئے۔

دادا جان کے کمرے سے باہر آ کر زندگی روز کی طرح معمول پر آ گئی۔ امی جی کچن میں چلی آئیں جبکہ ابو جی اور بھیا خبریں سننے کے لیے ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئے جبکہ زرمین امی جی کی مدد کرانے ان کے ساتھ کچن میں موجود تھی اور وہ خود یونیفارم بدلنے کمرے میں چلی آئی۔

آج کا دن خاصا محنت طلب اور تھکا دینے والا تھا۔ سارا دن پریکٹیکل کرتے لیب میں گزر گیا پھر گھر واپسی پر روٹ دیر سے چلا اور گھر لوٹی تو دادا جان کی حالت نے پریشانی میں مبتلا کر دیا...... عصر کی اذان ہو رہی تھی اس نے کپڑے بدل کر نماز ادا کی اور باہر آ گئی۔ بھوک سے برا حال تھا مگر کھانے کو من نہیں تھا۔

امی جی نے کھانا کھانے کو کہا تو وہ انہیں منع کرتی خاموشی سے دادا جان کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ ابھی تک اسی طرح بے سدھ پڑے تھے۔ ان کے برابر میں بیٹھ کر اس نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا...... اس نے ایک بار پھر ان کی نبض چیک کی جواب نارمل محسوس ہو رہی تھی اس نے

دادا جان کے چہرے کی طرف دیکھا۔

وہ مسکرا رہے تھے۔

وہ تیزی سے ان پر جھکی۔

''دادا جان آپ جاگ گئے؟'' انہوں نے اس کی بات کا جواب تو نہیں دیا تھا البتہ آنکھیں کھول کر اس کی سمت دیکھا ضرور تھا۔

''دادا جان......'' اس نے بے تابی سے پکارا تھا۔

''کیوں رو رہی ہو شیری......؟'' ان کے انداز میں کتنا پیار بھرا تھا۔ شرمین نے ہاتھ اٹھا کر اپنا چہرہ چھوا جو آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا اسے حیرت ہوئی وہ رو رہی تھی۔

''دادا جان مجھے پتا ہی نہیں لگا کہ آنسو کب نکلے......'' اب وہ بھی مسکرائی تھی۔

''روتے نہیں ہیں بیٹا......'' دادا جان کی آواز میں شگفتگی تھی اسے شدید حیرت نے آ گھیرا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک تو وہ ان کی طبیعت دیکھ کر پریشان تھی اور اب دادا جان کیسے تر و تازہ دکھائی دے رہے تھے۔ شاید یہ معجزہ تھا کہ خدا نے ان کو پھر سے بولنے کی ہمت بخشی تھی۔

''دادا جان آپ کے بغیر سب اتنا بیکار لگ رہا تھا...... میں بہت اداس تھی......'' اس نے منہ بسورا وہ ایک بار پھر مسکرا دیے اس پل ان کے چہرے پر کتنا نور تھا۔ چہرہ روشن، روشن دکھائی دے رہا تھا۔

''شرمین ذرا مجھے پانی پلا دو......'' وہ ان کے برابر سے اٹھی اور سائڈ ٹیبل پر رکھے جگ سے پانی گلاس میں انڈیل کر ان کے پاس چلی آئی...... اپنے بازو پر ان کی گردن ذرا سا اٹھائے اس نے انہیں پانی پلایا اور پھر سے آرام دہ حالت میں تکیے پر لٹا دیا۔

دادا جان اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر رہے تھے۔

''نہ جانے کیسی پیاس ہے پانی پی کر اور پانی کی طلب محسوس ہونے لگی ہے۔''

''دادا جان میں آپ کے لیے کھانے کو کچھ لاتی ہوں۔''

ان کو وہیں چھوڑ کر وہ تیزی سے کچن میں آئی تھی سب کو ان کے ہوش میں آنے کی خبر کی اور پلیٹ میں دادا جان کے لیے بنائی گئی کھچڑی لیے ان کے کمرے میں آ گئی۔

''لیجیے، امی جی نے خاص طور پر آپ کی پسند کی کھچڑی بنائی ہے...... اسے دیکھ کر تو خود میری بھوک بھی چمک اٹھی ہے۔'' اس نے ہنس کر کہا اور دادا جان کی طرف نظر کی تو وہ گھبرا گئی۔

وہ لمبی، لمبی سانسیں بھر رہے تھے...... اس نے جلدی سے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ سائڈ ٹیبل پر رکھی اور ان کے برابر بیٹھ کر ان کے چہرے کو تھامے انہیں پکارنے لگی۔

''دادا جان، دادا جان!'' مگر جواب ندارد...... اسے باہر جا کر کسی کو بلانے کا ہوش ہی نہیں رہا۔ دادا جان دوپہر کی طرح برف کی سل کے مانند ٹھنڈے ہو رہے تھے اس نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا پھر ان کا ہاتھ تھام کر نبض ٹٹولنے کی کوشش کی سارے وقت میں اس کی نظریں دادا جان کے چہرے پر جمی تھیں وہ اب رک، رک کر سانسیں بھر رہے تھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ انہیں سانس لینے میں خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہو۔

''دادا جان......!'' دادا جان نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک آخری لمبی سانس بھری اور اس کے ہاتھوں میں بے جان ہوگئے۔ وہ پھٹی، پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی جن کا کچھ دیر پہلے سانس لیتا وجود اب حالتِ سکون میں آ گیا تھا۔ دادا جان اسے چھوڑ کر جا چکے تھے اس نے شدید غم کی حالت میں انہیں پکارا تھا۔

''دادا جان......'' غم کی زیادتی کی وجہ سے اس کی آواز جیسے پھٹ سی گئی تھی۔ اب وہ ان کا چہرہ چھوڑ کر کھڑی ہوگئی اور دھاڑیں مار، مار کر رونے لگی۔

اس کی چیخ و پکار سن کر گھر کے سارے دیگر افراد تیزی سے دوڑے چلے آئے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو وہ سب یہیں موجود تھے۔ دوپہر سے لے کر عصر تک کے وقت میں کوئی نہ کوئی ضرور ان کے ساتھ تھا مگر ان کا دم نکلتے وقت صرف شرمین تھی۔

دادا جان کو ان سے بچھڑے مہینہ ہو چکا تھا مگر وہ ابھی تک یقین نہیں کر پائے تھے۔ سردیاں اپنے عروج پر تھیں آج فراغت کے بعد وہ سب امی، ابو کے کمرے میں محفل جمائے بیٹھے تھے۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ ان کی باتوں میں دادا جان کا ذکر چل رہا تھا۔ شرمین گم صم بیٹھی ان کی باتیں غور سے سن رہی تھی۔ امی جی کچھ بول رہی تھیں وہ ان پر نظریں جمائے بیٹھی تھی جب اچانک ہی امی کی سانسیں اکھڑنے لگیں اور وہ ایک طرف کو لڑھک گئیں...... سب سے پہلے وہی ان کی طرف بڑھی تھی۔ ابھی تو اس کی امی جی نہا کر نکلی تھیں اور کمبل میں دبک کر بیٹھ گئی تھیں پھر اسی نے انہیں گرم، گرم چائے دی تھی۔

''امی جی آپ کو کیا ہوا......'' وہ ان کی طرف بڑھی۔

زرمین اور بھیا بھی امی جی کے گرد بیٹھے ان کے ہاتھ پاؤں سہلا رہے تھے جبکہ وہ خود ان کا سینہ مسل رہی تھی...... ان کی کوششوں کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا...... امی جی پیلی پڑتی جا رہی تھیں۔ زرمین نے رونا شروع کر دیا جبکہ وہ خود خوف کے زیر اثر دم سادھے کھڑی تھی۔

ابو جی اور بھیا امی جی کو لے کر ایمر جنسی بھاگے...... تو اس کا سکتہ ٹوٹا......

''امی جی کو تو کوئی بیماری بھی نہیں تھی پھر انہیں کیا ہوا؟''

''کیا امی جی بھی اسے دادا جی کی طرح چھوڑ کر چلی جائیں گی......'' یہ سوچ کر ہی اس کی جان نکلنے لگی۔ وہ جہاں بیٹھی تھی وہیں سجدہ ریز ہو کر چیخ، چیخ کر رونے لگی۔

''اللہ جی...... میری امی جی کو کچھ نہ ہو، مجھے میری امی جی لوٹا دیں۔''

ایک ہی بات کو دہراتی وہ بری طرح روئے جا رہی تھی جب زرمین نے اسے اٹھا کر پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

''امی جی کو کچھ نہیں ہوگا شرمین آپی، آپ پانی پی لیں......'' وہ خود بھی پریشان تھی مگر اس کے باوجود بھی وہ اسے تسلی دے رہی تھی۔ اس نے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے لیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس نے موبائل اٹھایا اور بھیا کا نمبر پریس کیا دوسری طرف سے اس کی کال پک نہیں کی گئی تھی۔ خوف کی ایک لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی تھی۔ ''کہیں کچھ غلط تو نہیں ہو گیا......'' اس نے دیوانہ وار دوبارہ بھیا کا نمبر ملایا اب کی بار دوسری بیل پر کال پک کر لی گئی تو اس نے چھوٹتے ہی بھیا سے سوال کیا تھا۔

''بھیا امی جی سے میری بات کروا دیں۔''

انہوں نے سیل فون امی جی کو پکڑا دیا۔

''شرمین بیٹا میں ٹھیک ہوں......'' امی جی کی کمزور سی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ آواز اس قدر ہلکی تھی اسے لگا بھیا نے امی جی کی آواز کی نقل کر کے اس سے بات کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے بھیا کی کال ڈراپ کر کے ابو جی کو کال کی۔

''ابو جی، امی جی سے بات کروا دیں پلیز......'' اس کا انداز التجائیہ تھا۔

''شرمین بیٹا...... تمہاری امی اب بالکل ٹھیک ہیں۔'' انہوں نے اس کو یقین دلانا چاہا مگر اس نے پھر التجا کی۔

''ابو پلیز ایک بار امی جی سے بات کروا دیں۔''

ابو نے امی جی کے ہاتھ میں سیل دیا تو امی جی ایک بار پھر اس سے مخاطب تھیں۔ وہ آنکھیں بند کیے بہت غور سے ان کی آواز سنتے ہوئے اپنے اندر اتار رہی تھی۔

''امی جی ٹھیک ہیں......'' وہ ایک بار پھر شکرانے کے طور پر سجدہ ریز ہو گئی۔ بے خودی کے عالم میں اس کا سر بڑی زور سے زمین سے ٹکرایا تھا مگر اسے تو جیسے پرواہ ہی نہیں تھی۔

ابھی کچھ دیر پہلے اسے لگا تھا کہ زندگی ختم ہو گئی ہو...... اس کی اپنی سانسیں اٹکنے لگی تھیں اس کی ماں کو خدا نے دوسری زندگی سے نوازا تھا۔ وہ شکر ادا نہ کرتی تو کیا کرتی۔

سجدے سے اٹھی تو اس کی پیشانی پر بڑا سا گومڑ نمودار ہو چکا تھا۔

زرمین اس کے پاس بیٹھی تھی وہ اب تک اپنے آپ میں نہیں تھی۔ کچھ دیر پہلے کی کیفیت اس کو دہلائے دے رہی تھی...... زرمین کے گلے لگ کر وہ ایک بار پھر رو دی۔

کچھ دیر بعد امی جی، بھیا اور ابو جی کے ساتھ گھر واپس آ گئی تھیں۔ ذرا سی دیر میں یہ سب ہو جانے کی وجہ سے وہ بہت کمزور دکھائی دے رہی تھیں۔ سب سے پہلے وہ ان کے گلے لگی تو کچھ سکون نصیب ہوا...... ساری رات وہ امی جی کے پاس سے ہلی تک نہیں۔ پوری رات ان کے پاس بیٹھی جاگتی رہی۔

پہلے دادا جان کی اچانک موت اور اب ایسے امی جی کی اچانک بگڑتی طبیعت نے نہ جانے کیوں اس کے اندر بہت سارا خوف بھر دیا تھا۔ اس کے اپنے اسے چھوڑ جائیں گے تو وہ کیا کرے گی......؟ آنکھیں بند کرتی تو دادا جان کا اس کے ہاتھوں میں دم توڑتا چہرہ سامنے آ جاتا۔ آنکھیں کھولتی تو امی جی کی بند ہوتی سانسیں اس کو مزید خوف زدہ کر دیتیں۔

وہ ایک بہادر لڑکی تھی مگر ان سانحوں کی وجہ سے جو خوف اس کے اندر بیٹھا اس نے اس کی شخصیت کو بری طرح توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کی راتوں کی نیندیں جیسے اڑ گئی تھیں۔ رات میں اگر وہ سو بھی جاتی تو نہ جانے کتنی بار اس کی آنکھ کھل جاتی، وہ سوتے سے اٹھ بیٹھتی اور گھر کے سوئے افراد کو جا کر ان کے کمروں میں دیکھتی۔ امی جی اور ابو جی کے کمروں میں وہ چپ چاپ کھڑی ان کے زندہ ہونے کا یقین کرنے کے لیے بار، بار ان کی آتی جاتی سانسوں کی ضمانت لیتی کچھ تسلی نصیب ہوتی تو اپنے کمرے میں آ جاتی......

اس کی صحت پہلے کی نسبت بری طرح گر رہی تھی۔ ہر کام پر سے اس کی توجہ ہٹنے لگی۔ غضب تو جب ہوا جب اس نے اپنی پڑھائی ادھوری چھوڑی اور گھر بیٹھ گئی۔ حالانکہ یہ وہی شرمین تھی جسے ڈاکٹر بننے کا جنون کی حد تک شوق تھا...... اور اب اس نے اپنا کیریئر تک داؤ پر لگا دیا تھا۔ گھر کے ہر فرد نے اسے سمجھا کر دیکھ لیا مگر اس کی نہ ہاں میں نہ بدلی...... آج بھی اسی سلسلے میں ابو جی اس کے پاس آئے تھے۔

''شرمین بیٹا...... میں چاہتا ہوں آپ اپنی تعلیم مکمل کر لیں۔''

''مگر ابو جی میں ایسا نہیں چاہتی...... میں گھر میں ہی رہنا چاہتی ہوں۔'' اس نے انکار کر دیا تھا۔

''مگر بیٹا آپ کی تعلیم کا کیا ہوگا؟ آپ نے تو ہائیر اسٹڈیز کے لیے باہر جا کر پڑھنے کا پلان کیا تھا۔ وہ سب کیوں ادھورا چھوڑ دینا چاہتی ہو؟'' وہ کسی بھی صورت اسے راضی کر لینا چاہتے تھے مگر اس کے جواب نے تو جیسے ان کی بولتی بند کر دی۔

''میں غلط تھی ابو جی...... میں نے اتنا آگے تک کا پلان کر لیا زندگی کا کوئی بھروسا نہیں، نہ جانے کب موت آ جائے...... پھر فائدہ اتنے آگے تک کی پلاننگ کرنے کا......؟''

''یہ موت اور زندگی کا ذکر درمیان میں کہاں سے آ گیا۔'' ابو جی نے بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھا...... وہ اسے کچھ سمجھانا چاہ رہے تھے۔

''اگر تمہاری طرح ہر شخص موت کے ڈر سے کچھ بھی کرنا چھوڑ دے تو دنیا تو اپنی جگہ رک ہی جائے گی...... کیسے چلے گا نظامِ زندگی؟ چلو یہ تو اچھی بات

ہے انسان موت کے ڈر سے ایسا سوچے... کوئی بھی عمل کرے تو پہلے سوچے تاکہ اسلام کے مطابق زندگی کو سنوارے اور موت بھی سنور جائے مگر یہ تو سراسر بے وقوفی ہے کہ اپنا ہر کام چھوڑ کر موت سے پہلے موت کا انتظار شروع کرکے زندگی کو مشکل ترین بنا دے......''

شرمین نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا وہ مایوس ہی لوٹ گئے تھے۔ نہ جانے اس نے کیا سوچ لیا تھا جو اس حد تک مایوسی اس کے اندر رچ بس گئی تھی۔ اپنوں کی فکر میں گھلتی وہ انہی سے دور ہونے لگی تھی۔

اس کی فکر کا انداز ہی الگ تھا۔ ایک طرف ان کے لیے پریشانی ہوتی تو دوسری طرف ان سے سخت ہوتی جا رہی تھی جیسے اس دن بھیا معمولی سے کچھ لیٹ ہوگئے تو اس نے ایک گھنٹے میں چار بار انہیں کال کی ساتھ میں سختی سے انہیں گھر پہنچنے کو کہا جب بھیا گھر پہنچے تو وہ ان پر کوئی بھی لحاظ کیے بغیر برس پڑی۔ بھیا نے بڑے تحمل سے اس کی ڈانٹ کو سنا تھا۔ پھر جب وہ سب کہہ چکی تو بھیا نے کہنا شروع کیا۔

''شرمین تم بھول رہی ہو کہ میں تم سے بڑا ہوں اور دوسری بات یہ کہ میں گھر سے بتا کر گیا تھا کہ آج میں کسی ضروری کام کی وجہ سے لیٹ آؤں گا...... اس کے باوجود بھی تم نے جتنی بار مجھے کال کی ہے میں نے ہر بار تمہاری کال پک کی اور ہر بار تمہیں اپنے کام کی نوعیت سے آگاہ کیا۔ پھر بھی تم اس طرح ری ایکٹ کررہی ہو، مجھے تو شدید حیرت ہو رہی ہے...... تم اتنی ناسمجھ تو کبھی نہ تھیں شرمین......'' قدرے ناراضی سے اسے کہتے وہ اپنے کمرے میں جا چکے تھے مگر اسے ان کا انداز بہت بری طرح کھلا تھا۔

''ایک تو میں ان کی فکر میں اس قدر پریشان رہی اوپر سے مجھے ہی چار باتیں سنا گئے......'' کتنی ہی دیر وہ وہاں بیٹھی روتی رہی تھی۔

وہ شاید وہمی ہوگئی تھی...... اس قدر وہمی کہ اپنوں سے اپنوں ہی کے لیے الجھ پڑتی تھی۔ اس کی ہر وقت کی توجہ اور نصیحتوں سے سب بیزار دکھائی دینے لگے تھے۔ انہیں اس پر سخت غصہ آنے لگا تھا۔ جب وہ چھوٹے بچوں کی طرح ان کی چھوٹی سے چھوٹی باتوں کا خیال رکھتی...... جب تک وہ سو نہ جاتے ان کے سر پر سوار رہتی...... ہر وقت کی توجہ بھی انسان کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کردیتی ہے ایسا ہی ان کے ساتھ بھی ہو رہا تھا...... وہ اب اس سے چڑنے لگے تھے۔

مگر وہ ان کا غصہ، ان کی ناراضی کو مکمل نظر انداز کیے اسی طرح اپنے خوف و وہم کے درمیان گھن چکر بنی ہوئی تھی۔

امی جی کی طبیعت کئی دن سے خراب چلی آرہی تھی۔ زرمین کے پیپرز شروع ہوجانے کی وجہ سے وہ گھر کے کاموں کی طرف سے بالکل ہی غافل ہوگئی تھی۔ ایسے میں کچن کی ساری ذمے داری اس کے کندھوں پر تھی۔ اسی لیے امی خرابیِ طبیعت کے باوجود اس کی مدد کروا دیتی رہیں لیکن اس نے کئی بار ان سے کہا وہ کچن کے کام نہ کریں وہ سب خود کرلے گی مگر امی جی پھر بھی کوئی نہ کوئی کام کرتی دکھائی دیتیں۔ آج بھی کچن میں کھڑی سالن بنا رہی تھیں جب اچانک آجانے والے چکر کی وجہ سے وہ گرنے کو تھیں کہ انہوں نے جلدی سے کاؤنٹر تھاما جبھی شرمین کچن میں آئی اور آگے بڑھ کر انہیں گرنے سے بچایا تھا اور انہیں سہارا دے کر وہاں سے انہیں کمرے میں لا بٹھایا تھا۔ انہیں پانی پلانے کے بعد وہ ان پر خفا ہونے لگی۔

''کہا تھا ناں مت کام کیا کریں مگر آپ نے پہلے کبھی میری بات سنی ہے جو آج سنتی...... سوچیں ذرا اگر میں فوری وہاں نہ آجاتی تو آپ گر جاتیں۔ ماربل کا فرش تھا کہیں چوٹ ووٹ لگ جاتی تو کیا ہوتا......؟'' اس کے لفظوں میں پروا کا ہر رنگ موجود تھا مگر امی جی چڑ گئیں۔

''شرمین تمیز سے بات کرو، میں تمہاری ماں

ہوں، تم میری ماں نہیں ہو۔'' تو وہ بڑبڑاتی ہوئی ان کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اس دن کے بعد سے اس نے کچن کی ذمے داری بھی اپنے سر لے لی۔ وہ پہلے سے زیادہ مصروف ہوگئی مگر اس قدر مصروفیات کے باوجود بھی وہ اپنوں کی طرف سے ذرا سا بھی غافل نہیں ہوئی تھی ان کی ہر چیز ہر ضرورت کا خیال وہ اسی طرح رکھتی تھی۔ ان کے منہ سے نکلنے والی ہر بات گویا اس کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔

سب نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا...... وہ سب کی فکر میں رہتی مگر اس کی فکر کرنے والا اسے سمجھنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ بہت اکیلی ہوتی جا رہی تھی۔ خدا کے حضور جھک کر وہ جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی تو بس اپنوں کی سلامتی کے لیے دعا کرتی...... اٹھتے بیٹھتے یہ دعا تو جیسے ورد کی طرح اس کی زبان پر جاری رہا کرتی۔ ابھی نمازِ عشا کی ادائیگی کے بعد ہاتھ اٹھائے آنکھیں بند کیے آنسو بہاتی اپنوں کے لیے دعا گو تھی جب ابو جی اس کے کمرے میں داخل ہوئے...... اسے دعا میں مشغول دیکھ کر وہیں فرش پر اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ کافی دیر دعا مانگ چکنے کے بعد جب اس نے پھیلے ہوئے ہاتھ چہرے پر پھیر کر آنکھیں کھولیں تو نظر کے سامنے ابو جی کو بیٹھے پایا۔

''ابو جی آپ اس وقت میرے کمرے میں...... کوئی کام تھا کیا......؟'' وہ ایک دم ہی کونشس ہوئی تھی۔

''کیا میں کام کے علاوہ اپنی بیٹی سے بات کرنے نہیں آسکتا......؟'' انہوں نے اس کا انداز دیکھ کر ہلکے سے مسکرا کر کہا تھا۔

''بالکل آسکتے ہیں......'' وہ سر جھکا گئی۔

''خدا سے اپنے لیے کیا مانگا......'' ابو جی نے سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔

''اپنے لیے......؟ اپنے لیے تو کچھ بھی نہیں مانگا......'' اس نے بڑی معصومیت سے جواب دیا تھا۔

ابو جی مسکرا دیے ایسے جیسے انہیں اس سے اسی جواب کی توقع تھی۔

''پھر اتنی دیر تک اتنا مگن ہوکر کیا مانگ رہی تھیں؟''

''آپ سب کی سلامتی کی دعا......'' وہ نظریں جھکائے ناخنوں سے کھیلنے لگی تھی۔ ابو جی اس کی بات سن کر دنگ رہ گئے۔

اتنی دیر سے وہ صرف یہ دعا مانگ رہی تھی......؟ انہیں اس کی ذہنی کیفیت پر ذرا سا شک گزرا تھا جب ہی آج وہ اس کے پاس چلے آئے تھے مگر اب اس کی باتیں سن کر ان کا شک جیسے یقین میں بدل گیا تھا۔

''شرمین بیٹا آپ سے ایک بات پوچھوں؟ سچ، سچ بتائیے گا۔'' انہوں نے گہری نظر سے اس کے جھکے سر کو دیکھا تھا۔

''پوچھیں ابو جی......؟'' اس نے جھکا سر اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔

''تمہیں کیا بات ڈراتی ہے؟''

''مجھے......؟'' اس نے کہا پھر کچھ توقف کے بعد جھجکتی ہوئی مزید گویا ہوئی۔'' بہت سے ڈر مجھے ڈراتے ہیں ابو جی...... جیسے میں گھر سے باہر ہوئی اور مجھے کچھ ہوگیا تو...... اجنبی لوگوں کی بھیڑ میں، میں لاوارث پڑی رہ گئی تو......؟ مجھے بہت ڈر لگتا ہے ابو جی کہ اگر آپ میں سے کسی کو کچھ ہوگیا تو......؟'' اس کا خوف اس کی آنکھوں سے عیاں تھا۔

جب تک وہ اپنے خوف کا سامنا نہیں کرے گی وہ اسی طرح اس کے اندر پنجے گاڑے بیٹھا اسے دہلائے رہے گا...... انہوں نے اسی سے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

''اچھا اگر ہم سے کسی کو کچھ ہوگیا تو آپ کیا کرسکتی ہو......؟ اس طرح ہمارا خیال رکھ کر کیا ہمارے قریب آتی موت کو ہمارے قریب آنے سے

روک لو گی؟''

وہ خاموش رہی تھی۔

''جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہے گا بیٹا'' وہ اسے سمجھانا چاہ رہے تھے۔ ''کیوں اس طرح کی فکروں میں الجھ کر خود کو ہلکان کیے رکھتی ہو'' وہ ذرا دیر چپ ہو کر اس کے تاثرات جانچتے رہے پھر مزید کہنے لگے۔

''ہم گھر سے باہر ہوں تو آپ دس بار کال کر کے ہماری خیریت معلوم کرتی ہو، کیا آپ کی کال کرنے سے ہم پر آئی مصیبت ٹل جائے گی؟ اپنی امی جی سے ہر کام چھڑوا کر ان کو بیڈ ریسٹ پر بٹھا دیا اگر انہیں کچھ ہونا ہوا تو کیا یوں آرام کی حالت میں نہیں ہو سکتا...... آپ ہمارے لیے دعا کرتی ہو یہ اچھی بات ہے مگر اس طرح فکر مند ہونا...... یہ تو غلط ہے ناں بیٹا یہ تو مکمل ابنارمل رویہ کہلاتا ہے...... آپ نے محسوس کیا آپ کی اپنی ہی وجہ سے آپ کے اپنے بہن، بھائی آپ سے دور ہوتے جاتے رہے ہیں۔'' وہ اب رونے لگی تھی ابو جی نے اسے رونے دیا تھا تاکہ اس کا خوف آنسوؤں میں بہہ جائے...... وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''جی ابو جی میں ان سب کی اتنی فکر کرتی ہوں مگر وہ مجھے سمجھتے ہی نہیں۔''

''فکر کرنا اچھی بات ہے بیٹا مگر جس طرح آپ کرتی ہیں وہ غلط ہے، کبھی خود کو دیکھا ہے آپ نے؟ کس قدر کمزور ہوگئی ہیں آپ؟ اس سب سوچوں میں پڑ کر اپنی تعلیم تک کو ادھورا چھوڑ دیا...... آپ خدا سے دعا کرتی ہیں اس پر یقین ہے ناں آپ کو...... تو پھر......؟'' انہوں نے استفہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تو اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

''تو بیٹا جب اس سے دعا مانگتی ہو تو اس پر یقین بھی رکھو، وہ تمہیں ضرور سنے گا...... ویسا ہی جیسا تم چاہو گی۔ اگر تم اس کے حضور جھکی اس سے دعا بھی مانگو اور ساتھ میں خوف میں مبتلا بھی رہو تو کیا فائدہ اس دعا کا...... جس میں آپ خود نہ یقین رکھتی ہوں، پھر خدا کیسے آپ کی دعا سنے گا...... خدا سے حسنِ ظن رکھو...... آپ اپنے گمان میں ایسی باتیں سوچو گی تو آپ کی دعا تو بے اثر ٹھہرائی جائے گی ناں......؟ وہ خدا ہے سب سے بڑا ہے، اسی پر یقین مضبوط رکھو...... وقت سے پہلے کبھی کچھ نہیں ہو سکتا...... اور جو ہونا ہوتا ہے جس چیز کا وقت آچکا ہوتا ہے پھر دنیا کی کوئی بھی طاقت اسے ہونے سے نہیں روک سکتی۔ اس اللہ کو محبوب رکھو وہ تمہیں محبوب رکھے گا۔ سب کچھ اس پر چھوڑ دو، اس کی رضا میں راضی ہو جاؤ پھر وہ ہوگا جو آپ چاہو گی، جو کچھ بھی آپ کے دل میں خدشات ہیں، ڈر ہیں اس سے کہہ ڈالو وہ آپ کو سنے گا...... اپنوں کو اس کی امان میں دے کر مطمئن ہو جاؤ وہ آپ کی امانت کی حفاظت کرے گا اس سے بڑھ کر کوئی امانت دار ہی نہیں ہو سکتا...... ایسا کر کے دیکھو بیٹا پھر دیکھنا آپ کا ہر ڈر، ہر خوف نکل بھاگے گا۔'' ابو جی کے ہر لفظ میں اثر تھا ایک یقین تھا اس کا ڈر تمام خوف دل سے نکلتا ہوا محسوس ہوا۔

''ہاں وہ خدا ہی تو ہے، وہی سب کا مالک و مختار ہے۔'' اس کا دل ٹھہرنے لگا۔ دل و دماغ میں مچی رہنے والی ہر وقت کی بے چینی کو سکون آگیا...... ''وہ ذات ہی تو ہے جو سب کرنے والی ہے...... پھر وہ کیوں اس کے کاموں کو اپنے سر پر لے کر خود کو پریشان کرے......'' اس نے سر جھکا کر مکمل یقین کے ساتھ اپنا ہر خوف خدا کے حضور پیش کر دیا...... اور خود ہلکی پھلکی ہوگئی۔ ابو جی نے پیار و شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا...... تو اس کا دل مزید اطمینان سے بھر گیا۔ وہ واقعی غلط تھی اور اب اس کا ایک نارمل زندگی کی طرف لوٹ آنا ممکن تھا۔






میرا نصیب

سعدیہ حیدر

اذان کی آواز سے ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ دسمبر کی یخ بستہ صبح تھی۔ پنکھوں کا شور نہ ہونے کی وجہ سے موذن کی آواز کانوں میں واضح طور پر رس گھول رہی تھی۔ اس نے رضائی سے سر باہر نکالا اور پھر کلمہ پڑھتے ہی اٹھ بیٹھی۔

اماں بھی اپنے پلنگ پر جاگ ہی رہی تھیں۔ طوبیٰ نے انہیں سلام کیا اور سیدھا باورچی خانے کا رخ کیا تھا۔ پانی کا دیگچا گرم ہونے کے لیے



چڑھایا۔ ابا کے کمرے سے کھانسنے کی آواز آرہی تھی۔ اس نے انہیں جا کر سلام کیا پھر روزمرہ کے معمول میں مصروف ہوگئی۔ یعنی گرم پانی سے اماں اور ابا کو وضو کرانا پھر خود بھی نماز کی ادائیگی اور بعد میں چائے کی تیاری...... پورے گھر میں سکوت طاری تھا۔ خاموشی ٹوٹنے میں تقریباً آدھا گھنٹا تھا جب تک بھابی اور بچوں کی اپنے کمرے سے آمد نہ ہوتی۔ چوبیس گھنٹوں میں یہی چند سکون بخش لمحات ہوتے جب وہ اماں کے گھٹنوں سے لگ کر باتیں کیے جاتی...... پھر تو...... اور اس تو کے بعد کاموں کی وہ طویل فہرست ہوتی جو اسے انجام دینے ہوتے اماں نے اس کے ہاتھوں سے گرم چائے کی پیالی لیتے ہی دعا دی۔

''جیتی رہو خوش رہو اللہ نصیب اچھا کرے۔''

''نصیب......؟'' اس کے دل کو جیسے دھکا سا لگا۔ ''کب اچھا ہوگا یہ نصیب؟ عمر کی اٹھائیس بہاریں تو دیکھ لیں۔'' ڈھلتی عمر کے مہیب سائے جیسے ہر وقت ڈرانے کے لیے تیار رہتے۔ وہ اندر کی گھٹن کو مسکراہٹ کے پردے میں چھپاتی ہوئی اماں کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ اماں نے لرزتی انگلیوں سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر ان کی ہتھیلی اس کے گال پر آکر ٹھہر گئی۔

''تو اتنی کیوں چپ رہتی ہے؟'' اماں کے ممتا کے جذبات جب عروج پر ہوتے تو وہ تم سے تو پر آجاتی تھیں۔

''کچھ نہیں اماں...... آپ محسوس زیادہ کرتی ہیں۔'' وہ مسکرادی۔

''کیا میری اداکاری زیادہ جاندار نہیں......''

اسے اپنی سوچ پر بہت زور سے ہنسی آئی۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی خاموش طبع تھی۔ ٹین ایج میں تو اس کی ہنسی کی جھنکار گھر بھر کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتی۔

گھر بھر...... جس میں ابا، اماں اور بھیا اور سب سے چھوٹی وہ خود سب کی آنکھوں کا تارا۔ مگر ابا کی ریٹائرمنٹ اور بھیا کی شادی کے بعد افراد تو بھابی کے اضافے کے بعد وہی تھے لیکن ان کے مقامات تبدیل ہوگئے تھے۔

اس سے پہلے اس نے نہیں سوچا تھا کہ کمائی ہوئی رقم کس طرح لوگوں کی وقعت میں اضافہ کرتی ہے۔ گھر کے بڑے تو ابا اور اماں ہی تھے لیکن کماؤ پوت بھیا...... چنانچہ اب سربراہ کا تاج بھی انہوں نے ہی پہننا تھا اور اس تاجپوشی کے بعد ملکہ کا درجہ تو بھابی کو ہی ملنا تھا چنانچہ اماں اور ابا نے چپ چاپ اس معزولی کو دل سے قبول کرلیا تھا اور وہ......؟

اس سارے معاملے میں اس کی حیثیت ہی کیا تھی۔ شطرنج کی بساط پر ایک معمولی پیادے کی کیا وقعت...... شروع، شروع میں تو بھابی بہت گھل مل کر رہیں لیکن بچوں کی آمد کے ساتھ ہی وہ ان میں زیادہ مصروف ہوتی گئیں۔ یوں گھر کی ساری ذمے داری رفتہ، رفتہ اس کے کاندھوں پر منتقل ہوتی گئی اس کی سادہ طبیعت نے بغیر کچھ محسوس کیے ساری ذمے داریاں خوش اسلوبی سے اٹھالیں لیکن...... اس لیکن کے آگے وہ سوال تھے جن کے جواب اس کے یا اماں، ابا کے پاس نہیں تھے۔ بڑھتی عمر...... اس کی قبول صورت اور سفید پوشی کا بھرم ایسے میں اچھے رشتے کی امید دیوانے کا خواب ہی لگتی...... مگر نہیں...... اماں، ابا کے طویل سجدے اور دعائیں...... وہ خدا سے مایوس نہیں تھے۔ مایوسی کفر ہے...... وہ تو صبر اور شکر کی راہ کے مسافر تھے...... اس نے اپنا سر جھٹک کر اماں سے کہا۔

''اماں......! میں سوچ رہی ہوں کہ آج تانیہ کی طرف چکر لگالوں...... کئی دفعہ آچکی ہے اب تو لگتا ہے کہ ناراض ہے وہ۔''

''ہاں، ہاں، کیوں نہیں؟ دوپہر میں سارے

کاموں سے فارغ ہوکر چلی جانا......'' اماں نے مسکرا کر جواب دیا۔

اسی وقت ثنا بھاگتی ہوئی آئی اور پھپو کا نعرہ لگا کر اس کی گود میں سر چھپالیا۔

دروازے پر بھابی کھڑی تھیں۔

''ثنا چلو دیر ہوجائے گی۔'' انہوں نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔

''بھابی میں اسے باتھ روم لے جاتی ہوں۔'' وہ نرمی سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

بھابی قدرے مطمئن انداز میں واپس پلٹ گئیں۔ اماں نے پیار بھری نظر اس پر ڈالی۔ وہ ہمیشہ سے ہی ایسی تھی نرم مزاج، صلح جو، بدلتے ہوئے حالات بھی اس کا مزاج بدلنے میں کامیاب نہ ہوسکے تھے۔

دوپہر میں وہ تانیہ کی طرف چلی آئی جو پچھلی گلی میں ہی رہتی تھی۔

''بھئی طوبیٰ تم تو ہمارے گھر کا راستہ ہی بھول گئیں۔'' اس کی اماں اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔

''نہیں خالہ جان بس پچھلے دنوں اماں کے جوڑوں کا درد کچھ زیادہ ہی تھا بس انہیں چھوڑ کر نکلنے کا دل ہی نہیں ہوا۔''

''اچھا چلو اب تو آگئیں، آؤ اندر کمرے میں چلتے ہیں۔''

تانیہ بھی اس طرح بڑی سادہ مزاج لڑکی تھی۔ اس لیے طوبیٰ اور وہ دونوں آپس میں بڑی گہری سہیلیاں تھیں۔ تانیہ نے اسے بڑی رازداری سے بتایا کہ اس کا رشتہ آیا ہوا ہے۔ لڑکا سرکاری دفتر میں کلرک تھا۔ بڑی بہن شادی شدہ اور گھر میں صرف ابا......

''لیکن طوبیٰ میں سخت پریشان ہوں۔'' وہ فکر مندی سے بولی۔

''کیوں......؟'' طوبیٰ نے سوال کیا۔

''بھئی پہلی بات تو یہ کہ میں سب سے بڑی ہوں۔ میرے بعد اماں اکیلی ہوجائیں گی اور دوسری......'' وہ یہ کہہ کر چپ ہوگئی۔

''دوسری کیا تانیہ......؟''

''مانا کہ میں نے کسی شہزادے کے خواب نہیں دیکھے تھے مگر کلرک......'' وہ ذرا خاموش ہوئی پھر بولی۔

''میں نے یہ بھی تو نہ چاہا تھا۔'' اس کی آواز سے ملال عیاں تھا۔

''دیکھو تانیہ ہوسکتا ہے کہ میری بات تمہیں کڑوی لگے مگر...... بحیثیت دوست تمہیں سمجھانا میرا فرض ہے۔ تمہاری پہلی بات کا جواب تو یہ ہے کہ تمہاری شادی سے تمہاری اماں اکیلی نہیں پُرسکون ہوجائیں گی۔ اب رہا لڑکے کے کلرک ہونے کا سوال......؟ تو میرے خیال سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس کی کمائی حلال ہے یا حرام...... آج کے دور میں چمکتی دمکتی دولت اور آسائشات تو بہت جلد نگاہوں کو خیرہ کردیتی ہیں لیکن اس چمک دمک میں ہم بھول جاتے ہیں کہ یہ چمک دمک ایمان کی روشنی کو کم کرنے کا سبب تو نہیں بن رہی۔''

''اچھا اگر یہ رشتہ تمہارے لیے آتا تو......؟'' تانیہ نے سوال کیا۔

''نہیں بھئی تمہیں ہی مبارک ہو...... اگر کبھی ایسا وقت مجھ پر آیا تو میں حلال کمائی کو ترجیح دوں گی۔ ابھی تو تم مجھے اچھی سی چائے پلادو۔'' وہ گھر واپس آئی تو بھیا آفس سے آچکے تھے جوان بہن بوڑھے ماں، باپ اور تین بچوں کی ذمے داریوں سے ان کے کندھے ڈھلکتے ہوئے محسوس ہورہے تھے۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو بھیا اپنی جگہ سے کھڑے ہوگئے۔

''سوچ لیجیے ابا...... وقت تیزی سے ہمارے ہاتھ سے نکلا جارہا ہے۔'' وہ الجھی ہوئی نظروں سے بھیا کا چہرہ تکنے لگی اور وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ طوبیٰ نے سوالیہ نظروں سے اماں کی جانب دیکھا مگر اماں جیسے انجان بن گئیں پھر عقدہ کھل ہی گیا۔

اس نے اماں اور بھابی کے درمیان ہونے والا مکالمہ سن لیا۔

اس کے لیے رشتہ آیا ہوا تھا۔ بھابی کے کوئی دور پار کے رشتے دار تھے سب کچھ صحیح تھا۔ بس ایک بات غلط تھی اور وہ غلط بات کیا تھی...... رشتہ باضابطہ طور پر نہیں آیا تھا صرف بھابی کے ذریعے زبانی بات ہی ہوئی تھی کہ ابا اور بھیا سے لڑکے کے ابا کی ملاقات کہیں باہر ہوگئی۔ بھیا دونوں کو ہوٹل لے گئے کہ چلیں میں آپ دونوں کو چائے پلاتا ہوں۔

وہیں گفتگو کا رخ بینک اور پھر بینک سے حاصل ہونے والے منافع (سود) کی جانب ہوگیا۔ رضا (لڑکے کے ابا) نے بڑے جوش سے فرمایا۔

''بھئی ہم تو اسے غلط نہیں مانتے، بھئی حکومت نے اجازت دی ہوئی ہے۔'' ابا مارے صدمے کے کچھ کہہ ہی نہ سکے۔

اب بھیا انہیں گھر بلانا چاہ رہے تھے مگر ابا انکاری تھے۔ بھیا کا اصرار تھا۔ ''ابا لڑکا تو اپنا کام کرتا ہے ہمیں ان کے ابا کے خیالات سے کیا لینا دینا۔'' پھر یہ سرد جنگ بالآخر ایک طویل بحث پر ختم ہوگئی۔

شام کی چائے پر بحث کا آغاز ہوا۔ ابا اپنی جگہ حق بجانب تھے۔

''بیٹا، ماں، باپ کی دی ہوئی تربیت بہر حال ساری زندگی اپنا اثر دکھاتی ہے جو چیز باپ کے لیے آج حلال ہے مستقبل میں بیٹا بھی اسے اپنے لیے جائز سمجھے گا۔''

''پر ابا طوبیٰ کی بڑھتی ہوئی عمر کا تو خیال کیجیے......''

طوبیٰ کو سامنے سے آتا دیکھ کر بھیا گڑبڑا گئے۔

''بیٹا...... مجھ سے زیادہ میرے رب کو خیال ہے۔'' ابا کا لہجہ پرسکون تھا۔

''اماں...... آپ ہی کچھ سمجھائیں......'' بھیا نے اماں کی جانب التجائیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''میرے خیال سے سمجھانے کی تمہیں ضرورت ہے۔'' اماں کا اطمینان جیسے طوبیٰ کو ڈھارس دے گیا۔

''ٹھیک ہے ابا آپ کی مرضی...... ویسے رشتہ اچھا تھا۔'' بھیا شکست خوردہ لہجے میں بولے۔

بھابی کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے۔ رات کے کھانے پر بھی ماحول نارمل نہ ہوسکا۔ سب چپ تھے اور جلد ہی سب سونے اپنے، اپنے کمروں میں چلے گئے۔

رات چپ تھی۔

طوبیٰ نے کھڑکی سے آسمان پر نظر کی۔ ستارے ٹمٹا رہے تھے۔ ''کیا میرے مقدر کا ستارہ کبھی نہیں چمکے گا۔'' اس کے ذہن میں بھابی کے جملے گونجنے لگے۔ جب وہ رات کے کھانے کے برتن دھو رہی تھی تو بھابی چپکے سے اس کے پیچھے آکر کھڑی ہوگئیں۔

''آپ نے تو ڈرا ہی دیا بھابی۔'' وہ چونک گئی۔

''وہ میں......'' بھابی خاموش تھیں۔

''کیا بھابی کوئی کام ہے؟'' بھابی اسے کسی سوچ میں گم لگیں۔

''نہیں، وہ میں یہ کہہ رہی تھی کہ تمہارے بھیا چاہتے ہیں کہ تم اپنے حق کا استعمال کرو۔''

''حق...... کیا مطلب...... کون سا حق میں کچھ سمجھی نہیں۔''

''بھئی یہی کہ اس رشتے کے لیے اماں کے سامنے اپنی رضامندی کا اظہار کردو۔''

بھابی نے تیزی سے جملہ ایک سانس میں مکمل کیا اور پھر ہانپنے لگیں۔

اب سانس لینا طوبیٰ کے لیے دوبھر ہو رہا تھا۔

''بھابی آپ......؟'' باقی الفاظ جیسے اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔ بھابی تیزی سے کچن سے باہر تھیں۔ اور اب آسمان پر دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''یا اللہ......! میں کیا کروں...... کس دوراہے پر آکھڑی ہوں۔ میری مدد کر۔'' بازگشت میں جیسے اس کے اپنے جملے گونجنے لگے جو اس نے ثانیہ سے کہے تھے۔

''بھئی ایسا وقت مجھ پر آیا تو میں حلال کمائی کو ترجیح دوں گی۔'' اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی گہری کھائی میں گرتی جارہی ہے۔ ایک طرف ابا، اماں اور ان کی دی ہوئی تربیت...... دوسری جانب بھیا بھابی...... اسے بھابی سے زیادہ بھیا کی فکر تھی...... مٹھیوں سے نکلتی ریت کے مانند اس کی عمر...... بھیا کی ذمے داریاں...... معاشی مسائل...... مگر معاملہ ساری زندگی کا تھا...... رزقِ حلال اور رزقِ حرام اور ان دونوں کے درمیان ہچکولے لیتی اس کی زندگی اسے وہ حدیثِ رسولؐ یاد آئی جس میں ایسے شخص کا ذکر ہے جو بالوں میں گرد اور تھکے جسم کے ساتھ اللہ کے حضور اس کے گھر میں فریاد کرے گا مگر رزقِ حرام کے باعث اس کی دعا شرفِ قبولیت نہ پائے گی۔ وہ بے چین ہوکر اٹھ گئی۔

گھڑی کی سوئی تین بجا رہی تھی۔

رات کا پچھلا پہر...... وہ پہر جب خدا آسمانِ دنیا پر اپنے بندوں کی فریاد سننے کے لیے درِ رحمت وا کرتا ہے وہ وضو کر کے جائے نماز پر تہجد کی غرض سے کھڑی ہوگئی۔

نماز کی ادائیگی کے بعد اس نے اپنا آنچل دعا کی غرض سے پھیلایا مگر جیسے تڑپ کر سجدے میں گر گئی۔

جائے نماز اسے جائے قرار محسوس ہو رہی تھی۔

''یا اللہ......! میں عاجز و کمزور...... تیرے حضور التجا کر رہی ہوں۔ میرے مالک اپنے حبیب پاکؐ کے صدقے مجھے بچالے۔

مجھے غلط فیصلے سے بچا...... اے میرے مالک مجھے لوگوں کے غلبے سے بچا۔ میری زندگی میں آسانیاں عطا کر اے اللہ...... میری ذات سے دوسروں کی زندگی آسان ہوجائے۔'' اس کا پورا وجود ہچکیوں کی زد میں تھا۔

چاہتوں کا مکاں

ایک مدت سے تعمیر کر رہی ہوں میں
چاہتوں کا مکاں
جس میں کڑی سزائیں
بے التفاتی
نفرتوں کی ہر ایک گٹھری کو
دفن کر کے
میں نے خشتِ الفت سے
بنیاد رکھی ہے اس مکاں کی
سو جس کی بنیاد میں ہو شامل
پُرخلوص جذبے، ہزار چاہتیں
بھلا وہ مکیں اس کے اثر سے
کب تلک رہ سکتے ہیں دور اس سے
میں بھی اسی یقیں کے سہارے
گزار رہی ہوں یہ لمحے سارے
کبھی تو چھینٹیں پڑیں گی دل پر
نفرتوں کے موسم چھٹیں گے دل سے
تمہارے قلب تک میری رسائی ہوگی
تمہاری بے رحم طبیعت کو
میری محبتوں سے آشنائی ہوگی
زندہ ہوں میں اسی یقیں کے سہارے
گزار رہی ہوں یہ لمحے سارے

شاعرہ: حمیرا نوشین، منڈی بہاؤالدین

اسے صرف یہ محسوس ہورہا تھا کہ اس پوری کائنات میں بس وہ ہے اور اس کا رب درمیان کے فاصلے مٹ گئے ہیں۔ میں اور تو کی کیا حقیقت ہے؟ کیا بندگی ہے؟

ان تمام فلسفوں سے بے نیاز وہ سیدھی سادی لڑکی صرف رب کائنات کے حضور سجدے میں تھی۔ اس کا پورا وجود مجسم دعا تھا۔ جسم لرزہ بر اندام...... آنکھیں اشک بار...... یکا یک اسے اپنے سر پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔

اس نے سر اٹھایا۔

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ کیا......

''بھیا......'' بھیا دوزانو ہو کر اس کے پاس بیٹھ گئے۔ اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر رونے لگے۔

''مجھے معاف کردو طوبیٰ، میں نے ابا کی تربیت فراموش کردی۔ میں نے رب کے حکم کی تعمیل نہ کی۔ میں نے تم پر بھی دباؤ ڈالنے کی کوشش کی۔ لیکن یقین کرو رات سے میں بھی بے چین تھا۔ کوشش کے باوجود نیند نہیں آرہی۔ ایسا محسوس ہورہا تھا کہ کہیں کچھ غلط ہے، مجھے معاف کردو بہنا...... خدا کا شکر ہے کہ میں اس وقت پانی پینے کی غرض سے باہر آگیا۔ انشاءاللہ وہی ہوگا جو تم چاہوگی۔''

''میں نہیں بھیا...... اللہ تعالیٰ!'' طوبیٰ نے تصحیح کی۔

اور دونوں مسکرادیے۔

دوسرے دن چھٹی تھی۔ برآمدے میں بھیا اور ابا کی سیاسی معاملات پر بحث چھڑی ہوئی تھی۔ اماں تلاوت میں مصروف اور بھابی حسب معمول بچوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ اور وہ......

ابھی نہا کر نکلی تھی۔ صاف ستھرا، چہرہ...... اس کا چہرہ قبول صورت تھا لیکن پاکیزہ خیالات... ایک روشنی بن کر چہرے سے جھلکتے تھے۔ اس کا چہرہ پُرسکون تھا۔

اماں نے مسکرا کر ایک نظر اس پر ڈالی اور قرآن بند کرکے دعا کے لیے ہاتھ اٹھادیے۔

اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔

سکینہ خالہ اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ دروازے پر تھیں۔

سکینہ خالہ، اماں کی خالہ زاد بہن تھیں انتہائی سادہ طبیعت اور ملنسار...... اماں انہیں دیکھ کر مسکرا اٹھیں۔

''ارے سکینہ بڑے دن بعد آئیں، آؤ بیٹھو......'' ان کا بیٹا باہر ہی ابا اور بھیا کے ساتھ بیٹھ گیا۔ بہو نے پیار سے طوبیٰ کو گلے لگالیا۔

آج پیار کے انداز ہی اور تھے۔ طوبیٰ نے فرق واضح طور پر محسوس کیا تھا۔

''بھئی آج تو طوبیٰ کے ہاتھ کی چائے پینی ہے۔'' سکینہ خالہ نے فرمائش کی۔

وہ ان کے انداز پر الجھتی باورچی خانے میں آگئی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو سکینہ خالہ نے اسے گلے سے لگالیا۔ ''بھئی بڑے نصیبوں والی بچی ہے۔''

''ہاں اماں! میرے بھائی کو دین دار لڑکی ہی چاہیے تھی۔'' سکینہ خالہ کی بہو نگہت مسکرائی۔

طوبیٰ کے ہونق چہرے کو دیکھ کر اسے بڑا مزہ آرہا تھا۔

اور طوبیٰ سوچ رہی تھی۔

''نگہت بھابی کا بھائی ایک دین دار انسان...... اور دنیاوی اعتبار سے ڈاکٹری کے مقدس پیشے سے وابستہ.... اے میرے اللہ! تُو ہی مسبب الاسباب ہے۔ بے شک پاکیزہ مردوں کے لیے پاکیزہ بیبیاں......''

اماں کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ تھی اس کے نصیب کا ستارہ چمک اٹھا تھا۔





صحیح نشانہ

شمیم فضل خالق

چھوٹے بازار میں میر قاسم کی کافی بڑی دکان تھی...... ان کی دکان کو دو بستوں والی دکان کہتے تھے اور سارے بازار میں ان کی واحد دو بستوں والی دکان تھی ورنہ باقی سارے دکان ایک، ایک بستے کی تھی...... میر قاسم بڑے سوشل بندے تھے، یاروں کے یار تھے۔ شطرنج کھیلنے کے لیے انہوں نے یہ حل نکالا تھا کہ دکان کا ایک حصہ انہوں نے حجرہ سا بنالیا تھا...... سرخ رنگ کا پرانا افغانی قالین بچھا کر انہوں

نے اس کے اردگرد گاؤ تکیے رکھ دیے تھے۔ جہاں ان جیسے شطرنج کے شوقین یاد آجاتے اور تب بازیاں جمتیں گپ شپ ہوتی ...... ہنسی مذاق ہوتا...... قریب کی دکان سے چائے کے، قہوے کے زنگ آلود چاینک آتے...... دکان کا دوسرا حصہ انہوں نے جنرل اسٹور بنا رکھا تھا جس میں کوالٹی کا سامان ہوتا...... جنرل اسٹور پر انہوں نے فواد نامی لڑکے کو رکھا تھا...... شطرنج کھیلتے، کھیلتے اور گپ شپ لگاتے ہوئے بھی وہ فواد کو نظروں کے حصار میں لیے رکھتے۔

فواد ایک گڈ لکنگ نوجوان تھا...... اس نے ایف اے کیا تھا اور آج کل بی اے کی تیاری پرائیویٹ طور پر کر رہا تھا...... اس کا ایک چچا کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ والدین اس کے فوت ہو چکے تھے۔ اپنا خرچہ اٹھانے کے لیے وہ میر قاسم کی دکان میں ملازم ہو گیا تھا...... میر قاسم نے اسے ملازم رکھتے ہوئے ہر طرح کی تحقیق کی تھی اور بعد میں نت نئے طریقوں سے اسے آزمایا بھی تھا...... کبھی وہ اپنے جنرل اسٹور میں پانچ سو یا ہزار کا نوٹ گرا دیتے لیکن ہر بار فواد ان کو نوٹ پکڑاتے ہوئے کہتا۔

”حاجی صاحب...... یہ لیں اپنے پیسے...... چینی کی بوری کے پیچھے پڑے تھے......“ وہ مسکرا کر نوٹ اپنی جیب میں اُڑس لیتے...... وہ دکان سے ناغہ کبھی نہ کرتے اور جتنے بھی گاہک آتے انہیں دل ہی دل میں گنتے اور شطرنج کھیلتے، کھیلتے بھی نظروں میں تولتے کہ گاہک نے کیا خریدا اور کتنا خریدا...... اس سلسلے میں انہیں کبھی فواد پر شک نہیں ہوا...... دراصل اس نے کبھی انہیں شک کا موقع نہیں دیا...... شام کو دکان بند ہونے سے پہلے وہ سارا حساب کتاب میر قاسم کو دے کر جاتا اور یہ حساب کتاب میر قاسم کو بالکل صحیح لگتا...... فواد دوپہر میں ایک گھنٹے دو گھنٹے کے لیے دکان چھوڑ کر باہر جاتا...... میر قاسم اس کو یہ سہولت خوشی سے دے دیتے اور اس دوران خود دکان پر بیٹھ جاتے۔ ان کے خیال میں وہ لڑکا بالا تھا...... بیٹھ، بیٹھ کر تنگ ہو جاتا تو تھوڑی بہت آؤٹنگ اس کا حق بنتا تھا...... لنچ وہ میر قاسم کے ساتھ ہی کرتا تھا...... میر قاسم نے اس کی دیانت داری کے عوض اسے بہت سی مراعات دی تھیں جن میں ایک اسے اپنے ساتھ لنچ کرانا تھا...... لنچ گھر سے ہی آتا تھا۔ سارے دکانداروں نے مل کر ایک چھوٹے سے لڑکے کو تھوڑے سے پیسوں کے عوض اپنے، اپنے گھروں سے لنچ لانے کے لیے رکھا تھا...... سارے دکانداروں کے گھر آس پاس ہی تھے...... لڑکا سائیکل پر جاتا اور تمام گھروں سے لنچ باکسز سائیکل کی ٹوکری میں ڈال کر لے آتا...... اگر کبھی وہ لڑکا نہ ہوتا تو میر قاسم، فواد کو لنچ لانے گھر بھیج دیتے...... میر قاسم کی بیوی کچھ عرصہ پہلے فوت ہو چکی تھی...... ایک بیٹی تھی...... راحیلہ نام تھا اس کا...... بیوی کی وفات کے بعد یار دوستوں نے میر قاسم کو دوسری شادی کے لیے بہت مجبور کیا لیکن میر قاسم نہ مانے...... وہ دوستوں میں خوش رہنے والے مرد تھے۔ دوبارہ پیروں میں بیڑی ڈالنے کو تیار نہ تھے...... راحیلہ ایک جوان لڑکی تھی...... گھر میں اس کے اکیلے رہنے کا مسئلہ تھا...... شہر میں میر قاسم کی ایک بیوہ خالہ تھیں جو بے اولاد تھیں اور تیرے میرے گھروں میں لڑھکتی پھر رہی تھیں...... میر قاسم خود ان کے پاس گئے اور بڑی عزت سے خالہ زینب کو لے آئے تب سے زینب خالہ، راحیلہ کے پاس تھیں اور میر قاسم اب راحیلہ سے بالکل بے فکر ہو گئے تھے...... راحیلہ نے میٹرک کر لیا تھا اب وہ کالج جانے لگی تھی...... وہ پڑوس کی لڑکیوں کے ساتھ آیا جایا کرتی تھی...... وہ تیکھے نقوش کی سانولے رنگت کی دبلی پتلی لڑکی تھی، وہ بہت زیادہ حسین تو نہ تھی لیکن دیکھنے میں اچھی لگتی تھی...... لیکن کچھ دنوں سے میر قاسم کی نیندیں اڑ گئی تھیں...... جب سے راحیلہ کی سہیلی نازش کی شادی ہوئی تھی...... میر قاسم کو بھی راحیلہ کی فکر ہو گئی تھی۔ نازش، راحیلہ کی عمر کی تھی اور اس کا جھٹ منگنی پٹ

بیاہ ہو گیا تھا۔ میر قاسم کو اب اس لیے بھی فکر ہو گئی تھی کہ خالہ زینب آئے روز بیمار رہنے لگی تھیں...... میر قاسم سوچ رہے تھے کہ اگر خدانخواستہ خالہ زینب کو کچھ ہو گیا تو پھر وہ راحیلہ کے لیے کون سا سہارا تلاش کریں گے، اس سے اچھا ہے کہ اسے اپنے گھر کا کر دیں اور بے فکر ہو جائیں۔ اس دن ان کا کوئی دوست شطرنج کھیلنے نہیں آیا تھا، وہ اکیلے ہی اپنی دکان والے حجرے میں بیٹھے شطرنج کے مہروں کو آگے پیچھے کر رہے تھے...... فواد کسی گاہک کے ساتھ الجھا ہوا تھا وہ سودا قرض مانگ رہا تھا جبکہ فواد مسلسل انکار کر رہا تھا اور اسے دکان میں لٹکے ہوئے گتے کے بورڈ پر لکھے اس جملے کی طرف متوجہ کر رہا تھا کہ ادھار مانگ کر شرمندہ نہ کریں...... لیکن گاہک اپنی بولی بول رہا تھا کہ آج پیسے نہیں ہیں سودا دے دو...... چند دن بعد پیسے دے دوں گا...... میر قاسم ایسے معاملات میں چپ ہی رہتے تھے...... فواد خود ہی معاملہ سلجھا لیتا تھا...... آج بھی دونوں کی تکرار سن رہے تھے لیکن بیچ میں دخل نہیں دے رہے تھے۔ فواد اور گاہک کی تکرار اب جھگڑے میں تبدیل ہو چکی تھی...... میر قاسم کو فواد کا یہ رویہ اچھا لگ رہا تھا کہ وہ ان کی طرف داری کر رہا تھا بلکہ ان کے ایک اصول کو فالو کر رہا تھا کہ جو انہوں ہمیشہ روا رکھا تھا وہ ادھار کے سخت خلاف تھے...... دونوں کے جھگڑے کے بیچ ہی انہوں نے سوچا کہ اگر ان کی محنت سے حاصل کی ہوئی دکان فواد کے حصے میں آئی تو وہ ان کے اس واحد ورثے کا صحیح حقدار ہوگا...... لیکن...... وہ اپنے اس خیال پر دل ہی دل میں ہنسے کہ بھلا فواد کس اینگل سے ان کی جائداد کا حقدار ہوگا...... کہ وہ تو صرف ان کا نوکر ہے...... اچانک...... ایک سرسراتا ہوا خیال ان کے ذہن میں آیا...... کہ اگر فواد ان کا داماد بن جائے تو نہ صرف ان کی دکان پر اس کا حق ہوگا بلکہ وہ ان کا دایاں بازو بن جائے گا اور ان کے بیٹے کی خالی جگہ بھی پُر ہو جائے گی اور راحیلہ کو بھی کسی

اور گھر میں نہیں جانا پڑے گا...... ان کا دل اس خیال پر زور، زور سے دھڑکنے لگا جیسے دل سینے کی دیواریں توڑ کر باہر آجائے گا...... ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے...... یہ خیال ہی بے حد انوکھا اور عجیب تھا...... شاید ان کے دوستوں اور بازار کے لوگوں کو یہ بات پسند نہ آئے کہ انہوں نے اپنی لاڈلی بیٹی کا نکاح ایک تنخواہ دار ملازم سے کرنے کا سوچا ہے اور ہوسکتا ہے یہ لوگ اس شادی میں رکاوٹیں بھی ڈالنے کی کوشش کریں......

"لیکن...... مجھے اِدھر اُدھر کے لوگوں سے اور ان کے خیالات کے بارے میں سوچنے کی کیا ضرورت ہے، میں وہی کروں گا جو میرا دل چاہے گا اور جسے میں اپنے لیے مناسب سمجھوں گا......" میر قاسم جتنا، جتنا ان خیالات کو اپنے ذہن سے دور کرنے کی کوشش کرتے اتنا ہی وہ ذہن پر قابض ہوتے جارہے تھے وہ سوچ رہے تھے "آخر فواد میں خرابی کیا ہے وہ گڈ لکنگ ہے...... پڑھا لکھا ہے اور مزید پڑھ رہا ہے...... جب بھی دکان پر گاہک نہ ہوتے تو وہ اپنی کتابیں کھول کر پڑھنے میں مشغول ہوجاتا...... نہ اس کے آگے کوئی ہے نہ پیچھے کوئی ہے، ایک بیٹی کے باپ کے لیے یہ بھی اس کی خوبی میں شمار ہوتا ہے بس اس کی ایک خامی ہے کہ وہ غریب ہے اور ان کا نوکر ہے تو غربت کوئی خامی نہیں اور نہ ہی محنت کرنا کوئی گالی ہے۔ وہ محنت کرتا ہے اس دکان کے لیے جان مارتا ہے اور بدلے میں، میں اسے تنخواہ دیتا ہوں...... اور ویسے بھی اس نے کئی بار کہا ہے کہ یہ جاب اس کی عارضی جاب ہے وہ پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بننا چاہتا ہے......" میر قاسم کا سوچ، سوچ کر برا حال ہوگیا...... ان کی نسیں درد سے پھٹنے لگیں...... فواد اور گاہک کا جھگڑا کب کا ختم ہوچکا تھا...... گاہک دکان سے جاچکا تھا اور فواد اپنی کورس کی کتاب پڑھ رہا تھا...... میر قاسم کو مختلف قسم کی سوچوں نے ادھ موا کر رکھا تھا لیکن انہوں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ وہ ہر حال میں فواد کو داماد بنائیں گے چاہے اس کے لیے انہیں کچھ زیادہ کیوں نہ کرنا پڑے...... شاید اس کے لیے خالہ زینب بھی نہ مانیں، ایک نئی سوچ ان کے ذہن پر حملہ آور ہوئی...... لیکن بہر حال وہ ان تمام مخالفتوں کا مقابلہ کریں گے...... فواد کے بارے میں تو انہیں یقین تھا کہ وہ یہ خبر سن کر خوشی سے پھولا نہیں سمائے گا...... اس نے تو یہ سوچا بھی نہیں ہوگا کہ ایک دن وہ بیٹھے بٹھائے نہ صرف اپنے مالک کی بیٹی کی قسمت کا مالک بن جائے گا بلکہ ایک عدد گھر اور جما جمایا کاروبار بھی اسے مل جائے گا...... آج گھر جاتے ہوئے میر قاسم کے ذہن کو سوچوں نے شل کر رکھا تھا...... کبھی کبھی انہیں ڈر بھی لگنے لگتا......

"لوگ کہتے ہیں کہ پیر کی جوتی کو سر پر کبھی نہیں رکھنا چاہیے کیا خبر...... وہ مجھے میرے ہی کاروبار سے بے دخل کردے...... مجھے آنکھیں نہ دکھانے لگ جائے...... خیر......" میر قاسم نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے خود کو تسلی دی...... "میں کیوں اپنی ساری کشتیاں جلاؤں گا...... سب کچھ راحیلہ کے نام کروں گا فواد اس کا شوہر ضرور ہوگا لیکن جائداد تو راحیلہ کے نام ہوگی اور فی الحال تو راحیلہ کے نام بھی نہیں ہے...... گھر، دکان سب میرے نام ہے...... جائداد کی فکر چھوڑ کر مجھے راحیلہ کا گھر بسانے کی فکر کرنی چاہیے۔" مثبت اور منفی خیالات کے بگولے ان کے ذہن میں اٹھ رہے تھے۔

شام کو وہ دکان بند کر کے گھر آئے تو کمرے سے خالہ زینب کی ہائے وائے کی آوازیں آرہی تھیں...... یہ روز کا معمول تھا خالہ زینب بیمار تو تھیں لیکن ان کی عادت واویلا مچانے کی بھی تھی۔ چھوٹی سی تکلیف ہوتی تو بھی بہت زیادہ شور مچاتیں...... اکثر تو میر قاسم ان کی ہائے وائے نظر انداز کر کے اپنے کمرے میں چلے جاتے لیکن آج وہ ایسا نہ کرسکے...... راحیلہ نے باپ کو دیکھا تو لپک کر کچن سے باہر آگئی اور باپ کو سلام کر کے ان سے پھل

فروٹ کا لفافہ لینے لگی......

خالہ کی طبیعت زیادہ خراب ہے کیا؟" اس کے سلام کا جواب دے کر میر قاسم نے اس سے پوچھا۔

"پتا نہیں۔" وہ منہ بنا کر بولی۔ "دوائی تو دے دی ہے۔"

"اچھا...... میں ان سے مل لیتا ہوں...... تم میری چائے وہیں لے آنا۔"

راحیلہ نے قدرے حیرت سے اثبات میں سر ہلایا۔ ابا اتنی زیادہ دیر تو خالہ کے کمرے میں نہیں رکتے...... خیر وہ دل میں سوچنے لگی اور چائے بنانے کے لیے کچن میں گھس گئی۔

"کیا حال ہے خالہ...... طبیعت زیادہ خراب ہے کیا؟" میر قاسم سلام کر کے ان کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"بس بیٹا...... ٹانگوں میں شدید درد ہورہا ہے...... پاگل بنا کر رکھ دیا ہے ان دردوں نے مجھے......" خالہ کو خود بھی ان کے بیٹھنے پر حیرت ہوئی۔ اکثر وہ کھڑے، کھڑے اس کا حال پوچھتے یا سیدھے اپنے کمرے میں چلے جاتے...... خالہ زینب گاؤ تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ گئیں۔

"ڈاکٹر کی دوائی تو ٹائم پر لے رہی ہیں ناں......؟"

"ہاں بیٹا...... راحی وقت پر دوائیاں دے دیتی ہے۔" وہ بولیں تو میر قاسم ہمدردی سے کہنے لگے۔

"ایک دو دن دیکھ لیتے ہیں خالہ...... اگر آرام نہ آیا تو دوسرے ڈاکٹر سے چیک اپ کرالوں گا۔"

"اچھا بیٹا...... خدا تمہاری عمر دراز کرے......"

خالہ زینب انہیں دعائیں دینے لگیں...... میر قاسم کچھ دیر بیٹھے سوچتے رہے پھر بولے۔

"خالہ...... آپ سے ایک بات کرنی تھی۔"

خالہ زینب کی ہائے وائے تھم گئی......

"ہاں بیٹا...... سو باتیں کہو...... مجھے بھی تم سے ایک بات کرنی تھی...... خیر پہلے تم کہو......" وہ بولیں۔

میر قاسم نے ان کی بات پر زیادہ توجہ نہ دی اور بولے۔

"دراصل مجھے راحی کے بارے میں بات کرنی ہے...... وہ...... اس کی شادی کے بارے میں...... اب وہ بڑی ہوگئی ہے۔" آہٹ پر وہ خاموش ہوگئے...... راحیلہ چائے کا کپ لے کر آئی تھی...... کپ تپائی پر رکھ کر وہ بولی۔

"ابا...... میں سیما کے پاس جاتی ہوں...... کچھ سہیلیاں آئی ہیں اس کے گھر...... اس نے چائے پر سب کو بلایا ہے۔"

"ہاں، جاؤ بیٹا......" میر قاسم نے خوشی سے اسے اجازت دی کہ اس کی غیر موجودگی میں وہ خالہ زینب سے آزادی کے ساتھ اس کے متعلق بات کرسکیں گے...... سیما کا گھر قریب ہی محلے میں تھا اور راحیلہ کے ساتھ اس کی بہت دوستی تھی...... راحیلہ کے جانے کے بعد میر قاسم نے پھر سے اپنی بات شروع کی، ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ میں پھنساتے ہوئے وہ بولے۔

"راحی بڑی ہوگئی ہے خالہ...... اب ہمیں اس کے متعلق سوچنا چاہیے۔"

"شکر ہے بیٹا...... تجھے اس کا خیال تو آیا...... ورنہ تو، تو شطرنج میں ایسا محو تھا کہ اکلوتی بیٹی کا خیال تک تجھے نہیں آتا تھا۔" خالہ زینب نے قدرے طنزیہ انداز میں کہا۔

"نہیں، اب ایسی بات بھی نہیں ہے...... لیکن اتنی بڑی بھی نہیں ہوئی تھی وہ...... اب بڑی ہوگئی ہے تو......" میر قاسم شرمندہ سا ہوکر بولا۔

"دیکھ بیٹا...... چھوٹی بڑی کو چھوڑ...... تیرے حالات ایسے ہیں کہ تجھے راحی کے بارے میں چند سال پہلے سوچنا چاہیے تھا...... دوسری شادی تو کرتا نہیں ہے...... میں چراغِ سحری ہوں...... اور ویسے بھی میں کہاں اس کی جوانی کی حفاظت کرسکتی ہوں اور یہی بات میں تجھ سے کہنا چاہ رہی تھی پر زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی...... کتنے دن سے کشمکش

میں ہوں کہ تجھے بتاؤں تو کیسے بتاؤں......'' خالہ نے رسانیت سے کہا۔

میر قاسم کو کسی انہونی کا احساس ہوا...... الجھن بھری نظروں سے خالہ زینب کو دیکھتے ہوئے وہ بولے۔

''کیا بات ہے خالہ...... کیا کوئی بات ہوئی ہے؟'' خالہ زینب تھوک نگلتے ہوئے بولیں۔

''ہاں بیٹا...... بہت بڑی بات ہے...... دراصل راحیلہ نے اپنے لیے چور دروازہ ڈھونڈ لیا ہے۔''

''کک...... کیا......؟'' میر قاسم کا دل دھک سے رہ گیا...... ان کا دل ڈوبنے لگا...... وہ ہراساں لہجے میں بولے۔

''خالہ...... آپ پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہیں...... صاف، صاف بات کریں ناں......''

''صاف، صاف بات یہ ہے میر قاسم...... کہ راحی نے اپنے لیے بر خود چن لیا ہے...... ایک لڑکا اس سے ملنے آتا ہے......'' میر قاسم کو ایسے لگا جیسے کسی نے کس کر طمانچہ ان کے منہ پر مار دیا ہو...... وہ لڑکھڑا کر رہ گئے...... کافی دیر تک تو ان سے بات نہیں ہو سکی لیکن جب بولے تو ان کی آواز غیظ و غضب سے... بھرپور تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور غصے سے کانپتی آواز میں بولے۔

''کہاں ہے وہ منحوس...... میں اس کا خون پی جاؤں گا...... زندہ زمین میں گاڑھ دوں گا اسے...... ذلیل!'' خالہ زینب نے چارپائی سے اٹھ کر ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور انہیں دوبارہ کرسی پر بٹھاتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولیں۔

''میر قاسم...... جوان، بیٹی کا باپ اس طرح چیخ کر نہیں بولتا...... دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں بچہ...... اپنی عزت کو خود سنبھالنا پڑتا ہے۔''

میر قاسم بھرائی آواز میں بولے۔

''بیٹی نے تو عزت کا جنازہ نکال دیا اب میں کیا اپنی عزت سنبھالوں گا...... لیکن خالہ......!'' اور ایک شکایت بھری نظر ان پر ڈالی۔

''آپ نے بھی مجھے نہیں بتایا...... اب بتا رہی ہیں۔''

ایک ٹھنڈی آہ بھر کر خالہ زینب بولی۔

''ایک باپ کو ایسی خبر سنانی آسان کب ہوتی ہے بیٹا اور مجھے تو خود چند دن پہلے معلوم ہوا ہے...... میں تو دوپہر کو کھانا کھا کر سو جایا کرتی تھی، وہ تو چند دن قبل مجھے نیند میں پیاس نے ستایا تو میں پانی پینے اٹھی...... دیکھا تو راحی کسی لڑکے کے ساتھ کچن میں بیٹھی تھی...... مجھے دیکھتے ہی وہ لڑکا تو بھاگ گیا اور راحی میری منت سماجت کرنے لگی کہ میں تمہیں نہ بتاؤں۔''

''وہ لڑکا کون تھا؟'' میر قاسم ہاری ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

''میں نے لاکھ پوچھا پر اس نے بتا کر نہ دیا...... ہوگا اس کی کسی سہیلی کا بھائی وائی......'' خالہ زینب نے جواب دیا۔

میر قاسم کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بیٹھے بیٹھے مر چکے ہوں...... وہ عجیب سی کیفیت سے گزر رہے تھے...... کبھی ان کا دل چاہتا کہ خود کو مار لیں کبھی راحیلہ کی جان لینے کو دل کر رہا تھا۔ خالہ زینب انہیں دھیرے، دھیرے سمجھا رہی تھیں۔

''دیکھ بچے...... اپنے غصے پر قابو پا...... راحی کو کچھ نہ کہہ...... بلکہ ایسا ظاہر کر جیسے تجھے کچھ معلوم ہی نہیں...... دیکھ میر قاسم یہ جوانی بڑی دیوانی ہوتی ہے...... نہ اپنا نقصان دیکھتی ہے نہ دوسروں کا...... بس جھٹ پٹ اس کے ہاتھ پیلے کر دے...... اگر تو نے اس کے لیے کوئی لڑکا ڈھونڈا ہے تو دیر نہ کر......'' اس کے علاوہ بھی خالہ زینب نے انہیں بہت نصیحتیں کیں اور انہیں کسی بھی انتہائی قدم سے روکے رکھا...... میر قاسم، خالہ زینب کے کمرے سے اپنے کمرے تک آئے تو انہیں قدم اٹھانا مشکل لگ رہا تھا ایک، ایک پیر من، من بھر کا ہو رہا تھا...... ان کا جی زندہ رہنے سے اچاٹ ہو گیا تھا...... وہ لائٹ آن کیے بغیر اپنے بستر پر گرے اس رات انہوں نے کھانا بھی نہیں کھایا...... صبح بھی بغیر ناشتا کیے دکان پر آگئے...... وہ گم صم اپنے حجرے میں بیٹھے تھے آج زوروں کی بارش برس رہی تھی۔ کڑاکے کی سردی تھی...... فواد دکان کی جھاڑ پونچھ کر رہا تھا اس نے ایک دو بار میر قاسم کو پکارا لیکن میر قاسم کا دھیان اس... طرف نہ تھا...... وہ کچھ بھی نہیں سن رہے تھے ان کے چہرے پر ایسی مردنی چھائی تھی کہ فواد کا دل سہم سا گیا...... وہ بے اختیار ان کے قریب گیا۔

''حاجی صاحب...... آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں......؟''

وہ خالی خالی نظروں سے فواد کی طرف دیکھتے ہوئے... بالکل اچانک بولے۔

''فواد...... مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے...... بہت اہم بات......'' فواد نے فوراً کہا۔

''کہیے ناں حاجی صاحب......'' میر قاسم نے کچھ بے بسی سی الجھی، الجھی نظروں سے اسے دیکھا اور جس بات پر ابھی انہوں نے مزید سوچنا تھا اور پھر فیصلہ کرنا تھا...... وہ فیصلہ تو اچانک ہو گیا...... وہ نظریں جھکا کر بولے۔

''فواد...... فواد بیٹے...... تم جانتے ہو ناں کہ میں تم سے ایک بیٹے جیسی محبت کرتا ہوں...... جانتے ہو ناں تم......؟''

''جی حاجی صاحب......'' فواد سعادت مندی سے اپنا سر جھکاتے ہوئے بولا۔

''میں نے بھی ہمیشہ آپ کو اپنے باپ کی طرح سمجھا ہے۔'' میر قاسم دبے دبے جوش کے ساتھ بولے۔

''اگر ایسا ہے تو کیوں ناں ہم سچ مچ کے باپ، بیٹا بن جائیں۔''

''جی......''

''وہ اس طرح کہ تم میرے داماد بن جاؤ......'' میر قاسم نے اب کے صاف، صاف بات کرنے کی ٹھانی۔

''جج...... جی......'' مارے حیرت کے فواد سے بات نہیں ہو پا رہی تھی...... وہ پھٹی، پھٹی نظروں سے میر قاسم کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو...... الفاظ گول مول ہو کر اس کے حلق میں چبھنے لگے تھے...... وہ کچھ کہنے کے...... کچھ بولنے کے قابل نہیں رہا تھا......

میر قاسم نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔

''راحیلہ میری اکلوتی بیٹی ہے...... اگر وہ میرے گھر سے چلی گئی تو میرے پاس کچھ نہیں رہے گا...... اس لیے میں نے سوچا تھا کہ اسے میں ایسے لڑکے سے بیاہوں گا جو میرا داماد نہ ہو...... بلکہ بیٹا بن کر میرے ساتھ رہے...... اور اس کے لیے میں نے تمہارا انتخاب کیا...... کیونکہ تم کافی وقت سے میرے ساتھ رہ رہے ہو...... تمہاری ساری خوبیاں مجھ پر آشکار ہو چکی ہیں۔''

''لل...... لیکن حاجی صاحب......'' وہ کھسیا کر بولا۔ ''میں تو آپ کا نوکر ہوں...... نہ گھر ہے نہ روپیہ، پیسہ ہے...... آپ آسمان ہو تو میں زمین...... یہ کیسے ہو سکتا ہے...... میری اور آپ کی رشتے داری

صحیح نشانہ

یقین

جب تک وہ میرے دل میں رہتا تھا
تب تک وہ میرے یقین میں رہتا تھا
بھرم ٹوٹا اس یقین کا کہ وہ میرا ہے
اس یقین اس بھرم کے ٹوٹنے کی صدا
بہت دور تک سنائی دی

مرسلہ: مسز فرح امجد، ٹاؤن شپ لاہور

دعا

مانگی ہے دعا
تیری خوشیوں کی
مگر!
اپنے ساتھ
اگر ہے گوارا تجھے بھی
تو تم بھی
آمین کہہ دو

شاعرہ: مدیحہ نورین مہک، برنالی

کیسے ہوسکتی ہے۔'' وہ حیران اور پریشان تھا۔

''ہونے کو سب کچھ ہوسکتا ہے فواد بیٹا......''

میر قاسم نے ہنکارا بھرتے ہوئے محبت سے اسے دیکھا...... ''تم پڑھے لکھے ہو...... شریف ہو، تابعدار ہو، تمہاری شکل صورت اچھی ہے، کیا خامی ہے تم میں...... غریب ہونا کوئی جرم نہیں...... اور سنو...... جو چیزیں تمہارے پاس نہیں وہ میں تمہیں دوں گا...... مثلاً گھر، کاروبار اور ایک عدد بیوی...... اور ہاں ایک عدد باپ بھی......'' اچانک فواد پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ میر قاسم کی پیروں پر رکھ دیے۔

''حاجی صاحب...... آپ مجھے اتنی عزت اور محبت دے رہے ہیں جس کا میں اہل بھی نہیں...... میں انکار کر کے کیوں گناہ گار بنوں...... آپ دیکھیں گے کہ میں ہمیشہ آپ کا نوکر بن کر ہی رہوں گا۔''

کل سے لے کر اب تک پہلی بار میر قاسم نے اطمینان کی سانس لی...... انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے کل سے ان کے سینے میں سانس گھٹ رہی تھی...... جیسے وہ پہلی بار کھل کر سانس لے پائے ہوں...... انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''میں آج ہی تمہارے چچا سے بات کرتا ہوں۔'' فواد کے چچا کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا...... وہ بھی فواد کی طرح حیران تھا اسے اپنے بھتیجے کی قسمت پر رشک آرہا تھا۔ معاملات اتنی جلدی، جلدی طے پاگئے کہ خود میر قاسم کو بھی یقین نہیں آرہا تھا...... گھر میں شادی کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ خالہ زینب کی ساری بیماریاں گھر میں ہلا گلا ہونے سے ہی بھاگ گئی تھیں...... پڑوس کی لڑکیوں کے ساتھ وہ شادی کی تیاریوں میں مصروف تھیں اور فی الحال اپنی ساری بیماریاں وہ بھول بیٹھی تھیں...... میر قاسم کے دل میں راحیلہ کی طرف سے دھڑکا سا لگا تھا سو وہ شادی جلدی کرنے کے حق میں تھے۔ راحیلہ ان کے سامنے آنے سے گریزاں رہتی تھی...... اسے شک ہوگیا تھا کہ خالہ نے شاید میر قاسم کو اس کے متعلق سب کچھ بتا دیا ہوگا...... میر قاسم بھی راحیلہ کو چائے کھانے کا نہیں کہتے تھے...... دونوں کے بیچ چھپن، چھپائی کا کھیل ہورہا تھا۔ میر قاسم وہاں نہ جاتے جہاں راحیلہ ہوتی اور راحیلہ باپ کو دیکھ کر کونے کھدروں میں چھپ جاتی......

شادی کا دن آگیا...... میر قاسم نے سارے محلے داروں اور بازار کے دکانداروں اور اپنے یار دوستوں کو بڑا پُرتکلف کھانا کھلایا...... اور راحیلہ اور فواد ایک ہوگئے...... فواد اپنا مختصر سا سامان لے کر میر قاسم کے گھر آگیا...... میر قاسم کے دل سے جیسے منوں بوجھ اتر گیا...... وہ بالکل ریلیکس ہوگئے...... اب ان کی شطرنج کی بازیاں کچھ زیادہ ہی لگنے لگیں...... خالہ زینب بھی مطمئن ہوگئیں کہ جوان لڑکی کی چوکیداری آسان بات تو نہیں تھی ہاں ایک بات ضرور تھی کہ وہ فواد کو دیکھ کر سوچتیں کہ انہوں نے فواد کو کہاں دیکھا ہے...... انہیں فواد کی شکل جانی پہچانی سی لگتی تھی...... اکثر وہ اس شک کا اظہار راحیلہ سے کردیتیں تو راحیلہ ہنس کر کہتی۔

''اب مجھے کیا پتا خالہ...... کہ آپ نے فواد کو کہاں دیکھا ہے۔'' لیکن رات کو وہ ہنس کر جب یہی بات فواد سے کرتی تو فواد مسکرا کر کہتا۔

''بھئی راحی...... بڑی تیز ہیں تمہاری خالہ...... یعنی اس دن پکن میں مجھے ایک نظر دیکھ کر ہی انہوں نے مجھے یاد رکھا ہوا ہے...... حالانکہ میں تو اس دن چھلاوا بن گیا تھا...... اتنا تیز تو میں زندگی میں نہیں بھاگا ہوں جتنا اس دن بھاگا تھا۔''

دونوں کی مشترکہ ہنسی جب باہر تک آتی تو میر قاسم کے ہونٹ خود بخود مسکرانے لگتے۔ گویا ان کا فیصلہ بالکل صحیح تھا۔ راحیلہ اس لڑکے کو بھول گئی تھی جس سے وہ ملا کرتی تھی۔

اللہ مالک

ثوبیہ رفعت ذوالفقار



ان کے چہرے پر پریشانی اور تفکر کے اثرات واضح تھے۔ جدید طرز پر بنی اس خوب صورت بلڈنگ سے اپنے پی اے کے ہمراہ باہر نکل کر انہوں نے اپنی بلیک مرسیڈیز کی طرف قدم بڑھا دیے تھے جو سڑک کے کنارے اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ کھڑی لوگوں کی توجہ اور واہ، واہ اپنی طرف سمیٹ رہی تھی۔

سرمئی ڈریس میں ملبوس ہاتھ میں قیمتی بریف کیس تھامے آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھائے، اپنی شاندار پرسنالٹی کے ساتھ خود آفندی صاحب نے بھی وہاں سے گزرتے ہوئے بہت سے لوگوں کو مرعوب کیا تھا۔ چلچلاتی دھوپ میں تیز قدم چلتے ہوئے وہ بار، بار اپنے ماتھے اور چہرے پر آیا پسینہ صاف کررہے

تھے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے پی اے کو ہدایات بھی جاری کر رہے تھے۔

''تم مزید دو دن یہاں رکو گے۔'' انہوں نے آرڈر کیا تھا۔

''جی سر۔'' پی اے کی طرف سے نہایت مستعدی سے جواب آیا تھا۔

''تمہیں اپنا سارا کام نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے کرنا ہوگا...... مجھے ہر حال میں ان کے سیکریٹس چاہئیں۔'' انہوں نے مزید کہا تھا۔

''ایسا ہی ہوگا سر، ڈونٹ یو وری......'' پی اے کو جیسے رٹایا گیا تھا ان کی ہر بات کا مثبت جواب دینے کے لیے...... چلتے، چلتے وہ لوگ گاڑی تک پہنچ گئے تھے۔ جہاں ڈرائیور نے دروازہ پہلے سے کھول دیا تھا۔ اوراب دروازہ تھامے مؤدب کھڑا تھا۔

''یاد رکھنا...... اگر یہ خبر لیک ہوئی یا کسی قسم کی کوتاہی ہوئی تو اس کے ذمے دار صرف تم ہوگے۔'' وارننگ دے کر وہ وھب سے گاڑی میں بیٹھ گئے تھے جبکہ پی اے کی زبان گنگ ہوگئی تھی اس انوکھی لیکن خوف ناک تنبیہ کو سن کر......

''جلدی گھر چلو......'' بریف کیس برابر کی سیٹ پر پٹختے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے انہوں نے ڈرائیور کو بارعب لہجے میں آرڈر کیا...... لنچ ٹائم تھا اور آفندی صاحب ابھی ابھی ٹینڈر آکشن سے فارغ ہوئے تھے اوراب انہیں اسلام آباد سے لاہور اپنے گھر جانا تھا کیونکہ وہ کھانا ہر ممکن کوشش میں اپنی فیملی کے ساتھ ہی کھاتے تھے چاہے ٹائم سے بے ٹائم ہو جاتے۔ جو انہیں بے حد عزیز تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی موٹروے پر ڈال دی تھی۔ پی اے سکتے کے عالم میں کھڑا ان کی گاڑی کو وہاں سے روانہ ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

رنج، کرب، حسد، ملال، غصہ اور ٹینشن کی ملی جلی کیفیات ان کے اعصاب پر سوار تھیں۔ کچھ دیر پہلے ہونے والے نیلامی کے تمام سین کسی فلم کی طرح باری، باری ان کے ذہن میں چکر کھا رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ان کا غصہ اور ملال سوا ہوتا جا رہا تھا۔

''ذلیل، خبیث...... چھوڑوں گا نہیں میں اسے۔'' نہایت نامعقول الفاظ ان کے منہ سے یقیناً مخالف پارٹی کے لیے نکلے تھے۔ آج تک شیراز آفندی کو کسی نے بزنس کے میدان میں شکست نہیں دی تھی اور آج ضیغم صدیقی آج کی نیلامی جیت گیا تھا۔

''میرا دل کرتا ہے، میں ختم کردوں اس کو......'' انہوں نے غصہ نکالنے کے لیے پوری قوت سے ہاتھ کا مکا بنا کر گاڑی کی کھڑکی پر مارا تھا جس سے ایک زوردار ٹھک کی آواز پیدا ہوئی تھی۔ جس کا شیراز آفندی نے نوٹس نہیں لیا...... اپنا غصہ نکالنے کے لیے انہیں ایک پنچنگ بیگ کی ضرورت تھی جس پر متواتر گھونسوں کی بوچھار کر کے وہ دل کی بھڑاس نکال سکتے۔

''گاڑی تیز چلاؤ......'' وہ ڈرائیور پر دہاڑے تھے۔ جس نے فوراً سے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی تھی مگر اگلے ہی لمحے اسے گاڑی کو روکنا پڑا تھا۔

''گاڑی کیوں روک دی۔'' وہ ڈرائیور پر چلّانے ہی والے تھے جب ونڈ اسکرین کے پار نظر آتی ٹریفک سگنل کی ریڈ لائٹ کو اپنا منہ چڑاتے دیکھا۔

''ڈیم اٹ......'' انہوں نے سیٹ کی پشت کے ساتھ ٹیک لگالی اور کرب سے آنکھیں موندلیں۔ ان کی زندگی میں اتنی مشکلیں کیوں ہیں، وہ آئے دن آفتوں کے گرداب میں پھنستے جا رہے تھے۔ ان کا سکون برباد ہوتا جا رہا تھا۔ کتنی کوشش کی تھی انہوں نے، یہ نیلامی جیتنے کو خود کو کتنے سال مشقت کی چکی میں پیسا تھا مگر فائدہ کیا ہوا چار کروڑ...... صرف چار کروڑ کا منافع...... ان کے مسائل ہی اتنے ہی زیادہ تھے کہ یہ لمبی چوڑی رقم ان کی ضروریات کے سامنے

حقیر معلوم ہو رہی تھی۔ ان کے گھر کا بے تحاشا خرچ، کمپنی کے اخراجات، ملازمین کی تنخواہیں، والدہ کا علاج، علی کی گاڑی، مونا کی فرمائشیں، بیگم کی شاپنگ اور سب سے بڑھ کر نئی فرم لانچ کرنا جس کے لیے وہ پچھلے تین سالوں سے جتن کر رہے تھے۔ ان تمام مسائل سے نپٹنے کے لیے انہیں بے تحاشا پیسے کی ضرورت تھی۔ انہی پرابلمز کی وجہ سے ڈپریشن اور انسومنیا کے مریض بن گئے تھے۔

☆☆☆

''پاپا مجھے اس سال ورلڈ ٹور پر لازی جانا ہے۔ آپ مجھے جانے دیں گے ناں...... آپ کو تو پتا ہے میرے بچپن کا خواب ہے۔'' مونا نے پیار سے لپٹتے ہوئے ان سے کہا تھا ان کے ذہن میں بیٹی کی معصوم خواہش ابھری۔

''پاپا آپ نے مجھ سے اسپورٹس کار دلانے کا وعدہ کیا تھا میں نے آپ کا پوزیشن لانے کا خواب پورا کیا اوراب آپ میرا ارمان پورا کریں۔ مجھے میرا انعام اسی مہینے چاہیے۔'' علی نے پُرجوش ہوتے ہوئے انہی کا وعدہ یاد دلایا تھا۔ ان کی نظروں کے سامنے اپنے بچوں کے ہنستے مسکراتے ڈیمانڈز کرتے چہرے گھوم رہے تھے۔ آفندی صاحب نے آنکھیں کھول دیں وہ اپنی سوچوں میں غلطاں تھے جب ان کے موبائل پر میسج آیا۔ وہ میسج بینک کی طرف سے تھا۔

''ایک اور نئی مصیبت!'' میسج پڑھتے ہی ان کے منہ سے نکلا تھا۔ ان کے کریڈٹ کارڈ پر اچھی خاصی رقم کی شاپنگ کی گئی تھی اور وہ جانتے تھے ان کا کارڈ استعمال کرنے کی جرأت کون کرسکتا ہے۔ وہ نمبر ملانے ہی والے تھے جب ان سے پہلے ان کی بیگم کی کال آگئی۔

''ہیلو ہنی......'' شرمین نے کھلکھلاتے ہوئے کہا تھا۔

''ہیلو!'' جواباً انہوں نے مدھم لہجے میں کہا تھا۔

''کیا ہوا...... آپ ٹھیک تو ہیں ناں......'' شرمین کو فکر ہوئی تھی اپنے لونگ ہسبینڈ کی۔

''ٹھیک ہوں تم کیسی ہو؟'' وہ بس اتنا ہی بول سکے تھے۔

''بہت خوش......'' ساتھ ہی وہ مسکرائی تھی۔

''آپ کے ہوتے ہوئے میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''کچھ کر رہی ہو؟'' آفندی صاحب اصل موضوع پر آنا چاہتے تھے۔

''ہاں، اپنی فرینڈ کی میرج اینی ورسری کے لیے گفٹ لینے نکلی تھی۔ میری بہت ہی خاص فرینڈ ہے...... ہاں آپ کا کارڈ ہی استعمال کیا ہے یہی بتانے کو فون کیا ہے، آپ کے اکاؤنٹ میں اب تھوڑی ہی رقم ہے۔'' آفندی نے گہری سانس لی، سات لاکھ کی رقم اسے تھوڑی رقم لگ رہی تھی۔ جو بات انہیں گلے میں پھنسی ہڈی محسوس ہو رہی تھی ان کی لاڈلی بیگم نے اسے چٹکیوں میں اڑا دیا تھا۔

''ویسے انوائٹ تو انہوں نے ہم دونوں کو کیا تھا لیکن آپ کے پاس تو ٹائم ہی نہیں ہوتا میرے لیے...... نہ گھر میں بیٹھ کر آرام سے چند باتیں کرنے کا نہ کسی جگہ باہر جا کر فرصت سے انجوائے کرنے کا...... مجھے اکیلے ہی ہر جگہ خوار ہونا پڑتا ہے۔'' اسی نے الٹا شکوہ کر کے فون رکھ دیا تھا۔ آفندی صاحب بس اپنے موبائل کو دیکھتے رہ گئے۔ جہاں سے کچھ دیر پہلے ان کی عزیز از جان بیگم کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

گاڑی اب موٹروے کی سڑکوں پر فراٹے بھر رہی تھی انہیں سفر کرتے ہوئے تقریباً ڈھائی گھنٹے ہوگئے تھے۔ جب گاڑی کے ٹائر چرچرائے تھے اور پھر اس نے مزید حرکت سے انکار کر دیا تھا۔

''اب کیا ہوگیا ہے؟'' انہوں نے بیزاری سے ڈرائیور سے دریافت کیا تھا۔

''سر معلوم نہیں شاید گاڑی میں کچھ مسئلہ ہوگیا ہے۔ میں ابھی دیکھتا ہوں۔'' اس نے بونٹ کھول کر

لیور کھینچا اور نیچے اتر کر انجن چیک کرنے لگا۔ ایک ٹائر کی ہوا بھی کم ہو گئی تھی۔ ڈرائیور نے آفندی صاحب کو ایک اور منحوس خبر سنا کر ان کی ٹینشن میں مزید اضافہ کیا تھا اور شاید ویسے بھی بیٹری یا انجن میں کہیں کوئی ٹیکنیکل پرابلم آگیا تھا۔

''میں قریب ہی کوئی ورک شاپ ڈھونڈتا ہوں۔'' اس نے ان کی طرف کی کھڑکی کے پاس آکر کہا۔ تھوڑے فاصلے پر آبادی کے آثار تھے۔

درد اور بے چینی کے آثار اس کے چہرے پر بسیرا کیے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں دنیا جہاں کا کرب سمٹا تھا۔ وہ چل کر اپنی چھپر نما دکان سے باہر آیا اور اضطراب کے عالم میں نگاہیں اِدھر اُدھر دوڑائیں۔ مگر نظریں مایوس ہو کر واپس پلٹ آئیں پھر اس نے نگاہ اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا...... اور شاید کسی سے کوئی فریاد کرنے لگا تھا...... اس کی آنکھوں کی سطح نم ہو گئی مگر اس کی امید میں ذرا آنچ آئی تھی نہ رتی بھر کمی...... کچھ دیر وہ یونہی کھڑا رہا اور پھر نگاہیں جھکا لیں اس کی تکلیف میں افاقہ ہوا تھا۔ شاید اوپر سے کسی نے اسے تسلی دی تھی یا ڈھارس بندھائی تھی۔ وہ واپس اپنی جھونپڑی کی طرف لوٹنے لگا تھا۔ جب اسے دور سے کوئی بھاگتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اسی طرف آرہا تھا اور اسے ہاتھ کا اشارہ بھی کر دیا تھا۔ اس شخص کی آنکھیں چمک اٹھیں...... یہ صبح سے لے کر سہ پہر تک اس کا پہلا گاہک تھا۔

☆☆☆

آفندی صاحب سے گاڑی میں بیٹھنا محال ہو رہا تھا۔ گاڑی بند ہو جانے کی وجہ سے اے سی نے مزید خنکی پھیلانا بند کر دیا تھا اور گاڑی کے اندر حبس بڑھ گیا تھا۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کا شیشہ کھول دیا جب اچانک گرم ہوا کا جھونکا اندر داخل ہوا اور ان کے منہ سے ٹکرایا آفندی صاحب کو وہ ہوا جہنم کی آگ سے بھی زیادہ پُرتپش محسوس ہوئی تھی۔ انہوں نے سرعت سے منہ موڑا تھا۔

''واٹ دا ہیل از دس......'' وہ دوبارہ شیشہ بند کرنے والے تھے۔ جب ڈرائیور بھاگتا ہوا ان کے پاس آیا۔

''سر مجھے پاس ہی ایک ورک شاپ مل گئی ہے۔ گھبرائیں نہیں، گاڑی جلدی ٹھیک ہو جائے گی۔'' وہ پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بتا رہا تھا۔ ''بس ہم ابھی گاڑی دھکیل کر وہاں تک لے کر جائیں گے اور......''

''کیا بکواس ہے یہ......'' آفندی صاحب نے درمیان میں ہی اسے ٹوک دیا تھا۔ ''تمہارا مطلب ہے میں گاڑی کو دھکا لگاؤں گا۔'' انہوں نے بے یقینی سے پوچھا تھا۔

''نو سر میں اور وہ شخص دھکا لگا کر گاڑی کو وہاں تک لے جائیں گے آپ بس...... پیدل چل کر ہمارے ساتھ آئیں۔'' ڈرائیور نے تھوک نگلتے ہوئے انہیں آگاہ کیا تھا۔ جواباً آفندی صاحب نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔ ایک معمولی شخص کی بے وقعت جھونپڑی تک شیراز آفندی کا چل کر جانا ان کی شان کے خلاف تھا مگر اس وقت مجبوری تھی۔ موٹر وے کی ہیلپ سروس آج ناپید تھی۔

☆☆☆

وہ بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ ان کے سامنے مکینک کے ہاتھ تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ ٹائر میں ہوا بھرنے کے بعد وہ اب انجن اور اس کی تاروں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھا۔ شاید کسی وائر کا انجن سے رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے اسپارک انجن تک نہیں پہنچ رہا تھا اور انجن نے اسٹارٹ بند کر دیا تھا۔ وہ شخص غیر معمولی انداز میں آفندی صاحب کو اپنی طرف اٹریکٹ کر رہا تھا۔ اس کے فن میں اس کی مہارت کمال کی تھی۔ وہ اسی قدر آرام اور مستعدی سے اپنا کام انجام دے رہا تھا گویا یہ سب اس

کے لیے کوئی کھیل ہو۔ آفندی صاحب اسے بغور تکنے میں مصروف تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو انہیں اس جگہ سے متلی محسوس ہورہی تھی، وہ ایک چھوٹا سا دڑبا نما ایک کمرا تھا جسے اس شخص نے اس ویرانے میں اپنی ورکشاپ بنایا ہوا تھا۔ گارے اور اینٹوں کو ملا کر دیواریں تعمیر کی گئی تھیں اور اس کے اوپر بانس اور گھاس پھونس کا چھپر ڈالا گیا تھا۔ کمرے کے ایک کونے پر ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائی بچھی تھی۔ جس پر کسی قسم کا کپڑا یا دری نہیں بچھائی گئی تھی۔ بس پائنتی پر ایک کھیس رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک بوسیدہ میز پر ایک واٹر کولر اور اس کے اوپر ایک اسٹیل کا گلاس الٹا کر کے رکھا ہوا تھا۔ جس کے کناروں پر زنگ لگا ہوا تھا اور کولر کے ساتھ ہی ایک ٹرے میں کھانا کے برتن لپیٹے ہوئے اور دوسرے کونے پر اس کا مرمت کا سامان تھا۔ آفندی نے نخوت سے سر جھٹکا تھا اس شخص نے انہیں بیٹھنے کے لیے اشارہ کیا تھا مگر جواباً انہوں نے گھور کر دیکھا تھا۔ اور اب...... وہ مبہوت ہو کر اس شخص کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں لگتا تھا ایک ڈور نے انہیں اس شخص کے وجود کے ساتھ باندھا ہوا ہے اور وہ شخص اس ڈور کے ذریعے انہیں اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ اس کا بارونق، تروتازہ چہرہ اور اس پر سجی ہوئی داڑھی، چہرے کی معصومیت اور ہاتھ کی پھرتی، کام میں مہارت، عمدگی اور دلجمعی اس کی شخصیت کو ایک انوکھا وقار بخش رہی تھی۔ وہ ہنوز اس کی طرف متوجہ تھے۔ کچھ دیر پہلے والی بے کلی... فی الوقت کہیں منہ چھپا کر بیٹھ گئی تھی۔

☆☆☆

نہ جانے وہ شخص کب ان کی آنکھوں کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ اور پُرامید لہجے میں بولا تھا۔

''کام ہوگیا صاحب......'' آفندی صاحب چونکے تھے وہ ان کے سامنے کھڑا چہرے پر ہلکی سی آس لیے ہوئے تھا۔ وہ کپڑے کے ساتھ اپنے ہاتھ مل رہا تھا۔ شاید وہ ان سے اجرت کا تقاضا کر رہا تھا۔ اس کے پیچھے ان کا ڈرائیور گاڑی کو تسلی سے چیک کر رہا تھا اور پھر جھٹکے سے اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تھی۔

''گاڑی ٹھیک ہوگئی صاحب......'' اس شخص نے انہیں یقین دہانی کرائی تھی۔ آفندی صاحب نے ایک خواب کی سی کیفیت میں اپنی جیب میں ہاتھ ڈالے تھے اور چند نوٹ اس کی جانب بڑھائے تھے۔ اس شخص نے حیرت سے ان نوٹوں کی جانب دیکھا وہ رقم اس کی محنت سے زیادہ تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر صرف ایک پانچ سو کا نوٹ پکڑا تھا۔

''میری محنت بس اتنی ہی تھی، مجھے اس سے زیادہ نہیں چاہیے۔'' آفندی صاحب کو حد درجہ حیرت ہوئی تھی۔ انہوں نے آج تک اپنی ایک پائی بھی کسی پر فضول خرچ نہیں کی تھی۔ اس شخص کو انہوں نے اجرت سے زیادہ رقم دی تھی اور وہ اس سے انکار کر رہا تھا۔

''میرے لیے اتنی رقم کافی ہے، اتنے میں میرے بچوں کی آج کی روٹی پوری ہو جائے گی۔ آج رات میرے بچے بھوکے نہیں سوئیں گے۔ آج گھر میں امن ہوگا۔ ہاں میرے بچے بھوکے نہیں سوئیں گے۔'' وہ شخص دیوانہ وار کہتے ہوئے اپنی دکان کی جانب بڑھ رہا تھا۔

''سنو......'' آفندی صاحب اسے پکار اٹھے تھے۔ یہ ''بس آج کی روٹی کے پیسے ہیں، تم کل کیا کرو گے؟'' وہ شخص ان کی پکار سن کر رکا تھا۔

''کل......کل کا اللہ مالک ہے......'' کہہ کر وہ شخص اپنی جھونپڑی کی جانب بڑھ گیا۔ آفندی صاحب کے قدم وہیں رک گئے۔

''کل کا اللہ مالک ہے......'' ان کے اندر سکون ...کی ایک لہر اٹھی تھی۔ بلیک مرسڈیز سڑک پر رواں تھی۔ ''کل کا اللہ مالک ہے'' شیراز آفندی جیسے، جیسے یہ بات سوچ رہے تھے ویسے، ویسے ان کے دل میں اطمینان بھرتا جارہا تھا۔ یہ جگہ ان کی پسندیدہ ترین جگہ بن گئی تھی۔

دل کے دروازے

کائنات غزل



''بکواس بند کرو اپنی ورنہ میرا ہاتھ اٹھ جائے گا۔''

''نہیں کروں گی...... بالکل نہیں کروں گی میرے باپ کے پیسے پر نظر رکھتے ہو اور میں بولوں بھی نہ......''

دھاڑ دروازہ زور سے بند ہوا تھا۔ رات تقریباً ڈیڑھ بجے اپنی چابی سے دروازے کا لاک کھول کر اندر داخل ہوتے ہی وہاں پڑے ٹوٹے گلدان کو جوتے کی نوک سے کونے میں کر کے وہ آگے بڑھا۔

صوفے پر آصفہ ماتھے پر پٹی باندھے آڑی ترچھی سو رہی تھی۔ نیچے کارپٹ پر دونوں بچے گندے سندے حلیے میں سو رہے تھے۔ کارپٹ پر برگر کی تھیلی اور برگر میں سے نکلا ہوا کباب، انڈا گرا ہوا تھا۔

وہ سیدھا کچن میں گیا جا کر ایک گلاس پانی پیا اور فریج میں جھانکا۔ جو خالی پڑا تھا صرف ایک بریانی سے بھری پلیٹ رکھی تھی۔ یقیناً پڑوس سے آئی تھی۔ اس نے وہیں اسٹول پر بیٹھ کر ٹھنڈی بریانی کھائی اور پانی پی کر اٹھ کھڑا ہوا۔ چائے کی طلب تھی لیکن کچن کی حالت دیکھ کر طلب وہیں دبائی۔ دونوں بچوں کی فیڈر بنائی۔ ایک، ایک کر کے دونوں کو بیڈ پر لا کر لٹا آیا۔ آصفہ پر نظر گئی تو دل تاسف سے بھر گیا۔

دونوں ہاتھ سینے پر باندھے وہ اسے دیکھے گیا۔ ماتھے پر گومڑ سا محسوس ہو رہا تھا سفید پٹی پر سرخ خون .... جو سوکھ کر براؤن ہو چکا تھا۔ چہرے پر بکھرے بالوں کی لٹیں......آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے، ملگجے سے حلیے میں بھی وہ اپنی، اپنی لگی۔ وہ آہستگی سے گھٹنوں کے بل بیٹھا چہرے سے بال ہٹائے۔ آصفہ ذرا سا کسمسائی، نظر پھر چوٹ پر گئی تو صبح والا واقعہ یاد آیا......خون کھولنے لگا تیزی سے اٹھا اور بیڈ روم میں چلا گیا۔

☆☆☆

آصفہ کی آنکھ صبح دیر سے کھلی۔ دونوں بچے کارپٹ سے غائب تھے۔ بیڈ روم میں آئی، چھوٹا مغیث جھولے میں فیڈر لیے سو رہا تھا جبکہ یاور اور معیز کے کپڑے بیڈ پر پڑے تھے یعنی یاور، معیز کو اسکول لے کر چلا گیا تھا۔ ایک دم سر چکرایا تو اسے یاد آیا کہ کل سے بھوکی ہے اور اس کے ساتھ ہی کل کا منظر پوری جزئیات کے ساتھ یاد آنے لگا۔

کل جب یاور نے معیز کو اسکول چھوڑ کر آنے کے بعد اس سے پیٹرول کے پیسے مانگے تھے۔ اس نے یاور کو کتنی باتیں سنائی تھیں پھر کیا ہوا تھا۔ اچانک سر میں اٹھتی ٹیس نے یاد دلایا۔ یاور نے چابی کا گچھا کھینچ مارا تھا۔ پہلے تو وہ سن بیٹھی رہ گئی۔ آنکھیں خشک ہو گئی تھیں۔ جب آنکھ سے کچھ اوپر ایک گیلی لائن محسوس ہوئی ہاتھ لگایا تو انگلیاں سرخ ہو کر واپس آئیں۔

دروازے کی دہاڑ سے آصفہ حواس کھو بیٹھی پوری قوت سے ساتھ رکھی ٹیبل پر رکھا گلدان کھینچ مارا تھا اور پھوٹ، پھوٹ کر رودی۔ نہ جانے وہ کتنی دیر روتی رہی بھوک نے ستایا تو اٹھ کر فریج میں دیکھا کل کا آملیٹ تھا۔ ایک تھیلی میں روٹی کا ٹکڑا تھا۔ فریج بند کر کے واپس آئی مغیث کو فیڈ کروایا چکر آنے لگے۔ سر درد سے پھٹنے لگا۔ زخم پر پٹی باندھی۔ خالی پیٹ ہی پین کلر لی۔ معیز کی چھٹی کا وقت ہونے والا تھا۔ مغیث کو پڑوس میں چھوڑ کر عبایا پہنا معیز کو اسکول سے لا کر چینج کروایا وہی کل والا آملیٹ گرم کر کے روٹی اور دودھ کے ساتھ رکھ دیا۔

کارپٹ پر معیز کے ساتھ ہی بیٹھ کر صوفے پر سر ٹکا لیا۔ آنکھیں موندتے ہی کئی آنسو پلکوں کی باڑھ پھلانگ گئے۔

''مما، مما......'' آصفہ نے آنکھیں کھولیں۔

''مما آپ کیوں رو رہی ہیں؟ میں ٹرے کچن میں رکھ کر آ گیا۔ آپ کے سر میں درد ہے سر دبا دوں۔''

''نہیں میری جان۔'' آصفہ، معیز کے ننھے، ننھے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چومنے لگی۔ معیز کو سینے میں بھینچ کر وہ پھر رونے لگی۔

''مما۔''

''جی، بیٹے۔''

''مما آپ کا موبائل بج رہا ہے۔'' آصفہ کی نظر گھڑی پر گئی کتنی دیر ہو گئی تھی ایک ہی طرح بیٹھے، بیٹھے جسم اکڑ گیا تھا۔ اسے پتا بھی نہ چلا معیز کب اٹھ کر پاس سے چلا گیا تھا۔ موبائل بج، بج کر بند ہو گیا تھا۔ مغیث کو دودھ پلا کر پڑوس کے بچے کو پیسے دے کر برگر منگوایا۔ برابر کی مسز جمیل نے برگر کے ساتھ بریانی بھی بھیج دی تھی۔ معیز نے آدھا برگر کھایا اور وہیں سو گیا۔ مغیث وہیں پڑی بال سے کھیلنے لگا موبائل ایک بار پھر بجا۔ آصفہ موبائل لے کر صوفے پر آ کے لیٹ گئی۔

''ہیلو السلام علیکم!''

''پہچانا؟''

''آپ بتا دیں۔'' انتہائی تھکی ہوئی آواز میں آصفہ نے کہا۔

''میں مومنہ ہوں آصفہ۔ تم ٹھیک ہو سو تو نہیں رہی تھیں؟''

''نہیں بس یونہی سر میں درد تھا۔ تم سناؤ کیسی ہو کب آ رہی ہو پیرس سے؟''

''لگتا ہے آصفہ تمہاری طبیعت واقعی ٹھیک نہیں ہے...... میں نے تمہیں کراچی کے نمبر سے کال کی ہے تم نے دیکھا ہی نہیں۔''

''نہیں یار بتایا ناں سر میں درد ہے۔ تم کراچی کے نمبر سے کیسے کال کر رہی ہو؟''

''ارے بابا کراچی میں ہوں جبھی تو کراچی کے نمبر سے کال کر رہی ہوں۔''

''تم......تم کب آئیں کراچی؟ مجھ سے ملنے نہیں آئیں اور کال بھی نہیں کی۔'' آصفہ کا دل بھر آیا۔

''آصفہ میری جان، تم رو کیوں رہی ہو آتے ہی اتنی مصروف ہو گئی۔ گھر کی سیٹنگ، جمال نے سارا بزنس وائنڈ اپ کیا پھر یہاں سیٹ کیا۔ سمیع کا ایڈمیشن بس سب کچھ میں اتنا ٹائم لگا لیکن یاد مجھے تم برابر تھیں۔ تم سناؤ بچے، یاور بھائی کیسے ہیں؟''

''ٹھیک ہیں سب۔'' آصفہ نے گہری سانس لی۔

''سنو مجھے کچھ بھی ٹھیک نہیں لگ رہا۔'' مومنہ کو کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ جو آصفہ بات کرنے سے پہلے مسکراتی تھی بات کرتے، کرتے بھی آواز اتنی کھنکھناتی تھی کہ سامنے بگڑے موڈ والا بھی مسکرا دیتا اور اس وقت......

''مومنہ تم کیا سننا چاہتی ہو میری بربادی کی داستان تو سنو۔'' آصفہ کا لہجہ چیخ گیا۔ مومنہ کا ہاتھ دل پر گیا۔

''خدا خیر کرے۔''

ٹونٹ ٹونٹ کی آواز پر آصفہ موبائل دور پھینک کر روتے، روتے سو گئی۔

''اوہ......!'' مومنہ کا سارا بیلنس ختم ہو چکا تھا۔ آتے ہی اچھا خاصا لوڈ کروایا تھا لیکن سسرال میں اِدھر اُدھر کال کر کے سب ختم۔ ''آصفہ پتا نہیں کیا سوچے گی۔'' مومنہ کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا۔ جلدی، جلدی سارا کام نمٹا کر کل ہی آصفہ کے گھر جانے کا پروگرام ترتیب دینے لگی۔

☆☆☆

بیل کی آواز نے آصفہ کو سوچوں کے گرداب سے نکالا۔ بہ مشکل اٹھی آہستہ، آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے دروازے تک آئی۔ سامنے مومنہ کھڑی تھی۔ مومنہ کو دیکھتے ہی پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور گلے لگ کر رونے لگی۔

''آصفہ، آصفہ کیا ہو گیا ہے یار اندر تو آنے دو۔'' آصفہ نے دوپٹے سے منہ پونچھا مومنہ اسے صوفے پر بٹھا کر کچن سے پانی لا کر پلانے لگی۔

''اب بولو کیا بات ہو گئی؟'' اندر آنے کے بعد وہ بولی۔ گھر کا حال تو ایک نظر میں ہی دیکھ لیا تھا۔

''ہو گئی نہیں ہو چکی، میں برباد ہو چکی۔'' آصفہ اتنا کہہ کر ہچکیوں سے رونے لگی۔

''آصفہ کچھ بتاؤ تو......'' مومنہ نے انتہائی افسوس سے اپنی بچپن کی دوست کو دیکھا۔

''یاور کا کہیں چکر چل رہا ہے، سارا پیسہ اسی پر لٹا رہا ہے۔ گھر میں خرچ دینا کم کر دیا ہے اور تو اور پاپا جو پاکٹ منی مجھے دیتے ہیں، اس میں سے بھی مجھ سے پیسے مانگتا ہے۔ اگر نہیں دوں تو مارنے بھی لگا ہے۔ یہ دیکھو کل اس نے چابی کا گچھا کھینچ مارا تھا۔'' مومنہ کو پہلے تو گھر کا حشر اور اب آصفہ کی بات سن کر سکتہ ہو گیا تھا۔ اسے یقین نہیں آیا کہ یاور ایسا کر سکتا ہے؟

مغیث کے رونے کی آواز پر آصفہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔۔۔ مومنہ گہری سانس لیتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔

کچن میں جا کر کچھ چیزیں ٹھکانے لگائیں۔ گھر سے لایا ہوا کھانا ہاٹ پاٹ میں سے نکالا۔ ٹرے لے کر بیڈروم میں چلی آئی۔

''آؤ آصفہ کچھ کھالو۔'' مومنہ بیڈ پر ہی بیٹھ گئی۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' آصفہ نے مغیث کو تھپکتے ہوئے جواب دیا۔

''آصفہ میں نے ناشتا بھی ٹھیک سے نہیں کیا جبھی جلدی پہنچی ہوں، پلیز جلدی آجاؤ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔'' آصفہ کو مجبوراً آنا پڑا۔ کھانا کھا کر کچھ کمزوری کم ہوئی اور حواس بھی بحال ہوئے۔

''آصفہ تمہاری کام والی ملازمہ کتنے بجے آتی ہے؟''

''نہیں آتی، وہ بھی نہیں آتی اب...... گاڑی بھی بیچ دی......'' مومنہ کو ایک بار پھر آصفہ کو چپ کروانا مشکل ہوگیا۔

''اچھا ٹھیک ہے یار، ہم مل کر اس مسئلے کا کچھ حل نکالتے ہیں۔ تم ابھی نہا کر فریش ہو جاؤ دو بجے بچوں کی چھٹی ہو جاتی ہے پھر مجھے تو جانا ہوگا۔ پلیز جلدی کرو۔'' مومنہ کھانے کے برتن سمیٹتے ہوئے بولی۔ آصفہ کو ناچار اٹھنا پڑا۔ مومنہ نے کمرے پر ایک نظر ڈالی اور جتنا ممکن تھا کر اسمیٹا پھر ایک خیال کے تحت برابر والے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور کچھ ہی دیر میں مسز جمیل کی ملازمہ کے ساتھ پورا گھر چمکا دیا۔

آصفہ بیٹھی خلاؤں میں تکتی رہی۔ اسے یاد آیا کے معیز کی چھٹی کا بھی ٹائم ہوگیا۔ کل اقبال ڈے ہونا تھا اور پھر ویک اینڈ آصفہ نے جلدی سے بیگ میں بچوں اور اپنے چند جوڑے ڈالے اور مومنہ سے کہا۔

''پلیز تم مجھے امی کی طرف ڈراپ کر دینا۔'' مومنہ حیران نظروں سے اسے دیکھے گئی۔

''تم کیا کر رہی ہو یہ......؟'' مومنہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

''کچھ نہیں کر رہی ہوں یار اور جو تم سمجھ رہی ہو وہ تو بالکل نہیں۔ تمہیں معلوم ہے ناں میری ماما کہتی ہیں مہینوں آ کر رہو لیکن شوہر سے لڑ کر آؤ گی تو ایک گھنٹا بھی نہیں رکنے دوں گی......'' آصفہ نے بیزاری سے کہتے ہوئے عبایا پہن کر مغیث کو گود میں اٹھایا اور گھر لاک کر کے مومنہ کے ساتھ گاڑی میں آبیٹھی۔ معیز کو لے کر وہ ماما کے ہاں اتر گئی۔

''ارے میرے بچے آگئے۔'' ماما لان میں پودوں کو پانی دیتی ہوئی مل گئیں۔ پائپ چھوڑ کر آصفہ کو گلے لگایا۔ باری، باری دونوں کو پیار کیا۔ مغیث کو گود میں لیتے ہوئے اندر کی طرف بڑھیں۔ ساتھ ہی ملازمہ کو آواز لگا کر نل بند کرنے کا کہا۔

''مالی بابا کہاں ہیں؟'' آصفہ نے بیگ رکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''بیمار ہیں بیچارے اور تم سناؤ یاور بیٹے نے چھوڑا ہے؟'' ماما ملازمہ کا لایا ہوا اسکواش گلاس میں نکالتے ہوئے بولیں۔

''نہیں ماما، مومنہ پیرس سے آگئی ہے، گھر آئی ہوئی تھی وہی ڈراپ کر کے گئی ہے۔ اسے اپنے بچوں کو لینا تھا اسی لیے اندر نہیں آئی اور یہ اسلام آباد گئے ہوئے ہیں کام کے سلسلے میں۔'' آصفہ نے تفصیلاً جواب دینے کے ساتھ آخر میں بہانہ گھڑا کہ ماما کی زیرک نگاہوں سے بچنا آسان نہیں تھا۔

''یہ تمہارے ماتھے پر گومڑ کیسا ہے؟'' ماما کو پریشانی لاحق ہوئی۔

''اُف یہ مائیں بھی ناں۔''

''ایسے ہی بس کچن میں چکر آگیا تھا کیبنٹ سے سر ٹکرا گیا۔'' آصفہ نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

''بیٹا خیال رکھا کرو اپنی صحت کا، رنگت بھی دیکھو کیسی زرد ہو رہی ہے۔ لگ ہی نہیں رہیں وہی گلابی، گلابی سی آصفہ۔ صدیوں کی بیمار دکھ رہی ہو۔''

''مما بھوک لگ رہی ہے۔'' معیز کی آواز پر ماما چونک کر اٹھیں۔

''ارے، میں اپنے بابا کو ابھی اچھا سا کھانا کھلاتی ہوں۔'' ماما کی توجہ اپنے سے ہٹ کر معیز کی طرف لگنے پر تشکر بھری سانس لی۔

☆☆☆

بستر پر لیٹتے ہی مومنہ کو پھر سے آصفہ کی پریشانی نے آگھیرا۔

''جمال!''

''ہوں۔''

''اِدھر میری بات تو سنیں۔'' مومنہ نے جمال کا بازو ہلایا۔

''ہاں بولو۔'' جمال نے کروٹ بدلی۔

''جمال میں آج آصفہ کے گھر گئی تھی۔''

''اچھا، کیسی ہے وہ؟''

''جمال، یاور کا کسی لڑکی سے چکر چل رہا ہے اور......'' آہستہ آہستہ وہ تمام احوال جمال کے گوش گزار کرنے لگی۔

''اوہ تو یہ بات ہے۔'' جمال پریشانی سے اٹھ بیٹھا۔ ''پھر بھی تم آصفہ کو سمجھاؤ اس سے کہو کہ ہم اس کے ساتھ ہیں۔ میں بھی یاور سے بات کروں گا۔'' جمال دوبارہ لیٹ گیا۔

☆☆☆

کل آصفہ نیازی کی برتھ ڈے تھی کالج میں سب فرینڈز اس کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھی تھیں۔

''ہم نے سر زوہیب سے بات کر لی ہے۔ انہوں نے پرمیشن بھی دے دی۔ آصفہ اب تو وعدہ کرو کل اچھا سا ڈریس اپ ہو کر آؤ گی۔''

''اور عبایا بھی اتارو گی۔'' ندا کی بات میں سمیرا نے ٹکڑا لگایا۔

''ہاں بابا لیکن پردے کا خیال بھی تم لوگوں نے رکھنا ہے۔'' آصفہ نے ہامی بھری۔

''او کے باس۔'' ارومہ نے سر جھکا کر اسٹائل سے کہا سب ہنسنے لگیں۔ ان کا گروپ پورے کالج میں مشہور تھا۔ تمام استاد انہیں پسند کرتے تھے کیونکہ یہ لوگ پڑھائی میں بھی بہت اچھی تھیں۔ ان کی اچھی ریپوٹیشن کی وجہ سے سر زوہیب جو ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ تھے انہوں نے بھی اجازت دے دی تھی کہ پچھلی خالی کلاسوں میں سے اِک کلاس انہیں چند گھنٹے کے لیے دے دی جائے گی۔ جہاں یہ لوگ آصفہ کی برتھ ڈے کھل کر انجوائے کر سکیں چونکہ آصفہ کالج میں بھی نقاب نہیں اتارتی تھی آج الگ کلاس کی وجہ سے آصفہ نے عبایا بھی اتارا اور خوب تیار بھی ہوئی۔

آصفہ ہاتھ میں کولڈ ڈرنک لیے سر کو دائیں، بائیں ہلا کر مومنہ سے مسکرا کر بات کر رہی تھی کہ کلاس کے آگے سے گزرتے ہوئے یاور زمان کی نظر آصفہ پر پڑی جو پلٹ نہ سکی۔ سرخ رنگ کا خوب صورت اسکارف لیے سرخ ہی اے لائن فراک، چوڑی دار پائجامہ اور چہرے پر بلا کی معصومیت۔ بات کرتے ہوئے بائیں گال میں پڑتا ڈمپل۔ لائٹ سے میک اپ میں وہ ادھ کھلا گلاب لگ رہی تھی۔

آصفہ کو اپنے چہرے پر کسی کی نظر کا ارتکاز محسوس ہوا تو ہیزل براؤن آنکھوں میں ناگواری سی آگئی۔ اپنی ہی کلاس کا یاور زمان چاروں طرف سے بے نیاز ہو کر اسے دیکھے جا رہا تھا۔ آصفہ نے رخ موڑ لیا۔ پیچھے اس کے سنہرے بال آبشار کے مانند محسوس ہو رہے تھے۔ یاور کے کندھے پر جمال نے ہاتھ رکھا تو وہ گہری سانس لیتے ہوئے پلٹ گیا۔

پھر آہستہ، آہستہ یاور نے آصفہ کے دل میں جگہ بنا ہی لی اب وہ جب بھی اسے دیکھتا تو آصفہ نیازی بھی بس نیچے دیکھ کر مسکرا دیتی۔ کبھی آصفہ کی نظریں یاور کو دیکھ کر لو دینے لگتیں تو کبھی اسے نہ پا کر بے چین سی ہو جاتیں۔ بس انہی نظروں کا رابطہ تھا آپس میں۔ اس سے زیادہ نہ کبھی یاور نے آگے بڑھنے کی کوشش کی اور نہ آصفہ نے۔ فائنل ایئر ختم ہوتے ہی جمال نے مومنہ کے لیے اور یاور نے

آصفہ کے لیے رشتہ بھیجا۔ عبدالجبار نیازی آصفہ کے والد اپنے نام کی طرح ایک شخصیت رکھتے تھے حتیٰ کہ یاور زمان جو جدی پشتی رئیس اور کئی ایکڑ زمین کا وارث تھا وہ بھی کنفیوز ہوگیا۔ عبدالجبار نیازی صاحب نے یاور زمان کے بارے میں اچھی طرح تحقیق کروائی۔ یاور کے باپ کے انتقال کے بعد اس کے چچازاد بھائیوں نے ان کے کاروبار اور گھر پر قبضہ کر کے اسے بے دخل کر دیا۔ یاور نے اپنا حصہ مانگا تو تھوڑا بہت دے کر اسے ڈرا دھمکا دیا۔ یاور نے اس پیسے سے ایک چھوٹا سا فلیٹ خریدا اور باقی سے اپنا بزنس اسٹارٹ کیا اس کی محنت رنگ لائی تھی۔ آصفہ شادی ہو کر اسی فلیٹ میں آگئی تھی۔ یاور، آصفہ کو دیوانوں کی طرح چاہتا تھا تو وہ بھی یاور پر فدا تھی پھر ان کی خوشیوں اور مسرتوں کو بڑھانے کے لیے معیز چلا آیا۔ ان کی زندگی بہت خوشگوار گزر رہی تھی پھر نہ جانے کس کی نظر لگ گئی۔

☆☆☆

''یاور جو پوچھوں گا سچ، سچ بتاؤ گے؟'' جمال دوسرے دن یاور کے آفس میں موجود تھا۔ حال احوال پوچھنے کے بعد جمال اصل مدعا پر آیا۔ ''ایسا کیا ہوا ہے یاور جو تم دونوں بکھر گئے ہو؟''

''کچھ نہیں یار، وہ عورت نفسیاتی ہوگئی ہے۔'' یاور نے بیزاری سے جواب دیا۔

''نہیں، وہ اتنی بڑی بات ایسے نہیں کہہ سکتی جو تمہیں دیوانوں کی طرح چاہتی تھی۔ آج خود دیوانی بنی بیٹھی ہے۔'' جمال نے دکھی لہجے میں کہا۔

''تم نہیں سمجھتے ہو۔ صبح، صبح اٹھ کر چیخنے لگ جاتی ہے گھر میں توڑ پھوڑ کرتی رہتی ہے۔ خرچ دو مہینے کا ختم دس دن میں کر دیتی ہے۔ بیزار آگیا ہوں گھر جاؤ تو اتنا پھیلاوا کہ گھر میں قدم رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔'' یاور کہتا جا رہا تھا اور جمال اسے کھوجتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''لیکن وہ تو کچھ اور ہی کہہ رہی تھی۔''

''کیا...... کیا کہہ رہی تھی؟''

''پہلے تم بتاؤ، سچ بتاؤ گے ناں؟'' جمال اب اس سے وعدہ لے رہا تھا۔ یاور نے گہری سانس لیتے ہوئے ہاں میں گردن ہلائی۔

''آصفہ نے سومنہ کو بتایا ہے کہ تمہارا کوئی چکر وغیرہ چل رہا ہے اور تم سارا پیسہ اسی پر لٹا رہے ہو اور اس کے والد جو پاکٹ منی دیتے ہیں وہ بھی تم لے لیتے ہو اور اگر وہ نہ دے تو ہاتھ بھی اٹھاتے ہو؟'' جمال کہہ رہا تھا اور یاور شاکڈ رہ گیا۔ آصفہ کی سوچ اس حد تک چلی گئی ہے۔

''اُف۔'' یاور دونوں ہاتھوں میں سر گرا کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

''یاور آپ آج کل کچھ لیٹ آ رہے ہیں۔''

''ہاں...... بس۔''

''میں نے آپ کو کال کی تھی۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے مجھے ڈاکٹر کی طرف جانا ہے۔''

''بھول گیا تھا سوری۔ چلو اب سونے دو۔'' یاور کے لہجے میں بیزاری تھی۔

''تو سو جائیں۔'' آصفہ نے غصے میں کروٹ بدل لی۔ کتنی ہی دیر گزر گئی۔ آصفہ کو انتظار ہی رہا کہ یاور ابھی منائے گا لیکن کچھ دیر بعد ہی یاور کے خراٹوں کی آواز آنے لگی اور آصفہ کا تکیہ بھیگنے لگا۔

موسم میں آج کل حبس سا محسوس ہو رہا تھا۔ معیز کو لے کر وہ گھر سے نکلی تو دھوپ کی تیزی سے آنکھیں چندھیا گئیں۔ گائناکالوجسٹ کے ہاں پہنچتے ہی اندیشے کی تصدیق بھی ہوگئی۔

''مبارک ہو آپ امید سے ہیں لیکن آپ کا یہ بچہ تو ابھی بہت چھوٹا ہے اور آپ کمزور بھی بہت ہیں آپ کو احتیاط کرنی چاہیے تھی۔'' ڈاکٹر نے پیشہ ورانہ انداز میں کہہ کر میڈیسن لکھ دیں۔ وہ دھیرے، دھیرے مایوس کن انداز میں قدم اٹھاتی کلینک سے

نکل آئی اب باہر ہلکی، ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ اسے زوروں کی بھوک لگی تھی۔ وہ قریبی ریسٹورنٹ آگئی۔ برگر اور کولڈ ڈرنک کا آرڈر دے کر وہ نڈھال سی چیئر پر بیٹھ گئی۔ ویٹر برگر سرو کر کے گیا وہ چھوٹے، چھوٹے بائٹ لینے لگی۔ ساتھ، ساتھ اِدھر اُدھر بھی نظر دوڑا لیتی۔ ایک دم اسے لگا کہ برگر کا گولا سا اس کے حلق میں پھنس گیا۔ دور ٹیبل پر گولڈن شولڈر کٹ بالوں والی عورت کے ساتھ مسکراتا ہوا یاور۔ عورت کی پشت اس کی جانب تھی۔ آنسوؤں کو باہر آنے کا موقع مل گیا۔ برگر ادھورا چھوڑ کر بچے کو گود میں اٹھایا بل ادا کر کے وہ گھر لوٹ آئی۔

گھر آ کر بھی عجیب بے چینی میں گھری تھی۔ یاور آج بھی دیر سے آیا کسی بھی قسم کی بات کیے بنا کھانا کھایا اور سونے لیٹ گیا۔ آصفہ معمول کے مطابق چائے لے کر آئی تو وہ سو چکا تھا یا معلوم نہیں سوتا بن رہا تھا۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ آصفہ کی آنکھ ناگوار بُو سے کھلی۔ سامنے یاور راکنگ چیئر پر آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا اور ہاتھ میں جلتا ہوا سگریٹ تھا۔ آصفہ سگریٹ دیکھ کر دہل گئی۔ اٹھ کر یاور کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور آہستگی سے پکارا۔

''یاور کیا ہوا نیند نہیں آ رہی؟'' یاور نے انتہائی سرخ آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے آنکھیں کیوں لال ہو رہی ہیں؟''

''تم سوئی کیوں نہیں ہو، دماغ مت کھاؤ ہٹ جاؤ میرے سر پر سے۔'' یاور کی آواز کسی دہاڑ سے کم نہ تھی۔ آصفہ کا ہاتھ دل پر گیا اور وہ سسکتی چلتی گئی۔ وہ کرسی کو ٹھوکر لگا کر باہر چلا گیا اور آصفہ کی یہ رات بھی بھیگتی چلی گئی۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو باہر زوروں کی بارش ہو رہی تھی۔ کھڑکی بھی بند نہیں تھی۔ سارا جسم درد کر رہا تھا۔ کھڑکی بند کر کے وہ باہر آئی، وہ صوفے پر بیٹھا موزے پہن رہا تھا۔

کیا کروں؟

جو کر رہا ہے زمانہ مری سرشت نہیں
کسی کے خواب چرانا مری سرشت نہیں

کروں گی رقص میں شب بھر تمہاری یاد کے ساتھ
اکیلے ہجر منانا مری سرشت نہیں

مرے لیے جو دعاؤں کے پھول چنتا ہو
اسی پہ انگلی اٹھانا مری سرشت نہیں

میں گھر بلا کے اسے سونپ دوں گی اپنا آپ
پر اس کے دام میں آنا مری سرشت نہیں

کسی کے زخم پر مرہم بھلے نہ رکھ پاؤں
کسی کو زخم لگانا مری سرشت نہیں

میں جس کی یاد میں رو، رو کے صبح کرتی تھی
اسی کو دل سے بھلانا مری سرشت نہیں

از: سیدہ جیا عباس، مرالی تلہ گنگ

''ناشتا دے دو۔'' وہ مخاطب کیے بنا بولا۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟ باہر بارش ہو رہی ہے بہت تیز......'' آصفہ کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔

''میں نے تمہیں کہا ہے ناں میرے معمولات میں مت بولو۔ میں کہاں جاؤں، کہاں آؤں، کیسے موسم میں آؤں کیسے موسم میں جاؤں۔ ناشتا دینا ہے تو دو ورنہ رہنے دو۔'' اس کی آواز ہلکی لیکن لہجہ تلخی لیے ہوئے تھا۔ آصفہ آنسو پیتی کچن میں آگئی۔ چائے ابلتے ہی اسے ابکائی آئی واش روم بھاگی۔ باہر یاور کھڑا تھا۔

''طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو رہنے دو میں ناشتا باہر کر لوں گا۔''

''نہیں، میں لے کر آ رہی ہوں تیار ہے

ناشتا۔‘‘ وہ دوپٹے سے منہ تھپتھپاتی کچن میں آ گئی۔ یاور وہیں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ آصفہ نے اس کے آگے ناشتا لگایا اور معیز کی فیڈر بنا کر اندر چلی گئی۔

☆☆☆

’’یہ کیا؟‘‘ یاور نے جب مہینہ آنے پر خرچ دیا تو آصفہ نے سوال کیا۔

’’پیسے ہیں اور کیا؟‘‘

’’یاور اتنے کم پیسوں میں گزارہ کیسے ہوگا۔ دوائیں وغیرہ کتنے خرچے بڑھ چکے ہیں اور آپ……‘‘

’’دماغ مت خراب کرو، اپنے فالتو خرچے بند کرو، لوگ اس سے بھی کم میں گزارہ کرتے ہیں۔‘‘ یاور کے انداز پر آصفہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ یہی یاور، آصفہ کے لاکھ منع کرنے پر بھی کہتا تھا۔

’’لیے جاؤ کیے جاؤ شاپنگ جو پسند ہو خرید لو جیب کی فکر نہ کرو خالی ہو جائے گی تو کریڈٹ کارڈ موجود ہے ناں۔‘‘

ہر مہینے رقم کم ہوتی چلی گئی۔

’’یاور اتنے کم پیسے، میں ملازمہ کو کیسے دوں گی؟‘‘

’’ہٹاؤ ملازمہ، ساری دنیا خود کام کرتی ہے تم کوئی انوکھا بچہ پیدا نہیں کر رہیں۔‘‘ پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا ڈیلیوری کے وقت کمزوری کی وجہ سے ایسا مسئلہ ہوا کہ آپریشن کے بنا گزارہ نہ تھا۔ یاور نے گاڑی بیچ کر اسپتال کا بل ادا کیا۔ ہاتھ تنگ ہوتا چلا گیا۔ آصفہ گھر اور بچوں میں الجھ کر رہ گئی۔ عبدالجبار صاحب جو پہلے پاکٹ منی دیتے تھے وہ بینک میں جمع ہوتی تھی اب وہ بھی خرچ ہونے لگی۔ معیز کا ایڈمیشن بھی انہی پیسوں سے ہوا۔

’’خرچہ اب بھی وہ مجھے ہی دیتا ہے جو دس دن میں ختم ہو جاتا ہے۔ تو پاپا والے پیسے خرچ ہونے لگتے ہیں۔‘‘ مومنہ، آصفہ کے پاس بیٹھی تھی۔

’’اب تم بتاؤ میں کیا کروں؟ ماما کو خبر ہوگی تو ابھی گھر سے باہر کر دیں گی کہ کیوں لڑ کر آئی ہو۔‘‘

’’ابھی کیا کہہ کر گئی ہو؟‘‘ مومنہ نے استفسار کیا۔

’’یہی کہ یاور اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔‘‘ آصفہ نے سر کے پچھلے حصے کو دباتے ہوئے کہا۔

’’پھر تم نے کیا سوچا ہے یاور سے الگ ہونا چاہتی ہو؟‘‘

’’نہیں، نہیں۔‘‘ وہ یک دم گھبرا گئی اس نے تو ایسا کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

’’پھر……؟‘‘ مومنہ، آصفہ کے دل کا حال جانتی تھی۔ اب اسے جانچ رہی تھی۔

’’مومنہ، میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔‘‘ اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

’’سمجھ تو مجھے بھی کچھ نہیں آ رہا کہ تم دونوں کو ہوا کیا ہے۔ تم نمازِ حاجت پڑھ کر اللہ سے دعا مانگو۔‘‘ مومنہ نے مشورہ دیا۔

’’لیکن…… میں تو نماز ہی نہیں پڑھ رہی اب۔‘‘ آصفہ نے شرمندگی سے بتایا۔

’’یہ کیا کہہ رہی ہو تم…… تم تو تہجد بھی پڑھتی تھیں، کیا ایک بھی نماز نہیں پڑھتی ہو؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ آصفہ نے نظریں چرائیں۔

’’تمہیں تو سب معلوم ہے ناں کہ ناپاکی کی حالت میں شیطان حاوی ہو جاتا ہے۔ سب سے بڑی وجہ یہی ہے تمہارے اور یاور کے درمیان جھگڑوں اور بے برکتی کی۔‘‘ مومنہ نے تاسف سے اسے دیکھا۔

’’اچھا اب کوشش کروں گی۔ چھوٹے مغیث کی وجہ سے اکثر کپڑے خراب رہتے ہیں۔‘‘

’’نہ صرف نماز پڑھو بلکہ اپنے گھر واپس چلی جاؤ اگر تمہاری بات یعنی یاور کے چکر والی درست بھی ہے تو تم خود ہی اپنی جگہ خالی کر آئی ہو۔ خالی جگہ دیکھ کر تو نہ آنے والا بھی آ جاتا ہے بلکہ اٹھو میرے ساتھ ہی چلو اگر تم آج بھی آنٹی کے گھر رکیں تو انہیں شک

ہو سکتا ہے۔ شاباش جلدی سے پیکنگ کرو۔‘‘ مومنہ بہت رسان سے اسے سمجھا رہی تھی۔ آصفہ کے آنسو اس کے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔ مومنہ نے اسے گلے لگا لیا۔

☆☆☆

معیز کو اسکول چھوڑ کر یاور گھر آیا تو آصفہ آنکھوں پر بازو رکھے لیٹی تھی۔

’’آصفہ…… آصفہ میری بات سنو۔‘‘ اس نے آصفہ کا بازو ہلایا۔

’’نہیں سننی مجھے تمہاری کوئی بات۔‘‘ وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

’’مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے تم سے بات کرنے کا۔ میری براؤن ٹائی کہاں ہے بس اتنا بتا دو۔‘‘ یاور نے بات بدلی۔

’’مجھے نہیں پتا میں نے ٹھیکا نہیں لیا ہوا تمہاری چیزوں کا۔ جس کے لیے سج سنور کر جا رہے ہو اسی سے پوچھو۔‘‘ آصفہ اسی پوز میں بولی۔

’’فالتو بکواس مت کرو۔ فضول میں بار، بار میرے منہ نہ لگا کرو۔‘‘ یاور چیخا۔

’’فالتو بکواس میں نہیں کر رہی اور میں منہ نہیں لگی تم……‘‘ یاور نے پاس رکھے فلاور اسٹینڈ کو ٹھوکر ماری اور باہر نکل گیا۔ فلاور اسٹینڈ آصفہ کے پاؤں پر گرا۔ بھل بھل کر کے خون بہنے لگا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

’’مومنہ دعا کرو میں مر جاؤں، اپنے بچوں سمیت تمہارے کہنے سے اس جہنم میں دوبارہ آ گئی۔ کیا صلہ ملا۔ اس نے پھر مار دھاڑ شروع کر دی۔‘‘ وہ فون پر مومنہ کو بتا رہی تھی۔

’’لاؤ میری بات کرواؤ۔‘‘ پیچھے سے جمال کی آواز سنائی دی۔

’’ہیلو آصفہ، کیسی ہو سسٹر؟‘‘

’’جمال بھائی اپنے ایب نارمل دوست سے میرا پیچھا چھڑائیں، میں تھک گئی ہوں اس شخص کی مار کھا کھا کر۔‘‘ یاور کے گھر سے نکلتے ہی مومنہ کی کال آ گئی تھی۔

’’او کے…… او کے آپ ٹینس نہ ہوں، میں سمجھاتا ہوں اسے۔‘‘

☆☆☆

’’یاور تو آصفہ کو طلاق دے دے۔‘‘

’’کیا…… کیا کہہ رہا ہے بھائی؟‘‘ یاور پریشان ہو گیا۔ جمال نے یاور کے آفس آتے ہی سلام دعا کے بعد پہلی بات یہی کی۔ ’’تجھ سے آصفہ نے کہا ہے کچھ؟‘‘ اس نے جمال کو دیکھا۔

’’ہاں، وہ اب تیرے ساتھ نہیں رہنا چاہتی، اب تم خود سوچ لو کہ کرنا کیا ہے۔‘‘ جمال نے سے کھوجتی نظروں سے دیکھا۔

’’یار میں نے تمہیں نہیں بتایا بلکہ کسی کو بھی نہیں بتایا کہ میرا بزنس بالکل ڈاؤن ہو چکا ہے۔ میری پارٹیوں پر حریفوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ سب کچھ ختم ہو گیا ہے نئے سرے سے اسٹارٹ لینے میں بال، بال قرض میں جکڑ چکا ہوں اب گھر سے بھی بندے کو ٹینشن ملے تو بندہ کہاں جائے۔‘‘ یاور سر تھام کر بیٹھ گیا۔

’’تم نے یہ بات آصفہ سے بھی شیئر نہیں کی؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ یاور نے نظر اٹھائی۔

’’پہلی بات تو یہ کہ وہ تمہاری شریکِ حیات ہے دکھ درد کی ساتھی اگر اسے اپنے مسائل سے آگاہ نہیں کرو گے تو وہ خود بخود تمہارے رویوں سے تمہارے بارے میں غلط سوچ رکھے گی۔ اگر شروع ہی میں تم نے شیئر کیا ہوتا تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔‘‘ بات کے دوران ہی جمال کی کال آئی وہ یاور کو سوچ میں ڈوبا چھوڑ کر باہر چلا گیا۔

☆☆☆

’’پہلے تو تم یہ بتاؤ کہ تم اتنے خراب حلیے میں کیوں رہتی ہو مانا کہ تمہارے حالات اب پہلے جیسے

نہیں رہے لیکن وارڈ روب تمہاری اب بھی بہترین جوڑوں سے بھری ہے۔'' مومنہ اور جمال نے آج کل دونوں میاں بیوی کو سدھارنے کا بیڑا اٹھایا ہوا تھا۔

''دل نہیں کرتا یار۔'' آصفہ نے کسلمندی سے کہا۔''اتنی پریشانیوں میں مار کھا، کھا کر کون اچھے کپڑے پہنے۔''

''بالکل غلط کررہی ہو تم۔ تمہیں تو اور تیار ہو کر رہنا چاہیے تاکہ یاور گھر آئے تو صاف ستھری بیوی ملے اور باہر کی عورت کی طرف سے دھیان خود بخود ہٹ جائے۔'' مومنہ نے سمجھایا۔

''تمہیں معلوم ہے یاور جو رقم دیتا ہے میں اس میں کیسے خرچ چلا رہی ہوں؟'' آصفہ نے کہتے ہوئے روتے مغیث کو گود میں اٹھایا۔

''اس کا بھی حل ہے تم سب سے پہلے اپنے پورے مہینے کا خرچ ایک کاپی پر لکھو۔ اس میں سے انتہائی ضرورت کی چیزیں مثلاً کھانے کا خرچ، پیٹرول کا خرچ، مغیث کے ڈائپرز کے خرچ الگ کرو پھر جب یاور تمہیں رقم دیں تو تم سب چیزوں کے پیسے الگ کرلو۔ کم پڑیں تو انکل کی دی ہوئی پاکٹ منی میں سے ڈال لو۔ ویسے بھی تم انکل والے سارے پیسے خرچ کررہی ہو۔ ہر چیز لکھ کر منگواؤ، ہر خرچ کا حساب رکھو۔ پھر دیکھو کچھ بچتا ہے تو اوپر کے کام کے لیے کام والی لگالو۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ کالج کی اتنی ذہین لڑکی استادوں کی ہر دلعزیز شاگرد ذہیٹر کا یہ حال ہوجائے گا۔'' مومنہ نے انتہائی افسوس سے کہا۔ آصفہ کو لگا جیسے اسے گھپ اندھیرے میں روشنی کی کرن دکھائی دی ہو۔

☆☆☆

الارم کی آواز پر اس کی آنکھ کھلی، پہلے تو سمجھ ہی نہیں آیا کہ اندھیرے میں الارم کیوں بجا ہے۔ دور سے اذان کی آواز آئی تو یاد آیا فجر کی نماز کا وقت ہے۔ تیزی سے بستر چھوڑا۔ برابر میں دیکھا یاور بستر سے غائب تھا وہ دھک سے رہ گئی پورا گھر دیکھ لیا وہ کہیں نہ تھا۔ نماز کا وقت تنگ پڑنے لگا۔ وضو کیا نماز پڑھ کر خوب رو، رو کر دعائیں مانگیں۔ جائے نماز لپیٹ کر پلٹی تو یاور پیچھے کھڑا تھا۔

کہاں چلے گئے تھے کا سوال کرتے، کرتے زبان دانتوں میں دبالی۔ یاور کے حلیے سے لگ رہا تھا کہ مسجد سے آرہا ہے۔ سر پر ٹوپی تھی اور صاف ستھرے کپڑے۔ کچھ دیر وہ اسے غور سے دیکھتا رہا۔ بلیک اور پنک کاٹن کے پرنٹڈ سوٹ اور سفید نماز کے دوپٹے میں وہ روئی، روئی بہت ہی معصوم اور پاکیزہ لگ رہی تھی۔ یاور نے پہلے کی طرح اپنی بانہیں وا کردیں۔ وہ پہلے تو ذرا جھجکی پھر اس کی بانہوں میں سمٹ گئی اور زاروقطار رونے لگی۔ یاور نے بھی چپ نہ کروایا بس اس کے بالوں پر ٹھوڑی ٹکائے اس کی کمر تھپتھپاتا رہا۔ خوب رونے کے بعد الگ ہو کر وہ بیڈ پر جا بیٹھی۔ وہ بھی اسی سائڈ پر آکر لیٹ گیا۔ آصفہ کو اپنی بے اختیاری پر افسوس ہوا تو اٹھ کر کچن میں چلی آئی۔ معیز کے اسکول اور یاور کے آفس جانے میں بہت وقت تھا۔ اتنی دیر میں کافی کام نمٹ سکتا تھا۔ رات کے برتن دھو کے دو کیبنٹ کی اچھی طرح صفائی کی پھر ناشتا تیار کیا۔ معیز کو اٹھا کر واش روم بھیجا۔ یاور ناشتے کا کہنے آئی تو یاور سوچکا تھا۔ اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی کہ تھوڑی دیر پہلے والی بے اختیاری پر شرمندگی تھی۔ بس کھڑی دیکھتی رہی۔

''کتنا ظالم شخص ہے مجھے چھوڑ کر دوسری عورت کی سنگت میں خوش ہوتا ہے۔'' اس نے خود کلامی کی۔

''تو کیا اتنے گندے حلیے اور لڑتی جھگڑتی بیوی سے خوش ہو؟'' اس کا ضمیر کرلایا۔

''نہیں، اب نہیں لڑوں گی ہر وقت صاف ستھری رہوں گی پھر تم واپس پلٹ آنا کسی دوسری عورت کے پاس نہ جانا، یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔''

آصفہ اپنے آپ سے باتیں کرنے میں اتنی مگن تھی اسے احساس ہی نہ ہوا یاور کب سے آنکھیں کھولے اسے اپنے پاس کھڑا روتا دیکھ رہا ہے۔

''کون سی دوسری عورت؟'' یاور نے اس کا ہاتھ کھینچا اور اپنے پاس بٹھالیا۔

''کوئی سی نہیں، مت بات کریں مجھ سے۔''

''مما یونیفارم چینج کرلیا۔'' معیز کی آواز پر آصفہ جھٹکے سے اٹھی۔

''چلو بیٹا ناشتا ٹیبل پر لگا ہے۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کچن میں لے آئی۔

''واؤ مما آج تو آپ نے میری پسند کا ناشتا بنایا ہے۔'' ناشتا دیکھ کر وہ خوش ہوگیا۔ آصفہ، معیز کو تیزی سے ناشتا کرتے دیکھ کر مسکراتی رہی۔ نماز پڑھ کر طبیعت میں ایک سکون سا اتر آیا تھا۔

یاور، معیز کو چھوڑ کر آیا تو آصفہ بلند آواز سے تلاوت کررہی تھی۔ وہ اس کی آواز کی چاشنی اور مٹھاس میں گم ہوگیا۔ تلاوت سے فارغ ہو کر آصفہ کچن میں آگئی۔ مغیث کی فیڈر بنا کر اسے پلائی پھر سبزی بنانے لگی۔ یاور نے خاموشی سے اس کے ہاتھ سے چھری لے کر رکھی اور اس کا ہاتھ تھام کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

''اب بتاؤ کون سی عورت؟''

''کوئی سی بھی نہیں، چھوڑیں میرا ہاتھ مجھے بہت کام کرنا ہے۔'' آصفہ نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ اس کے آنسو نکل آئے۔

''بات سنو جہاں تک میرا خیال ہے تم نے مجھے مسز گیلانی کے ساتھ دیکھا تھا۔ دیکھ تو میں نے بھی تمہیں لیا تھا لیکن ان دنوں میں سخت پریشان تھا۔ وہ میرے پارٹنر کی وائف ہیں اکثر آفس کے معمولات انہی کے ہاتھ میں ہیں۔ میں تمہیں بتانا بھول گیا اور تم نے بھی پوچھنے کی زحمت نہ کی خود ہی دل میں وسوسے پال لیے۔ خود بھی پریشان ہوئیں اور مجھے بھی کردیا۔'' آصفہ کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

''آپ خود نہیں بتاسکتے تھے، میں پوچھتی تو آپ کہتے کہ میں شک کررہی ہوں۔'' آصفہ نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''ہاں تو محترمہ آپ نے یقین ہی کرلیا شک کے بجائے۔''

''تو کیا کرتی، آپ کو معلوم ہے عورت ہر طرح کی قربانی دے سکتی ہے سب کچھ برداشت کرسکتی ہے لیکن دوسری عورت کو کبھی برداشت نہیں کرسکتی۔ تو میں نے تو پاگل ہونا ہی تھا۔ آپ کا رویّہ بھی اتنا خطرناک تھا۔'' آصفہ پھر سے چھکوں پھکوں رونے لگی۔ کچھ دیر تو یاور اسے لب بھینچے دیکھتا رہا پھر اسے سینے سے لگالیا۔

''اچھا بس سوری..... معاف کردو یار۔'' یاور نے اسے خود سے دور کرتے ہوئے اس کا چہرہ تھام لیا اور اپنی پوروں سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے گویا ہوا۔

''یہ تمام غلط فہمیاں ایک دوسرے سے بات کلیئر نہ کرنے کی وجہ سے ہوئی ہیں اور نہ میں نے تمہیں جان بوجھ کر چابی ماری تھی اور نہ اسٹینڈ یقین کرو تمہاری تکلیف دیکھ کر میرا دل تڑپ گیا تھا لیکن تم نے غصہ ہی اس قدر دلایا.....'' اس نے کہتے ہوئے آصفہ کے ماتھے پر اپنی محبت کی مہر ثبت کی۔

''یاور مجھ سے سارے وعدے لے لیں خود بھی ٹھیک ہوجاؤں گی بس آپ کبھی دھوکا مت دینا۔'' اب کہ وہ خود ہی اس کے سینے سے لگی۔ یاور نے اپنی ٹھوڑی اس کے سر پر ٹکائی اور سوچنے لگا کہ اچھے دوست خدا کی نعمت ہوتے ہیں اور آصفہ سوچ رہی تھی کہ ایک سمجھدار ماں کی ہستی ہی گھر ٹوٹنے سے بچاتی ہے۔ ماؤں کی شہ پر ہی کتنے گھر ٹوٹتے بکھرتے ہیں خدا کا شکر ہے اس نے مجھے سمجھدار ماں اور مخلص دوست عطا کیے۔



نوخیز امنگ

رابعہ نیازی

پرفیوم کا آخری مرتبہ اسپرے کرنے کے بعد میں نے خود پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی اور اور سب کچھ ٹھیک نظر آنے پر واپس مڑ گیا۔ بیڈ کے بالکل ساتھ میرے پالش جوتے جگمگا رہے تھے۔ میں نے جھک کر جوتے پہنے تو زارا ناشتے کے لوازمات سے بھری ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ میری پرفیکٹ تیاری کو دیکھ کر وہ آپوں آپ مسکرائی تھی۔ یہ اس کی روزانہ کی روٹین تھی جو ذرا سی ردوبدل کے بعد میرے سامنے دُہرائی جاتی۔ آج بھی ناشتا شروع کرنے سے پہلے میں نے اس پر ایک اچٹتی نظر ڈالی، وہ گھر کے عام سے لباس میں جس پر رات کی شکنیں نمایاں تھیں میں ملبوس میری تیاری کے دوران بکھری اشیا سمیٹنے میں مصروف تھی۔ اس کے الجھے بال جوڑے کی شکل میں قید تھے۔ اس کی ہر صبح کا آغاز نماز کے بعد میرے کاموں میں گزر جاتا۔ وہ میرے آفس جانے تک ایک وفا شعار بیوی کا ثبوت دیتے ہوئے میری ایک، ایک چیز میرے ہاتھ میں پکڑاتی جاتی مگر میرے واپس آنے تک وہ تمام کام ختم کر کے بالکل فریش نظر آتی۔

”زارا تم بھی ناشتا کر لو ٹھنڈا ہو جائے گا۔ کام تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔“ میں نے آملیٹ کو کاٹنے سے دونیم کرتے ہوئے اسے آواز دی۔

”نہیں آپ ناشتا کر لیں، میں بعد میں فارغ ہو کر آرام سے کھالوں گی۔“ اس نے حسبِ عادت جواب دیتے ہوئے بیڈ پر بچھی چادر کی شکنیں دور کیں۔ روزانہ ہی ناشتے میں کئی طرح کے لوازمات نظر آتے۔ میں اپنی پسند کے مطابق کچھ چیزیں کھاتا اور باقی چیزیں یقیناً زارا میرے جانے کے بعد کھاتی۔ وہ میرا مزاج کافی حد تک سمجھنے لگی تھی۔ ورنہ صبح اس کے آملیٹ بنانے پر میرا دل ہاف فرائی انڈا کھانے کو کرنے لگتا یا پھر ہاف فرائی بنانے پر وہی کھانے کو مچلنے لگتا۔ مگر اب وہ تمام تر اشیا میرے سامنے لا کر رکھتی اور میرے جانے کے بعد بچی ہوئی اشیا اس کے ناشتے کا سامان بنتیں۔ مجھے آج بھی اس پر ٹوٹ کر پیار آیا مگر یہ صرف ایک لمحہ ہی تھا جس نے مجھے زارا کی گرفت میں لیا اور میرا دماغ پھر سے کہیں اور بھٹکنے لگا تھا۔

ناشتے کے بعد میں پھر سے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آیا اور بالوں کو آخری بار برش کیا۔ خوب صورت سجے بالوں کو مزید سنوارتے ہوئے میں واپس مڑا تو زارا نے ہاتھ بڑھا کر میری ٹائی درست کی اور میری مطلوبہ فائلز لیے مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی۔ اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تو میں تیزی سے گلی میں مڑ گیا۔ اس گلی کے دونوں اطراف میں بنے گھر متوسط طبقے کی کھلی عکاسی کرتے نظر آرہے تھے۔ سوئے اتفاق وہ آج بھی اپنے دروازے میں کھڑی نظر آئی۔ میرے قدموں نے جیسے چلنے سے انکار کر دیا۔ سست روی سے قدم اٹھاتا میں اسے ہی تکنے میں محو تھا۔ وہ اپنے ادھ کھلے دروازے میں کھڑی میری مخالف سمت میں باہر جھانک رہی تھی۔ شاید اسی لیے اسے میرے آنے کی خبر تک نہیں ہوئی۔ کاٹن کا پرانا سا پردہ تھا سے مجھے اس پر کسی خوب صورت تصویر کا گمان گزرا۔ میں اس کے بے حد قریب پہنچ کر نادانستگی میں رک گیا۔ آخر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ روزانہ یہ اور میں ایک ہی وقت گلی میں آمنے سامنے آن ملتے ہیں۔ یقیناً اس کی کیفیت بھی مجھ سے الگ نہیں...... دلِ بے چین میں خوش گمانی نے یہاں سے وہاں تک خوب ڈیرے ڈالے۔ خود پر نظروں کی تپش پا کر وہ میری طرف مڑی اور پھر چھپاک سے پردے کے پیچھے گم ہوگئی۔ مگر اس دوران میں اس کے لبوں پر پھیلا تبسم دیکھ چکا تھا۔ اس کے لمبے بالوں میں بڑے، بڑے شیشوں والا پراندہ ہمیشہ ہی ڈلا نظر آتا۔ اب بھی اس کے تیزی سے مڑنے پر پراندے میں لگے گھنگرو چھن سے بج اٹھے اور میرے دل و دماغ میں جیسے سُریلی

عید

عید پھر سے جگائے دیتی ہے
سارے ماضی کے درد بے درماں
عید کی رونقوں میں شامل ہوں
ہنستے بستے شہروں میں جیسے قبرستاں
اور بڑھ جاتی ہے بھولی ہوئی باتوں کی کسک
عید کا دن تو فقط زخم ہرے کرتا ہے
عید آئی ہے سلگتی ہوئی یادیں لے کر
آج پھر اپنی تنہائی پر ترس آیا ہے

مرسلہ: جبیں نیاز، ملتان

گھنٹیاں سی بج اٹھیں مگر میں جانتا تھا، وہ اب بھی پردے کے پیچھے چھپی کھڑی ہے اور میرے آگے بڑھنے پر پردے کی اوٹ سے جھانک کر اپنے بے قابو دل کی دھڑکن سنتی چلی جائے گی۔ اس کے نازک مرمریں پاؤں میں کولہاپوری چپل مجھے پردے کے پیچھے سے نظر آرہی تھی۔ ایک بار تو دل چاہا کہ آواز دے دوں مگر گلی میں کسی نہ کسی کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اب بھی ساتھ والے الطاف صاحب کو دیکھ کر میں ہولے سے کھنکھارا اور بے دلی سے آگے بڑھ گیا۔ جانے کیوں ایک لمحے کے لیے بھی مجھے زارا کا خیال نہیں آیا جس کی زندگی کا محور صرف میری ذات تھی۔

''نہ جانے کیوں ہم مردوں کو گھر کی پاکیزہ اور پُرسکون فضا بھی مطمئن نہیں کر پاتی۔'' میں نے گلی کے آخری سرے پر جا کر ایک بار پھر خوش گمانی کے پروں کو دیکھا جو آج کچھ زیادہ ہی پرواز کرنے لگے تھے مگر خالی گلی بھائیں، بھائیں کر رہی تھی۔ مجھ میں مزید صبر کا مادہ موجود نہیں تھا۔ تین ماہ ہو چلے تھے اس چوہے بلی کے کھیل کو... مگر آج میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس مہ جبیں کو اپنا حالِ دل بتا دینا چاہیے اور یقیناً وہ مجھ سے الگ نہیں سوچتی ہو گی۔ میں نے خود کو بھرپور تسلی دیتے ہوئے ایک خوب صورت کارڈ خریدا اور چند سطروں میں اپنے جذبات کو جس قدر مقید کر سکتا تھا کرنے کے بعد میرا رخ پوسٹ آفس کی جانب تھا۔

☆☆☆

''ارے بابا اب چھوڑ بھی دو، کیا گنجا کرنا ہے مجھے۔'' میں نے جھنجلاتے ہوئے زارا کے ہاتھ پیچھے کرنے چاہے جو تیزی سے میرے بالوں میں چل رہے تھے۔ چھٹی کا دن تھا اور زارا ہمیشہ کی طرح مجھے کرسی پر بٹھائے سر کی مالش کرنے میں مصروف تھی۔ اس کے بعد یقیناً وہ میرے پاؤں بھی رگڑ، رگڑ کر دھونے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔

''زیادہ نخرے مت دکھاؤ۔ چپ چاپ بیٹھے رہو بس تھوڑی دیر باقی ہے۔'' زارا کے ڈانٹ میں بھی پیار بھرا مان تھا۔

''میرا خیال ہے تم سے بچنے کے لیے میں اپنی ڈیوٹی اتوار کو بھی لگوا لوں ورنہ تم شاید مجھے گنجا کیے بنا نہیں چھوڑو گی۔'' میں نے شرارتاً دھمکی دی تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔ کال بیل کی آواز نے اس کی ہاتھوں کی حرکت کو چند لمحے کے لیے روکا......

''میں دیکھتی ہوں۔'' کہہ کر وہ باہر کی جانب لپکی۔ اس وقت میں جس حلیے میں بیٹھا تھا باہر گیٹ تک جانا خاصا شرمندہ کر سکتا تھا۔ لہٰذا میں لاؤنج کے جالی دار دروازے کے قریب جا کھڑا ہوا۔

''کیسی ہو زارا باجی......؟ میں نے آپ کو تنگ تو نہیں کیا اس وقت آ کر......؟'' ایک شیریں سی آواز میرے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ وہ مہ جبیں، زارا کے سامنے گیٹ کے قریب کھڑی تھی۔

''نہیں بالکل بھی نہیں، آؤ اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔'' زارا نے حسبِ عادت مسکرا کر کہا تو اس نے زارا کی کلائی تھام لی۔

''نہیں باجی، مجھے ذرا جلدی ہے، میں بیٹھنے نہیں آئی۔ آپ سے چھوٹا سا کام تھا۔'' وہ سر جھٹک کر بولی تو نیلے پراندے میں لگے گھنگرو خوب صورت لے پر بج اٹھے تھے۔

''آپ کو تو پتا ہے میں پڑھی لکھی نہیں ہوں۔ آج یہ خط... آیا ہے کہیں سے، جانے کس نے بھیجا ہے۔ آپ ذرا پڑھ کر سنا دیں۔'' اس نے گلابی لفافے میں قید وہ کارڈ زارا کی جانب بڑھایا جسے میں دو دن پہلے پوسٹ کر کے آیا تھا۔ ایک طوفان تھا جو میرے ارد گرد ناچنے لگا تھا۔ گلابی لفافہ زارا کے ہاتھوں میں کھلتا جا رہا تھا اور مجھے لگا کہ پراندے کے گھنگرو، شیریں تبسم اور زارا کی مان بھری کھلکھلاہٹ میرے کانوں میں یکے بعد دیگرے بجتی چلی گئی ہے۔





شمع ہدایت

اختر شجاعت

شکر، عطائے الٰہی

اے وہ ذات (اللہ)! جس کی یاد، یاد کرنے والوں کے لیے سرمایۂ عزت! اے وہ جس کا شکر، شکر گزاروں کے لیے وجۂ کامرانی...... اے وہ جس کی فرمانبرداری، فرمانبرداروں کے لیے ذریعۂ نجات ہے۔ رحمت نازل فرما حضرت محمد ﷺ اور ان کی آل پر...... اور ہمارے دلوں کو اپنی یاد میں اور ہماری زبانوں کو اپنے شکریہ میں اور ہمارے اعضا اپنی فرمانبرداری میں معروف رکھ...... کہ دوسری ہر یاد، ہر شکریہ اور ہر فرمانبرداری سے بے نیاز کر دے۔

جب ہماری زندگی کے دن بیت جائیں اور سلسلۂ حیات قطع ہو جائے اور تیری بارگاہ میں حاضر ہونے کا بلاوا آئے جسے بہر حال آنا اور جس پر بہر صورت لبیک کہنا ہے تو ہمارے کاتبان، ہمارے جن اعمال کا شمار کریں ان میں آخری مقبول عمل توبہ کو قرار دے...... اے رب تو محمد ﷺ اور ان کی آل پر رحمت نازل فرما...... (آمین)

شکر کیا ہے؟

شکر کے لغوی معنی ہیں احسان ماننا اور احسان مندی...... اللہ رب العزت نے ہمیں اتنی نعمتیں عطا کی ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں...... دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ممکن ہی نہیں ہے۔

خالقِ کائنات نے قرآن مجید میں اپنے ذکر کے ساتھ شکر کو بیان فرمایا ہے...... ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر کرو اور ناشکری سے بچو......''

(سورۂ بقرہ: 152)

دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ......

''اگر تم شکر کرو اور ایمان لے آؤ تو اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب نہیں دے گا۔''

(سورۂ نساء: 147)

''اور ہم بہت جلد شکر کرنے والوں کو اجر دیں گے۔''

(سورۂ آل عمران: 144)

''اگر تم شکر کرو گے تو میں نعمتیں زیادہ کروں گا۔''

(سورۂ ابراہیم: 7)

خداوندِ عالم نے حضرت موسیٰ سے فرمایا۔ ''اے موسیٰ میرا شکر بجا لاؤ ایسا کہ میرے شکر کا حق ادا ہو جائے۔''

حضرت موسیٰ نے کہا۔ ''میں کیونکر تیرے شکر کا حق ادا کر سکتا ہوں جبکہ ادائے شکر خود ایک نعمت ہے۔'' تو قدرت کی طرف سے ارشاد ہوا۔

''اے موسیٰ! اب تم نے میرا شکر ادا کیا جبکہ یہ جان لیا کہ ادائے شکر بھی میری ایک نعمت ہے۔''

سب سے پہلے انسان یہ علم و یقین پیدا کرے کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام نعمتوں کا سرچشمہ اور وہی منعمِ حقیقی ہے...... اور جو کچھ بالواسطہ یا بلاواسطہ ملتا ہے اسی کی طرف سے ملتا ہے۔ ایک بار حضرت داؤدؑ نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کی...... ''اے میرے پروردگار! میں کیونکہ تیرے شکر سے عہدہ برآ ہو سکتا ہوں جبکہ شکر بھی تیری ایک نعمت ہے جس پر شکر واجب ہے'' تو خداوندِ عالم نے ان پر وحی کی کہ...... ''میں مقامِ شکر میں اس بات پر تم سے خوش ہوں کہ تم نے یہ جان لیا کہ تمام نعمتیں میری جانب سے ہیں۔''

حضرت امام جعفر صادقؒ کا ارشاد ہے کہ نعمت

کتنی بڑی ہو اس پر ادائے شکر کا طریقہ یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرو۔"

مزید ارشاد فرمایا ..... کہ "محرمات (وہ باتیں جن سے روکا گیا ہے) سے کنارہ کشی کرو۔"

☆☆☆

حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا...... "قیامت کے دن کہا جائے گا کہ حمد کرنے والے کھڑے ہو جائیں......لوگوں کا ایک گروہ اس پر کھڑا ہو جائے گا ان کے لیے ایک (علم، پرچم) جھنڈا ہوگا وہ اس کے ساتھ جنت میں جائیں...... عرض کیا گیا کہ یا رسولؐ اللہ! حمد کرنے والے کون ہیں؟" جو لوگ ہر حالت میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں...... یعنی جو ہر دکھ اور سکھ میں اپنے اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔"

فرمان نبوی ﷺ ہے کہ "اللہ کی چادر شکر ہے۔" اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوبؑ کی طرف وحی فرمائی کہ میں طویل باتوں کے بجائے اپنے دوستوں سے شکر کرنے پر راضی ہو گیا ہوں...... اور صابرین کی تعریف میں فرمایا گیا کہ ان کا گھر جنت میں ہے۔ شکر کے وقت میں ان سے مزید شکر کا مطالبہ کرتا ہوں۔ میری طرف نظر رکھنے پر انہیں مزید نعمتیں عطا کرتا ہوں۔"

ایک بار فتوحات کے موقع پر جب مال آیا تو حضرت عمر فاروقؓ نے حضور اکرم ﷺ کے حضور عرض کی۔ "ہم کون سا مال لیں؟"

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا...... "ذکر کرنے والی زبان اور شکر کرنے والا دل......" حضرت ابن مسعودؓ کا ارشاد ہے کہ "شکر نصف ایمان ہے۔" حدیث شریف میں ہے کہ سب سے بڑھ کر ذکر لا الہ الا اللہ کو افضل الذکر اور الحمد للہ کو افضل الدعا کہا گیا ہے...... الحمد للہ میزان کو بھر دیتا ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں...... کہ ایک رات حضور اکرم ﷺ میرے پاس سے اٹھے اور تھوڑے پانی سے وضو فرمایا اور نماز شروع کی...... آپ ﷺ اس قدر رونے لگے کہ آپؐ کے آنسو سینے پر بہنے لگے پھر رکوع کیا...... پھر سجدہ کیا اور ہر حالت میں روتے رہے...... میں نے دریافت کیا...... یا رسول اللہ ﷺ آپ اس قدر کیوں روئے؟ جبکہ آپ گناہ سے محفوظ ہیں...... اس ..... بشارت کی موجودگی میں اتنی مشقت کیوں برداشت فرماتے ہیں ایسا تو وہ کرے کہ جس کی آخرت محفوظ نہ ہو...... آپ ﷺ نے فرمایا۔ کہ "یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے، کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسی بشارت دے۔"

آپ ﷺ نے ایک شخص سے پوچھا۔ "کیسے ہو؟" اس نے کہا...... "اچھا ہوں......" آپ نے سوال پھر دہرایا...... اُس نے پھر کہا "اچھا......" آپ ﷺ نے تیسری مرتبہ پوچھا...... "کیسے ہو؟" تو اس نے کہا...... "الحمد للہ اچھا ہوں......" تو آپ ﷺ نے فرمایا...... "میں بھی یہی سننا چاہتا تھا۔" (کہ مکمل جواب یہی ہے)

☆☆☆

حضرت ابراہیم خواصؒ فرماتے ہیں...... ایک بار میں ایک بزرگ سے ملنے ایک بستی میں گیا جب میں ان کے گھر پہنچا تو ان کا گھر نہایت پاکیزہ دیکھا...... اس مکان میں دو محرابیں تھیں ایک محراب کے گوشے میں وہ بزرگ تشریف فرما تھے اور دوسری محراب میں ایک پاکیزہ اور روشن چہرے والی بوڑھی خاتون بیٹھی تھیں...... یہ دونوں کثرتِ عبادت میں بوڑھے ہو چکے تھے۔ میرے آنے پر انہوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا...... تین دن میں ان کے یہاں رہا...... جب میں نے واپسی کا ارادہ کیا تو میں نے ان بزرگ سے پوچھا۔ "یہ پاک دامن عورت آپ کی کون ہیں؟" انہوں نے فرمایا...... یہ ایک رشتے سے تو میری چچا زاد بہن ہے اور دوسرے رشتے سے میری بیوی ہے۔" میں نے کہا...... "میں نے تو ان تین دنوں میں آپ دونوں میں غیریت اور بیگانگی دیکھی ہے...... اس کی وجہ بیان فرمائیں......" انہوں نے جواب دیا...... "بات یہ ہے کہ ہم بچپن میں ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے تھے......

ان کے والد نے مجھ سے شادی نہیں کرنی چاہی...... تو ایک عرصے تک ہم دونوں اپنی، اپنی محبت دل میں لیے بیٹھے رہے یہاں تک کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ میرے والد اس کے چچا تھے۔ انہوں نے اس کا نکاح میرے ساتھ کر دیا۔

جب پہلی رات ہم دونوں یکجا ہوئے تو اس نے مجھ سے کہا۔ "جانتے ہو کہ اللہ نے ہمیں کیسی نعمت سے سرفراز کیا ہے کہ ہم دونوں ایک ہو گئے۔ اس نے ہمارے دنوں کو ناخوشگوار آفت سے نجات دی۔ لہٰذا ہمیں آج کی رات اپنے آپ کو نفسانی خواہش سے باز رکھنا چاہیے اور اس نعمت کے شکریہ میں ہم دونوں کو خدا کی عبادت کرنی چاہیے۔" میں نے کہا۔ "تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔" دوسری رات بھی اس نے یہی کہا...... جب تیسری رات آئی تو میں نے کہا کہ گزشتہ دو راتیں تو میں نے تمہارے شکر میں گزار دیں آج رات تم میرے شکر میں عبادت کرو۔" اس طرح ہم پینسٹھ سال گزار چکے ہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو چھونا تو درکنار کبھی نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ساری عمر نعمات الٰہی کے شکرانے میں گزار دی۔" سبحان اللہ...... ایسے پیارے، پیارے اللہ کے شکر گزار بندے گزرے ہیں۔

☆☆☆

حضرت شفیق بلخیؒ نے حضرت امام جعفر صادقؒ سے فتوت (سخاوت، مروت، شجاعت خاصے وسیع معنی ہیں) کی نسبت ایک سوال کیا...... امامؒ نے فرمایا...... آپ بتائیں آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟ حضرت بلخیؒ نے کہا کہ ہمیں اگر کچھ مل جائے تو شکر ادا کرتے ہیں اور نہ ملے تو صبر کرتے ہیں۔" اس پر امام جعفر صادقؒ نے فرمایا...... "مدینہ میں ہمارے ہاں کتوں کا یہی حال ہے...... ہماری حالت یہ ہے کہ مل جائے تو اوروں میں بانٹ دیتے ہیں اور نہ ملے تو شکر کرتے ہیں۔"

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ کی نعمتوں سے اس طرح فائدہ اٹھانا کہ معصیت (گناہ) کے کسی کام میں ان سے مدد نہ لی جائے اسی کا نام شکر ہے۔

ہمیں اس بات پر یقین رکھنا چاہیے کہ ہم سے جو بھی نیکی ہو رہی ہے اور جس اطاعت و عبدیت اور ذکرِ خداوندی کا ہم سے ظہور ہو رہا ہے، یہ سب اللہ کی توفیق، مدد، قوت، طاقت اور انعام کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اپنے تمام احوال سے الگ ہو جائیں۔ اللہ کی ذات صفات اور نور افعال میں فنا ہو جائیں، اپنی عاجزی، نادانی کوتاہی کا اقرار کریں اور تمام احوال میں اپنا مرکزِ سکون اللہ کو سمجھیں۔

شکر...... زبان، دل اور دیگر اعضائے بدن سے ہوتا ہے...... دل کا شکر یہ ہے کہ نیکی کا ارادہ کرے اور مخلوق کے لیے بھی نیکی ہی سوچے...... زبان کا شکر یہ ہے کہ اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے ان کلمات کو کہے جو شکر ادا کرنے کے مخصوص ہیں...... مثلاً سبحان اللہ...... الحمد للہ...... جزاک اللہ...... شکر اللہ...... اعضا کا شکر یہ ہے کہ انہیں عبادتِ الٰہی میں مصروف رکھا جائے...... اور برے کاموں میں استعمال نہ کیا جائے...... آنکھوں کا شکر یہ ہے کہ جس مسلمان کا عیب دیکھیں تو پردہ رکھیں...... کانوں کا شکر یہ ہے کہ جو عیب کی باتیں سنیں اسے راز رکھیں...... اچھی محفل میں بیٹھیں اور اچھا ذکر سنیں یہ سب باتیں اللہ کے شکر میں داخل ہیں اس کے علاوہ زبان کا شکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی رہے...... شکر کرنا عبادت ہے۔ شکوہ شکایت کرنا اہلِ تقویٰ کے نزدیک ناپسندیدہ فعل ہے۔

جو ان تمام امور کا خیال رکھتا ہے وہ اپنے پروردگار کا شکر گزار بندہ کہلاتا ہے...... مگر ایسے شکر گزار بندے بہت کم ہیں...... جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"اور میرے شکر گزار بندے کم ہی ہیں۔"

(سورۂ سبا، 13)

شکر کا ایک مقام یہ بھی ہے کہ بندہ اپنے سے کم درجے کے آدمی کی طرف دیکھے اور اپنے اوپر خدا کے فضل و کرم کو دیکھے...... اور دوسرا آدمی جس آفت میں

مبتلا ہے اور وہ اس سے محفوظ ہے تو وہ اس پر ڈھیروں پر شکر ادا کرے پھر دین کے اعتبار سے اپنے سے بلند تر درجے والے پر نظر کرے اور اپنے سے بلند درجے آدمی کے علم...... ایمان اور حسنِ یقین پر رشک کرے اور اپنے آپ کو برا سمجھے اور اپنے آپ کو ملامت کرے اور اس قسم کے اعلیٰ احوال حاصل کرنے کی کوشش کرے جب ایسا ہوگا تو وہ شاکرین میں داخل ہوگا اور اس کا نام بھی محرومین میں آجائے گا...... اس مفہوم میں حضور ﷺ نے فرمایا...... ''جس نے دنیا میں اپنے سے کم تر کی طرف نظر رکھی اور دین میں اپنے سے برتر کی طرف نگاہ رکھی تو اللہ تعالیٰ اسے صابر و شاکر کرسکے گا...... اور جس نے دنیا میں اپنے سے برتر کی طرف دیکھا اور دین میں اپنے سے کم تر کی طرف دھیان رکھا اسے نہ صابر لکھے گا اور نہ شاکر لکھے گا۔''

حضرت ایوب علیہ السلام کی مناجات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی...... آدمیوں میں سے میرے ہر بندے کے ساتھ دو فرشتے ہیں جب بندہ میری نعمتوں پر شکر کرتا ہے تو دونوں فرشتے کہتے ہیں...... ''اے اللہ...... ! اس پر اپنی نعمتیں مزید فرمایا...... اس لیے کہ یہ اہلِ شکر و حمد ہے، شاکرین سے خوب قریب ہو اور ان کو مزید کی توفیق دے اور ان پر مزید انعام فرما...... اور اے ایوب علیہ السلام شاکرین کے لیے یہ انعام کافی ہے کہ ان کا درجہ میرے ہاں اور فرشتوں کے ہاں بڑھ جاتا ہے......

چنانچہ میں ان کے شکر کا شکر کرتا ہوں...... فرشتے ان کے لیے دعا کرتے ہیں...... زمین ان سے محبت کرتی ہے اور آثار و نشانات ان پر روتے ہیں...... اس لیے اے ایوب علیہ السلام شکر گزار بن جا اور میرے احسانات و انعامات کو یاد کرنے والا ہو جا...... اور میں تمہیں ذکر کی توفیق دوں تو میرا ذکر کر اور تجھے شکر کی توفیق دوں تو میرا شکر کر...... جن کو توفیق دیتا ہوں اس پر ان کا شکر کرتا ہوں اور شکر پر انہیں جزا دیتا ہوں...... اور ان پر راضی ہوتا ہوں...... اور میرے نزدیک بدترین بندہ وہ ہے جو صرف ضرورت کے وقت ہی میرا شکر کرے اور صرف سزا اور ابتلا کے وقت ہی میرے سامنے زاری کرے...... اللہ تعالیٰ نے شاکرین کو صالحین، مقربین اور عالمین فرمایا...... اور یہ تینوں اعلیٰ ترین مقاماتِ یقین میں سے ہیں......

☆☆☆

ایک بار حضرت شیخ سعدیؒ کی جوتی دورانِ سفر ٹوٹ گئی...... تو وہ پریشان ہوئے کہ لوگ کیا...... کہیں گے کہ پاؤں سے ننگا ہوں...... یہ سوچ ہی رہے تھے کہ آپؒ کی نگاہ ایک ایسے شخص پر پڑی جو پاؤں سے معذور تھا...... آپؒ نے فوراً اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے پاؤں کی نعمت تو عطا کر رکھی ہے۔

رب کریم کی نعمتوں کا جس قدر بھی شکر ادا کیا جائے وہ کم ہے...... جبکہ اس کی شانِ کریمی تو یہ ہے کہ جس قدر اس کا شکر ادا کیا جائے تو وہ اتنا ہی نعمتوں میں اضافہ فرما دیتا ہے...... حضرت رابعہ بصریؒ شکر ادا کرنے پر شکر ادا کیا کرتی تھیں...... کہ اللہ نے شکر کی توفیق دی تو اس شکر پر شکر ادا کیا جائے...... سبحان اللہ......

کتنی عجیب بات ہے کہ اس رب کریم کی عطا کی ہوئی نعمتوں سے ہم خوب لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی ایک چیز جو کسی وجہ سے ہمیں نہیں عطا کی گئی جبکہ اس کا عطا نہ ہونا یقیناً ہمارے ہی مفاد میں ہے...... اس ایک چیز کی محرومی ہمیں نہ صرف یاد رہتی ہے بلکہ ہم اس کا شکوہ بھی کرتے ہیں اور بار، بار کرتے ہیں جبکہ ہمیں سوچنا چاہیے یہ مصیبت یا مشکل خود ہماری اپنی کسی کوتاہی کے سبب تو نہیں...... اگر ایسا ہے تو ہمیں چاہیے کہ اس کی بارگاہ میں معافی مانگیں، توبہ کریں...... ہمیں تو ہر لمحے اس عظیم ہستی کا شکر گزار رہنا چاہیے کہ جس رب کریم نے ہمیں بے تحاشا اپنی نعمتوں سے نوازا ہے...... اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو توفیق بخشے کہ ہم اپنے رب تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرسکیں اور اس کے شکر گزار بندوں میں سے ہوسکیں...... آمین۔

☆☆☆

آتی ہے عید جب آتی ہے یاد تیری

شائستہ زریں

عید کا چاند ابھرا تیری یاد کے ساتھ
چاندنی میں تیری یاد کی خوشبو پھیلی

گزرے بیتے لمحے جب ایک یاد کی صورت ہمارے ذہن میں محفوظ ہوتے ہیں تو ہمارے لیے اثاثہ بن جاتے ہیں۔ اگر یہ ساعتیں عید سے منسوب ہوں تو ہر عید پر ان کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور شاعر کا یہ خیال درست ثابت ہو جاتا ہے کہ

آتی ہے عید جب، جب آتی ہے یاد تیری

اور ہمارا موضوع بھی یہی ہے لیکن التزام ہم نے یہ رکھا ہے کہ صرف ''فنونِ لطیفہ'' سے تعلق رکھنے والے معزز خواتین و حضرات کو سروے میں شامل کیا ہے۔ سوشل زندگی سے متعلق ان کی عید کی یادیں منفرد ترین ہیں۔

حسینہ معین

ڈراما نگار

پی ٹی وی کی عید کے حوالے سے ایک ایسی یاد ہے جو بیک وقت اچھی بھی اور بری بھی۔ یہ ۱۹۷۲ء کی بات ہے میرے والد آرمی میں تھے، ایک ایکسیڈنٹ میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔

مجھے پی ٹی وی کی جانب سے عید کا ڈراما لکھنے کو کہا گیا تھا لیکن شدید صدمے کی کیفیت میں، میں نے لکھنا بند کر دیا۔ ٹی وی سے کنور آفتاب، افتخار عارف اور محسن علی آئے اور انہوں نے مجھے سمجھایا کہ ''آپ کے والد آپ کی ہر کامیابی پر بہت خوش ہوتے تھے، آپ ڈراما لکھیں گی تو وہ بہت خوش ہوں گے''۔ ابا کے انتقال کو چند ہی دن ہوئے تھے، میں نے دو تین دن میں ''پپی عید مبارک'' لکھ کر دے دیا۔ یہ پی ٹی وی کے لیے میرا عید کا پہلا ڈراما تھا۔ عید کے



حسینہ معین

ایک دن بعد افتخار عارف نے فون کر کے بتایا کہ ''تمہارا ڈراما بہت کامیاب رہا، لوگوں نے بہت تعریف کی ہے۔'' ''پپی عید مبارک'' کا بہت چرچا ہوا۔ کئی چھوٹے، چھوٹے ایوارڈ بھی ملے۔ لیکن آج تک میں نے یہ ڈراما نہیں دیکھا۔

ایاز خان

کامیڈین

چند برس قبل ایک شو کے لیے امریکا کے ٹور پر



ایاز خان

گیا تھا وہاں پر میں نے عید منائی تھی۔ لاس اینجلس کی مسجد میں تمام پاکستانیوں نے عید کی نماز پڑھی تھی، نماز میں نے پڑھائی تھی۔ وہاں مقیم تمام پاکستانی نہایت محبت اور عزت سے پیش آئے۔ کئی لوگوں نے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ اتنی محبتیں پا کر محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ وطن سے دور ہیں لیکن گھر، بچوں اور بیگم کی کمی بہر حال محسوس ہوئی۔ عید کی رات کو شو ہوا۔ سب نے بہت انجوائے کیا۔ پاکستانیوں کی کثیر تعداد نے بھرپور پزیرائی کی۔

قندیل جعفری
ہوسٹ، شاعرہ

ناروے میں ایک عید شو کیا تھا۔ عید کا دن تھا ظاہر ہے وطن سے دور، سو وطن اور گھر والوں کی بہت یاد آ رہی تھی، جی چاہ رہا تھا کہ پر لگیں اور ہم پاکستان پہنچ جائیں۔ بہت جذباتی کیفیت تھی جب وطن کے ذکر پر میں نے یہ اشعار پڑھے۔

مجھے یہ بات بلبل نے بتائی
جہاں دل مطمئن ہو وہ چمن ہے
یہاں پردیس میں ملتا ہے سب کچھ
مگر اپنا وطن اپنا وطن ہے

وہاں موجود پاکستانیوں نے کہا کہ یہ اشعار ان کے جذبات و احساسات کے ترجمان ہیں۔ تمام پاکستانی بہت جذباتی ہو رہے تھے۔ کئی نے تو یہ تک کہا کہ پردیس میں عید ہمارے لیے خوشیوں کا سندیسہ نہیں، اداسی کا پیغام لاتی ہے.. وطن سے دوری کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔ خود میں بھی اسی کیفیت سے دوچار تھی لیکن اپنی فنی ذمے داری



قندیل جعفری

خوش اسلوبی سے نبھائی۔ سو شو بہت کامیاب اور عید یادگار رہی۔

سمیع ثانی
ٹی وی آرٹسٹ

۱۹۹۶ء میں عابد علی کی پروڈکشن میں ''دوسرا آسمان'' کی ریکارڈنگ کے لیے دبئی گئے تھے ۴۵ دن تک مسلسل ریکارڈنگ کروائی۔ رمضان کا مہینہ تھا تمام فنکاروں کی شدید خواہش تھی کہ عید اپنے وطن اور گھر میں کریں۔ چاند رات کی صبح چار بجے تک ہم نے ریکارڈنگ کروائی اور صبح آٹھ بجے کی فلائٹ



سمیع ثانی

سے ہم کراچی پہنچ گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ سارا دن سو کر گزارا شام کو عید کا بھرپور لطف اٹھایا، یہ احساس بہت دل خوش کن تھا کہ عید اپنے گھر اور اپنوں کے ساتھ منا رہے ہیں۔

صائمہ کنول
اسٹیج آرٹسٹ

پچھلے برس عید کے ایک کھیل کی ریکارڈنگ کروائی تھی، میرا کردار رشتے کروانے والی خاتون کا تھا، عین وقت پر دو کرداروں کا مسئلہ ہو گیا۔ میں نے اپنے شوہر جہانگیر حسن اور پڑوسن خالہ حمیدہ کو رضامند کر لیا۔ دونوں کا کردار مختصر تھا، بس چند مکالمے ادا کرنے تھے۔ خالہ حمیدہ درست ادائیگی نہیں کر پا رہی تھیں ہمارے ڈائریکٹر سیفی حسن نے کہا کہ خالہ جو میں کہوں وہی آپ بھی بول دیجیے گا۔ خالہ راضی ہو گئیں وہی الفاظ دہرانے کے لیے لیکن ہوا یوں کہ ہمیں ہدایت دینے کے لیے سیفی صاحب جو جملہ بولتے خالہ اسی انداز میں بولتیں مثلاً سیفی صاحب نے کہا کیو خالہ نے وہی الفاظ دُہرا دیے



صائمہ کنول

وہاں موجود لوگوں کا ہنستے، ہنستے برا حال تھا خیر کسی نہ کسی طرح شوٹ مکمل ہوا لیکن عید کا یہ ڈراما اور اس کی ریکارڈنگ کے دوران ہونے والی حیران کن پریشانیاں اور دلچسپ لمحات ہمیشہ یاد رہیں گے۔

حنا یسین
ٹی وی پروڈیوسر

ایک عید کے موقع پر ہم نے بچوں کو ڈریم لینڈ لے جا کر ''عید فن ایٹ ڈریم ورلڈ'' کے نام سے پروگرام کیا تھا۔ پانچ مختلف رنگوں کی شرٹس پی ٹی وی نے بچوں کی تیار کروائی تھیں۔

بچوں کے پانچ گروپس بنائے ہر گروپ کی پہچان ان کی شرٹ تھی۔ ان گروپس کے درمیان مقابلے کروائے تھے۔ خاص کر سوئمنگ اور واٹر بوٹنگ کے مقابلوں میں بچوں نے خوب انجوائے کیا ہم نے بچوں کو تحائف بھی دیے۔ ہم اپنے ساتھ حسن جہانگیر اور دو ڈانسر بھی لے کر گئے تھے۔ پروگرام ایاز احمد نے ہوسٹ کیا تھا۔ بچوں نے خوب ہلا گلا کیا اور عید کا بھرپور لطف اٹھایا۔ بچوں کے



حنا نسیم

لیے عید کا نہایت کامیاب شو تھا اور میرے لیے بہت یادگار۔

عرفان قریشی

ڈائریکٹر، آرجے ایف ایم ۱۰۷

بحیثیت پروڈیوسر اور ڈائریکٹر مختلف چینلز سے



عرفان قریشی

وابستہ رہا ہوں ایسے ہی ایک عید شو میں، میں نے اپنی محبت رینا کو دیکھا اور فوراً ہی ان کی نانو کے قدموں میں بیٹھ گیا کہ آپ مجھے اپنا بیٹا بنالیں۔ اس عید شو پر رینا کی دید نے زندگی خوشگوار بنادی۔ اس طرح وہ عید یادگار رہی کہ ہم نے ایک دوسرے کو پالیا۔ گویا وہ عید ہمارے ملن کی بنیاد بنی۔ اس کے علاوہ وہ عید شو بھی ہمیشہ یاد رہے گا جب معین اختر بھائی بھی ہمارے ساتھ شو میں تھے۔

رینا عرفان

ہوسٹ، مغنیہ

گزشتہ برس عرفان قریشی اور میں یورپ ٹور پر گئے۔ ہم دونوں چونکہ ایف ایم اور ٹی وی کے علاوہ میوزک میں بھی انوالو ہیں۔ وہاں ہالینڈ،



رینا عرفان

بیلجیم اور فرانس میں کچھ کنسرٹس شیڈول تھے۔ میٹھی عید بھی ان ہی دنوں میں آئی۔ وہ عید بالکل مختلف انداز کی تھی۔ پہلے دن صبح مسلم کمیونٹی ہال میں نمازِ عید ادا کی۔ دوپہر میں ریہرسل تھی۔ رات کو کنسرٹ۔ اللہ کے فضل سے سب بہت اچھا ہو

گیا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے بچوں کے بغیر عید میں لطف نہیں آرہا تھا مگر جب حیا اور حرمین سے بات ہوگئی تو دل کو سکون بھی ملا اور عید کا لطف بھی آیا۔ کنسرٹ میں پاکستانیوں کے علاوہ غیر ملکیوں کو بھی جھومتے دیکھا تو خوشگوار حیرت ہوئی اور عید کا لطف بھی دوبالا ہوگیا۔ وہ عید کا سب سے یادگار لمحہ تھا جب تقریباً تین ہزار کے قریب حاضرین نے ہمارے ساتھ مل کر اے وطن پیارے وطن گایا تو اپنے پاکستانی ہونے پر فخر محسوس ہوا۔ اس وقت جذبۂ حب الوطنی کو عرفان اور میں نے بڑی شدت سے محسوس کیا۔

ڈاکٹر ندا نسیم کاظمی

اینکر Q ٹی وی

عید کی اصل خوشی یہی ہے کہ ہم اوروں کو بھی اس میں شریک کریں۔ پچھلی دفعہ عید شو کیا تو گھر میں ٹینشن تھی لیکن میں عید شو کے لیے کمٹ کرچکی تھی۔ شو



ڈاکٹر ندا نسیم کاظمی

کے تمام شرکا نے بہت شرارتیں کیں، میں نے بھی بھرپور ساتھ دیا۔ بے شک میرے اندر دکھ تھا لیکن میں

نے اپنی منصبی ذمے داریاں نہایت خوش اسلوبی سے نبھائیں۔

سارہ رضا خان

مغنیہ

چند برسوں سے باوجود شدید خواہش کے عید پر گھر والوں کے ساتھ وقت نہیں گزار پاتی۔ گزشتہ سال چاند رات کو بڑے بھائی کا نکاح تھا اور ٹی وی پر میری لائیو ٹرانسمیشن، بھائی کے نکاح کے فوراً



سارہ رضا خان

بعد ٹی وی چلی گئی پروگرام ختم ہوتے ہی گھر آئی تو سارے مہمان جاچکے تھے صرف گھر والے ہی رہ گئے تھے۔ اگلے دن ہم نے سوچا کہ عید ملن پارٹی رکھتے ہیں۔ لیکن عید کے دن عید کا کنسرٹ کی وجہ سے یہ بھی نہ ہوسکا کہ ہمیں آؤٹ آف سٹی جانا تھا ہمارا نجی پروگرام تو خراب ہوگیا لیکن عید کا کنسرٹ بہت اچھا ہوگیا، بعد میں گھر والوں کے ساتھ عید رنگ تو ہوگئی لیکن بھائی کے نکاح میں بھرپور شرکت نہ کرسکنے کا ملال دل میں رہ گیا۔ اس لحاظ سے یہ عید یادگار رہی۔

عظمیٰ بلوچ

آر جے

ایف ایم ۱۰۱ پر بحیثیت آر جے flood victim کے ساتھ گزاری جانے والی عید بلاشبہ ناقابلِ فراموش ہے۔ جن کا سب کچھ پانی بہا کر لے گیا ہو، ہم ان کے لیے چھوٹی، چھوٹی خوشیاں ساتھ لے کر گئے



عظمیٰ بلوچ

تھے۔ یہ لائیو شو تھا جس کا نام ہم نے ''میٹھی عید کی خاص خوشیاں'' رکھا تھا۔ میں اور میرے ساتھی RJS اپنے پروڈیوسر محمد عارف کے ہمراہ خواتین کے لیے مہندی، چوڑیاں اور بچوں کے لیے کھلونے لے کر گئے تھے۔ بچے اپنے گفٹ پا کر بہت خوش ہوئے تھے۔ ہم سیلاب سے متاثر بچوں اور بڑوں کے تاثرات بھی براہِ راست نشر کر رہے تھے۔ ایک خاتون بے تحاشا روتے ہوئے بتا رہی تھیں کہ میرے بھائی میرے لیے عید پر چوڑیاں اور مہندی لاتے تھے، یہ سن کر عارف بھائی نے چوڑیوں اور مہندی کا پیکٹ انہیں پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''میں بھی تو آپ کا بھائی ہوں'' ہماری جانب سے تسلی کے میٹھے بول اور عملی مظاہرے نے عید کے دن ان کے سوگوار چہروں پر خوشی کے جو رنگ بکھیر دیے تھے۔ تب دل کو جو تسکین ملی تھی وہ ناقابلِ فراموش ہے۔

خوشبو

☆ جب قرآن سے نکلتی ہے تو روح کو پاکیزہ کر دیتی ہے۔
☆ جب نماز سے نکلتی ہے تو مومن کی معراج بن جاتی ہے۔
☆ جب وضو سے نکلتی ہے تو محبت کے پھول بکھرنے لگتے ہیں۔

مصباح رضا سید، فیصل آباد

☆☆☆

قارئینِ کرام! سروے سے جو مجموعی تاثر سامنے آیا وہ یہی ہے کہ فنی زندگی سے وابستہ عید کی یادوں میں بنیادی رنگ ایثار کا ہے۔ بلاشبہ فنونِ لطیفہ سے متعلق حساس دل اور بیدار ذہن ایسے ہی دیوانے ہوتے ہیں، جو اوروں کی خوشی پر اپنی خوشی قربان کر دیتے ہیں۔ اپنے غم بھلا کر خوشیاں بانٹ دیتے ہیں۔ آپ نے پڑھا کیسے ایک عظیم دکھ سے گزرتے ہوئے بھی حسینہ آپا نے ''پہلی عید مبارک'' کی سوغات عوام کو دی۔ بلاشبہ......

یہ بڑے لوگ ہیں جینے کا ہنر جانتے ہیں

لائقِ صد تحسین ہیں یہ ہنر مند جو ''عید، خوشی اور خوشیاں بانٹنے کا دوسرا نام ہے'' محض لفظوں میں استعمال نہیں کرتے بلکہ پوری سچائی سے جذبوں میں نہ صرف محسوس کرتے ہیں بلکہ اس کا عملی مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔ سلام اے زندہ دلانِ وطن سلام۔

قارئینِ کرام! آپ سب کو ہماری اور ادارۂ پاکیزہ کی جانب سے عید مبارک۔ دلی دعا ہے کہ

ہر آنگن میں خوشیوں بھرا سورج ابھرے
چہکتا رہے ہر آنگن عید کے دن

(آمین)

بہنوں کی محفل

مدیرہ

☆ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ!

☆ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

☆ آپ سب کو دلی عید مبارک قبول ہو۔ دعا ہے کہ آپ جہاں، جہاں بھی ہوں صحت و تندرستی کے ساتھ خوشی اور محبتوں کے ساتھ رہیں۔ آپ کی ذات سے اگر کسی کو خوشی نہیں پہنچتی تو آپ کی وجہ سے کسی کو کوئی دکھ یا تکلیف بھی نہ پہنچے اور اس بات کا سب سے زیادہ خیال رکھنا ہے گو کہ اب پہلے کی طرح ملنا کم، کم ہو گیا ہے کہ پہلے خاندان کے چھوٹے اپنے بڑوں کو سلام کرنے چاند رات میں اور پھر عید پر لازمی پہنچا کرتے تھے مگر اب بھی الحمدللہ عید پر بہت رونق ہوتی ہے۔ یہ دن ہمیشہ خاص ہی ہوتا ہے اور سب اپنی، اپنی بساط کے مطابق عید مناتے ہیں...... عید کے دن اگر گھر سے باہر نکلیں تو آنکھوں میں تراوٹ سی محسوس ہوتی ہے پورا علاقہ، پورا شہر صاف ستھرا سا دکھائی دیتا ہے کہ ہر شخص نئے یا صاف کپڑے پہنے خوش باش سا دکھائی دیتا ہے اور یہ صفائی ستھرائی دل میں ایک عجیب سی طمانیت پیدا کرتی ہے اور ہنستے مسکراتے لوگ ہمیشہ خوب صورت دکھائی بھی دیتے ہیں مگر پھر بھی...... ہمارے آس پاس رشتے داروں میں دوستوں میں، روٹھے ہوئے لوگ روٹھے ہی رہتے ہیں وہ اپنے دل میں بغض کی ایک دیوار از خود کھڑی کر لیا کرتے ہیں۔ جب کسی کو ہماری ضرورت نہیں ہے تو ہمیں بھی اس کی پروا نہیں ہے۔ اگر کوئی ہمیں یاد نہیں کرتا تو ہمیں بھی کسی کو یاد کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے اور یوں ہم اپنے بہت سے پیاروں سے پہلے دور اور پھر بہت دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مارے غصے کے انہیں فیس بک سے بھی بلاک کر دیتے ہیں اب یہ کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ جھک جانے میں عظمت ہے، معاف کرنے والے کا درجہ زیادہ بڑا ہوتا ہے کہ جب جان کر بھی نہ جانا جائے تو اس کو شخصیت کا روکھا پن تو ضرور کہہ سکتے ہیں مگر ان سب کی دل کی ویرانی اور منتشر ذہنی کیفیت نہ کسی کو دکھائی دیتی ہے اور نہ اس سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے تو پھر ہم سب لوگ کیوں نہیں باز آتے ایسی حرکتوں سے ایسی باتوں سے جو ہماری خوشیاں کم کر دیا کرتی ہیں (لمحہ فکریہ) عزیز بہنو...... اپنی ذات سے دوسروں کی خوشیاں بڑھا کر دیکھیں تو سہی...... آپ کی اپنی خوشیاں بھی دگنی تگنی ہوتی چلی جائیں گی، انشاء اللہ۔

☆ پیار سے زیادہ پیاری بہنو...... میں جانتی ہوں آپ سب مجھ سے بے حد محبت کرتی ہیں اور ایسی ہی محبت میرے دل میں بھی آپ کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے مگر میں آپ کو ہمیشہ تاکید کرتی ہوں کہ نہ مجھے نہ میری بیٹی کو عید کارڈ تک نہ بھیجا جائے...... اس مہنگائی کے دور میں فضولیات پر پیسے ہرگز نہیں خرچ کرنے چاہئیں کہ آپ کی دعائیں میرے لیے بہت خوب صورت تحفہ بلکہ تحائف ہیں جو مجھے دل سے پسند بھی ہیں مگر اس کے باوجود بعض بہنیں کچھ بھی سمجھنے پر تیار نہیں ہوتیں اور جو اُن کا دل چاہتا ہے وہ کرتی ہیں، یہ سوچے سمجھے بغیر کہ اس سے کوئی دوسرا کوفت میں بھی مبتلا ہو سکتا ہے۔ خیر...... اس وقت مجھے کوفت تو کیا شدید تکلیف ہو رہی ہے۔ ایک نوے سالہ خاتون سے فون پر بات کر کے۔ وہ اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ رہتی ہیں بڑا بیٹا اور اس کی بیوی ان کی چھوٹی بہو کو بالکل پسند نہیں کرتے ان خاتون کی کوئی بیٹی بھی نہیں ہے۔ وہ جب چھوٹے بیٹے کے پاس رہتی ہیں تو وہ اور ان کی بہو...... ان پر یہ احسان رکھتے ہیں کہ آپ کو ہمارا شکر گزار ہونا چاہیے کہ آپ کو ہم نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے اور جب وہ بڑے بیٹے کے پاس جاتی ہیں تو وہ ان پر علیٰحدہ احسان دھرتے ہیں کہ آخر ہمارے پاس آنا پڑا ناں۔ آپ کو تو چھوٹے بیٹے کو عاق کر دینا چاہیے۔ ابا جی کا جو دکانوں کا کرایہ آپ اس کے گھر میں بیٹھ کر خرچ کرتی ہیں وہ اس کو ملنا ہی نہیں چاہیے وغیرہ وغیرہ بات مختصر یہ کہ آج نوے سالہ خاتون نے جب

مجھ سے یہ کہا انجم بیٹی کیا تم مجھے کسی مکان کا کوئی پورشن کرایے پر دلوا سکتی ہو تا کہ میں اپنی زندگی کے بقیہ دن سکون سے کاٹ سکوں تو مجھے انہیں دلاسا دینا اور سمجھانا کتنا مشکل ہو گیا اس کا اندازہ شاید آپ لگا ہی نہیں سکیں۔

★ ★ ★

★ اس سے قبل کہ آپ سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالیں آپ سے ایک ضروری بات اور کرلوں۔ میرا پرانا فون نمبر خراب ہے مجھ سے رابطے کے لیے آپ اس نئے نمبر پر رابطہ کیجیے۔ 021.36964779

★ اور اب آیئے پہلے ایک بار درود ابراہیمؑ پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے ابھی پڑھ لیں اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالمِ اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔

★ ★ ★

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

★ مصنفہ صائمہ اکرم چوہدری، اسلام آباد کے ٹی وی سیریل عنایہ تمہاری ہوئی نے خوب دھوم مچا ہی دی ہے اب عید کے بعد دو چینلز سے صائمہ کے دو خوب صورت سیریلز شروع ہو رہے ہیں۔ (مبارکاں بھئی مبارکاں)

★ پاکیزہ کی نئی مصنفہ حیا ترمذی، کاغان ویلی کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے کاغان انٹرنیشنل اسکول کی پرنسپل بن گئی ہیں۔ (مبارک باد)

★ بفضلِ تعالیٰ میری نواسی ایمیہ نے آغا خان بورڈ سے میٹرک کا امتحان اے ون گریڈ میں پاس کر لیا ہے۔ (ماشاء اللہ)

★ مصنفہ اختر شجاعت کی دوسری کتاب بہت جلد آنے والی ہے۔ (مبارک باد)

★ رمضان المبارک میں ہماری بہت سی تبصرہ نگار بہنیں، قارئین بہنیں عمرے کی ادائیگی کے لیے سعودی عرب گئیں اور بہت سی بہنوں کو اعتکاف میں بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ (آپ سب کو بے حد مبارک باد)

دعائے صحت کے لیے التماس

★ مصنفہ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی کی طبیعت ناساز ہے۔
★ مصنفہ نزہت اصغر، کراچی بسترِ علالت پر ہیں۔
★ مصنفہ شائستہ زریں، کراچی کی والدہ بیمار ہیں۔
★ مصنفہ رفاقت جاوید، اسلام آباد کی طبیعت ناساز ہے۔
★ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ذکیہ ایوب، کراچی علیل ہیں۔
★ پاکیزہ کی مستقل قاری فرزانہ شعیب، سوات بیمار ہیں۔
★ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز تنویر بخاری، کراچی علیل ہیں۔
★ شاعرہ فری جاوید فری، لاہور کی طبیعت ان دنوں ٹھیک نہیں ہے۔
★ پاکیزہ کی مستقل قاری شیریں ظفر، کراچی ہنوز علیل ہیں۔
★ پاکیزہ کی دیرینہ قاری اور تبصرہ نگار رضیہ زبیری، کراچی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔
★ شاعرہ نجمہ اصغر کے...... بچے گرمی کی شدت کی وجہ سے شدید بیمار ہیں۔
★ ہم سب کی لاڈلی امینہ عندلیب، سلانوالی کی طبیعت بے حد خراب ہے۔

مبارک ہو

★ نئی مصنفہ ساجدہ ناز، سندھ کی شادی ہو گئی ہے۔
★ معروف اینکر شائستہ لودھی کا نکاح ہو گیا ہے۔
★ پاکیزہ کی مستقل قاری پروین ملک، کراچی کی منگنی ہو گئی ہے۔
★ پاکیزہ کی مستقل قاری اور شعبۂ تعلیم سے منسلک عمرانہ شہناز، کراچی کی شادی خوب دھوم دھام سے ہو گئی ہے

اور اب وہ عمرانہ ندیم کہلاتی ہیں۔

انتقالِ پُرملال

☆ شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار نجمہ اصغر، کراچی کے والد اور والدہ لو لگ جانے کی وجہ سے انتقال کر گئیں۔

★ اس ماہ عالیہ رضا کی برسی ہے۔

نوٹ: تمام مرحومین کی مغفرت کی دعا کے ساتھ صرف تین مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ کر ان کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کریں۔

✍ **رفاقت جاوید**، اسلام آباد سے۔ ''میرا ناول رنگِ خلش اختتام کو پہنچا۔ جسے سراہا بھی گیا اور یہ بھی فرمایا گیا کہ اس ناول کے سمجھنے کے لیے موٹا دماغ چاہیے حالانکہ ضرورت اس کے برعکس تھی۔ اسی کے پیشِ نظر میں آپ کو اپنی آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی معصوم سی بات سنانا چاہوں گی۔ پروین شاکر کے پاس ایک بہت نامور گلوکارہ تشریف لائی جس کی ازدواجی زندگی برباد ہو چکی تھی۔ وہ اپنے دکھ کا اظہار کچھ یوں کرنے لگی کہ جب میرے بچے چھین لیے گئے اور گھر سے نکال دیا گیا تو میں نگر نگر کے آنسو روئی جب میرے ناول نے نئے موڑ پر نئی زندگی کو جنم دیا تو میں نے ناول کو انجام دے ڈالا۔ تو میری قارئین کو قطعاً اچھا نہیں لگا۔ میں جانتی ہوں کہ پاکیزہ کی تبصرہ نگار خواتین ہر تحریر کو بڑی باریک بینی سے پرکھتی ہیں لیکن کسی نے رنگِ خلش کو ان صاحبہ کی طرح نہیں پرکھا جو تیس سال سے پاکیزہ سے منسلک ہیں، ماشاء اللہ۔ رنگِ خلش عید کے بعد کتابی شکل اختیار کرنے کی تیاری میں ہے جس کا انجام سائرہ کی ازدواجی زندگی کے تجربات و مشاہدات پر مبنی ہے۔ وہ نمرا کو ہتھیار پھینکنے کے بجائے ہتھیار استعمال کرنے کے گر سکھاتی ہے کیونکہ یہی عورت کی عزتِ نفس، وقار اور معراج ہے۔ میرا ہر ناول اور ہر کہانی سچائی پر مبنی ہوتا ہے ہمارا معاشرہ ایسے کتنے ہی نفسیاتی مسائل کو جنم دیتا ہے جو حال کا روپ دھار کر تاریخ کو دُہراتے رہتے ہیں۔ سیمنٹ بجری کے بنے ہوئے مکانوں میں محبت جیسے میٹھے سُریلے جذبوں سے عاری بسنے والے مکین نئی نسل کی پرداخت بہتر طریقے سے کرنے سے قاصر ہوتے ہیں کیونکہ مرد مکان بناتا ہے اور عورت اسے گھر بنانے کی تگ و دو کرتی ہے۔ دو ہستیوں کے نظریات میں یکجہتی اور ہم آہنگی سے ایسے گھروں میں پھول و کلیاں مسکراتی ہیں۔ صنفِ قوی کو اللہ تعالیٰ نے ہم پر فوقیت دی ہے اس کے تعاون کے بغیر کارِ جہاں کا حسن ماند پڑ جاتا ہے۔ اس لیے ذمے داری بھی اسی کے زمرے میں آتی ہے۔ اس کہانی کے کردار آپ کو اپنے آس پاس ہی ملیں گے ذرا آنکھیں کھلی رکھیں تا کہ ظلم کو پہچان سکیں۔ کان کھلے رکھیں تا کہ فریاد کو سن سکیں۔ عادل جیسے بچے جو معاشرے کا ناسور ہیں ممکن ہے ان کی تعداد میں کمی واقع ہو جائے اور وہ بچیاں جو معصوم ہیں ان کی شنوائی ہو سکے۔ ریب ایک نفسیاتی مرض ہے اس بیماری کی دوا آپ کے دواخانے میں موجود ہے۔ اس کا نام ہے اپنے حقوق کی شناسائی۔ ذرا ڈھونڈیں اور صنفِ قوی کو پہچانیں اگر وہ بے پروا، خود پسند اور تنہائی کو اولیت دیتا ہے، جذبات و احساسات سے محروم ہے تو وہ اپنی شریکِ حیات کو ہر پل کچوکے لگائے گا، زبان سے نہیں اپنی خاموشی کی تیز دھار تلوار سے۔ اگر ہر بات پر قیل و قال کر کے نیچا دکھانے کی کوشش اس کی فطرت میں ہے تو اس کی محبت بھی لہولہان ہو گی۔ اگر وہ فرعون بن کر اپنی طاقت اور اختیارات کو منوانا چاہتا ہے تو اس کی چاہ ریت کے ذروں کے مانند ہو گی جو ہر وقت آنکھوں کو اشکبار رکھے گی۔ جو اپنے ہم سفر کو عزت و تحریم کی نگاہ سے دیکھے گا۔ اس کے ساتھی کے بطن سے محبت و مسرت جنم لے گی۔ عورت کے بروقت فیصلے سے ان گنت بدنما رنگوں پر شوخ و شنگ رنگوں کی چھاپ لگ جاتی ہے اور نئی نسل کی پرداخت شوریدگی، انتشار اور آہ و بکا کے ماحول کے بجائے مسرت و طمانیت کے کھٹولے میں ہونے لگتی ہے۔ عورت کی قربانی اس کے اعلیٰ اخلاقیات و بلند کردار کی نشاندہی کرتی ہے۔ ہماری مشرقی تربیت نے ہمارے پاؤں جکڑ رکھے ہیں لیکن جب قدم اٹھانے کی ہمت بحال کی جاتی ہے تو دنیا ہم پر وسیع ہو جاتی ہے اور رحمتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ میں بات علیحدگی کی نہیں کر رہی۔ اپنے حقوق کے حصول کے لیے سوچیں۔ ماں جس کی بے لوث محبت و ایثار کا جواب نہیں وہ بھی اپنے بچے کو دودھ رونے پر ہی پلاتی ہے۔ سائرہ بن کر زندگی گزارنے سے مسائل کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل نکلتا ہے۔ یہ میرے ناول کی تھیم تھی کہ محتاجی سے بہتر خود اعتمادی ہے جس میں

آزادی اور کامیابی ہے۔'' (رفاقت بہن آپ کی آرا پہنچائی جارہی ہے، ابھی ہماری قارئین بہنیں ناول سے متعلقہ آپ سے سوالات بھی کریں گی۔ ہم آپ کو وہ تمام سوالات ارسال کردیں گے، مجھے امید ہے کہ آپ کے جوابات سے بھی پڑھنے والی بہنوں کی تشفی ہوگی اور ان کی معلومات میں بھی اضافہ ہوگا)

✉ ستارہ آمین کومل، پیرمحل سے۔''جون کا شمارہ شاندار رہا...... ہماری لنگوٹی حیا بخاری اور پیاری بجو صدف آصف جو شامل تھیں بہت اچھا لکھتی ہیں ماشاءاللہ یار بجو اور پیاری لنگوٹی جلدی، جلدی آیا کریں ناں...... بندی انتظار کرتی ہے۔ نزہت آپا نے بھی خوب لکھا۔ شیریں حیدر ویل ڈن ان کی حاضری اچھی لگتی ہے۔ صائمہ اکرم کی اسٹوری خوب رہی...... نوک جھوک سے محظوظ ہوتے رہے ہم اور جناب باقی سب نے بھی شاندار لکھا...... سب کو شاباش...... آپ کی پرانی اور مستقل قاری عارفہ.... کراچی مجھے پاکیزہ کا باقاعدہ قاری بنا کر خود غائب...... مس یو آپی اب آپ تو رابطہ بھی نہیں کرتیں آجائیں ناں...... اب عید نمبر پر اک نظر نگہت سیما کا ناول اچھا ہے۔ قیصرہ حیات بھی اب بہت اچھا لکھیں گی۔ نبیلہ ابر راجا، ظالم خاتون میں نہیں بولتی، اب ہاں کتنا رلایا آپ نے۔ بشریٰ گوندل ویل ڈن آپ کو دیکھ کر اچھا لگا۔ باقی سب نے بہت اچھا لکھا سب کو شاباش... سیما یاسمین مجتبیٰ کو پکڑیں ذرا تفصیلی انٹرویو لیں۔'' (تبصرے کا شکریہ...... اب بے فکر رہیں سیما یاسمین بھی انٹرویو کے کٹہرے میں ضرور آئیں گی)

✉ سیدہ غزالہ عالم، کراچی سے۔''طویل غیر حاضری عرصہ 10 سال کے بعد دوبارہ آگئی ہوں کیا تھی یہ زندگی جس میں اپنے تین عدد معصوم بچوں کے ساتھ اور اپنے ہم سفر کے ساتھ...... مگر بہنوں کی ناگہانی موت نے سب کچھ ختم کر دیا یکے بعد دیگرے تین موت نے زندگی بدل دی۔ کچھ اچھا نہیں لگتا...... والدہ کے انتقال کے بعد باجی ظفرانہ 2010ء 23 مئی پھر رعنا عالم باجی کا 16 جولائی 2011ء کبھی نہیں بھولے۔ ہم سال میں تین، تین برسیاں مناتے ہیں نومبر میں والدین پھر 23 مئی 16 جولائی اس لیے اب کچھ اچھا نہیں لگتا۔ پاکیزہ کے تمام سلسلے ویسے ہی خوب صورت ہیں۔ پتا نہیں جگہ ملے گی یا نہیں کیونکہ اب دل مرچکا ہے، اب کچھ اچھا نہیں لگتا تو شاید آپ بھی ہمیں جگہ نہ دیں۔'' (گڑیا یہ تمہارا اپنا پرچہ ہے، تم جم جم آؤ...... تم تو میرے دل میں رہتی ہو...... پہلے کی طرح شرکت کرو)

✉ عائشہ اعوان، رحیم یار خان سے۔''ٹائٹل بہت اچھا تھا کیونکہ دوپٹے کے ساتھ تھا۔ بڑی، بڑی آنکھوں کے ساتھ عروبہ گلابی دوپٹے کے ساتھ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ انجم باجی کی محبت بھری باتوں نے دل موہ لیا۔ واقعی غریبوں کو ہماری ضرورت ہے اور خاص کر عید کے لحات میں تو ہمیں ان کی دل کھول کر مدد کرنی چاہیے۔ کہانیوں میں غزالہ فرخ کی چاندرات اور دروازہ اچھی تحریر تھی۔ سارہ ملک کی جو کے برابر نیکی، بہت زبردست تھی۔ رمضان کے مبارک ماہ کے بارے میں بہت خوب صورت انداز میں لکھا گیا۔ مبارک ہو۔ شیریں حیدر کی زندگی خاک نہ تھی، پڑھی اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ اختر شجاعت نے خشیت الٰہی میں سرکار مدینہ جناب محمد ﷺ کے جو ارشادات قلم بند کیے ہیں۔ پڑھ کر دل کو سکون ملا۔ بہنوں کی محفل میں آمنہ عندلیب کی علالت کا پڑھا دعا ہے کہ اللہ پاک ان کو جلد صحت یاب کرے، آمین...... جلترنگ خوب رہا ایک جملہ بہت پسند آیا...... جملہ...... چھوٹے قد کی رقیہ اپنا دو انچ اونچا جوڑا گدی سے نوچتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔ اس جملے پر بہت ہنسی آئی۔ روحانی مشورے بہت اچھے تھے۔ اس طرح ہمیں دین کی باتیں ہمیشہ یاد رہتی ہیں۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

✉ ام ایمان قاضی، کوٹ چھٹہ سے۔''نگہت سیما کے ناول کو پڑھا ہنوز دلچسپی برقرار ہے۔ فرحین اظفر کی کہانی پڑھ کر ایک تھکن سی رگ و پے میں سرائیت کرگئی۔ عورت اور قربانی لازم و ملزوم ٹھہرے۔ خیر آخر میں پھر بھی سب کچھ بہتر ہوگیا۔ متاع دل پڑھ کر کچھ حیرانی ہوئی کہ آج کے دور میں دُرِیکتا جیسا کوئی معصوم بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے اردگرد سازشوں کے تانے بانے بُنے ہوئے ہیں اور اسے کسی ایک بات یا عمل سے احساس ہی نہیں ہورہا۔ نگہت اعظمی کا افسانہ پڑھ کر دنیا میں ہی مکافاتِ عمل کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے پر یقین آگیا۔ قیصرہ حیات کے ناول کی شروعات اچھی ہے اور ناول کا تھیم بھی...... آگے چل کر مزید اچھا ہوجائے گا۔ چاندرات اور دروازہ ایک اچھی تحریر تھی۔ جوانی اور بڑھاپے کے خواب اور اندیشوں کے درمیان سفر کرتی ہوئی...... سب سے زیادہ متاثر مجھے سارہ ملک کے ناولٹ جو کے برابر نیکی نے کیا۔ وارث،

مرد کی فطرت کے کئی پہلو روشن کرتی ہوئی تحریر تھی۔ نورعین کا ناممکن بھی اچھا رہا۔ شیریں حیدر ہمیشہ کی طرح کچھ اچھا ہی لاتی ہیں۔ ان کی کہانی پر تبصرہ کہانی مکمل ہونے کے بعد کروں گی۔ آخری پرچہ اور بخشش کا در کھلا بھی سبق آموز تحاریر تھیں۔ عورت کی مخصوص عادات کے حوالے سے۔ شمع ہدایت میں اس بار خشیت الٰہی کا موضوع دل میں ڈھیروں ندامت جگا گیا کہ اس غافل زندگی کے ساتھ ہم کس منہ سے اللہ کے سامنے جائیں گے۔ رمضان کے حوالے سے مختلف شخصیات سے سروے اچھا لگا۔ ڈاکٹر زاہدہ پروین نے بچیوں کے حوالے سے بہت اہم بات کی طرف دھیان دلایا۔ نزہت جبیں ضیا کی زبانی ان کے بیٹے کی شادی کا حال اچھا لگا۔ پاکیزہ ڈائری میں رمضان کے حوالے سے اقتباسات اچھے لگے۔ جلترنگ پڑھ کر آپا میں بہت دفعہ آپ کی ذہن کی زرخیزی پر حیران رہ جاتی ہوں۔ (شکریہ)

✉ عظمیٰ زہری، اوستہ محمد سے۔''اس بار دین کی باتیں دیکھ کر لگا جیسے میری کھوئی ہوئی چیز مل گئی ہو۔ مجھے کچھ کہنا ہے اس بار سب سے اعلیٰ رہا۔ خصوصی مضامین میں سب کچھ ہر بار سے ہٹ کر ملا خصوصاً شائستہ زریں کا سروے، میں اکثر گنگناتی ہوں میں ساری بہنیں خوب سے خوب تر گنگنا رہی تھیں۔ عظمیٰ آفاق سعید کے قلم سے ہمیشہ ہی شگوفے پھوٹتے نظر آتے ہیں ہمیشہ سو میں سو نمبر تو آپ کے ہاتھ میں تھامے قلم سے لکھے پاکیزہ ڈائری کو ملتے ہیں۔ حمیرا نوشین نے بخشش کا در کھلا لکھ کر غیبت جیسے گناہ سے بچنے کو کہا اس ماہ مبارک کے مہینے میں ایسے گناہوں سے کیسے بچا جائے یہ ہمیں پڑھنے کو ملا۔ سارہ ملک کے لکھے جو کے برابر نیکی میں بہت ہی پیارے طریقے سے مریم نے ہمیں چھوٹی، چھوٹی باتوں کا احساس کروایا۔ زندگی خاک نہ تھی، شیریں حیدر کے ہاتھوں کی کہانی خاص سمجھ میں نہیں آئی۔ آگے آئندہ اقساط پڑھیں گے تو ہی پتا چلے گا کہ وہ کہنا کیا چاہتی ہیں ناممکن اور آخری پرچہ میں ہمیشہ کی طرح پر ہاں خاص، خاص موقعوں کی طرح اللہ پر یقین اس کی بڑائی و کبریائی پڑھنے کو ملی اللہ تعالیٰ کے آگے ممکن اور ناممکن کچھ بھی نہیں ہے۔ ...صرف کُن کی کہنے کی دیر ہوتی ہے وہ ہر چیز پر قادر ہے، متاع دل کیا لکھوں اس کے بارے میں نبیلہ ابر راجا اپنی سیٹ اپنی جگہ اپنے ہاتھ کی خاصیت کو چھوڑنے کو تیار ہی نہیں یہ کہانی دُرِیکتا کی وجہ سے اونچی اڑان بھرتی جارہی ہے اب تو ان کے شوہر نامدار کی اچھی خاصی انٹری ہوگئی ہے کہانی میں اب تو کہانی اور دلچسپ لگے گی۔ قیصرہ حیات کی آخری امید نے زبردست تاثر چھوڑا اپنی پہلی قسط میں ہی میرے دل و دماغ پر چھاگئیں۔ نگہت سیما کے اعتبار وفا نے بہت اچھی وفا نبھائی ہے ان کے ساتھ بھی اور ہمارے ساتھ بھی روزِ اول کی طرح ستارہ بن کر چمک رہی ہے یہ کہانی پاکیزہ چاند ہے اور ہر مہینے اس میں ناول، ناولٹ، منی ناول، افسانے اور باقی ساری چیزیں ستاروں کی طرح چمکتی نظر آتی ہیں۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

✉ حمیرا ملک، سیالکوٹ۔ یقیناً آپ نے فرضی نام سے خط لکھا ہوگا اور خط کسی طور پر بھی اشاعت کے قابل نہیں ہے مگر تمہاری زندگی کی کہانی پڑھ کر واقعی میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ تمہارا فون نمبر میں نے سنبھال کر رکھ لیا ہے اگر کسی مستند این جی او کے بارے میں مجھے معلوم ہوا تو میں ان کو تمہارا نمبر ضرور دے دوں گی مگر ایک بات یہ سمجھانا چاہتی ہوں کہ تم اپنے کپڑوں کی پبلیسٹی ٹی وی چینلز پر ہی کیوں کرنا چاہتی ہو۔ اگر تم اپنے گھر میں بیٹھ کر اپنے ڈیزائن کیے ہوئے کپڑے بیچنا چاہتی ہو تو فیس بک پر اپنی بوتیک کا اشتہار لگا دو، یہ کام تو اس طرح بھی کیا جاسکتا ہے۔

✉ مسز نزہت اشفاق، کراچی سے۔''سلسلے وار ناولوں میں قیصرہ حیات کے ناول کی قسط بہت اچھی لگی۔ شیریں حیدر تو بہت اچھا لکھتی ہیں اور ہماری پسندیدہ رائٹر ہیں۔ نگہت اعظمی کا ناولٹ بہت پسند آیا۔ دیگر افسانوں میں غزالہ فرخ، سویرا ملک، نورعین، تسنیم منیر علوی نے متاثر کیا۔ شائستہ زریں کا سروے ہمیشہ ہی بہترین ہوتا ہے۔ خصوصی مضامین ڈاکٹر زاہدہ پروین اور اختر شجاعت کے مضمون اچھے لگے۔ شادی میرے شہزادے کی تو پہلے بھی شائع ہوا تھا اور اب بھی اچھا لگا۔'' (کیوں نہ اچھا لگتا کہ ہر ماں کے لیے اپنا بیٹا اپنا شہزادہ ہی تو ہوتا ہے اور ہر ماں کو اپنا دولہا بنا بیٹا سب سے زیادہ خوب صورت لگتا ہے)

✉ فریدہ سجاد، کراچی سے۔''پاکیزہ باقاعدگی سے پڑھتی ہوں مگر مصروفیات کے باعث انجم کو فون بھی عرصے بعد کیا کرتی ہوں اس دفعہ تو انجم تمہارا فون ہی نہیں مل رہا تھا۔ (میں نے پہلے بھی اسی محفل میں اپنا نیا فون نمبر لکھ دیا تھا اب آپ نوٹ کرلیں ... 02136964779) اس دفعہ کے تمام افسانے ناولٹ بہت پسند آئے۔ خاص طور پر جلترنگ کی

بات ہے۔ (آپ کی پسندیدگی کا شکریہ) ہاں سیما مناف سے میرے بچے نے پڑھا ہے ان کی بھانجی کے انتقال کا بہت افسوس ہوا کہ اس بچی کو ہم نے دیکھا تھا۔'' (آپ کی تعزیت سیما مناف تک پہنچائی جا رہی ہے)

صوفیہ اختر، کراچی سے۔ ''سب پاکیزہ بہنوں کو پہلے عید کی اور پھر یوم آزادی کی مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک میں اور ہمارے شہر میں ہمیشہ امن و امان رکھے اور رزق کی فراوانی ہو، آمین۔ جولائی کا پاکیزہ بہت اچھا لگا مگر مجھے فیشن کے صفحات کی کمی ہمیشہ محسوس ہوتی ہے۔ نئے لباس، نئے انداز سے بہت سے لوگ بہت کچھ سیکھا کرتے ہیں۔ شادی میرے شہزادے کا عنوان دیکھ کر یوں لگا جیسے عمیر کی شادی کی شاید سالگرہ کا احوال ہوگا۔ خیر اچھا لگا۔ (سب کے بیٹے سب کے لیے اپنے، اپنے عمیر ہی ہیں اس لیے ہر بیٹا ہی شہزادہ ہوتا ہے) ناولٹ میں مجھے نگہت اعظمی کی تحریر پسند آئی۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ وہ دوبارہ شروع ہوگی۔ میں بڑی شدت سے انتظار کر رہی ہوں کہ مارکیٹ میں جو اُن کی کتاب آئی تھی اب وہ بھی ختم ہو چکی ہے۔ ہاں جلترنگ اور بہنوں کی محفل اس دفعہ بھی سرفہرست رہی۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے سرگرمیوں میں میری بیٹی سمیعہ اختر کی نیوز لگائی۔'' (پیاری صوفیہ پاکیزہ کی پسندیدگی کا شکریہ، اللہ کرے کہ آپ ہر ماہ اپنی خوشیوں کی نیوز ہمیں دیں اور ہم انہیں لگائیں۔ ہاں ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا انشاء اللہ ہم جلد لگائیں گے۔ ہاں آپ کو اور تمام بہنوں کو بھی یوم آزادی مبارک ہو)

نگہت اعظمی، کراچی سے۔ ''مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کی والدہ کے انتقال کے دکھ کو اتنے بڑے غم کو الفاظ کے ذریعے کیسے کم کیا جا سکتا ہے۔ یہ تو ایسا دکھ ہے جو وقت کے ساتھ کم نہیں ہوتا بلکہ جیسے، جیسے وقت گزرتا ہے والدین کے نہ ہونے کا احساس شدت اختیار کرتا جاتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ جب تک والدین زندہ رہتے ہیں ہمیں ان کے ہونے کا احساس اتنا نہیں ہوتا جتنا ان کے چلے جانے کے بعد ان کے نہ ہونے کا ہوتا ہے۔ لگتا ہے جیسے انسان بھری دوپہر میں جلتے سورج کے نیچے کھڑا ہے اور سر پر کوئی سایہ نہیں ہے۔ مجھے یاد ہے میری ان سے اکثر ملاقاتیں نسرین باجی کے گھر میں ہوتی تھیں۔ ہمیشہ میں نے ان کو نک سک سے تیار دیکھا۔ ان کا انداز بہت مشفقانہ تھا۔ نسرین باجی اور ان کا ساتھ بہت پرانا تھا۔ وہ کہتی ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ ایک ماں کی طرح میرا خیال رکھا۔ وہ میری ہر مشکل میں میرے کام آتی تھیں۔ وہ برملا اس بات کا اظہار کرتی ہیں کہ آج میرے بچے جس مقام پر ہیں اس میں ان کے بچوں کا بہت ہاتھ ہے۔ انہوں نے میرے بچوں کی تعلیم میں جس طرح میرا ساتھ دیا۔ میں اسے بھول نہیں سکتی۔ ان کا گھر میرے لیے میکے کی طرح تھا۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جو بھی اس دنیا میں آیا ہے اسے ایک نہ ایک دن اس دنیا سے جانا ہے۔ انسان کے اس ظاہری جسم کو ایک دن فنا ہو جانا ہے۔ بس صرف نیکیاں ہیں جو باقی رہنے والی ہیں۔ یقیناً آپ کی والدہ نے جو نیکیاں کی ہیں وہ روشنی بن کر ان کی قبر میں اجالا بکھیر رہی ہوں گی۔ آپ کے لیے یہ بات کتنی سکون بخش ہے کہ آپ کی والدہ نے ایک کامیاب زندگی گزاری۔ اپنے بچوں کی اعلیٰ تربیت کی اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیے اور انشاء اللہ خدا ان کی نیکیوں کا اجر ضرور اور ضرور دے گا کہ وہ ایسا رحمٰن اور رحیم ہے کہ ایک نیکی کا ستر گنا زیادہ اجر دیتا ہے۔'' (بے شک، الٰہی آمین ثم آمین)

صفیہ بیگم، لالہ موسیٰ سے۔ ''سب پاکیزہ بہنوں کو عید مبارک۔ پاکیزہ کا ہر شمارہ میرے لیے خاص ہوتا ہے۔ اسے نہ صرف میں بلکہ ہماری فیملی کے تمام افراد ہی بے حد شوق ذوق سے پڑھتے ہیں اور اس سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ انجم باجی ہمارے آپ دل میں بستی ہیں اور ہر روز ہماری دعاؤں میں شامل رہتی ہیں۔ یوں تو مجھے اس کے افسانے ناول سب ہی اچھے لگتے ہیں مگر ذیشان کی شادی کا احوال گوکہ مختصر ہی شائع ہوا تھا بہت اچھا لگا تھا۔ ہم شدت سے اس کے تفصیلی احوال پڑھنے کے منتظر ہیں اور ہر بار دیر ہو رہی ہے۔ میری خصوصی مبارک باد محترمہ عذرا رسول کو پہنچا دیں کہ آپ کے لکھے ہوئے ہر لفظ کو ہم نے بہت محبت سے پڑھا ہے۔'' (عذرا رسول شکریہ کہتی ہیں)

نجمہ اصغر، کراچی سے۔ ''انجم باجی، میں تو اپنی بیماری کی وجہ سے پریشان رہتی تھی مگر کراچی کی قیامت خیز گرمی نے تو مجھے ہلا کر بلکہ لرزا کر رکھ دیا۔ اس گرمی میں روزے کی حالت میں میرے والد انتقال کر گئے۔ والدہ کی حالت ہنوز خراب ہے۔ بچے بھی تاحال بیمار ہیں۔ آپ سے رابطہ اس لیے کیا ہے کہ آپ دعا کیجیے گا کہ میری ماں، میرے بچے ٹھیک ہو جائیں۔'' (پیاری نجمہ تم بالکل پریشان مت ہو۔ میں اور ہماری سب بہنیں آپ سب کے لیے دعا کریں گی اور اللہ تعالیٰ آپ کی تمام پریشانیوں کو ختم کر دے گا۔'' (انشاء اللہ)

نور افشاں، شکار پور سے۔ ''باجی آپ کو خوشی کی خبر سنانی تھی۔ میرے مضامین یہاں کے سندھی اخبار میں باقاعدگی سے شائع ہو رہے ہیں (بے حد مبارک باد) اور جب میں سب کو فخر سے بتاتی ہوں کہ میں پاکیزہ کی تبصرہ نگار بھی ہوں تو سب کو اچھا لگتا ہے۔ انجم باجی آپ سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ آپ کی باتیں، مشورے میرے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ آپ کسی بھی بہن کو کوئی بھی مشورہ دیں یا نصیحت کریں، میں اسے پلو سے باندھ لیتی ہوں۔'' (پیاری بیٹی تم ایک بہت اچھی لڑکی ہو جو دوسروں کے تجربے سے بھی فائدہ اٹھانا جانتی ہو اور ایسے لوگ ہمیشہ کامیاب رہتے ہیں۔ تمہارے لیے بے شمار دعائیں)

مسز رضا، لاہور سے۔ ''بہت عرصے بعد اس محفل میں آئی ہوں اور یہ بتانا چاہتی ہوں کہ جب ماں بیمار ہوتی ہے تو بیٹیاں ان کی خدمت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑا کرتیں۔ بیمار ماں اگر چڑچڑی بھی ہو جائے تو ان کی چڑچڑاہٹ تک کو برداشت کر لیا کرتی ہیں اور اگر یہی سب کچھ ساس کے ساتھ ہو تو کہا جاتا ہے کہ اس حد تک میں نہیں کر سکتی ہوں۔ میں یہ کہنا چاہتی ہوں ایک بیمار کی جب خدمت کی جاتی ہے تو اس وقت وہ ساس نہیں ہوتی وہ بس ماں ہوتی ہے کہ ماں کی شکلیں تو بہت سی ہوتی ہیں۔'' (مسز رضا آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں اور میں آپ سے متفق ہوں۔ جب چند سال پہلے میں نے اپنی بیمار ماں کو آئی سی یو میں بیڈ پین دیا تھا تو یہ احساس اسی وقت دل میں سرایت کر گیا تھا کہ میں یہ کام کسی بھی بیمار عورت کا کر سکتی ہوں نہ تو مجھے گھن آتی تھی اور نہ ہی کوئی مسئلہ ہوا تھا کہ عورت ماں ہی تو ہے)

سمیعہ اختر، کراچی سے۔ ''آپ کا بہت شکریہ ہماری امی کا خط شائع کر کے خوش کر دیا۔ پاکیزہ ایک نہایت منفرد اصلاحی، تفریحی اور ادبی رسالہ ہے جو تربیت کے تمام تقاضے پورے کرتا ہے۔ اس کی اکثر تحاریر پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ گویا یہ تو میرے بھی دل میں تھا۔ اس دفعہ جس تحریر نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ رمضان المبارک کے بابرکت مہینے کے حوالے سے اپنی لغزشوں اور کوتاہیوں کو سنوارنے کا راستہ دکھانے والی تحریر جو کے برابر نیکی ہے۔ اتنی چھوٹی، چھوٹی باتیں جن کو ہم گناہ کے زمرے میں شامل ہی نہیں کرتے کس قدر خرابیاں پیدا کرتی ہیں۔ مبارک باد سائرہ اتنی خوب صورت تحریر لکھنے پر۔ باقی سارے سلسلے حسبِ معمول زبردست تھے۔ اللہ تعالیٰ پاکیزہ کو اور اس کو سنوارنے اور نکھارنے والے ہاتھوں کو ہمیشہ قائم و دائم رکھے، آمین۔'' (نوازش)

ارم کمال، فیصل آباد سے۔ ''اس دفعہ پاکیزہ 26 تاریخ کو ملا تو دلِ بے قرار کو قرار آیا۔ ٹائٹل بہت یونیک رہا۔ اداریے میں آپ نے بہت ہی پیاری بات کی جس کا حکم ہمیں ہمارا خدا بھی دیتا ہے اچھے کے ساتھ پیش آنا تو کوئی بڑی بات نہیں۔ برے لہجوں اور رویوں کے ساتھ خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی سے پیش آنا ہی آپ کی کامیابی ہے۔ سلسلے دار ناول اعتبارِ وفا اپنے مخصوص انداز میں رواں دواں ہے۔ متاعِ دل کا چوتھا حصہ سوگوار کر گیا۔ شاہ زیب بیچارہ سب کو روتا چھوڑ کر چلا گیا۔ اب خدا دُرِ یکتا کو اپنے بہت اپنوں کے شر سے بچائے۔ حیا بخاری کا ابرِ رحمت بہت ہی دلنشین تحریر تھی۔ کانچ کے خواب بھی جو سگے اور سوتیلے کے گرد گھومتی ہوئی تھی لیکن خدا کسی کا صبر ضائع نہیں کرتا۔ گھنی شیریں حیدر کی شاہکار تحریروں میں سے ایک تحریر تھی۔ چلو ہم ساتھ چلتے ہیں میں احیان اور بسمہ دونوں نے پوری عزت اور وقار سے ایک دوسرے کو پایا۔ صائمہ اکرم کو اتنی خوب صورت تحریر پر ڈھیروں مبارک باد کے ٹوکرے قبول ہوں۔ اسیرِ وفا کا دوسرا اور آخری حصہ چاہتوں، محبتوں کے گرداب میں گھومتا ہوا دانیہ کا یقین بڑھا گیا کیونکہ دانیہ نے سب کی محبتوں کو اولیت دی اور کامیاب ٹھہری جبکہ رومانہ نے صرف اور صرف اپنی محبت کو آگے رکھا اور اس خود غرض محبت کی بدولت نامراد رہی۔ اختر شجاعت کا مضمون شمعِ ہدایت روح میں اتر کر دل میں جذب ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے استفادہ حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ اختر شجاعت کے لیے دل سے ڈھیروں دعائیں نکلیں۔ نیلم احمد بشیر سے ملاقات بہت بھرپور رہی ان کی سیدھی سچی اور بے ریا گفتگو نے دل موہ لیا۔ شائستہ زریں کا سروے ہر گھر کا سروے تھا۔ واقعی بجٹ کی گرمی کے

آ کے موسم کی گرمی کچھ بھی نہیں۔ بہنوں کی محفل ہم سب کی محبتوں اور چاہتوں کا پلیٹ فارم ہے جہاں انجم آپی پیار اور محبت کی زرینیں چلاتی ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز ضیا کو میری امی صادقہ جاوید کا سلام، میری امی اور ڈاکٹر ممتاز ضیا کا کراچی میں النور اسپتال میں کافی ساتھ رہا۔ جلترنگ حسب معمول قہقہے بکھیرتا گیا۔ پاکیزہ ڈائری عظمیٰ بہت محنت سے سجاتی ہیں۔ میں اکثر گنگناتی ہوں اور سندیسے کا رنگ ہی سب سے پیارا اور نیارا ہے۔ میری طرف سے انجم آپی کو خصوصاً اور کوثر خالد، پروین افضل شاہین، امینہ عندلیب اور بقیہ تمام بہنوں کو پاکیزہ کے تمام اسٹاف کو عید کی ڈھیروں مبارک باد قبول ہو۔'' (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے)

٭ فریدہ افتخار، اسلام آباد سے۔ ''عرصہ چار ماہ بعد اپنے وطن لوٹی ہوں۔ محترمہ عذرا رسول صاحبہ کو بیٹے کی شادی کی مبارک باد اللہ جوڑی سلامت رکھے، آمین۔ عظمیٰ کے سفرنامے نے خوب، خوب سیر کروائی جن، جن جگہوں میں نہ جاسکی اب وہاں کی سیر بھی ضرور کروں گی۔ ارے ہاں یاد آیا یہ شمیم فضل خالق نے ہم سے بڑا زبردست دوستوں والا گلہ کیا ہے کہ میں ان کے افسانوں پر تبصرہ نہیں کرتی۔ اگر میں تبصرہ کر کے تعریف کروں گی تو لوگ اسے اقربا پروری کا نام دے لیں گے کہ فریدہ افتخار نے تو تعریف کرنی ہی ہے کہ آپ میری دوست ہو۔ ارے ظالم، پاکیزہ سے جان پہچان بھی تو آپ کے ہاں آپ کی مہمان نوازی کے مزے لیتے ہوئے رسالے میں آپ کی تحریر پڑھ کر ہوئی تھی اور یہ ایسا منتر تھا جو ابھی تک چل رہا ہے بس ایک نشہ ہے پاکیزہ۔ اب اس میں آپ کی تحریروں، شمیم فضل خالق کا کمال ہے یا پھر انجم انصار کی وہ ان دیکھی محبتیں جو صرف میں ان کی نگارشات میں محسوس کر سکتی ہوں اور مجھے یوں لگتا ہے کہ شاید وہ صرف ہمارا خیال رکھتی ہیں نہیں بلکہ یہ ہر قاری لکھاری بہن کا سونی صد خیال ہے اور ہوگا۔ شمیم فضل خالق کی مختصر مگر حقیقت پر مبنی کہانی پسند آئی۔ تمنئی، شیریں حیدر نے خوب بجادی۔ انجام دل کو چھو گیا۔ ساسیں دل بڑا رکھیں، بہوؤں کی غلطیاں نظر انداز کریں بے جا تنقید نہ کریں تو ساس، بہو اچھی دوست ہو سکتی ہیں۔ الحمدللہ ہم اس معاملے میں خوش قسمت ہیں۔ اعتبار وفا اچھا جارہا ہے۔ متاع دل فی الحال خاندانی ریشہ دوانیوں کی زد میں ہے۔ ابر رحمت، دھوپ چھاؤں لیتا ہوا آخر ماہ نور پر برس ہی پڑا کہانی کا انجام خوب تھا۔ رنگ خلش کو خوب صورت موڑ دے کر رفاقت جاوید نے کہانی میں ایک خود پسند مغرور انسان کو بالآخر جھکنے، موم ہونے پر مجبور کر دیا۔ وہ بھی شاید اس لیے کہ اس کا اپنا بیٹا معذور ہو کر محتاج ہو گیا تھا۔ نمرا کی زندگی کا امتحان بھی اب سود کے ساتھ ہونے والا ہے۔ صائمہ اکرم چوہدری کا چلو ہم ساتھ چلتے ہیں احیان اور بسمہ کو آخر ایک دوسرے کے ساتھ چلنے کا سامان کر ہی دیا۔ اچھی کہانی ہے آپ کی محفل کا آغاز و اختتام دونوں ہی پسندیدہ ہیں۔'' (بھرپور تبصرے کا شکریہ)

٭ زاہدہ پروین، میرپور سے۔ ''شادی میرے بیٹے کی پڑھ کر جی خوشی سے معمور ہو گیا۔ دولہا دلہن کی اور آپ کی تصاویر دیکھ کر خوشی دوچند ہو گئی۔ میری اور میری بیٹیوں کی طرف سے نہایت پُرخلوص مبارک باد قبول فرمائیے۔ یہ خوشی اللہ تعالیٰ آپ کو اور معراج رسول صاحب کو بہت، بہت مبارک کرے، آمین۔ تمام تفصیلات کے دوران جہاں آپ نے سبین اور فرحان کا ذکر کیا، بے حد اچھا لگا۔ یقیناً آپ نہایت ہی خوب صورت دل و دماغ اور حسین سوچ کی مالک ہیں۔ خدا آپ کو خوش رکھے اور دولہا دلہن کی جوڑی کو سلامت رکھے۔'' (جی ہاں، سب سے محبت اور سب کا خیال رکھنے والی عذرا رسول آپ کی دعاؤں کے جواب میں جزاک اللہ کہہ رہی ہیں)

٭ فریدہ جاوید فری، لاہور سے۔ ''ٹائٹل تو بے حد دلفریب لگا پنک، پنک سا۔ سب سے پہلے آپ کا مجھے کچھ کہنا ہے بالکل صحیح لکھا ہے کہ عید کے دن غریبوں اور ضرورت مندوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ اس طرح ہمیں دلی سکون ملتا ہے۔ فرحین اظفر کا افسانہ تو اچھا لگا مگر ہمیں اس کا نام سمجھ میں نہیں آیا۔ سویرا فلک کا قفس، نگہت اعظمی کا ہنر، غزالہ فرخ کا چاند رات اور دروازہ سحرش رانی کا سوال بہترین افسانے لگے۔ سارہ ملک کا ناولٹ جو کے برابر نیکی نے تو کمال کر دیا۔ وہ باتیں تیری وہ فسانے تیرے پڑھ کر مزہ آ گیا۔ خوش رہو فاطمہ رضوی جی، شیریں حیدر جو ہماری فیورٹ رائٹر ہیں کا منی ناول زندگی خاک نہ تھی واہ کیا کمال کا ناول لے کر آئیں اور چھا گئیں۔ شگفتہ شفیق جو کہ ہماری پیاری دوست بھی ہیں اور بہترین شاعرہ بھی ہیں ان کو تقریب کی پزیرائی پر بے حد مبارک باد۔ حمیرا نوشین کا چھوٹا سا افسانہ بخشش کا در کھلا ایک نصیحت

آموز تحریر تھی۔ نزہت جبیں کا شادی میرے شہزادے کی پڑھ کر دل کر رہا تھا کہ کراچی جا کر شادی اٹینڈ کرتے واقعی منہاج اور اریبہ کی جوڑی چاند اور سورج کی لگ رہی تھی۔ نزہت جی بے حد مبارک باد قبول ہو جس طرح آپ نے شادی کا احوال لکھا ہے بے حد پسند آیا۔ کھانوں کا سن کر منہ میں پانی آ گیا مگر جو بات میٹھے گلاب جامن کی تھی کہ وہ تو میری پسندیدہ مٹھائی ہے۔ جلترنگ پڑھ کر بے حد ہنسی آئی پاکیزہ ڈائری اور سندیسے میں سب نے اچھا لکھا۔'' (شکریہ)

٭ جویریہ راج تنہا، کشمیر سے۔ ''آپ بھی مجھ حیرت ہوں گے کہ یہ کون تشریف لایا ہے تو جناب ہم ہیں پاکیزہ کے دیرینہ خاموش قاری، پاکیزہ دل کی گہرائیوں کو چھو رہا ہے تو ساتھ ہی ساتھ شہرت کی بلندیوں کی طرف بھی گامزن ہے۔ اللہ کرے یہ یونہی کامیابی کی منزلیں طے کرتا رہے۔ پہلی بار پاکیزہ میں خط لکھنے کی جسارت کی سوچا ساتھ ہی ساتھ اپنی شاعری بھی بھیج دوں۔ اگر پاکیزہ کے معیار پر پوری اترے تو بہت خوشی ہوگی۔ راحت وفا مجھے آپ کی پوئٹری بہت پسند ہے پلیز پاکیزہ کے لیے پوئٹری لکھتی رہیے گا اور پاکیزہ کے سب سلسلے سب سے اچھے ہیں۔ میں گاؤں سے خط لکھنے والی غالباً نہیں یقیناً پہلی ہوں۔ امید ہے جگہ ملے گی پلیز شاعری کے حوالے سے ضرور بتایئے گا۔'' (اس محفل میں خوش آمدید، اس محفل میں بھی بہت سی بہنیں گاؤں سے خط لکھتی ہیں۔ ابھی آپ کی شاعری پڑھی نہیں ہے انشاء اللہ حوصلہ افزائی کروں گی)

٭ فائزہ فاروق سحر، لاہور سے۔ ''میری امی کو مجھ سے بچھڑے ہوئے پندرہ سال ہو گئے ہیں۔ ابھی کل کی بات لگتی ہے۔ جب ہم ساتھ ساتھ تھے زندگی بدرنگ، بدوضع اور پھیکی سی لگتی ہے جب ماں کی چھاؤں ساتھ نہ ہو۔ جون کا پاکیزہ پڑھا ہر کہانی پسند آئی اور بڑی مدت بعد دو دن میں پڑھ لیا سارا پرچہ بھی کالج کے زمانے میں یوں پڑھا کرتے تھے۔'' (پیاری کالج گرل، آئندہ ہر تحریر کے بارے میں اپنی رائے دینا)

٭ مہوش سمرن راجپوت، سیالکوٹ سے۔ ''میری شروع سے عادت ہے سب سے پہلے بہنوں کی محفل میں جانا مجھے لیٹر لکھنا اور پڑھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ اپنی پیاری بہنوں سے ملاقات ہو جاتی ہے اور معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ نگہت سیما کا اعتبار وفا رت در رت ماضی سے پردے اٹھاتے آگے بڑھ رہا ہے۔ نبیلہ ابر راجا کا متاع دل کوئی اتنا بھی خود غرض ہو سکتا ہے رشتوں کی ایسے بھی موت ہوتی ہے۔ دل خون کے آنسو روتا ہے۔ شاہ زیب کا بے وقت مرنا دکھی کر گیا لیکن رائٹر بہتر جانتے ہیں۔ باقی سارے سلسلے اپنی جگہ خوب تھے لیکن ہم رہے نہ سدا کے جلد باز اس لیے پاکیزہ ختم کرنے کے بجائے لیٹر لکھنے کو ترجیح دی اس لیے تبصرہ کرنے سے قاصر رہے۔ عظمیٰ جی آپ کی غیر حاضری سے پاکیزہ کے رنگ پھیکے، پھیکے ہیں۔ صائمہ اکرم جی کوئی اچھوتی سی تحریر لے کر آئیں آپ رسالے میں شامل نہ ہو تو اک کمی سی رہ جاتی ہے۔'' (ہاں یہ تو ہے بھئی...... ہماری صائمہ کی تحریریں زندگی سے بھرپور رہتی ہیں)

٭ کیلی رب نواز لیلیٰ، اودھوالی بھکر سے۔ ''میں تقریباً جو بھی رسالہ آجائے پڑھ لیتی ہوں لیکن کچھ رسالے مخصوص ہیں جنہیں میں ضرور پڑھتی ہوں ان میں پاکیزہ بھی شامل ہے۔ جیسے پاکیزہ نام ہے رسالہ بھی ویسے ہی پاکیزہ ہے اس میں اسٹوریاں بھی زبردست ہوتی ہیں۔ رفعت سراج، عنیزہ سید، سمیرا حمید، نایاب جیلانی، نگہت سیما، حمیرا خان اور جتنی بھی رائٹرز ہیں مجھے بہت پسند ہیں میری دعائیں ہمیشہ پاکیزہ کے ساتھ ہیں۔ میں بھی پاکیزہ میں لکھنا چاہتی ہوں کہانیاں پلیز مجھے ضرور جواب دیجیے گا۔'' (پیاری لیلیٰ اس محفل میں خوش آمدید، آپ اپنی تحریریں ضرور بھیجیے گا۔ پڑھ کر جلد رائے دوں گی)

٭ ناظمہ شاہین اعوان، واہ کینٹ سے۔ ''تمام ناولز اور کہانیاں ہر بار کی طرح زبردست تھے۔ خاص طور پر صائمہ اکرم کا چلو ہم ساتھ چلتے ہیں۔ زمر نعیم کا اسیر وفا، شیریں حیدر کا تمنئی، نبیلہ ابر راجا کا متاع دل پڑھ کر رونا آ گیا۔ شاہ زیب کو بہت جلد موت کی وادی میں دھکیل دیا گیا۔ پاکیزہ ڈائری میں امینہ عندلیب کا مراسلہ بہت پسند آیا یہ حقیقت ہے کہ جب بندہ بیمار ہوتا ہے تو ہر منظر دھندلا نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و تندرستی اور شفائے عاجلہ و کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ نیلم احمد بشیر صاحبہ سے ملاقات اچھی لگی اور جلترنگ...... دل کرتا ہے آپ کے ہاتھ چوم لوں۔'' (اور ہمارا دل چاہ

رہا ہے کہ آپ کے ہاتھ چوم لیں)

٭ پروین ناز، پنجاب سے۔ ''رفاقت جاوید سے یہ گزارش کروں کی کہ نمرا کی زندگی میں خوشیاں عادل نے چھینی ہیں اور نبیلہ ابر راجا کی کاوش کی میں داد دیتی ہوں انہوں نے متاعِ دل بہت، بہت اچھا لکھا ہے۔ نگہت سیما کا ناول بھی بہت زبردست ہے اور عقیلہ حق کی جو تحریر کی دیوار اس نے بھی کافی کچھ سوچنے پر مجبور کردیا۔ میں بس اتنا کہنا چاہوں گی سب تحریریں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں کاش کوئی ایک ان میں میری تحریر بھی ہوتی۔ یہ آہ دل میں بس چبھ سی گئی۔'' (آپ خوب مطالعے کے بعد لکھیے انشاءاللہ آپ کی حوصلہ افزائی ضرور ہوگی)

٭ خولہ عرفان، کراچی سے۔ ''اداریے میں انجم جی آپ نے بہت اہم نکتے کی وضاحت کی۔ دل خوش ہوگیا کیونکہ حقیقتاً ہمارے یہاں آپس کے رشتے اور تعلقات جو روز بروز تنزلی کا شکار نظر آرہے ہیں اس کا اہم سبب ہمارے درمیان صبر و برداشت کا فقدان ہے۔ اس دفعہ بھی بہت عمدہ افسانوں، ناولٹ اور ناولوں کا انتخاب رہا جو سلسلے وار ہیں ان کی تو بات ہی الگ ہے اعتبار وفا اور رنگ خلش دونوں خوب صورت لفظوں اور اندازِ بیاں کے اعتبار سے کہانی کو عمدگی سے آگے کی طرف لے کر جارہے ہیں۔ نبیلہ ابر راجا کا متاعِ دل میں کہانی دلچسپ موڑ پر آگئی ہے تجسس بھی بڑھ رہا ہے۔ دُرِیکتا کے مستقبل کے بارے میں رشتے داروں کے مشکوک اور غیر منصفانہ رویّوں کا اندازہ کرکے افسوس بھی ہورہا ہے۔ پہلے کی نسبت اب مزید دلچسپی میں اضافہ ہوا ہے۔ شیم فضل خالق کا خواب سراب کا جواب نہیں۔ انوکھا انداز چونکا دینے والا۔ دونوں کرداروں کے مکالمے اور احساسات وجذبات حقیقت سے قریب تر اور بہت جاندار تھے۔ بہت عمدہ ماشاءاللہ البتہ صائمہ قیصر ہاشمی نے اسے آزاد کردو میں عورت کی زندگی کا تقابلی جائزہ پیش کرتے ہوئے بہت اچھے انداز میں اس حقیقت سے روشناس کروایا ہے کہ ہر شخص مجبور ہے کسی نہ کسی کے آگے خواہ وہ خود کو کتنا ہی طاقت ور سمجھے دوسرے اس بات کو بھی واضح کیا ہے کہ انسان کی مثال ہاتھی کے دانتوں کی سی ہے کھانے کے اور دکھانے کے اور۔ حیا بخاری کا ابرِ رحمت اور شیریں حیدر کا ناولٹ گھنٹی یقین کریں لفظوں کی جادوگری تھی کہ جب تک ختم نہیں ہوگیا اپنے سحر سے نکلنے نہیں دیا۔ (مصنفات شکریہ کہتی ہی) صدف آصف نے رشتوں کی ڈوری میں بے اعتباری سے اعتبار تک کے سفر کے لیے موزوں کہانی کا انتخاب کیا۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

٭ سنبل ملک اعوان، شاہدرہ سے۔ ''چلو ہم ساتھ چلتے ہیں صائمہ اکرم کی بہترین کاوش مگر ایک بات احیان جب گھر آیا وادا جی مری جانے کے لیے تیار تھے تو بارہ بجے تھے جب وہ لوگ اسلام آباد گئے تب دو بجے تھے اور جب مری کی طرف گامزن تھے تب بھی دو ہی بجے تھے۔ سردیوں کی رات ہو شدید سردی ہو کہر بھی برس رہا ہو اور ٹائم...... مجموعی طور پر ایک اچھا ناول بغیر قسط اگلے ماہ۔ پرندہ والدین کے رویّوں کے حوالے سے ایک اچھی تحریر پڑھنے کو ملی مگر ایک بات ہے آنٹی جن لڑکیوں نے بے راہ روی اختیار کرنی ہوتی ہے وہ تربیت کی وجہ سے ایسا نہیں کرتیں بلکہ میڈیا اور گھر سے باہر کلاس فیلوز کو دیکھتی ہیں تو ایسا کرتی ہیں (اچھی تربیت ہر جگہ برائی کی جانب قدم جانے سے روکتی ہے) نارسائی، اُمِّ ایمان بہت، بہت مبارک ہو آپ خوب صورتی سے مسلسل اچھی رائٹر ہونے کا اعزاز پا رہی ہو۔ دلخراش اینڈ کہ ہمارے چھوٹے، چھوٹے غلط فیصلے کس طرح ہمیں زندگیوں سے دور لے جاتے ہیں جس کا احساس ہمیں رزلٹ آنے پر ہوتا ہے۔ حوازادی کو نیلم بشیر نے خوب صورت لفظوں میں پرو دیا اور مرد کی حاکمیت کو واضح کیا۔ محبت رنگ ہے ایسا سعدیہ رئیس آنٹی اتنے خوب صورت خوب صورت ٹاپک آپ ڈھونڈ کر لاتی ہیں جن کا جواب ہی نہیں۔ اتنے پیار کرنے والے ہیرو، بگڑی ہوئی ہیروئن کو منانے والے دنیا میں ناپید تو نہیں پھر ہمارے لیے کیوں نہیں ہم بگڑے جو نہیں۔ بہنوں کی محفل ایک ایسی بیٹھک ہے جہاں سب کے حالات سے آگاہی ہوتی ہے۔ آنٹی پلیز جیسے آپ کچھ عرصہ پہلے سے آیت کریمہ ترجمے سمیت ساتھ حضرت یونس کا حوالہ دے کر شائع کرتی ہیں پلیز ایسے ہی کیا کریں۔ ظل شاہین، فیروزہ بیگم، یسمیٰ رضوی، فرخندہ لطیف، سلمیٰ غزل، امینہ عندلیب، تسنیم رضا، اقبال بانو، نازنین آفریدی، خولہ عرفان، شیریں ظفر، ایمان چوہدری، ملالہ اسلم نئی ہیں؟، کوثر خالد، پروین افضل شاہین کے خطوط بہت ہی اچھے تھے۔ بشریٰ اوکاڑہ، نزہت اصغر، فصیحہ آصف کی تعریف تو سورج کو چراغ دکھانا

ہے۔ پاکیزہ ڈائری آپی عظمیٰ آفاق کی ہے ہی خوب صورتی سے بھرپور۔ سندیسے بھی اچھے تھے۔ (شکریہ) آج کل تو کوئی اپنے سے چھ ماہ بڑی لڑکی سے شادی نہیں کرتا کجا کہ شادی شدہ، بیوہ اور ایک عدد بچے کی ماں بھی ہو۔ قبول کرنا دل گردے کا کام ہے۔ ویسے بھی ابھی دنیا اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوئی مگر افسوس کہ ہمیں آج تک کوئی اچھا شخص نہیں ملا۔'' (ملے گا، ضرور ملے گا امید پر دنیا قائم ہے انشاءاللہ)

٭ نائلہ بلیغ الرحمان، بہاول پور سے۔ ''باجی میں آپ کی خاموش قاری ہوں پاکیزہ سے ناتا بہت پرانا ہے۔ اب آپ مجھے بھی بہت پرانا نہ سمجھ لیں۔ میری ای اس وقت سے یہ رسالہ پڑھ رہی تھیں جب یہ ڈھائی یا تین روپے کا تھا۔ جب ہم نے پڑھنا شروع کیا تھا ایک دو بار بہنوں کی محفل میں شرکت کی۔ ہم ہیں راہی پیار کے سلسلہ چلتا تھا اس کے چند سوال آپ نے میرے بھی چھپے تھے اور میرا انٹرویو بھی شائع کیا تھا یعنی میاں بیوی کے حوالے سے بعدازاں معروفیت بڑھتی گئی پاکیزہ سے ناتا تو نہ ٹوٹا بس خاموشی سے سلسلہ چلتا رہا۔ اس دسمبر میں پاؤں میں چوٹ کی وجہ سے بستر پر پڑی رہی نہ کام نہ کاج میاں اور بچوں نے خوب خدمت کی یہ میری مصروفیت سے خالی دن تھے۔ ایک افسانہ لکھ مارا جو کہ لال جوڑا کے نام سے چھپ چکا ہے۔ بچوں نے شور مچایا مما آپ پاکیزہ میں بھی لکھو۔ میں نے کہا کہ بچہ جو کام میں اپنی اولاد کے لیے پسند نہیں کرتی اب کیا میں لو اسٹوری لکھ، لکھ کر لوگوں کے بچوں کو خراب کروں میں تو معاشرتی کہانی لکھ سکتی ہوں تاکہ اگر کسی کے دماغ میں کوئی رتی بھر بات میری وجہ سے سمجھ آجائے اور وہ میرے لیے راہِ نجات بن جائے۔ بے شک میں خاموش قاری ہوں مگر پاکیزہ کے توسط سے آپ کی ہر قاری اور افسانہ نگار کو یاد رکھتی ہوں۔ صادق آباد کا ذکر ہے۔ صائمہ اکرم یاد نہ آئے ہو نہیں سکتا۔ اس بار تمام افسانے اچھے تھے۔ حمیرا نوشین، فرحین اظفر، سویرا ملک، نگہت اعظمی، غزالہ فرخ، سارہ ملک، شیریں حیدر، بشریٰ گوندل کے افسانے دل پر اثر کرنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان سب خواتین کو مزید ترقیاں نصیب فرمائے، آمین۔ البتہ اس بار ساسوں کی شامت آئی ہوئی تھی ہماری افسانہ نگاروں کے ہاتھوں۔ اللہ سب ساسوں کو نیک ہدایت دے۔ خوش ذائقہ میں آم کی بہار تھی روزے سے منہ میں پانی آتا رہا۔ بہنوں کی محفل اول تا آخر پڑھی سب سے ملاقات ہوئی بہت اچھا لگا۔ سعدیہ ہما کو بچوں کی مبارک باد۔ پاکیزہ ڈائری زبردست اور سب سے دلچسپ۔ جلترنگ معاشرے کی برائیوں کو کتنی خوب صورتی سے کور کرتی ہیں آپ پڑھ کے مزہ آجاتا ہے۔ یہ صرف آپ کا کام ہے۔'' (گڑیا تم ماشاءاللہ ٹیلنٹڈ ہو مگر جب افسانے میں مضمون شامل ہوجائے تو اس سے افسانہ ختم ہوجاتا ہے تم کسی دن مجھے فون کرلو۔ انشاءاللہ تمہاری حوصلہ افزائی ہوگی)

٭ یاسمین کنول راجپوت، پسرور سے۔ ''آپ کی والدہ محترمہ کے انتقال کی خبر پڑھی بڑا دکھ ہوا اللہ تعالیٰ مرحومہ کے درجات بلند فرمائے، انہیں جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے اور آپ سب کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔ ابھی چند ماہ پہلے آپ نے اسلام آباد جانے کی روداد بتائی تھی تو اپنی ای جان کا ذکر کیا تھا کہ کیسے وہ آپ کی پسند کی چیزیں آپ کو کھلاتی تھیں اور کتنا پیار کرتی تھیں کتنا سلیقہ طریقہ تھا ان میں اور سستی، کاہلی بالکل نہ تھی جیسا کہ عموماً اس عمر کی خواتین ہوجاتی ہیں آرام طلبی وغیرہ وہ متحرک اور مسلسل متحرک زندگی گزارنے والی نیک خاتون تھیں۔ آپ ان کی اکلوتی بیٹی تھیں اور اتنی دور بیاہ دیا لیکن دل کے رشتے ہمیشہ قریب رہے وہ اسلام آباد اور آپ کراچی مگر فون کے ذریعے، آنے جانے کے ذریعے ساتھ، ساتھ تھیں اب اسلام آباد تو آپ جائیں گی مگر ماں کی عدم موجودگی آپ کو تکلیف ضرور دے گی۔ ماں رشتہ ہی ایسا ہے مخلص، بے لوث۔ اب جبکہ ہم خود مائیں بن چکی ہیں اس رشتے کی سمجھ آتی ہے۔'' (مگر جب کوئی نعمت اٹھالی جائے تو اس کی قدر اس وقت محسوس ہوتی ہے)

٭ محسنہ علی، بستی کھوکھر سے۔ ''میں محسنہ علی ہوں۔ میں نے اپنی سولہ سال کی زندگی میں کبھی بھی نہیں سوچا تھا کہ وقت نے میرے لیے کیا سوچ رکھا ہے۔ رائٹر بننے کا دور، دور تک بھی خیال نہ تھا۔ ساری زندگی تحاریر پڑھتے ہوئے دوسروں کے چھوڑے ہوئے سبقوں پر عمل پیرا رہی۔ آج کسی منجمد گلیشیر کی طرح اپنا ایک سبق غلافِ ذات کی صورت لیے آپ کے سامنے حاضر ہوں۔ دور، دور تک وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اس ماہِ صیام میں خدا مجھے کس تحفے سے نوازنے والا

✍ **ارم خان**......ڈی جی خان سے۔ ''ڈیئر آنٹی کئی دعاؤں کے ساتھ ایک بار پھر آپ کی محفل میں حاضر ہوں جولائی کا پاکیزہ سامنے رکھے سوچ رہی ہوں کہ کیا لکھوں۔ اصل میں متاع دل اور اپنی شاعری کے سوا کچھ نہیں پڑھا۔ اس لیے کچھ رسالے کے بارے میں لکھ نہیں سکتی (لوگ تو خوشی سے پھول جاتے ہیں اور تم......) آنٹی جان بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری شاعری اور خط کو پاکیزہ میں جگہ دی اب اور شاعری بھیج رہی ہوں امید ہے جگہ ملے گی۔ دو ماہ قبل ننھی پری کے عنوان سے ایک تحریر بھیجی تھی آنٹی جان میری اس کہانی کا انجام کیا ہے۔'' (گڑیا! وہ پری تو کہیں اڑ کر چلی گئی، کہاں گئی اور کیسے گئی کچھ پتا ہی نہیں چلا......تم کوئی دوسری کہانی بھیج دو)

✍ **صبا نور**، لیہ سے۔ ''آپی میں اپنے دوسرے سمسٹر کے امتحانات کی تیاری میں مصروف تھی اس لیے پاکیزہ سے دور رہی اب جو جولائی کا پاکیزہ دیکھا تو آپ کی ای کی ڈ۔تھ کا جان کے شدید دکھ ہوا۔'' (دکھ اپنی جگہ مگر تمہارے امتحان دینے کی بہت خوشی ہوئی، جب فائنل پاس کرلو تو مجھے بتانا)

✍ **پروین افضل شاہین**، بہاول نگر سے۔ ''دین کی باتیں پڑھ کر ایمان کو تازہ کرتے ہوئے آگے بڑھے تو سلسلے وار ناولز تو اچھے جا ہی رہے تھے ان کے علاوہ ناولٹ اور افسانوں میں زندگی خاک نہ تھی، جو کے برابر نیکی، متاع دل، قفس، بخشش کا در کھلا، وہ باتیں تیری وہ فسانے تیرے، چاندرات اور دروازہ خصوصی مضامین میں اتنی سی بات......شمع ہدایت، شادی میرے شہزادے کی، سردے پسند آئے۔ ہم سعدیہ ہما شیخ کو ان کی بیٹی حورعین کی مسلسل کامیابیوں پر دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ ہمارا دیرینہ مطالبہ پورا کرنے پر آپ کا بہت، بہت شکریہ کہ سوال، شعر، تحریر پر انعامات دیا کریں گی۔'' (مگر سوالات بھی دلچسپ آنے چاہئیں......آپ اور دیگر بہنیں خوب محنت کریں)

✍ **صائمہ سجاد بخش**، کوہاٹ سے۔ ''باجی آپ کس وقت فارغ ہوتی ہیں کہ انسان فون پر بات کر سکے میں نے فیس بک پر میسج بھی کیا تھا کہ آپ کو لیکن رمضان کی وجہ سے معروفیات زیادہ ہوتی ہیں۔'' (رمضان کے آخری عشرے میں، میں اعتکاف میں بیٹھی تھی اس لیے فون وغیرہ بھی ریسیو نہیں کیے تھے) ہاں سارہ ملک نے جو کے برابر نیکی بہت اچھے موضوع پر لکھا بہت اچھا لگا مگر لاسٹ میں جو انہوں نے پانچ ہزار کا نوٹ عیدی میں دیا وہ ابھی تک ہضم نہیں ہوا ہے زیادہ سے زیادہ ہزار ہونے چاہیے تھے۔ متاع دل کی کایا پلٹا دی ہے جانے کیسے حالات جگہ پر آئیں گے۔ حمیرا نوشین کا بخشش کا در کھلا اچھی تحریر تھی۔ خواتین کسی صورت غیبت سے باز نہیں رہ سکتی۔ پیٹ میں مروڑ ہوتا ہے دو چار منٹ بھی بات دبا نہیں سکتی۔'' (تبصرے کا شکریہ)

✍ **سونیا ملک**، فیصل آباد سے۔ ''سب سلسلے وار ناول اچھے جا رہے ہیں آنٹی عذرا رسول کو میرا اسلام دیجیے۔ آنٹی آپ مجھے بہت پیاری لگتی ہیں، آنٹی ہماری تربیت میں آپ کا بڑا ہاتھ ہے، اللہ آپ کو اور آپ کے ادارے کو اور ترقی دے۔ آنٹی آپ کے جلترنگ کی تو کیا ہی بات ہے جتنا مرضی موڈ خراب ہو مگر جلترنگ پڑھتے ہی دل میں اور چہرے پر خوشی کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو جاتی ہیں اور اب دیکھتے ہیں کہ آپ بہنوں کی محفل میں مجھے خوش آمدید کہتی ہیں کہ نہیں۔ آنٹی میں اور میری بہن آپ کو غزلیں بھیجیں تو آپ اپنے پاکیزہ کے خوب صورت صفحات کی زینت بنا دیں۔'' (گڑیا! اس محفل میں خوش آمدید......آپ کی اور آپ کی بہنوں کی حوصلہ افزائی ضرور ہوگی......مگر ابھی آپ کی کوئی غزل پڑھی نہیں ہے، اچھی ہوئی تو ضرور جگہ ملے گی)

✍ **سدرہ کلثوم مروت**، لکی مروت، صوبہ سرحد سے۔ ''آپ کا بہت، بہت، بہت شکریہ، بہت مہربانی جزاک اللہ خیراً کثیراً آپی میرے پاس الفاظ نہیں اور کس طرح شکریہ ادا کروں۔ اُف کتنی، کتنی خوشی ہوئی میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش آپ کے ڈائجسٹ کے توسط سے پوری ہوئی۔ مئی کے شمارے میں اپنی نظم دیکھی تو یقین نہیں آیا کہ میری لکھی ہوئی نظم ہے۔ رنگیلی پیاری آپی بہت بہت خوشی ہوئی۔ جون کا شمارہ تو ملا نہیں اور جولائی کا دیر سے ملا سو ابھی زیر مطالعہ ہے۔ آپ کا جلترنگ پڑھا بہت، بہت مزہ آیا۔ ایسے جیسے کوئی سویٹ ڈش کھائی جائے۔ اس کے ناول، سلسلے وار بہت، بہت اچھے جاری ہیں خوب مزہ آ رہا ہے۔'' (شکریہ)

✍ **دیا آفرین**، شاہدرہ سے۔ ''میں پاکیزہ کی خاموش قاری تھی لیکن اب سوچا کہ یہ خاموشی توڑ کر محفل میں شامل

ہے۔ ڈوبتی فجر کو ایک خیال نے ذہن کے دریچوں کی اوٹ سے جھانکا، دن ہونے تک میری انگلیوں کی پوروں پر مچلتے لفظ اپنی رہائی کے منتظر نظر آنے لگے جو دل میں تھا بے دھڑک صفحات کی نظر کرتی گئی۔ جو لکھا تھا پڑھا تو حواس گم ہونے لگے۔ سوچا ضلع بھکر کے پسماندہ سے گاؤں بستی کھوکر کی محسنہ علی کیونکر الفاظ کی سلطنت رکھ سکتی ہے۔ یہ میرے سفر کا آغاز ہے۔'' (پیاری محسنہ اس محفل میں خوش آمدید۔ تمہارا خط اور تمہاری کہانی پڑھ کر میں واقعی حیران رہ گئی۔ اتنی کم عمر لڑکی کی اتنی پختہ تحریر، ماشاء اللہ۔ تم میرے پاس ہوتیں تو گلے سے لگاتی مگر گڑیا جو تم نے مجھے لکھ کر بھیجا ہے وہ ایک فکاہیہ مضمون ہے۔ افسانہ نہیں مگر تمہارا یہ مضمون اخبار میں شائع ہو سکتا ہے)

✍ **بنت پاکستان** (یہ قلمی نام ہے) پنجاب کی شوخی......''باجی......میں سوچ رہی تھی (کہ آپ سے پہلے سے ہی کہہ دوں) کہ اگر آپ مجھے اس عید پر کارڈ بھیجنا چاہ رہی ہوں......تو پلیز آپ مجھے میرے موبائل کا کارڈ بھیج دیں......بے شک دو یا تین بھیج دیں......چھوٹے چھوٹے سے تو ہوتے ہیں......'' (ہاں کہہ تو ٹھیک رہی ہو تم......لاہور سے کراچی کی فلائٹ میں چھوٹی سی تو ہوتی ہے، فوراً آجاؤ......اور جب تم مجھ سے ملنے آؤ گی......تو میں سچی میں تمہیں موبائل کے ڈھیر سارے کارڈ دے دوں گی......میں ان کے نمبرز کھرچنے کے بعد پھینکتی جو نہیں ہوں......ڈھیر رکھے ہیں اچھا ہے کام آجائیں گے)

✍ **شائستہ زریں**، کراچی۔ ''اختر شجاعت کے مضمون کی میں جتنی بھی تعریف کروں وہ کم ہوگی......اختر کا ایک، ایک فقرہ سونے میں تولنے کے لائق ہے......ہاں اب ہم دلچسپ خوب صورت مکالموں سے سجا آپ کا ناول پڑھنا چاہ رہے ہیں آخر کب تک یہ انتظار کروائیں گی......'' (انشاء اللہ جلد......ہاں اختر شجاعت شکریہ کہتی ہیں)

✍ **نگینہ ضیا بخش**، کراچی سے۔ ''اس ماہ یعنی 15 اگست کو میری سالگرہ ہوتی ہے (بے حد مبارک باد) بس اب تو یہ دل چاہتا ہے کہ پاکیزہ کی کوئی تقریب ہو اور میں سب سے ملاقات کروں......(جی ضرور) ہاں یاد آیا چند دن پہلے پاکیزہ کی رائٹر نزہت جبیں ضیا کا ٹی وی انٹرویو دیکھا تھا......اور اس میں انہوں نے آپ کا نام لے کر آپ کی تعریف کی تھی......آپ نے تو ضرور دیکھا ہوگا......'' (نہیں، میں نے نہیں دیکھا، ہاں سنا تھا)

✉ **کرن نذیر**، اسلام آباد۔ آپ کا خط اور آپ کی رائٹرز پر ریسرچ کا مسودہ بھی موصول ہوا۔ جس میں آپ نے پاکیزہ ڈائجسٹ کی مدیرہ ہونے کے حوالے سے میرے تجزیے بھی شامل کیے ہیں، (شکریہ) کرن نے بہنوں کی محفل کی سب سے زیادہ تعریف کی ہے کہ اس میں ہر جگہ سے آنے والے خط شائع کیے جاتے ہیں۔ افسانوں، ناولوں کی بھی تعریف کی ہے۔ بس میرے حوالے سے ایک غلطی ہوئی ہے کہ میں پاکیزہ کی مدیرہ سولہ سال سے نہیں گزشتہ پچیس سال سے ہوں......آپ ریکارڈ کی درستگی کر سکتی ہیں۔

✍ **ایڈووکیٹ سعدیہ ہما شیخ**، سرگودھا سے۔ ''اداریہ ہمیشہ کی طرح دل میں اتر گیا اور آپ کا خاصہ ہے کہ آپ کے لبوں سے نکلی بات تیر کی طرح دل میں پیوست ہو جاتی ہے۔ فرحین اظفر نے بے اعتباری کی گرہیں کھولی بھی تو کب ہیں......جب عمر کی نقدی میں چند سکے رہ گئے۔ قیصرہ حیات کی انٹری آخری امید کے ساتھ بہت پُراثر رہی اور واقعی ہمیں اس کی ضرورت تھی۔ چاندرات اور دروازہ بھی ساس ماں کے گرد گھوم رہی تھی۔ پتا نہیں ہمارے ہاں ساس کا کریکٹر اتنا کمپلیکیٹڈ کیوں ہوتا جا رہا ہے اصل میں سارا قصور بیٹے کا ہے جو اپنی ذمے داری، اپنی بیوی پر لاد دیتا ہے۔ بیوی اور ماں میں پلڑا برابر رکھنے کے بجائے کسی ایک کی طرف جھکاؤ ہی پرابلم کری ایٹ کرتا ہے۔ ایک آپ کی ماں ہے تو دوسری آپ کے بچوں کی دونوں کو ہی تعظیم دینی چاہیے کہ ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں۔ سارہ ملک کا ناولٹ بھی اس ساس، بہو کے تناظر میں تھا اسی لیے ہم نے بھی اپنی رائے مدلل دے دی۔ یہ رشتے واقعی ہماری نیکیوں کو کھا رہے ہیں۔ شیریں حیدر کا منی ناول ہمیشہ ہم کی طرح زبردست رہا، بشریٰ گوندل کا آخری پرچہ بھی پُراثر رہا، ہاں بشریٰ کینوؤں کے ساتھ تمہارا ذکر بنتا تھا میرے انٹرویو میں مگر تم نے مجھے کینو کھلائے ہوتے تو یاد رہتا ناں......انعامات کا سن کر دل خوش ہو گیا مگر پہلا انعام بہنوں کی محفل کا ہونا چاہیے۔ میں اکثر گنگناتی ہوں اس پر انعام کی ضرورت نہیں۔'' (بات تو تمہاری ٹھیک ہے، بعض اشعار پر تو جرمانہ ہونا چاہیے کہ وہ اتنے گھٹیا کیوں بھیجے جاتے ہیں)

ہوجائے۔ رمضان المبارک کے اعتبار سے سجا سنورا پاکیزہ خوب صورت لگا۔ نزہت جبیں ضیا نے شادی کی تقریبات کا احوال سنایا گھر بیٹھے ہم نے بھی شرکت کرلی۔ اعتبار وفا، نگہت سیما خوب سسپنس پھیلاتی ہیں، میں دو چار قسطیں اکٹھی کر کے پڑھتی ہوں اور نئے سلسلے وار ناول آخری امید کے لیے نیک تمنائیں ہیں جلد ہی یہ ہمیں اپنے سحر میں جکڑ لے گا۔ نبیلہ ابر راجا کا متاع دل ہماری متاع جاں بھی بن چکا ہے مگر پلیز اور طویل مت کیجیے بہنوں کی محفل پاکیزہ ڈائری اور جلترنگ سب ہی خوب صورت سلسلے ہیں، میں پہلی بار شریک محفل ہونے کی جسارت کررہی ہوں امید ہے برا تو نہیں مانا ہوگا۔ دیگر سلسلوں کے ساتھ میں اپنی شاعری بھیج سکتی ہوں (ضرور) اسیر وفا کی بات نہ کروں تو ناانصافی ہوگی۔'' (اس محفل میں خوش آمدید...... پاکیزہ کی پسندیدگی کا شکریہ)

✿ گل شاہین، رحیم یار خان سے۔ ''موسم گل پڑھا شروع میں تو تحریر بہت بوجھل لگی ڈائیلاگ اور لفاظی کی بھرمار تھی سوچا بہت رومینٹک ہے اور حسن پرست بھی مگر کہانی دو پیغام لیے ہوئے تھی کہ مرد کی ذات واقعی ناقابلِ اعتبار ہوتی ہے سچ کہا گیا کہ مرد کی ذات پیاز کے چھلکے کے مانند ہوتی ہے۔ قفس پڑھا، مریم اس قدر ظلم سہتی رہی حیرانی ہوئی آج کے اس جدید دور میں تو میڈیا خواتین کے حقوق کے لیے بہت جدوجہد کررہا ہے اور انسانی حقوق کی تنظیمیں بھی اور مریم والدین کی عزت کی خاطر سب برداشت کرتی رہی مگر کہتے ہیں ناں کہ ظلم جب حد سے بڑھ جائے تو فنا کا در کھل جاتا ہے۔ اختر شجاعت کا مضمون خشیت الٰہی بہت ہی بہترین اور پُراثر تھا جزاک اللہ...... مستقل سلسلے تو پاکیزہ کی روح ہیں اس بار پاکیزہ ڈائری بہت محنت سے سجی ہے، رمضان شریف کے حوالے سے روحانی مشورے بہترین ہیں۔ جلترنگ میں پیچانیے آپ نے سو فیصد صحیح لکھا بلکہ وہ پٹا نام کی چیز تو بیشتر اینکرز لینا ہی گوارا نہیں کرتیں۔ کیا ہم ایک اسلامی معاشرے میں رہتے ہیں؟ کیا ہماری اخلاقی اور معاشرتی اقدار ہمیں یہ درس دیتی ہیں۔'' (ہاں بھئی ایسا ہی ہورہا ہے اور ہر طرف ہورہا ہے بس اللہ اپنا کرم کرے تو سب ٹھیک ہوجائے گا)

✿ پیاری بہنو! بزم پاکیزہ کے لیے شوخ و چنچل سوالات موصول نہیں ہوئے۔ اس لیے اس ماہ یہ سلسلہ شروع نہیں کیا گیا۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ کتنی جلدی اور کتنے دلچسپ سوالات بھیجتی ہیں۔ اب آیئے درود پاک پڑھ کر دعا مانگتے ہیں۔ یا اللہ...... یا رحمن...... یا رحیم میرے جسم کو شفا اور دل کو اپنی ذات کا یقینِ کامل اور آنکھوں کو نورِ بصیرت عطا فرما اور جب تک میں زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرمادے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے۔ یا رب العالمین مجھ سے میری اولاد سے اور میرے تمام عزیز و اقارب سے ہمیشہ ہمیشہ راضی رہنا اور ہر گناہ، ہر غلطی اور ہر کوتاہی کو معاف کرنا اور ہمارے عیبوں کی پردہ پوشی کرنا۔ اپنی نظر میں چھوٹا مگر دوسروں کی نظر میں بڑا بنادینا اور دونوں جہاں میں مجھے خیر عطا کرنا کہ بے شک تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے اور تیری ثنا سب سے بڑی ہے اور تیری پناہ عزت والی ہے اس لیے صرف اپنا محتاج رکھنا اور ہمیشہ ہمیشہ اپنی شان کے حساب سے ہم سب پر اپنا رحم و کرم اور فضل کرنا۔ ازل سے ابد تک سب کو معاف کردینا کہ بے شک میرا رب سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے اور ہر چیز پر قادر ہے اور میرا رب برکت اور بلندی والا ہے۔

یا مجیبُ یا مجیبُ یا مجیبُ

دعاگو

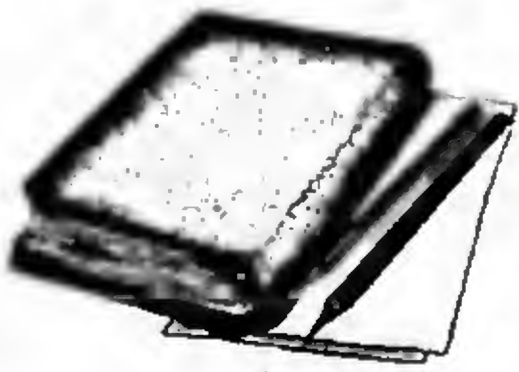
آپ کی اپنی باجی

انجم انصار

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.c فیز III ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500

فون نمبر 021-35804200 , 021-35895313 EXT 107,118



پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

حمد ربِ ذو الجلال

تو حرفِ حمد کو ایسے سنوار آنکھوں سے
جہانِ حمد میں آئے بہار آنکھوں سے
درِ خدا پہ نظر ایسے جذب میں آئے
لکھوں میں حمد کا اِک شاہکار آنکھوں سے
میں رب تیرے لیے لکھوں تمام حمد تری
تری صفات کا کیا ہو شمار آنکھوں سے
لبوں پہ آئے دعا مستجاب ہوجائے
تو رب کو عشق میں ایسے پکار آنکھوں سے
جو اشک ہوں وہ انہیں حمد میں شمار کرے
بہیں جو رب کی محبت شعار آنکھوں سے
تمام عمر خدا تیرے ذکر میں گزرے
اتر نہ پائے یہ تیرا خمار آنکھوں سے
کسی بھی وقت میں رب کو نہ بھولنے پائے
تو اس کو قلب میں ایسے اتار آنکھوں سے

شاعر: محسن علوی

مرسلہ: ایمنہ عندلیب، سلانوالی

نعتِ رسولِ مقبولؐ

تنہا ہے میری زندگی میری حیات عشق میں
بھیجوں سلام صبح شام میری نجات عشق میں
کیسے انہیں بھلا سکوں رگ، رگ میں وہ سما گئے
میری حیات عشق میں پاؤں وفات عشق میں
کیسے چھپاؤں حالِ دل دیدۂ تر کو کیا کروں
کھل گیا رازِ دل مرا لکھ دی جو نعت عشق میں
سجدے کروں میں رات دن ربِ کریم کے لیے
ڈوبی ہوئی ہے رات دن میری صلوٰۃ عشق میں
میرا خدا رحیم ہے کردے گا سب خطائیں معاف
لکھ دوں اگر کبھی کوئی یوں ہی سی بات عشق میں

کلام ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی

شوال کے چھ روزے

فخر کونین ﷺ نے فرمایا: جس نے رمضان کے روزے رکھے اور اس کے بعد چھ (نفل) روزے شوال (یعنی عید) کے مہینے میں رکھے تو پورے سال کے روزے رکھنے کا ثواب ملے گا۔ اگر ہمیشہ ایسا ہی کرے تو گویا اس نے ساری عمر کے روزے رکھے۔

مرسلہ: نور افشاں شکار پور

نماز

حضرت ابن مسعودؓ رسول پاک ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہر نماز کے وقت ایک پکارنے والا بھیجا جاتا ہے، پس وہ کہتا ہے: اے آدمؑ کی اولاد! تم اٹھو اور اس آگ کو بجھاؤ جو تم نے اپنے اوپر جلائی ہے پس لوگ اٹھتے ہیں، طہارت کے بعد نماز ظہر ادا کرتے ہیں تو دو نمازوں کے درمیان ان کے سارے گناہ معاف کردیے جاتے ہیں۔ پس جب نماز عصر کا وقت ہوتا ہے تو ایسا ہی کیا جاتا ہے۔ پس جب مغرب کی نماز کا وقت ہوتا ہے تو بھی اسی طرح ہوتا ہے۔ پس عشا کا وقت ہوتا ہے تو اسی طرح ہوتا ہے اس کے بعد لوگ سو جاتے ہیں تو بعض سراپا خیر ہیں اور بعض سراپا شر میں چلے جاتے ہیں۔

مرسلہ: اُمِ ایمان قاضی، کوٹ چھٹہ

سلام اے ارضِ وطن

راہ گزاروں، کوہساروں، ابر پاروں کو سلام

لعل و گہر پیدا کیے اس خاک نے ہر دور میں
تیری حرمت پر مٹے ان جاں نثاروں کو سلام
دشمنوں کی نیند اڑ جاتی ہے جن کے خوف سے
تیرے شاہین اور تیرے شاہسواروں کو سلام
ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی عزتوں کے پاسباں
جاں سے پیارے سبز پرچم اور ستاروں کو سلام
اپنے ارضِ پاک پر برسا تو بارش امن کی
بارشوں کو آبشاروں اور پھواروں کو سلام
گنگناتی ندیاں ہر سو ہیں ایسے خوش خرام
لہلہاتی کھیتیوں اور باغبانوں کو سلام

مرسلہ: فریدہ افتخار، اسلام آباد

گزارش

میری آنکھوں میں روشن نور کی شمعیں
تو کچھ دیر اور جلنے دے
میرے مولا مجھے تو حوصلہ دے
مجھے تو اور جینے دے
اندھیرے سے میں ڈرتی ہوں
تاریکیوں سے خوف آتا ہے
سیاہ راتوں کی وحشت سے
میرا دل ڈوب جاتا ہے
مجھے ان ظلمتوں کے خوف سے
تو اب نکلنے دے
میرے مولا مجھے تو نور دے
مجھے تو اور جینے دے

کلام: عالیہ ضیا، کراچی

لوک کتھا

کہتے ہیں کہ ہزاروں سال پہلے محبت اور حسن آپس میں دوست تھے ایک رات دونوں ساتھ، ساتھ تھے کہ اتنے میں چاند نکل آیا، محبت چاند کی بے حد تعریف کر رہی تھی یہ بات حسن کو بہت بری لگی۔ اس نے غصے میں آ کر محبت کی آنکھیں نوچ لیں۔ بس! اس دن سے محبت اندھی...... اور حسن ظالم ہو گیا۔

مرسلہ: فردوس شاہی، لاڑکانہ

وعدہ نبھاؤ ناں

پچھلے برس بھی میرے ساجن
تم نے یہ اقرار کیا تھا
چاند رات کو ملنے آؤں گا
تمہارے لیے پیار بھرے
ڈھیروں تحفے لاؤں گا
سجا کر پھول کلائیوں میں
تن من کو مہکاؤں گا
چھپ کر ست رنگی آنچل میں
زلفوں سے خوشبو چراؤں گا
دیکھو پھر سے ساجن عید آنے والی ہے
راہوں میں وفا کے دیپ جلائے بیٹھے ہیں
گاؤں کو آنے والے رستے
تیری چاہ میں سجائے بیٹھے ہیں
ساجن اپنا وعدہ نبھاؤ ناں......
چاند رات کو ملنے آؤ ناں......

شاعرہ: یاسمین اقبال، سنگھ پورہ لاہور

سب سے اچھی

زندگی کی سب سے اچھی ہجرت گناہوں سے نیکیوں کی طرف آنا ہے۔

مرسلہ: مصباح رضا سید، فیصل آباد

غزل

اس جیون سے ہم ہارے وصی
جب دشمن نکلے سارے وصی
آواز کو اس کی ترس گیا ہوں
کوئی دور سے مجھ کو پکارے وصی
قسمت پر وہ اپنی ناز کریں
ہیں جن کے چاند، ستارے وصی

دل خون کے آنسو رویا تھا
جب کام نہ آئے سارے وصی
ہمیں ڈر تھا تیری رسوائی کا
ہم اس لیے تم سے ہارے وصی
دل ٹوٹ کے ریزہ، ریزہ ہوا
جب بچھڑ گئے سب پیارے وصی

شاعر: وصی شاہ
مرسلہ: فریدہ، جاوید فری، لاہور

آنسو

آنسو مسکراہٹ سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں کیونکہ......
مسکراہٹ تو سب کے لیے ہوتی ہے مگر......
آنسو صرف ان کے لیے ہوتے ہیں جنہیں ہم کھونا نہیں چاہتے۔

دعا

اس ماہ کا انعام یافتہ مرسلہ......
دعا نصیب سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے کیونکہ جب زندگی میں سب کچھ بدل جائے تو انسان کے پاس صرف دعا ہی بچتی ہے جو نصیب بدل دیتی ہے۔

از: ظلِ شاہین، رحیم یار خان

لکھی لکھائی عید مبارک

سہیلی رومت میں زندہ ہوں
کس حال میں ہوں مت پوچھو
کیا سوچتی ہوں بتاؤں کیوں؟
خط کیوں نہیں لکھا مجبوری ہے
مجبوری کیا ہے بتا نہیں سکتی
ذرا سوچ سہیلی کیا تھے ہم
اب کیوں اتنے بدل گئے ہیں؟
ایسی بھی مصروفیت کیا
کہ سندر سہیلی کو رٹی رٹائی
عید مبارک عید کارڈ پہ لکھ بھیجیں
کیا ایسے کارڈ بازار میں کم ہیں؟
جن پر کچھ لکھنا نہ پڑے
بس اپنا اور دوجے کا نام لکھ بھیجو

از: صالحہ کوثر، لاہور

عید کے لمحات

ٹھہری رہے لبوں پہ
اک بات
ہو تیرا ساتھ
ہو چاند رات
ہاتھ میں ہو تیرا ہاتھ
یہ رنگ و نور کی برسات
ستاروں کی کہکشاں
نہ بیتے کبھی یہ حسیں پل
یہ دلکش حسیں ساعت
ہو تیرا ساتھ
ہوں عید کے لمحات

شاعرہ: فصیحہ آصف خان، ملتان

کچھ میٹھا ہو جائے

ڈاکٹر...... ”آپ کے شوہر کو مکمل آرام کی ضرورت ہے یہ نیند کی گولیاں لے جائیں۔“
میں نے پوچھا...... ”ڈاکٹر صاحب! میں انہیں یہ کس وقت دوں؟“
ڈاکٹر...... ”یہ ان کے لیے نہیں آپ کے لیے ہیں۔“

☆☆☆

☆ جس دن سے اس بے وفا کو چھوڑا ہے دوستو......! یقین کرو موبائل کی بیٹری تین سے چار دن آرام سے چل جاتی ہے۔

از: پروین افضل شاہین، بہاولنگر

پاکیزہ محبت

جب من کے پُر کیف موسم میں
ان گنت خواہشوں کے جگنو

عنایت کرتا ہے لیکن کبھی، کبھی ان کے بس کی بات بھی نہیں ہوتی۔

از: ایمان چوہدری، فیصل آباد

چاہتوں کے ڈھیروں اشجار کی
پرثمر ٹہنیوں پر جگمگ، جگمگ کرتے ہیں
تو قلب کی ان گنت خواہشوں میں سے
خواہشِ اولین ہو تم
میری پاکیزہ محبت ہوئی سربسجود
میری اس چاہت کی سرزمین ہو تم
میری زیست کے ہم نشین ہو تم
میری خواہشِ اولین ہو تم

شاعرہ: سامعہ ملک پرویز، بھیرہ خان پور ہزارہ

میرا دل

کسی نے ایک شادی شدہ شخص سے پوچھا۔
''آپ شادی سے پہلے کیا کرتے تھے؟''
اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
اور وہ بولا ''جو میرا دل کرتا تھا۔''

مرسلہ: منور شہزادی، گوجرانوالہ

کیسے کہوں

ہم نے روک رکھا ہے
خود کو یہ بتانے سے
تم سے جو محبت تھی
اب نہیں وہ باقی

شاعرہ: سیدہ علیشاہ، بہاول پور

اچھی باتیں

☆ایمان یہ نہیں ہے کہ رب پاک دیتا ہے بلکہ ایمان یہ ہے کہ رب پاک یقیناً دے گا۔

☆منفرد لوگوں کو ہمیشہ مار کھانی پڑتی ہے۔ طعنوں کی یا تنہائی کی......

☆مجھے پتا چلا کہ وہ مجھے ستر ماؤں جتنا پیار کرتا ہے تو مجھے اس کی محبت اچھی لگنے لگی پھر مجھے پتا چلا کہ اس کا بھی محبوب ہے پھر مجھے اس کے محبوب سے بھی محبت ہوگئی اور وہ مجھے نوازتا ہی چلا گیا۔

☆زخم ہمیشہ اسی سے ٹھیک ہوتے ہیں جو انہیں

ذات

چاند پھر آنسوؤں میں ڈوب گیا
رات پھر در بدر اکیلی ہے
اپنی تنہائیوں کا بوجھ لیے
ذات ہر موڑ پر اکیلی ہے

از: سیما گل، ملتان

لاجواب

ایک نوجوان ملازمت کے سلسلے میں انٹرویو دینے گیا۔ انٹرویو لینے والے صاحب نے نوجوان سے اس کی اہلیت و قابلیت پوچھنے کے بعد ایک عجیب سوال کیا شاید ان کا مقصد نوجوان کی تحمل مزاجی آزمانی تھی۔ ''اگر میں آپ کی بہن سے شادی کرنا چاہوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟''

نوجوان چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

''نو سر، اعتراض تو مجھے نہیں ہے...... مگر ایک مسئلہ ہے۔''

''کیسا مسئلہ......؟'' ان صاحب نے پُرتجسس انداز میں پوچھا۔

''سر ہمارے خاندان میں وٹے سٹے کی شادیوں کا رواج ہے۔'' نوجوان نے تحمل سے جواب دیا۔

از: ارم کمال، فیصل آباد

ہری مرچیں

شادی کی ایک تقریب میں جن آگیا، جن کو دیکھ کر لڑکیوں کی چیخیں نکل گئیں۔

ایک بابا جی نے لڑکیوں کو وضو کرنے کو کہا۔ لڑکیاں وضو کرکے آئیں تو...... جن کی چیخیں نکل گئیں۔

از: یاسمین اقبال، سنگھ پورہ لاہور



دلھن اور ماڈلنگ

رعنا کو ماڈلنگ کا کس قدر شوق تھا۔ کیٹ واک کرتی ہوئی ماڈلز اسے حد سے زیادہ اچھی لگا کرتی تھیں۔ کبھی وہ اپنے دالان میں ان کے انداز میں ذرا جو چلنے کی کوشش کرتی تو اماں کی پھٹکار سننے کو ملتی۔

''ارے کیا کنگروں کی طرح چل رہی ہے، صحیح طرح چلا کر۔'' اس نے بار، بار کوشش کی کہ ماں کو قائل کر سکے کہ اسے ماڈلنگ کا شوق ہے اور وہ اپنی خواہش پوری کرنا چاہتی ہے۔

''ماڈلنگ کرنے کا کیا فائدہ ہوگا تمہیں؟'' اماں نے ایک دن اس کی لمبی سی تقریر سن کر کہا۔

''خوب شہرت ملے گی۔''

''ہمیں لڑکیوں کی شہرت پسند نہیں ہے، اس کے علاوہ کیا فائدہ ملے گا؟'' ان کی جرح جاری تھی۔

''خوب پیسے ملیں گے...... آپ کو پتا ہے ٹی وی پر چلنے والے اشتہارات کے سیکنڈوں کے حساب سے پیسے ملتے ہیں۔''

''ہمارے پاس اللہ کا دیا بہت ہے۔ ہمیں ضرورت نہیں ہے کہ اپنی لڑکی کی ادائیں بیچیں۔''

''اماں لوگ ترستے ہیں...... اس فیلڈ میں آنے کے لیے اور ایک آپ ہیں کہ مجھے جانے سے روک رہی ہیں۔'' رعنا نے خاصے دکھے ہوئے دل سے کہا۔

''جب ہم نے نہ کردی تو کردی...... اور اب اس بارے میں پوچھنا بھی نہیں۔'' اماں کا لہجہ خاصا اڑا تھا۔

رعنا نے اپنی تصاویر جو کسی اشتہاری کمپنی میں بھیجی تھیں اور وہاں سے بلاوے کا لیٹر بھی آیا لیٹر اور ان تصاویر کو کبھی اکیلے میں دیکھتی تو بھل، بھل آنسوؤں سے روتی پر زندگی میں ملنے والا گولڈن چانس اماں کی وجہ سے ختم ہوگیا تھا۔

رعنا کے شوق چاہے کتنے ہی تیکھے تھے مگر فرمانبرداری کوٹ، کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اپنے کمرے میں شیشے کے سامنے چاہے کتنی ہی ادائیں دکھا کر خود ہی دیکھتی مگر اس سے آگے کی ہمت کبھی نہیں ہوئی کہ ماڈلنگ کی دنیا میں چوری چھپے قدم رکھنے کے بارے میں سوچتی پھر یوں ہوا کہ اماں نے رعنا کی شادی طے کردی اور وہ بھی چٹ پٹ...... ابھی رشتہ ہی طے ہوا تھا کہ معلوم ہوا کہ جولائی میں شادی بھی ہورہی ہے۔

''اماں اتنی گرمی کے موسم میں کوئی شادی ہوتی ہے؟'' اس نے احتجاج کیا۔

''ہاں بھئی...... بہت سارے لوگوں کی ہوتی ہے۔ اسکول، کالج کی چھٹیاں ہوتی ہیں...... مہمانوں کو بھی آنے جانے میں آسانی رہتی ہے۔''

''میں نے تو جولائی کی کسی دلہن کو بھی روتا پیٹتا نہیں دیکھا سب ہی اسٹیج پر ہنستی مسکراتی ہی نظر آتی ہیں......'' اماں کی بات بھی غلط نہیں تھی...... پھر رعنا بیگم بھی اپنی شادی کی تیاریوں میں جت گئیں۔ سب سے زیادہ خرچہ اس نے ملبوسات کی تیاری میں کیا...... اس کی نانی نے تو بہت سمجھایا بھی کہ کپڑے پر لگا پیسہ نظر نہیں آیا کرتا مگر رعنا نے ان کی بات سن کر چٹکیوں میں اڑادی اور پھر شادی کا دن آپہنچا......

اس دن سخت ترین گرمی تھی لو بھی چل رہی تھی مگر رعنا دھانی اور شاکنگ پنک لہنگے، کرتی میں بہت خوب

صورت لگ رہی تھی۔ مووی میکرز اور فوٹو گرافرز سے اس نے بطورِ خاص کہا تھا کہ وہ اپنی تصاویر اسٹیج پر ہی بنوائے گی اور جب مہمان شادی ہال میں پہنچے تو رعنا اسٹیج پر اچھی خاصی ماڈلنگ کر رہی تھی۔ باراتی اور دولہا میاں بھی ایک جانب کھڑے انہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ کبھی ایک ہاتھ سے دوپٹا اٹھائے اور دوسرے ہاتھ سے کانوں کے بالے کو پکڑے کھڑی ہو جاتی تو کبھی ہاتھ میں شیشہ لے کر اس کو شرمائی نظروں سے دیکھتی۔

ایک تصویر بنواتے وقت تو حد ہی کر دی۔ اپنا لہنگا دونوں ہاتھوں سے اوپر کرتے ہوئے اپنی آنکھیں ٹیڑھی کر کے آسمان پر گاڑ دیں۔

''ارے بھئی، یہ کیا ہو رہا ہے؟'' اماں یہ سب دیکھ کر بدحواس سی ہو گئیں۔ لوگوں کی ہنسی نے انہیں خاصا بدحواس کر دیا تھا۔

''اماں جی بہت خوب صورت پوز ہے...... اس تصویر میں پنڈلی تک مہندی بھی نظر آ رہی ہے۔ اور پائلیں بھی۔'' فوٹو گرافر نے وسیع القلبی سے تعریف کی۔

''ارے بس بھی کرو......'' انہوں نے ایک فوٹو گرافر کے تو تھپڑ بھی جڑ دیا جو دوپٹا ہٹا کر رعنا کی تصویر بنا رہا تھا۔ تب دولہا مسکرا کر بولے۔

''بھئی ماڈلنگ کا ہمیں بھی شوق ہے...... ہم دونوں کی ایک ساتھ ہی تصویریں بنا دیں، یہ کیا بات ہوئی کہ دلہن کی تو تصویریں بن رہی ہیں اور دولہا بیچارہ اکیلا کھڑا دیکھ رہا ہے۔''

''ہاں، ہاں آپ بھی آجائیں۔'' مووی میکر نے انہیں اسٹیج پر چڑھاتے ہوئے کہا اور پھر سب نے دیکھا وہ دونوں اب ماڈلنگ کا شوق پورا کر رہے تھے۔ کبھی سیدھے، کبھی ٹیڑھے، کبھی جھکے ہوئے...... دونوں خطرناک پوز دے رہے تھے اور مہمان کہہ رہے تھے۔

''دیکھنا ان دونوں کی تصویریں بہت اچھی آئیں گی۔'' (کرلوگل)

''اور اگر کسی ٹائٹل پر بھی چھپ جائیں تو ان کی جوڑی کسی فلمی جوڑی سے کم نہیں لگے گی۔'' رعنا تو بے حد خوش تھی...... اس کے تمام ادھورے ارمان آج پورے ہو رہے تھے۔

اکثر دلہنیں اپنی شادی کی تصویر کھنچواتے وقت ماڈلنگ کرتی نظر آتی ہیں کیا ان سب کے دل رعنا جیسے ہوتے ہیں.. یا سب لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

مختصر افسانے

1۔ اللہ وہ آگیا...... اب میں کیا کروں......

2۔ زندگی ضیق کر دی اس نے...... اب دیکھتی ہوں میں بھی......

3۔ کہاں گیا......؟ کدھر چلا...... ذرا سامنے تو آ......

4۔ آ جا رے...... آجا...... ورنہ...... بس...... ہاں!

5۔ تم مل جاؤ...... تو پتا چلے گا تمہیں کہ میں کیا حشر کرتی ہوں۔

6۔ نہ بابا نہ...... میں تمہاری تعریف کروں گی...... نہ بابا نہ......

7۔ پاگل کہیں کا...... اپنی بھنکتی ہوئی کار میں بیٹھ کر ہیرو سمجھ رہا تھا۔

8۔ ٹھیک ہے خوش...... میں تم سے بات کرنا تو کیا دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی......

9۔ جانتے نہیں تم...... مجھ کو...... کہ میں کتنی اکل کھری ہوں، تمہارے گھر والوں کو میں ایک آنکھ برداشت نہیں کر سکتی۔

ایک طویل ناولٹ

ہیرو، ہیروئن کی چونچالیں، 25 صفحات تک۔
غلط فہمیاں، پشیمانیاں، 18 صفحات تک۔
ہیرو، ہیروئن کو حقیقت کا ادراک 8 صفحات تک۔
بقیہ دس صفحات پر خوشگوار اختتام۔

اوچھا پن

آج مجھے مسز مراد کا انٹرویو کرنا تھا۔ ٹھیک پانچ بجے جب میں اپنی چمچماتی کار میں ان کے گھر پہنچی تو ملازم نے مجھے ان کے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔

ماشاء اللہ ان کا یہ ملاقاتی کمرا ایسا ہی سجا سنورا تھا جیسا میرا ڈرائنگ روم ہے بلکہ میرے کمرے میں سجاوٹ کی اشیا اس سے کہیں زیادہ ہی ہیں۔

دس پندرہ منٹ میں عنابی ریشمی جوڑے میں مسز مراد آئیں، اتفاق سے میرا سوٹ بھی اسی کلر کا تھا...... ہاں نفیس اس سے زیادہ تھا۔ انہوں نے کانوں میں سونے کے چھوٹے، چھوٹے سے بندے پہن رکھے تھے اور گلے میں کچھ بھی نہیں تھا، ہاتھ میں اولڈ فیشن کی چھتری کے ڈیزائن کی انگوٹھی تھی۔

میرے نئے فیشن کی جدید جیولری دیکھ کر وہ ہکا بکا سی رہ گئیں۔

''رضیہ! آپ تو بے حد نفیس جیولری پہن کر آئی ہیں۔'' تب میں بے اختیار ہنس پڑی۔

''آپ ہنستی ہوئی بہت اچھی لگتی ہیں۔'' وہ بولیں۔

''یہ بات مجھے معلوم ہے۔'' میں پھر ہنسی۔

''آپ نے اپنے گھر کو خوب سجا رکھا ہے۔'' میں نے یونہی کہا۔

''شکریہ......'' وہ انکساری سے بولیں۔

''ہاں میں نے بھی اپنے گھر کو خوب سجایا ہے۔ اگر کوئی مہمان کرسٹل کی ایک دو چیزیں اٹھا کر اپنے گھر لے جائے تو مجھے پتا بھی نہیں چلتا۔'' میں پھر ہنس دی۔

''کیا آپ کے ساتھ، کوئی ایسا واقعہ ہوا ہے؟'' وہ متحیری پوچھ رہی تھیں۔

''ہاں، ایسا اکثر ہوتا رہتا ہے، جس شام آپ اپنے ببلو کی سالگرہ کا کارڈ دینے آئی تھیں۔ اس شب بھی کوئی ہاتھ صاف کر گیا تھا۔''

''اُف، ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں۔'' انہوں نے متاسف لہجے میں کہا۔

''چور تو ہر طرح کے ہوتے ہیں۔''

''اچھا......'' اب وہ مجھے استفہامیہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

''میں نے دراصل مسز خان کی ساڑی کی تعریف نہیں کی تھی، ان کی بہن کی مہندی میں وہ زبردست پارلر سے تیار ہوئی تھیں۔ بس وہ جل گئیں۔ میرے ہاں ولیمے کا کارڈ دینے آئیں تو بس حساب برابر کر لیا۔''

''اوہ......'' حیرت سے ان کے منہ کے زاویے تبدیل ہونے لگے۔

''چلیے...... ہم انٹرویو کا آغاز کرتے ہیں۔ آپ ہمیں یہ بتائیں کہ آپ کی فیورٹ ڈش کون سی ہے؟''

''اتنا مشکل سوال فوری طور پر تو نہیں دے سکوں گی جواب۔''

''یہ مشکل سوال ہے؟''

''بے حد مشکل ہے، میری پسند تو آئے دن بدلتی رہتی ہے۔''

''آج کل کیا پسند ہے آپ کو......؟ یعنی موسم گرما میں آپ کیا کھانا پسند کرتی ہیں؟''

''بہت طویل فہرست ہے، یوں بھی میں کھانے کی کہاں شوقین ہوں، بس تھوڑا بہت چکھتی ہوں مگر چکھنے چکھانے میں بھی بہت کچھ ہو جاتا ہے۔''

''کیا کچھ ہو جاتا ہے۔''

''یہ تو میں ڈسکس کر کے بتا پاؤں گی۔''

''کب تک......''

''ایک ہفتہ تو لگ جائے گا۔''

''اتنا وقت لیں گی آپ......''

''پہلے میں گھر میں ڈسکس کروں گی پھر میں اپنے وکیل سے بات کروں گی۔''

''اتنی دردِ سری کی کیا ضرورت ہے؟''

''ہر آدمی اپنی کلاس کے حساب سے بات کرتا ہے۔'' انہوں نے اپنی بھویں اچکائیں۔

''ہاں یہ تو ہے مگر میں تو کبھی، کبھی اپنی کلاس سے

نیچے بھی اتر آتی ہوں۔'' میں ہنسی مگر ہنستے، ہنستے وہ ایک دم رک گئیں۔ ان کی بچی کو لیے آیا داخل ہو کر بولی۔

''میڈم، آپ کی امی کے گھر سے جو کڑھی آئی تھی جو آپ نے دوپہر میں کھا کر کہا تھا کہ رات کو بھی وہی کھائیں گی۔ یہ بے بی صاحب بول رہی ہیں کہ ان کو بھی صرف کڑھی چاہیے مگر وہ تو آپ کے لیے ہی بچی ہے۔ میں یہ بے بی صاحب کو کھلا دوں یا آپ کھائیں گی۔'' تب میں ہنس کر کھڑی ہو گئی۔

''شکریہ مسز مراو، مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا ہے۔''

قارئینِ کرام، ان دنوں میں بڑے لوگوں کی بیگمات سے صرف ایک ہی سوال پوچھ رہی ہوں۔ جی ہاں مجھے اسی موضوع پر ایک ریسرچ پیپر تیار کرنا ہے۔ موضوع تو یقیناً آپ کو پتا چل ہی گیا ہوگا۔

''او چھاپن!''

یہ خیر دوسری بات ہے کہ اگر ایسے موضوعات پر اوچھے لوگ ہی قلم اٹھائیں ...... تو ...... بات دل میں اتر جائے گی۔

ایک مکالمہ

(نند) ''کیسی ہیں بھابی آپ! اب طبیعت کیسی ہے؟''

(بھابی) ''ٹھیک ہوں، طبیعت کا کیا پوچھتی ہو، ویسی ہی خراب ہے، نزلہ، زکام کو لوگ بیماری ہی نہیں سمجھتے۔ جوڑ جوڑ ہلا کر رکھ دیا ہے۔ سر میں اس قدر درد ہے کہ نہ کہیں جانا اچھا لگ رہا ہے اور نہ ہی کوئی آیا ...... اور اس مرتبہ کراچی کی گرمی کیسی پڑی ہے ...... الٰہی توبہ ......!''

(نند) ''میں تو اس وجہ سے آ گئی، امی نے فون پر بتایا تھا کہ تمہاری بھابی، آج تین دن ہو گئے، اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلیں، جانے فریج میں کتنا کھانا بھر رکھا ہے، وہی لپالپ کھا رہی ہیں، گھر کے باورچی خانے کو آ کر دیکھ نہیں رہیں کہ بڑھیا نے کیا پکایا اور کیا کھایا۔''

(بھابی) ''ارے بھئی، جب اپنی طبیعت اچھی نہ ہو تو کچھ اچھا نہیں لگتا، مجھے تو اپنے بچے برے لگ رہے تھے ...... اللہ گرمی میں تو کچھ اچھا ہی نہیں لگتا۔''

(نند) ''ارے ہاں، بچے نظر نہیں آ رہے ہیں کہاں؟''

(بھابی) ''دو بچے بڑی آپا لے گئی ہیں اور دو چھوٹی آپا انہیں احساس تھا کہ مجھے بچے کس قدر تنگ کرتے ہیں ان کے شور کی وجہ سے میں دوپہر کو مووی تک نہیں دیکھ سکتی تھی۔ جب سے بچے اپنی خالاؤں کے پاس گئے ہیں میں نے اپنی شادی تک کی مووی دیکھ ڈالی۔''

(نند) ''ڈاکٹر کو دکھایا آپ نے کہ آپ کو نزلہ ہو گیا ہے، شاید وہ اس حالت میں آپ کو ایڈمٹ کر لیتا ...... ہوسکتا ہے کہ ناک کا کوئی چھوٹا موٹا آپریشن بھی ہو جاتا۔ کم از کم ......

دس بارہ بوتلیں گلوکوز کی لگ جاتیں تو آپ کی کمزوری تو دور ہو جاتی۔ شاید جو نندوں کو دیکھ کر آپ کو چکر آتے ہیں اور آپ قصداً اپنا دروازہ بند کر کے اس وقت تک بیٹھی رہتی ہیں، جب تک سب نندیں اپنے گھر نہیں جاتیں۔''

(بھابی) ''ارے ڈاکٹر کا کیا پوچھتی ہو، آج ڈاکٹر کے پاس چلی جاؤں تو سو پچاس بیماریاں تو وہ نکال ہی دے گا مگر تمہارے بھائی کے پیسے سے ہمدردی ہے کہ ہر دکھ، تکلیف، پریشانی اپنی جان پر جھیل جاتی ہوں۔ اب تم اپنی بہن کو دیکھ لو، پچھلے دنوں خوب موٹی ہو رہی تھیں اور اپنے میاں کو کہہ دیا کہ مجھ پر ورم چڑھ رہا ہے، خوب ڈاکٹروں کے ہاں چکر لگاتی رہیں، ڈاکٹروں کے لکھے ٹانک پی پی کر اور مزید موٹی ڈھسو ہو گئی ہیں اور میاں بیچارہ بیوی کے لیے ہلکان ہوتا رہتا ہے اور جب بھی آتا ہے کہتا

ہے کہ ''بیچاری صفیہ ہر وقت بیمار رہتی ہے۔'' بھئی مجھے نہیں آتے یہ ڈھکوسلے دکھانے، اس لیے بیماری بھی ہو جاؤں تو چپ چاپ بستر پر پڑ جاتی ہوں۔ اب رات کو کوئی پانچ دفعہ مجھے چھینکیں آئیں، تین دفعہ کھانسی اٹھی، تین دفعہ پانی پینے کے لیے اٹھی، ایک دفعہ ٹوائلٹ جانے کے لیے اٹھی، اب تم ہی بتاؤ میں رات کو کتنی دیر سوئی ہوں گی۔ ساری رات آنکھوں میں کٹی، اب ظاہر ہے میں صبح کے وقت ہی سوؤں گی ...... جب تمہارے بھائی آفس گئے، اسی وقت میری آنکھ لگی تھی۔ تمہاری اماں کی آواز میرے کانوں میں تیر کی طرح آئی، میاں بھوکا پیاسا دفتر جا رہا ہے، بیوی صاحبہ کمرے میں بے ہوش پڑی ہیں۔ سچ اتنا رونا آیا کہ بتا نہیں سکتی مگر مجھے تو عادت ہی نہیں ہے ...... کچھ بولنے کی۔ دم کی مٹھی دم میں ہی مار لی، بھئی اب اگر تمہارا بیٹا بھوکا پیاسا آفس جا رہا تھا تو تم اسے ناشتا کرا دیتیں، آخر شادی سے پہلے بھی تو دیتی تھیں، یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ بیٹوں کی شادیاں کرنے کے بعد یہ مائیں اپنے بیٹوں کا کام کیوں چھوڑ دیتی ہیں۔''

(نند) ''ارے چھوڑیں آپ ان باتوں کو، آپ یہ بتائیں، آپ نے ناشتا کیا یا نہیں ...... اس وقت تو تین بج رہے ہیں۔''

(بھابی) ''میں کیوں نہیں کروں گی ناشتا ......
سامنے والے حلوائی کو کہہ رکھا ہے کہ روزانہ گیارہ بجے چھ پوریاں، حلوا اور ترکاری اپنے نوکر کے ہاتھ بھیج دیا کرے۔ لسی کے دو گلاس بھی وہ اسپیشلی طور پر بنا کر بھیجتا ہے۔ ناشتے میں تو میرے روپے لگتے ہیں مگر دوپہر کا کھانا، چار بجے کے قریب کھاتی ہوں۔ میری آپا نے بریانی پکا کر پیکٹوں میں فریز کر کے دی ہے، جب بھوک لگتی ہے ایک پیکٹ نکالا مائیکرو ویو میں گرم کیا اور پیٹ بھر لیا ...... نہ تو میرا کوئی خرچہ ہے اور نہ ہی کوئی کام ...... بیمار پڑی ہوں تو میری بہنیں ہی کام آ رہی ہیں۔ کسی کے سر پر بوجھ نہیں ہوں۔''

(نند) ''ارے چھوڑیں ان باتوں کو، میں تو آپ کو دیکھنے آئی تھی۔ کل ہمارے میاں اپنی پروموشن کی خوشی میں فائیو اسٹار ہوٹل میں ڈنر دے رہے ہیں مگر آپ کی تو طبیعت خراب ہے۔ خیر ...... پھر سہی ......''

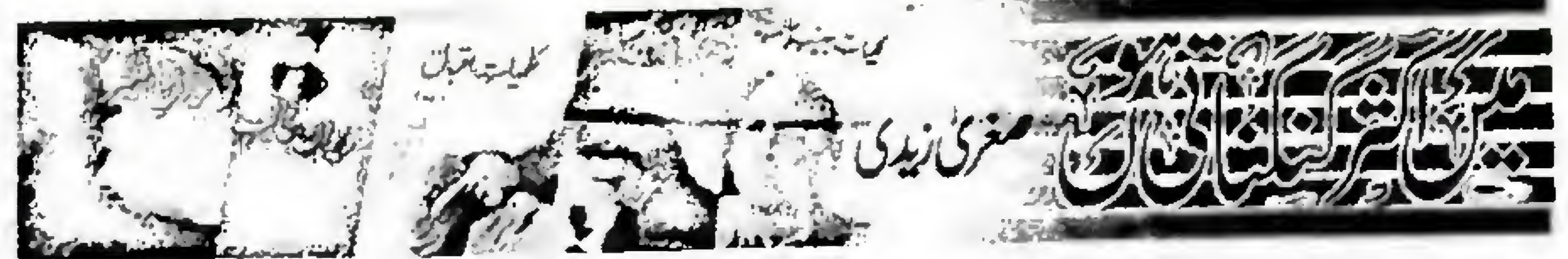
(بھابی) ''اچھا، فاروق ڈنر دے رہے ہیں۔ نہیں بھئی میں ضرور آؤں گی۔ بس کمزوری ہے مگر میں ایسی بھاوج نہیں ہوں جو اپنی نند کی خوشی میں شریک نہ ہوں، ضرور آؤں گی۔ وہی ہوٹل ہے ناں جس میں تم نے اپنے بچوں کی سالگرہ کی تھی۔''

(نند) ''ہاں وہی ہے مگر آپ سے تو اٹھا نہیں جا رہا نہ کوئی آتا اچھا لگ رہا ہے ...... اور ......''

(بھابی) ''ہاں، ہاں ...... اس کے باوجود میں آؤں گی کہ اپنی نندوں کو ہمیشہ اپنی بہنوں سے زیادہ جو سمجھا ہے۔ ہاں اگر جلنے والی ہوتی تو کبھی نہیں آتی ...... ہاں یاد آیا اس ہوٹل کا کھانا کیا مزے دار ہوتا ہے۔ کتنا ہی کھا لو ...... میرا تو پیٹ نہیں بھرتا ...... چائنیز کا تو جواب ہی نہیں ...... ہاں میں فیروزی سوٹ پہن لوں، جس میں آڑی، آڑی موتیے کی کلیاں کڑھی ہوئی ہیں۔ اس کو پہن کر میں زیادہ خوب صورت لگتی ہوں۔ اس کی میچنگ سینڈل تم سے لے لوں گی جو تم اس وقت پہنے ہوئے ہو، جاتے وقت یہیں چھوڑ کر جانا واپسی پر اپنی اماں کی کوئی چپل پہن جانا۔''

(نند) ''اچھا میں چلتی ہوں، لگتا ہے اب آپ کی طبیعت ٹھیک ہے۔ اماں کمرے میں اکیلی پڑی ہیں۔ ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ ذرا جا کر ان کو دیکھ لیں۔ ہاں دودھ فریج میں رکھا ہے وہ ہماری اماں کو پلا دینا۔ خود مت پی لینا ...... کہ آپ نے کہا کہ آپ کو دودھ سے الرجی ہو جاتی ہے۔''

☆☆☆



☆ارم کمال، فیصل آباد
عید بھی آئے گی اور آکر گزر جائے گی
مندمل زخم مگر پھر سے لگیں گے رسنے
یاد بے ساختہ آئے گا کوئی جانِ حیات
اِک اداسی میرے ماحول پہ چھاجائے گی

☆ردا حنیف، کراچی
توڑ کے رشتے ناتے سارے غیر کی محفل کی آباد
بادِ صبا! تو ہی بتا ہم رسمِ عید منائیں کیا
نامہ بر جا کر یہ کہنا تنہا ساغر اب تک ہے
دل کا ماتم کرنے والے جشنِ عید منائیں کیا

☆بدر دین افضل، بہاول نگر
نماز پڑھ کے ترے غم گلے لگاؤں گا
اکیلے عید منانا مری سرشت نہیں

☆صائمہ سجاد، بنگش، کوہاٹ
اس بچے کی عید نہ جانے کیسی ہوگی
جس کی جنت ننگے پاؤں پھرتی ہے

☆بشریٰ رضوی، کراچی
مرے بھی من کے دریچوں میں عید ہو جائے
مرے افق پہ اگر چاند بن کے چھائے وہ

☆نفیسہ نہال، لاہور
ہو جائیں سبھی شکوے گلے دور دلوں سے
وہ کہہ دیں گلے مل کے اگر عید مبارک
جب آپ ہمیں اپنا سمجھتے ہیں تو کہیے
ہنستے ہوئے بے خوف و خطر عید مبارک

☆فرزانہ نگہت، راول پنڈی
ہم تمہیں بھولنے کا سوچیں گے
جب کبھی دل پہ اختیار ہوا

☆یاسمین کنول، پسرور
کہیں گم زمانوں کی داستاں کہیں حال وفردا کا راز داں
کہیں رنگ حسنِ غزل میرا نہ تو اجنبی نہ تو آشنا
میرے ساتھ بھی دو قدم چلو ہو سکے تو ساتوں جنم چلو
میری چشمِ تر کی ہے التجا نہ تو اجنبی نہ تو آشنا

☆کائنات عبدالحلیم، میرپور خاص
کوئی پہر ایسا گزرا نہیں ہے
تیرے بارے میں جب سوچا نہیں ہے
ہمیں سب لوگ سمجھاتے ہیں آکر
اسے کوئی بھی کچھ کہتا نہیں ہے

☆نیلوفر خان، بہارہ کہو
تیرا دل میں اترنا پھر تیرا دل سے اتر جانا
قیامت تھا اگر وہ قیامت سے یہ بڑھ کر ہے

☆عنبر وسیم، گوجرانوالہ
ایک سے ایک خداوند ملا سجدہ طلب
آدمی سخت مراحل سے خدا تک پہنچا

☆رباب نقوی، کراچی
کچھ حرف التجا کے دعاؤں سے ڈر گئے
ارمان بندگی کے خداؤں سے ڈر گئے
اب کون دیکھتا ہے ترے شمس کی طرف
سورج مکھی کے پھول شعاعوں سے ڈر گئے

☆فضہ بتول، بہارہ کہو
یاد آؤں تو بس اتنی سی عنایت کرنا
اپنے بدلے ہوئے لہجے کی وضاحت کرنا
تم تو چاہت کا سمندر ہوا کرتے تھے
کس سے سیکھا ہے محبت میں ملاوٹ کرنا

☆رابعہ شاہد، دبئی
ہمارا تذکرہ چھوڑو، ہم ایسے لوگ ہیں جن کو
نفرتیں کچھ نہیں کہتیں، وفائیں مار دیتی ہیں

☆حمیرا نوشین، منڈی بہاؤالدین
عید کے چاند میں کھو کر نہ جانے
کتنی ماؤں نے اپنے چاندوں کو تلاشا ہوگا

☆سیدہ غزالہ عالم، کراچی
محبتوں کا حساب تھا نہ عداوتوں کا شمار تھا
کبھی اس کی ذات عذاب تھی کبھی وہ روح کا قرار تھا
اسے میں نے مڑ کے صدا نہ دی کہ پلٹ گیا وہ راہ سے
میں خزاں ہوا تو پتا چلا میری ذات کا وہ نکھار تھا

☆شبانہ ملک، ڈی جی خان
اپنے تیور تو سنبھالو کہ کوئی یہ نہ کہے
دل بدلتے ہیں تو چہرے بھی بدل جاتے ہیں

☆فریحہ شبیر، شاہ نکڈر
بکھر رہے ہیں میری زندگی کے ورق تمام
نہ جانے کب کوئی آندھی اڑا کر لے جائے

☆عرشیہ جنید، کراچی
کانچ کے پیچھے چاند بھی تھا، کانچ کے اوپر کائی بھی
تینوں تھے ہم، وہ بھی، میں بھی اور تنہائی بھی
یادوں کی بوچھاڑ سے جب پلکیں بھیگنے لگتی ہیں
سوندھی سوندھی لگتی ہے تب ماضی کی رسوائی بھی

☆روبینہ حیات مغل، کراچی
رکتا بھی نہیں ٹھیک سے چلتا بھی نہیں ہے
یہ دل کہ تیرے بعد سنبھلتا بھی نہیں ہے
اس عمر کے صحرا سے تیری یاد کا بادل
ٹلتا بھی نہیں اور برستا بھی نہیں ہے

☆ناظمہ شاہین، واہ کینٹ
اس شہر کے اجڑے دامن میں
کچھ جیون کے دن بیت گئے
وہ راتیں گئیں وہ باتیں گئیں
سکھ ہار گئے دکھ جیت گئے

☆سیما گل، ملتان
بجھے ہوئے سے، سجے ہیں تو دل ہیں بجھے بجھے
ہر شخص میں تضاد ہے دن رات کی طرح

☆ظل شاہین، رحیم یار خان
مختصر ہو گئیں اب دوستوں کی دوستیاں
صبح ہوئی تو صبح بخیر، رات ہوئی تو شب بخیر

☆فرخندہ جعفری، گجرات
اپنے بے نور چراغوں کو ضیا دی جائے
نہ کہ ہمسائے کی قندیل بجھائی جائے

☆کوثر خالد، جڑانوالہ
پھر جاگ اٹھا ہے دل میں پرانے دنوں کا درد
جی چاہتا ہے پھر کوئی تازہ غزل کہوں

☆ماہ نور قیصر، راول پنڈی
ایسا وجدان کہ ہر اِک شے میں تو ہی تو
ایسا فقدان کہ نزدیک رگِ جاں بھی نہیں

☆جبیں نیاز، ملتان
اذاں پہ قید نہیں بندشِ نماز نہیں
ہمارے پاس تو ہجرت کا بھی جواز نہیں

☆نرگس قسیم، صابہ موہڑہ
چھپ چھپ کے روؤں اور سرِ انجمن ہنسوں
مجھ کو یہ مشورہ مرے دردآشنا کا تھا

☆نگینہ ضیا بنگش، کراچی
ہوا کی پیروی کرنی پڑے گی
یونہی تھوڑی شجر جھک کر ملیں گے
تمہاری میزبانی کے بہانے
کوئی دن ہم بھی اپنے گھر ملیں گے

☆دیا آفرین...... شاہدرہ
محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہے زہر یہ بھی پی لیا میں نے
انہیں اپنا نہیں سکتا مگر اتنا بھی کیا کم ہے
کہ کچھ مدت میں خوابوں میں کھو کر جی لیا میں نے

☆☆☆



مزیدار سویاں

اجزا: سویاں، ایک پیکٹ۔ کنڈینسڈ ملک، ایک ٹن۔ الائچی، تین عدد۔ لونگ، دو سے تین عدد۔

ترکیب: ایک دیگچی میں سویاں ڈال کر بھون لیں اور نکال لیں پھر اسی دیگچی میں تھوڑا سا گھی ڈال کر اور الائچی، لونگ ڈال کر کڑکڑائیں پھر اس میں سویاں ڈال کر بھونیں اور کنڈینسڈ ملک ڈال کر ذرا سا پکائیں۔ جب پک جائے اور ملک اچھی طرح میلٹ ہوجائے تو اسے گھی لگے سانچے میں ڈال کر پھیلا لیں اور ٹھنڈا ہونے پر اس کو کسی بھی شیپ میں پیس کاٹ لیں اور اگر چاہیں تو اس کے لڈو بھی بنائے جاسکتے ہیں۔

مرسلہ: مدیحہ نورین مہک، برنالی

چاکلیٹ اسٹرابیری موز کیک

اجزا: انڈے، چھ عدد۔ میدہ، چار کھانے کے چمچ۔ کوکو پاؤڈر، دو کھانے کے چمچ۔ چینی، آدھی پیالی۔ ونیلا ایسنس، ایک چائے کا چمچ۔ گھی، ایک کھانے کا چمچ۔

اسٹرابیری موز کے اجزا

اسٹرابیری، دو پیالی۔ فریش کریم، دو پیالی۔ چاکلیٹ سیرپ، آدھی پیالی۔ جیلاٹن، ڈھائی کھانے کے چمچ۔ اسٹرابیری ایسنس، چند قطرے۔ چینی کا شیرہ، آدھی پیالی۔

ترکیب: اسفنج بنانے کے لیے صاف خشک پیالے میں انڈوں کی سفیدیوں کو چینی کے ساتھ پھینٹیں۔ پھر اس میں زردی ملا کر پھینٹ لیں۔ میدہ اور کوکو پاؤڈر ملا کر چھان لیں اور ونیلا ایسنس کے ساتھ پھینٹے ہوئے انڈوں میں ملا لیں۔ نو انچ کے دو سانچے لے کر ان میں برش کی مدد سے آئل لگا لیں اور تیار کیے ہوئے مکسچر کو دونوں میں آدھا، آدھا ڈال دیں۔ پہلے سے گرم کیے ہوئے اوون میں 180C پر پندرہ سے بیس منٹ بیک کر کے نکال لیں اور ٹھنڈا کرنے رکھ دیں۔

اسٹرابیری موز بنانے کے لیے

اسٹرابیریز کو صاف دھو کر ہلکی آنچ پر پکنے رکھ دیں۔ جب وہ اپنے ہی پانی میں گل جائے تو اسے ٹھنڈا کر کے بلینڈ کر لیں۔ چینی کے شیرے میں ایسنس ملا کر رکھ لیں، کریم کو فریزر میں دس منٹ رکھ کر ٹھنڈی کریں اور الیکٹرک بیٹر سے پھینٹ لیں۔ جیلاٹن میں چار کھانے کے چمچ نیم گرم پانی ملا کر اسے ابلتے ہوئے پانی کے پیالے میں پکا لیں، جب پگھلنے پر آجائے تو اسے کریم اور بلینڈ کی ہوئی اسٹرابیری کے ساتھ ملا کر پھینٹ لیں۔ موز تیار ہے۔

کیک کو ٹھنڈا کر کے پین سے نکالیں اور دونوں کیک پر شیرہ پھیلا کر ڈال دیں۔ جب شیرہ تھوڑا سا جذب ہوجائے تو کیک کو چاکلیٹ ساس سے کور کر دیں اور اس پر موز پھیلا کر لگائیں اور فریز میں رکھ دیں۔

دوسرے کیک کو بھی اسی طرح تیار کر لیں پھر دونوں کیک کو ایک دوسرے کے اوپر رکھیں اور اسے مکمل طور پر موز سے کور کر دیں۔

تین سے چار گھنٹے کے لیے فریزر میں رکھ کر ٹھنڈا کر لیں۔

پریزنٹیشن: اس زبردست کیک کو تازہ اسٹرابیریز سے سجا کر خاص مواقع پر پیش کریں۔

مرسلہ: زرینہ خان، بہارہ کہو

شاہی مرغ

اجزا: چکن کی بوٹیاں، آدھا کلو۔ ثابت گرم مسالا، ایک کھانے کا چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ بادام، پستے، دو کھانے کے چمچ۔ ادرک لہسن پسا ہوا، ایک کھانے کا چمچ۔ چھوٹی الائچی، تین سے چار عدد۔ پیاز، دو عدد درمیانی۔ فریش کریم، ایک پیالی۔ لال مرچ پسی ہوئی، ایک کھانے کا چمچ۔ گھی، تین کھانے کے چمچ۔

ترکیب: چکن کی بوٹیوں کو دھو کر خشک کرنے رکھ دیں۔ پیاز کو باریک کاٹ لیں اور بادام، پستوں کو دھو کر بھگو دیں۔ چھلکا نرم ہونے پر چھیل کر انہیں پھیلا کر خشک کر لیں۔ پین میں گھی میں ثابت گرم مسالا ڈال کر کڑکڑائیں پھر اس میں پیاز کو سنہری فرائی کر کے گرم مسالے کے ساتھ نکال لیں۔ اسی پین میں گھی میں ادرک لہسن، لال مرچ اور چکن ڈال کر تیز آنچ پر بھونیں۔ اس دوران الائچی اور بادام، پستوں کو گرائنڈر میں باریک پیسیں پھر اسے بلینڈر میں ڈال کر ساتھ میں فرائی کی ہوئی پیاز اور آدھی پیالی کریم ڈال کر بلینڈ کر لیں۔ بلینڈ کیے ہوئے مکسچر کو چکن میں ڈال کر چار سے پانچ منٹ درمیانی آنچ پر پکائیں پھر آنچ تیز کر کے بھون لیں۔ گھی علیحدہ ہونے پر ہلکی آنچ پر تین سے چار منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔

پریزنٹیشن: ڈش میں نکال کر اوپر سے کریم پھینٹ کر ڈال دیں اور گرم گرم شیرمال کے ساتھ پیش کریں۔

مرسلہ: رانیہ محمود، کوئٹہ

بلوچی رائس

اجزا: گوشت، آدھا کلو۔ لال مرچ پسی ہوئی، ایک کھانے کا چمچ۔ چاول، دو پیالی۔ پسا ہوا دھنیا، ایک کھانے کا چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ ہلدی، ایک چائے کا چمچ۔ ادرک، لہسن پسا ہوا، دو چائے کے چمچ۔ دہی، ایک پیالی۔ پیاز، تین عدد درمیانی۔ زعفران یا زردے کا رنگ، ایک چٹکی۔ آلو، تین عدد۔ کیوڑا ایسنس، ایک چائے کا چمچ۔ ٹماٹر، تین عدد درمیانے۔ ہرا مسالا، آدھی پیالی۔ ثابت گرم مسالا، ایک کھانے کا چمچ۔ کوکنگ آئل، تین چوتھائی پیالی۔

ترکیب: پیاز کو باریک کاٹ کر رکھ دیں، آلو اور ٹماٹر کے موٹے گول قتلے کاٹ لیں۔ گوشت کو صاف دھو کر رکھ لیں اور چاولوں کو بیس منٹ کے لیے بھگو کر رکھ دیں۔

پین میں کوکنگ آئل کو درمیانی آنچ پر گرم کریں اور اس میں آلوؤں کو ہلکی آنچ پر سنہرا فرائی کر کے نکال لیں پھر اسی پین میں پیاز کو سنہری فرائی کریں اور فرائی ہونے پر تھوڑی سی پیاز نکال کر علیحدہ رکھ لیں۔ پین میں ادرک، لہسن، نمک، گوشت، لال مرچ، دھنیا اور ہلدی ڈال کر بھونیں پھر ایک پیالی پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر پکنے رکھ دیں۔ علیحدہ بڑے پین میں چاولوں کو نمک ملے پانی میں گرم مسالا ڈال کر ابالیں اور چھلنی میں پانی نتھار لیں۔ گوشت گل جائے تو چولھے سے اتار لیں اور ابلے ہوئے چاولوں کے تین حصے کر لیں۔ دہی میں کیوڑا ایسنس اور زردے کا رنگ ڈال کر پھینٹ لیں۔ بڑے پین میں ایک حصہ چاولوں کا ڈال کر اس پر آلو اور ٹماٹر کے قتلے رکھیں پھر آدھا گوشت ڈال کر اس پر دوسرا حصہ چاول ڈالیں پھر گوشت ڈال کر ٹماٹر کے قتلے رکھیں اور تیسرا حصہ چاولوں کا ڈالیں۔ آخر میں فرائی کی ہوئی پیاز، باریک کٹا ہوا ہرا مسالا اور دہی ڈال کر ڈھک کر دم پر رکھ دیں۔ پانچ منٹ آنچ تیز رکھ کر پھر ہلکی آنچ پر دس سے بارہ منٹ دم دے دیں۔

مرسلہ: ناہید انجم، کراچی

☆☆☆

سندیسے پاکیزہ بہنیں

اعتبار
حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا۔
اس سے ضرور معافی مانگو جسے تم چاہتے ہو۔
اسے مت چھوڑو جو تمہیں چاہتا ہے۔
اس سے کچھ نہ چھپاؤ جو تم پر اعتبار کرتا ہے۔
از: نگینہ ضیا بخش، کراچی

زندگی مختصر ہے
ملے گا کیا دلوں میں نفرتیں رکھ کر
بڑی مختصر سی ہے زندگی مسکرا کے ملا کرو
از: نرگس نسیم، صابہ موہڑہ

کیسی خوشی.....؟
شوہر..... ''تمہاری امی کی مذاق کی عادت نہیں گئی۔''
بیوی..... ''کیا کہہ دیا میری امی نے؟''
شوہر..... ''آج بھی مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ میری بیٹی سے شادی کر کے خوش تو ہو ناں.....؟''
از: نور افشاں، شکار پور

وقت
کون کس کے ساتھ کتنا مخلص ہے
وقت سب کی اوقات بتا دیتا ہے
از: ماہا بلوچ، میرپور خاص

ایک حکایت
جاں بلب اگر تم ہو تو یقین ہے روزی
دو ہاتھ سلامت ہیں تو ہر زمین ہے روزی
از: کوثر خالد، جڑانوالہ

تلوار
غیر ضروری تنقید وہ تلوار ہے جو سب سے پہلے خوشگوار تعلقات کا سر قلم کرتی ہے۔
از: شازیہ محبوب، کراچی

پیاری پاکیزہ بہنوں کے نام
اسے بتا دو کہ میں اپنی دنیا میں مگن ہوں
یہ بھی بتا دینا کہ میری دنیا صرف تم ہو
مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

زیادہ
غرور ایک بیماری ہے جو کسی بھی کم ظرف کو لگ سکتی ہے
اور میرے اطراف میں شاید بیمار بہت زیادہ ہیں۔
از: انیلا ناہید، لیہ

میری عیدی
عید بھی گزر گئی
دعوتیں بھی نمٹ گئیں
مگر تمہاری یادداشت
شاید ابھی تک واپس
نہیں آئی..... کہ جب
بھی آتے ہو..... عیدی
کی بات ہی نہیں کرتے
از: صبا نور، لیہ

اصل بات
میں آپا کے ساتھ اپنے لڑکے کے لیے لڑکی دیکھنے گئی تھی۔ مگر وہاں بڑے، بڑے صوفوں اور بڑی، بڑی پینٹنگز کے کچھ نظر ہی نہیں آیا..... ہاں وہ لڑکی

بہت چھوٹی سی تھی میری بڑی، بڑی آنکھوں میں سما ہی نہیں سکی۔
از: عرشیہ جنید، کراچی

سن لو
مت پوچھ کہ کس طرح چل رہی ہے زندگی
اس دور سے گزر رہے ہیں جو گزرتا ہی نہیں
☆☆☆
ناراض ہونے کا شوق بھی پورا کر لو
لگتا ہے تمہیں ہم زندہ اچھے نہیں لگتے
از: نجمہ اصغر، کراچی

خوب صورت پیغام سب کے لیے
ہمیشہ اپنے آپ کو 'زیر' سمجھو 'زبر' نہیں سمجھو کیونکہ
کل کو تمہیں 'پیش' بھی ہونا ہے۔
مرسلہ: ظل شاہین، رحیم یار خان

شکوہ، جواب شکوہ
بطور پیغام کی صورت
شوہر کا شکوہ.....
اتنے کنکر ہیں دال میں بیگم
ایک لقمہ بھی کھا نہیں سکتے
بیگم کا جواب.....
رات دن اتنے پان کھاتے ہو
چار کنکر چبا نہیں سکتے
شوہر کا شکوہ.....
تم غیروں سے تو ہنس، ہنس کر ملاقات کرو ہو
اور ہم سے وہی زہر بھری بات کرو ہو
بیگم کا جواب شکوہ.....
ہم غیر کے آگے تمہیں کیا حال سنائیں
پاس آ کے سنو دور سے کیا بات کرو ہو.....
از..... مسز ایس اے نقوی، ڈیرہ غازی خان

سوال
دل کو تیرا بس تیرا خیال ہے اِک
تیری یاد کا ہر جانب جال ہے اِک
تو کب آئے گا انتظار سے پوچھتی ہیں آنکھیں
دل کے لب پہ بھی یہی سوال ہے اِک
ارم خان..... ڈی جی خان

غصہ
دیکھ کر جو ہمیں چپ چاپ گزر جاتا ہے
کبھی اس شخص کو ہم پیار کیا کرتے تھے
اور اب..... پرانی باتوں پر مجھے بے حد غصہ آتا ہے۔
از: سیدہ جیا عباس شاہ..... مرالی تلہ گنگ

تلاش
حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری فرمایا کرتے تھے کہ مجھے پوری زندگی میں دو لوگوں کی تلاش رہی پر وہ مجھے نہ مل سکے۔
ایک وہ جس نے صدقہ کیا ہو اور وہ مفلس ہو گیا ہو اور دوسرا وہ جس نے ظلم کیا ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے محفوظ رہا ہو۔
مصباح رضا سعید، فیصل آباد

فصیحہ آصف کے نام
تمہارے ہجر کے موسم گوارا ہیں
تمہارے ہجر میں دنیا بھلا دوں گی
تمہارے پیار کی گہری اذیت یاد رکھوں گی
میں سب کچھ بھول جاؤں گی
محبت یاد رکھوں گی
شاعرہ: فریدہ جاوید فری، لاہور

دل کی باتیں
اب عمر، نہ موسم، نہ وہ رستے کہ وہ پلٹے
اس دل کی مگر خام خیالی نہیں جاتی
ہمراہ ترے پھول کھلاتی تھی جو دل میں
اب شام ہی وہ دل سے خالی نہیں جاتی
از: سیما ممتاز عباسی، لاڑکانہ



ادارہ

حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا

قرآن پاک میں حضرت یوسف علیہ السلام کا پورا قصہ سورۂ یوسف میں بیان ہوا ہے اور اسی سورہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی اس دعا کے الفاظ بھی بیان کیے ہیں جو انہوں نے مانگی تھی۔ اس دعا کا موقع محل یہ تھا کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام مصر میں حکومت کے سربراہ بن گئے اور آپ کے والد جب عرصہ دراز کی جدائی کے بعد مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام سے ملے تو آپ نے اس وقت اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور اللہ کے حضور یہ دعا مانگی۔

ترجمہ: اے آسمانوں اور زمین کے بنانے والے! دنیا اور آخرت میں تو ہی میرا کارسازِ حقیقی ہے۔ پس تجھ سے اتنی غرض ہے کہ مجھے مسلمان ہوتے ہوئے وفات دے اور نیکوں سے جا ملا۔

اسرارِ دعا...... حضرت یوسف علیہ السلام کی اس دعا کے بھی بے شمار فوائد ہیں۔ اس کا سب سے پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ اگر کوئی سالک جو روحانی منزل پر رواں دواں ہو تو وہ اس آیت کو کثرت سے پڑھے تو خواب یا مراقبے میں اس پر زمین اور آسمان کے اسرار ظاہر ہوں گے۔ آسمانوں کے اوپر اللہ کی جو مخلوق رہتی ہے اس کا دیدار ہوگا اور جس طرح آخرت برپا ہوگی اس کے مشاہدات نظر آئیں گے۔

ترجمہ: اے میرے پروردگار! اس شہر کو امن کی جگہ کر اور مجھ کو اور میری نسل کو اس گمراہی سے بچا کہ لگے بتوں کو پوجنے، اے میرے پروردگار! کچھ شک نہیں کہ ان بتوں نے اکثر لوگوں کو گمراہ کیا ہے تو جس نے میری پیروی کی وہ میرا ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو، تو بخشنے والا مہربان ہے (پ۱۳۔ سورۂ ابراہیم، آیت ۳۵)

یہ دعا بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شہر مکہ کو امن والا شہر بنانے کے لیے مانگی تھی۔ اس دعا کا ایک فائدہ تو استقامتِ ایمان ہے کہ اس کے پڑھنے سے انسان کا ایمان پختہ ہوتا ہے۔ دعا کو پڑھے۔ انشاء اللہ راہِ راست پر آجائے گا۔

اس دعا کے پڑھنے سے انسان کو بخشش بھی حاصل ہوتی ہے۔ اس دعا کا خاص عمل یہ ہے کہ جو بچے نافرمان اور بے راہ ہوں تو ان کے والدین روزانہ بعد نمازِ فجر اس آیت کو پڑھ کر پانی پر دم کر کے انہیں پلایا جائے تو انشاء اللہ بچے راہِ راست پر آجائیں گے۔ آیت کے ان اسرار کے حصول کے لیے مرشد کامل کی باطنی توجہ کا ہونا از حد ضروری ہے کیونکہ توجہ کے بغیر بات نہیں بنتی۔

خاتمہ بالخیر کے لیے بھی ہر عالم دین، امام مسجد بلکہ ہر مسلمان کو نماز کے بعد اس دعا کا پڑھنا ضروری ہے اور جو شخص ہر نماز کے بعد ایک مرتبہ اس دعا کو عمر بھر پڑھتا رہتا ہے تو اس کا خاتمہ بالخیر ہوگا۔

بزرگانِ دین اور اولیا کے معمول کے مطابق اگر کوئی شخص اس دعا کو عشا کی نماز کے بعد گیارہ مرتبہ اول و آخر درود شریف ۴۱ روز تک پڑھے تو اس کی ہر وہ مشکل آسان ہو جائے گی جس کا وہ خواہشمند ہوگا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی دیگر دعا

ترجمہ: اے میرے پروردگار! قید مجھے اس سے زیادہ

محبوب ہے جس کی طرف وہ مجھے بلاتی ہیں اور اگر تو مجھ سے ان کے مکر نہیں پھیر دے گا تو میں ان کی طرف جھک جاؤں گا اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا۔ (پ۱۲۔ سورۂ یوسف، آیت ۳۳)

حضرت یوسف علیہ السلام نے...... زلیخا سے بچنے کے لیے جب یہ دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی اس دعا کو قبول فرمایا اور اس دعا کے پڑھنے سے...... زلیخا کے مکر کے اثرات ختم ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے اس دعا کی خیر و برکت سے عصمتِ نبی کی حفاظت کی۔

اسرار...... صوفیائے اور اللہ کے فقیروں نے اس دعا کے بارے میں یہ کہا ہے کہ اس دعا کے کثیر فوائد ہیں۔ اس دعا کے پڑھنے سے انسان کے والدین کی مغفرت ہوتی ہے اور اہلِ ایمان کی بخشش ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع قائم ہوتا ہے۔ اولاد نیکی کی طرف راغب ہوتی ہے۔ لہٰذا جو شخص اسے نماز کے بعد ایک مرتبہ پڑھے اس کی جان، مال، عزت، رزق بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں خیر و برکت حاصل ہوگی۔

کافروں کی ایذا سے محفوظ رہنے کی دعا

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! ہم تجھ ہی پر بھروسا رکھتے ہیں اور تیری ہی طرف رجوع کرتے ہیں اور تیری ہی طرف (ہمیں) لوٹ کر جانا ہے۔ اے ہمارے پروردگار! ہم کو کافروں (کے جور و ظلم) کا تختۂ مشق نہ بنا اور اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہ معاف کر۔ بے شک تو زبردست (اور) حکمت والا ہے۔ (پ۲۸ ممتحنہ۔ آیت ۔۶)

یہ دعا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کافروں کی ایذا رسانیوں سے بچنے کے لیے کی لہٰذا شر پسند لوگوں سے بچنے کے لیے یہ دعا بہت مفید ہے۔ یہ دعا دراصل غیروں پر غلبہ حاصل کرنے کی ہے جو شخص ظالموں میں پھنسا ہوا یا ایسی مشکلات میں ہو جن میں لوگ اسے تنگ کرتے ہوں تو اسے چاہیے کہ اس دعا کو پڑھے تو انشاء اللہ غلبہ پائے گا اس دعا کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ مصیبت سے نکلنے کی کوئی نہ کوئی صورت بن جاتی ہے۔

حضرت ہارونؑ کے لیے دعا

ترجمہ: اے میرے پروردگار! میرا اور میرے بھائی کا قصور معاف فرما اور ہم دونوں کو اپنی رحمت کے سائے میں لے اور تو تمام رحم کرنے والوں سے بڑا رحم کرنے والا ہے۔ (پ۹۔ سورۂ اعراف آیت ۱۵۱)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا

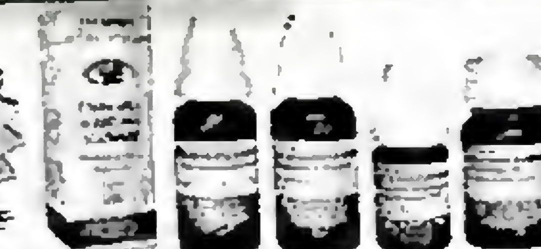
موسیٰؑ کو خدا تعالیٰ نے تورات دینے کے لیے کوہِ طور پر بلوا بھیجا تھا۔ یہ گئے تو اپنے بھائی ہارونؑ کو اپنا نائب کر گئے۔ ان کو واپس آنے میں دیر ہوئی تو بنی اسرائیل بے چین اور بے یقین تو تھے ہی، ایک شخص سامری کے بہکانے سے چاندی سونے کے بچھڑے کی مورت بنا کر پوجنے لگے۔ حضرت موسیٰؑ نے واپس آ کر یہ حال دیکھا تو بڑے ناخوش ہوئے اور ہارون علیہ السلام سے دست و گریبان ہو پڑے۔ انہوں نے معذرت کی اور اپنی مجبوری ثابت کی۔ تب کہیں جا کر موسیٰؑ کا غصہ فرو ہوا۔ اس پشیمانی کے وقت موسیٰؑ نے یہ دعا کی۔

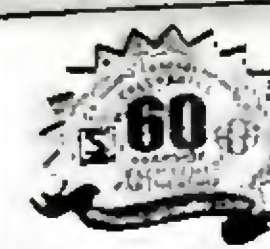
اس دعا کی خاصیت یہ ہے کہ آج بھی اگر کسی کے بھائی دوست یا عزیز سے اللہ کی نافرمانی ہو جائے تو وہ اس دعا کو پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کی غلطی معاف کر دے گا اور اسے اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ اس کے پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ جس کے لیے دعا کرنا ہو، دو رکعت نفل پڑھ کر سجدے میں یہ دعا تین مرتبہ پڑھنی چاہیے۔ انشاء اللہ اللہ معاف کرے گا۔

☆☆☆



شوابے ہومیوکلینک





اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

وزن کی زیادتی

عائشہ۔ پتوکی

میری عمر 37 سال ہے۔ میرا قد پانچ فٹ ہے۔

ٹوکن

برائے شوابے ہومیوکلینک

ستمبر 2015

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ________

پتا: ________

میرا وزن 125 کلوگرام ہے۔ میری خوراک میں ناشتے میں ایک کپ دہی، گیارہ بجے ایک کپ چائے، دوپہر میں کبھی ایک اور کبھی دو روٹیاں۔ رات، میں بہت ہی کم، کبھی کبھی چکن پیس کھاتی ہوں (مہینے میں دو بار) فروٹ میں آم کا جوس ہو تو روزانہ 2 آم اور خربوزے یا تربوز کا موسم ہو تو 2 سے 3 قاشیں کھاتی ہوں اور بس۔ بیماری مجھے کوئی نہیں ہے الحمدللہ۔ ڈاکٹر صاحب میں بڑھتے وزن سے بے حد پریشان ہوں۔ فی سبیل اللہ میری مدد کریں۔

جواب: اتنا وزن آپ کا کیسے ہوگیا؟ یہ نہیں لکھا۔ بچوں کی پیدائش کے بعد یا کوئی بیماری ہوئی؟ ورزش کیا کرتی ہیں؟ یہ خوراک جو آپ نے بتائی ہے کتنے عرصے سے لے رہی ہیں؟ کوئی ہارمونز کے ٹیسٹ وغیرہ کرائے یا نہیں؟ ان سب کی تفصیل بھیجیں۔ فی الحال 3 ماہ مندرجہ ذیل ادویات ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی استعمال کریں۔

Calc. Carb-200 ہفتے میں ایک مرتبہ۔ یہ دوا لینے سے ایک دن پہلے اور بعد کوئی اور دوا نہیں لینی۔ اس دوا کے ایک دن بعد Fucus ves-Ø اور Phytolaca

e baccis-Ø کے 11-11 قطرے ایک گلاس پانی میں ڈال کر ہر کھانے سے پہلے لیں دن میں 3 مرتبہ۔ کھانے میں تمام پھل اور سبزیاں لیں، ابلی ہوئی بھی لے سکتی ہیں۔ چاول آلو بھی لے سکتی ہیں۔ آم اور کیلا کنٹرول کر کے کھائیں۔ سوپ بھی لیا کریں۔ کم از کم چہل قدمی ایک گھنٹا ضرور کریں۔

نظر کی کمزوری

نورالعین فاطمہ۔ چونیاں قصور

میری چھوٹی بہن کی نظر کی کمزوری کا مسئلہ ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سال پہلے اس کو ہر وقت سر درد کی شکایت رہنے لگی۔ شروع میں معمولی سر درد سمجھ کر کبھی پیناڈول ٹیبلٹ لے لیتی اور کبھی اگنور کر دیتی۔ مستقلاً درد رہنے پر ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے بتایا کہ بچی کی نظر کمزور ہو رہی ہے اور ڈیڑھ نمبر کا چشمہ تجویز کیا۔ اس کے بعد یہ ہونے لگا کہ ہر چند ماہ بعد چشمے کا نمبر بڑھ جاتا۔ اب یہ صورتِ حال ہے کہ اس کی نظر ساڑھے تین نمبر کے چشمے تک آگئی ہے۔ کبھی اندھیرے میں ہو تو سامنے پڑی چیز تک نظر نہیں آتی۔ ہمارے لیے یہ بہت پریشانی کی بات ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہ ایسا کیا کیا جائے کہ اس کی تیزی سے گرتی ہوئی نظر ٹھہر جائے بلکہ ٹھیک ہونا شروع ہو جائے۔ میری بہن کی خوراک کافی کم ہے جس کی وجہ سے وہ جسمانی طور پر قدرے کمزور بھی ہے۔ دوسرے وہ نظر خراب ہونے کی ٹینشن بھی بہت لیتی ہے اس وجہ سے اکثر رونے لگ جاتی ہے۔ قبض کی شکایت بہت زیادہ رہتی ہے۔ آپ کوئی اچھی سی اور فوری اثر والی دوا تجویز کر دیجیے جس سے نہ صرف نظر گرنا ٹھہر جائے بلکہ بہتر ہونا شروع ہو جائے۔

جواب: آپ نے وزن اور قد نہیں لکھا جس سے ہم اندازہ کرتے کہ آپ کی بہن کتنی کمزور ہے؟ قبض کا تعلق صرف غذا سے نہیں بلکہ پانی اور آرام طلب زندگی اور خون کی کمی سے بھی ہوتا ہے۔ ہاں اس کا تعلق بالواسطہ



نظر کی کمزوری سے نہیں ہے۔ نظر کی کمزوری کی مندرجہ ذیل وجوہات ہوسکتی ہیں۔ خصوصاً آپ کی بہن میں۔ (1 آنکھ کے پردے میں پیدائشی نقص۔ ماہر امراض چشم آنکھ کے معائنے کے بعد بتا سکتا ہے۔ اس میں مکمل جوان ہونے تک نظر کمزور ہوتی رہتی ہے۔ (2 وٹامن A کی کمی سے بھی رات کو اندھیرے میں نظر نہیں آتا۔ گاجر، سیب، چقندر، شلجم، بادام، آم اور دیگر موسم کے پھل باقاعدگی کے ساتھ کھائیں۔ (3 پڑھنے کا طریقہ، سورج کی روشنی میں براہِ راست نہ پڑھیں، لیٹ کر نہ پڑھیں، پڑھتے ہوئے خیال کریں کہ کتاب کاپی اور آنکھ کے درمیان ایک فٹ کا فاصلہ ہو۔ روشنی اوپر سے یا بیٹھنے سے کتاب کاپی پر پڑے ڈائریکٹ آنکھوں پر نہ آئے۔ (4 ٹی وی اور کمپیوٹر کو مسلسل نہ دیکھیں۔ ٹی وی جتنے انچ کا ہے اتنے فٹ کا فاصلہ رکھیں (کم از کم 12 فٹ)۔ (5 سر پر کوئی چوٹ تو نہیں لگی؟ (6 کوئی بیماری؟ (7 خون کی کمی کا ٹیسٹ ضرور کرائیں۔ (8 آنکھوں کی ورزش کرائیں۔ خصوصاً صبح سویرے سورج نکلتے وقت 2 سے 3 منٹ دیکھیں۔ بالکل صبح سویرے کی دھوپ 15 منٹ تک جسم کو لگائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل میڈیسن 3 ماہ تک مسلسل استعمال کر کے حال بتائیں۔ Physostigma-30، Calc. phos-30 اور Calc flour-30 ہر شیشی میں سے 7-7 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ صبح دوپہر اور شام (رمضان میں افطار، سوتے وقت، سحری) میں استعمال کریں۔

منہ سے بو آنا

مسز خلیل۔ لیہ

میرے دو مسائل ہیں ان کے لیے برائے مہربانی کوئی دوائی تجویز کر دیں۔ مسئلہ نمبر 1: .... بریسٹ کا سائز نارمل سے زیادہ ہے۔ ورکنگ woman ہوں۔





اچھا نہیں لگتا۔ کیا کوئی ایسا علاج ہے کہ میری پریشانی دور ہو۔ مسئلہ نمبر 2: میں جو کچھ کھاتی ہوں دانت میں اٹک جاتا ہے۔ اس کے علاوہ صبح اٹھنے پر اور زیادہ وقت منہ بند رہے یا کھایا پیا نہ جائے تو بدبو آنے لگتی ہے۔

جواب: اپنا قد اور وزن بھی لکھنا تھا تاکہ اندازہ کیا جاتا کہ جسامت کے اعتبار سے صحیح ہے یا نہیں؟ ہارمونز کی کمی یا زیادتی کی وجہ سے سائز کم.... یا زیادہ ہوجاتا ہے جو قابلِ علاج ہے۔ آپ رات کو کھانے کے بعد برش کیا کریں اس کے بعد دھاگے یا خلال یا ڈینٹل فلاس سے دانتوں کے درمیان خالی جگہوں کو صاف بھی کیا کریں۔ دونوں مسائل کے لیے ذیل میں دی گئی ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی ادویات استعمال کریں۔ Mercsol-30, Chimaphila-30, Fragaria ves-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔

نسوانی مسائل و خوبصورتی

ارم اقبال۔ سرگودھا

میرا مسئلہ یہ ہے کہ 13 سال کی عمر میں ہی مجھے ماہانہ ایام آگئے اور اس وقت سے لے کر اب تک ان کی کوئی ترتیب نہیں۔ مجھے لیکوریا بھی عرصۂ دراز سے ہے۔ پچھلے ایک سال سے میرے بال تیزی سے جڑوں سمیت نکل رہے ہیں۔ بے حد باریک، چھوٹے ہیں، سر میں خشکی، بال روکھے اور دومنہ کے ہیں۔ میرے جسم پر اکثر الرجی ہوجاتی ہے۔ خارش کر کر کے وہ جگہ سوج جاتی ہے۔ ایک دو ماہ دوائی لی ہے۔ صافی بھی بے حد پی لیکن کوئی مسئلہ حل نہ ہوا۔ معدے میں بے حد جلن ہوتی ہے۔ پٹھوں میں کھنچاؤ ہوجاتا ہے۔ درد ہوتا ہے۔ ایک جگہ پر زیادہ دیر نہیں بیٹھا جاتا۔ پٹھے اکڑ جاتے ہیں۔ میرے چہرے پر عرصہ چھ سال سے دانے اور کیل مہاسے ہیں۔ چہرے پر خارش بھی ہوتی ہے۔ ایکنی سوپ اور ٹیوب ڈاکٹر نے دیں۔ ایک ماہ استعمال کے دوران آرام رہا۔ پھر اسی طرح ہوگیا۔ میرے چہرے پر کوئی رونق نہیں ہے۔ مرجھایا ہوا ہے۔ پچکے گال، سانولی رنگت، ہر وقت آنکھوں میں نیند اور تھکی تھکی رہتی ہوں۔ جب میں نے پاکیزہ میں آپ کے بارے میں پڑھا تو اللہ کا شکر ادا کیا کہ اللہ نے مجھے راستہ دکھایا ہے۔ مہربانی فرما کر میری رہنمائی کریں۔ مجھے کوئی دوا تجویز کریں۔ شکریہ۔

جواب: تمہاری اب تک صحیح تشخیص و علاج نہیں ہوا یا تم نے نہیں کیا۔ ذہنی آسودگی جسمانی افعال پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ذہنی آسودگی کے لیے صبر شکر اور قناعت کرو، نماز قرآن پڑھ کر اپنے مسائل کے حل کے لیے دعا کیا کرو۔ متوازن خوراک دودھ، دہی، مکھن، پنیر، انڈے، گوشت (گائے بکرا دمرغی)، مچھلی، دالیں، سبزیاں اور پھلوں کو اپنی غذا میں شامل کرو۔ واک کیا کرو۔ ابتدا 5 منٹ، پھر ایک گھنٹا، آہستہ آہستہ بڑھاؤ۔ بچوں کو اپنے والدین سے اپنے مسائل ضرور شیئر کرنے چاہئیں۔ غذا ہلکی پھلکی سادہ ہو۔ تلی ہوئی بھنی ہوئی اور تیز مرچ مصالحوں سے پرہیز کرو۔ کھانا خوب اچھی طرح چبا کر کھاؤ۔ جلدی جلدی نہ نگلو اور اس کے ساتھ پانی کا استعمال نہ کیا کرو۔ پانی ہمیشہ کھانے سے پہلے یا پھر 2 گھنٹے بعد پیا کرو۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 2 ماہ استعمال کے بعد تمام حالات تفصیل سے بتانا۔ Bismutum Pentarkan Ptk-16 ایک گولی دن میں 3 مرتبہ تھوڑے سے پانی کے ساتھ لیں۔ Magnsium phosphoricum Pentarkan Ptk-60 ایک گولی دن میں 3 مرتبہ تھوڑے سے پانی کے ساتھ لیں۔ Ferrum Pentarkan Ptk-45 دو گولیاں دن میں 3 مرتبہ تھوڑے سے پانی کے ساتھ لیں۔ Rhustoxicodendrom Pentarkan Ptk-7 اور Urtica Pentarkan Ptk-6 دونوں کے

10-10 قطرے آدھے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔

بری صحبت

اسامہ حفیظ۔ لاہور

میرا مسئلہ بہت سنگین ہے۔ بری صحبت اور آزادانہ نیٹ کے استعمال نے میری صحت پر برا اثر ڈالا ہے۔ میری عمر 17 سال ہے۔ اب مجھے احساس ہوگیا ہے اور میں نے دل و دماغ سے سدھرنے کا ارادہ کرلیا ہے۔ اچھی ڈائٹ کے ساتھ دوائی لینا بھی بہت ضروری ہے تاکہ میری صحت بحال ہوجائے۔ میں آرمی میں جانا چاہتا ہوں جو میرے پاپا کا خواب ہے۔ پر مجھے ڈر ہے کہ میری اس حالت کی وجہ سے وہ مجھے رجیکٹ ہی نہ کردیں۔ برائے مہربانی مجھے کوئی ایسی دوا بتائیں جو مجھے مکمل طور پر صحت یاب کردے اور میں آرمی میں جاسکوں۔

جواب: یہ ہمارے معاشرے کا بڑا المیہ ہے کہ ماں، باپ بچوں سے اور بچے ماں باپ سے دوستانہ ماحول نہیں رکھتے تاکہ جب وہ بلوغت کو پہنچیں تو ان میں ہونے والی نفسیاتی و جسمانی تبدیلیوں کا ذکر کریں اور ان کی صحیح رہنمائی ہو۔ رہی سہی کسر دوستوں کے بعد Net نے تمام کردی۔ بچے جب تک ذہنی طور پر تیار نہ ہوں ان کو قبل از وقت سیکس کی باتیں معلوم ہونا ان کی تباہی ہی نہیں بلکہ پورے معاشرے کی تباہی ہے...... اسلامی اصولوں کے مطابق ہمارے نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی کا ٹارگٹ بنائیں کیونکہ وہ نوجوان جو اپنی زندگی کا ٹارگٹ بناتے ہیں تو ان کی توجہ بے کار لایعنی چیزوں کی طرف نہیں ہوتی بلکہ اپنے Goal کی طرف ہوتی ہے۔ نماز، قرآن پڑھیں، ذکر اللہ کریں۔ اچھی ویب سائٹس وزٹ کریں۔ اچھے لوگوں کے ساتھ وقت گزاریں۔ دینی کتابوں کا مطالعہ بھی اس وقت اور اس عمر میں بہت اچھا رہے گا۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 2 ماہ تک استعمال کریں اور پھر حال بتائیں۔



Staphisagria-30، Bufo-30 کے 10-10 قطرے آدھے گلاس پانی میں جبکہ Alfalfa-Ø کے 15 قطرے آدھے گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔ متوازن غذا میں دودھ، پھل، سبزیاں زیادہ استعمال کریں۔ چاول کا استعمال بھی مفید ہے۔

رحم کی خرابی

عائشہ راجپوت۔ شیخوپورہ

میری عمر 24 سال ہے۔ شادی کو چار سال ہوگئے ہیں۔ شادی سے پہلے مجھے لیکوریا کی شکایت تھی لیکن شادی کے بعد زیادہ ہوگیا ہے۔ میں ذرا سی بھی کوئی گرم چیز نہیں کھا سکتی اور گرم دوا بھی نہیں اگر کھاتی ہوں تو بہت جلد آنکھیں پیلی پڑ جاتی ہیں اور لیکوریا زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ میرے ایام بھی ٹھیک نہیں ہیں اب بھی چھ ماہ سے نہیں ہوئے۔ میں نے انگریزی دوائی بہت کھائی لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔ پیٹ کے نچلے حصے میں درد رہتا ہے۔ لیڈی ڈاکٹر کو چیک اپ کروایا تو اس نے کہا کہ پیٹ کے نچلے حصے میں سوجن ہے یعنی بچہ دانی پر۔ پیٹ بھی بہت پھول گیا ہے۔ میرا معدہ بھی خراب رہتا ہے۔ بھوک بہت لگتی ہے لیکن جب کھانا کھا لیتی ہوں تو ہاتھ پاؤں کانپتے ہیں۔ قبض بھی رہتا ہے اور گیس بھی۔ میرے سر میں بھی درد رہتا ہے۔ کچھ بھی یاد نہیں رہتا، حافظہ بھی کمزور ہے۔ مجھے انتہائی کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ ریڑھ کی ہڈی میں درد رہتا ہے اور کندھوں میں بہت درد ہوتا ہے۔ ہاتھ پاؤں میں کیڑیاں چلتی ہیں۔ ہاتھ پاؤں سن ہوجاتے ہیں۔ سردیوں میں شدید سردی اور گرمیوں میں شدید گرمی کی وجہ سے دل گھبراتا ہے۔ سارے جسم سے گرمی نکلتی ہے اور ہاتھ پاؤں کے تلووں میں سے بھی۔ بلڈ پریشر ہر وقت لو رہتا ہے۔ مجھے موٹاپا بہت تیزی سے چڑھ رہا ہے۔ مجھے سب ورزش کرنے کا

مشورہ دیتے ہیں لیکن مجھ سے ورزش بھی نہیں ہوتی۔

جواب: آپ کی کیفیات پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے مسائل کے حل کے لیے سنجیدگی سے اب تک علاج نہیں کیا اسی وجہ سے وقت کے ساتھ آپ کی بیماریاں بڑھ گئیں۔ کیلشیم اور بی کمپلیکس کی کمی بھی لگتی ہے۔ مایوس نہ ہوں۔ آپ کے ان تمام مسائل کا ہومیو پیتھی میں حل موجود ہے۔ لیکن توجہ کے ساتھ علاج کریں۔ واک کیا کریں۔ تیز مرچ مصالحوں، تلی ہوئی اور بھنی ہوئی چیزوں کا استعمال نہ کریں۔ غذا کو اچھی طرح چبا کر کھائیں۔ یخ ٹھنڈا پانی نہ پیا کریں۔ متوازن غذا استعمال کریں۔ دہی کا استعمال بڑھا دیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ استعمال کے بعد دوبارہ حال بتائیں۔ Magnasium phosphoricum Pentarkan Ptk-60 ایک گولی دن میں 3 مرتبہ تھوڑے سے پانی کے ساتھ لیں۔ Calc carb-30 اور Sepia-30 کے 10 قطرے آدھے گلاس میں دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ Bismutum Pentarkan Ptk-16 کی ایک گولی تھوڑے پانی سے 3 مرتبہ پئیں۔

جوڑوں کا درد اور پیشاب کی بندش

ثریا نواز۔ لیہ

محترم جناب ڈاکٹر صاحب میری بیٹی نوشین کنول جس کی عمر 23 سال ہے ذہنی معذور ہے۔ تقریباً عرصہ ایک سال سے اس کے جوڑوں میں درد رہتا تھا جس کی وجہ سے اس کے ہاتھ پاؤں سوج جاتے تھے۔ اچانک اس کا پیشاب بند ہوگیا۔ متاثرہ جگہ پر سوزش ہونے کی وجہ سے نالی نہ لگ سکی۔ پیٹ میں انجکشن لگا کر پیشاب نکالا۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے اسے انجکشن اور ڈرپس لگا دیں۔ پوری رات اسے ہر 5 منٹ بعد تھوڑا تھوڑا پیشاب آجاتا۔ اسے سخت بخار تھا اور بہت کمزور ہوگئی تھی۔ جب اسے پیشاب ٹھیک آنے لگا تو میڈیسن کھلانا بند کردیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ میڈیسن کھانے سے اسے بخار ہوجاتا ہے۔ ہومیو پیتھک میڈیسن کھانے سے اسے نزلہ وزکام ہوجاتا ہے۔ جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ اب بھی جوڑوں میں درد ہے۔ درد کی وجہ سے ہاتھ پاؤں سوج جاتے ہیں۔ تمام رپورٹس کی فوٹو کاپی ارسال کررہی ہوں۔ ان کی روشنی میں میری بیٹی کے لیے کوئی علاج تجویز فرمائیں۔ تازیست دعا گو رہوں گی۔

جواب: نوشین کو موسم کے حساب سے پانی پلایا کریں۔ زیادہ گرمی میں زیادہ پانی پلائیں تاکہ پیشاب آرام سے کھل کر آئے۔ اسے کھانے میں تیز مرچ مصالحے اور مرغن اشیا نہ دیں۔ ایک ماہ دوائی کھلانے کے بعد اس کے بلڈ کے مندرجہ ذیل ٹیسٹ کرانے کے بعد مکمل حال بتائیں۔

Urea, Uric acid, Creatinine

ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کرائیں۔

Pentarkan Ptk-73Rhustoxicodendron کے 10 قطرے ایک گھونٹ یا آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ اور Solidago Pentarkan Ptk-79 کے 10 قطرے ایک گھونٹ یا آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں۔

☆☆☆